

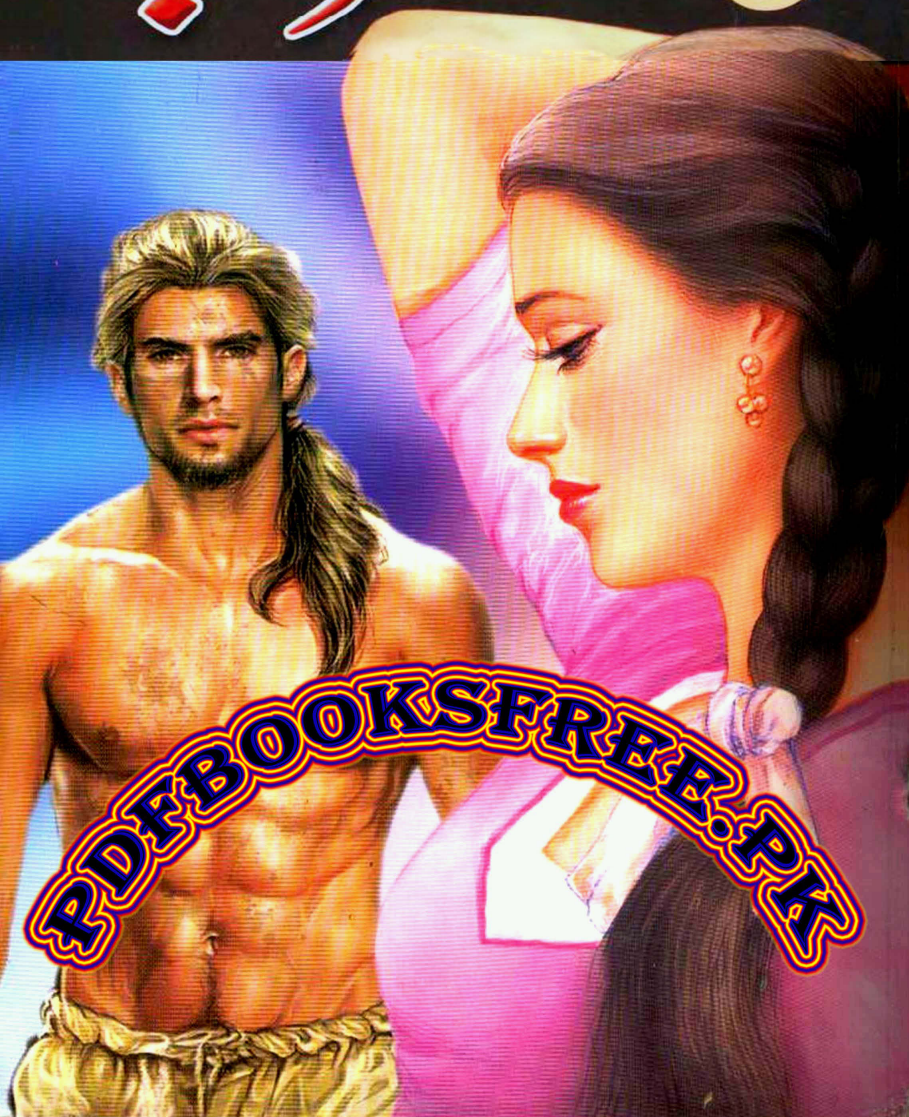
ایک نوجوان کے بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں کی تہلکہ خیز کہانی

سراب

راوی: شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

12



ایک نوجوان کے بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں کی ایک تھلکہ خیز کہانی

سراب

بارہواں حصہ

کاشف زبیر



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون: 37247414

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

بار اشاعت ————— اول
مطبع ————— یو این ڈی پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ————— عاطف رحمن، لاہور
قیمت ————— 250 روپے
بیرون ملک ————— 10 برطانوی پونڈ
15 امریکی ڈالر

جیسے جیسے بریف کیس کی لوکیشن کے بارے میں میرے علم میں اضافہ ہو رہا تھا میری پریشانی میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا پہلے بریف کیس آزاد کشمیر میں کہیں تھا اور اب یہ لائن آف کنٹرول عبور کر کے مقبوضہ کشمیر جا چکا تھا۔ ہم آزاد کشمیر تک جاسکتے تھے لیکن مقبوضہ کشمیر تک رسائی حاصل کرنا جان جو کھم کا کھیل تھا۔ مجھے اب تک یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی کہ خانہ بدوش قبیلے لائن آف کنٹرول کے پار جاتے رہتے تھے۔ یہ دنیا کی مشکل ترین اور خطرناک ترین سرحد تھی۔ جو دنیا کے دشوار ترین خطے میں واقع تھی۔ دنیا کی چوتھی اور چھٹی بڑی فوجی قوتیں یہاں برسرِ پیکار تھیں۔ یہاں سوائے فوج کے اور کسی کی نقل و حرکت نہایت مشکل کام تھی۔ سچی بات ہے صابر کی یہ بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھی کہ بریف کیس سمیت خانہ بدوش قبیلہ کنٹرول لائن کے پار جا چکا ہے۔

میں نے واپس آکر سفیر اور وسیم کو تازہ ترین حالات سے آگاہ کیا۔ وسیم بولا۔ "مجھے تو لگ رہا ہے کہ وہ بریف کیس ہمارے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔"

"ہو سکتا ہے لیکن ایک نیا خطرہ سامنے آیا ہے۔ ممکنہ طور پر چینی حکومت مجھے اور بیٹو کو اس بریف کیس کی گمشدگی کا ذمے دار قرار دے رہی ہے اور اس نے پاکستانی انٹیلی جنس حکام کو میری اور بیٹو کی تصاویر بھی فراہم کی ہیں۔ مگر فی الحال پاکستانی حکام نے اس سلسلے میں معذرت کر لی ہے۔ میں انٹیلی جنس کی تحویل میں رہ کر آیا ہوں اگر وہ چاہتے تو مجھے اس معاملے میں گرفتار کر لیتے۔"

"لیکن انہوں نے تجھے چھوڑ دیا۔" سفیر بولا۔

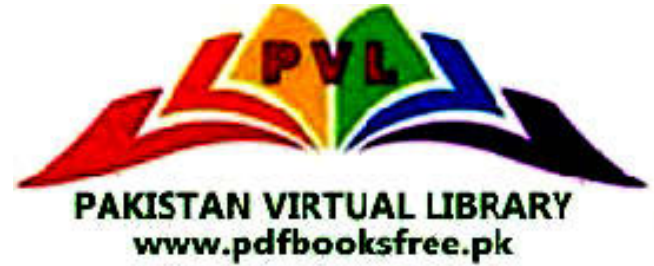
"ہاں مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مقامی حکام کا یہ رویہ برقرار رہے گا اگر ان پر بیرونی دباؤ آئے تو یہ یوٹرن لینے میں دیر نہیں لگاتے ہیں۔ اس لئے ہماری بچت کے لیے اس بریف کیس کی واپسی لازمی ہے۔"

وسیم غور سے میری بات سن رہا تھا۔ "آپ کا مطلب ہے ہم اس کے حصول کے خاطر لائن آف کنٹرول کے پار جائیں؟"

"میرا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے۔ بریف کیس جن لوگوں کے پاس ہے۔ ممکنہ طور پر وہ اس کی اہمیت سے ناواقف ہیں وہ اسے قیمتی ضرور سمجھتے ہوں گے۔ وہ اسے کھول بھی نہیں سکے ہوں گے۔"

"فرض کریں انہوں نے اسے کھولنے کی کوشش کی ہو اور وہ پھٹ کر ضائع ہو گیا؟" وسیم نے کہا۔

"یہ ایک مفروضہ ہے۔ ممکن ہے وہ اسے اب تک سنبھال کر بیٹھے ہوں۔"



ISBN 978-969-517-320-6

Stokist: (U.K)

Azhar Enterprises

315, Dickenson Road
Longsight, Manchester, M13 0NR
Tel: 0044 (0) 161 224 6331

اسٹاکسٹ
علی بابا سٹال
نسبت روڈ، چوک میوہسپتال، لاہور

جہاں سے وہ مدد حاصل کر سکے۔“

وسیم نے سر ہلایا اور کھڑا ہو گیا۔ ہم لاؤنج میں بیٹھے تھے سفیر نے ٹی وی آن کر دیا۔ ایک نیا چینل سے مرشد کی تباہ ہونے والی کوٹھی کے بارے میں خبر آ رہی تھی۔ نیوز کاسٹر بتا رہی تھی کہ کوٹھی مرشد علی نامی سیاست دان اور رکن قومی اسمبلی کی ملکیت ہے جو آج کل حکومت میں شامل ہے اس سے پہلے بھی اس کی ملکیت میں دو فیکٹریاں اور ایک کینل فارم اسی طرح تباہی کا شکار ہوئے تھے۔ مرشد علی نے اس کا الزام اپنے سیاسی حریفوں پر لگایا تھا۔ خبر میں نادر علی کی کوٹھی میں ہونے والا دھماکہ بھی شامل تھا۔ ڈھکے چھپے انداز میں بتایا گیا کہ مرشد علی کی اپنی شہرت اچھی نہیں تھی ماضی اور حال میں وہ کئی ایسے واقعات میں ملوث رہا تھا جن سے اس کی شہرت کو داغ لگا تھا۔ کالی کوٹھی کی تباہی نے مرشد کو سب کی توجہ کا مرکز بنا دیا تھا۔ مختلف چینل والے اس کے بارے میں خبریں کھود کھود کر لارہے تھے۔

کام کی رپورٹ ایک انگریزی زبان کے چینل سے ملی۔ پولیس حکام کے مطابق کوٹھی میں آگ لگانے والے بم نصب تھے اور جب کوٹھی میں آگ لگی تو اس میں کہیں ذخیرہ کیا ہوا گولہ بارود بھی پھنسا اور اس سے کوٹھی مکمل طور پر تباہ ہو گئی اس دھماکے کی زد میں آکر چار پولیس اہلکار ہلاک اور اتنے ہی شدید زخمی ہوئے تھے۔ وہ اس وقت کوٹھی کے پاس تھے اور وہاں ہونے والے دھماکوں کی آوازیں سن کر آئے تھے کہ ناگہانی طور پر پہلے آگ لگی اور پھر دھماکہ ہو گیا۔ پولیس پارٹی اس دھماکے کی پلٹ میں آ گئی۔ انہیں فرض شناسی مہنگی پڑی تھی۔ پولیس نے اس تباہی کا ذمہ دار نامعلوم افراد کو قرار دیا تھا۔ پولیس کے علاوہ کسی اور تحقیقاتی ایجنسی کی طرف سے تفتیش کا امکان بھی مسترد کر دیا تھا۔ مرشد علی نے فی الحال کسی خاص شخص پر شبہ ظاہر کرنے سے گریز کیا تھا اور اس نے فوری طور پر میڈیا والوں سے بات کرنے سے معذرت کرتے ہوئے عفریب ایک پریس کانفرنس کر کے حقائق قوم کے سامنے لانے کا وعدہ کیا تھا۔ البتہ اس نے کوٹھی میں کسی قسم کے غیر قانونی اسلحے یا گولہ بارود کی موجودگی کی نفی کی تھی۔

”حقائق قوم کے سامنے لانے کا وعدہ۔“ میں نے تلخی سے کہا۔ ”کیسے لوگ ہمارے لیڈر بنے ہوئے ہیں۔“

”ایسے ہی لیڈر ہیں یار۔“ سفیر نے کہا۔ ”ان ہی لوگوں نے اس ملک کا یہ حال کیا ہے۔“

”ان لوگوں نے نہیں ہم جیسی بے حس عوام نے جسے ذرا فکر نہیں ہے کہ حکمران ملک و قوم کا مفاد کتنے ستے داموں بچ رہے ہیں اور عوام کو صرف اپنی پڑی ہے۔ اگر لوگ متحد ہو جائیں صوابیت، اہمیت، فرقہ واریت اور ہر تقسیم بھول کر صرف پاکستانی بن جائیں۔ یقین کرو یہ سیاست دان، جاگیر دار و ڈیرے اور لٹیرے ملک چھوڑ کر ہی بھاگ جائیں گے۔“

سفیر نے غصہ سی سانس لی۔ ”ٹوٹھیک کہتا ہے لیکن جوڑو کہتا ہے وہ ہوگا نہیں۔“

”ہوگا۔“ میں نے یقین سے کہا۔ ”اب نہیں تو دس سال بعد پچاس سال بعد یا سو سال بعد ہوگا۔ سفیر، قوموں کی صدیاں سالوں کی طرح ہوتی ہیں۔ ہم اپنے لحاظ سے سوچتے کہ ہم برسوں میں جیتے یا جگڑتے ہیں لیکن قومیں صدیوں میں بنتی جگڑتی ہیں۔ تبدیلی آئے گی۔ اس ملک کو میں نے یا تم نے نہیں بنایا ہے اسے اللہ

”ایک مفروضہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لائن آف کنٹرول کے دوسری طرف جانے کا مقصد بھارتیوں سے بریف کیس کا سودا کرنا ہو۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میرا خیال ہے وہ ایسی حماقت نہیں کریں گے۔ بھارتیوں سے سودا کرنے کے لیے ان کی زمین پر جانا ایسا ہی جیسے سانپ کا زہر نکالنے کے لیے اس کے بل میں ہاتھ ڈالنا۔ اگر انہوں نے سودا کرنا ہوتا تو یہیں رہ کر کرتے۔“

”تب آپ کے خیال میں وہ لائن آف کنٹرول کے پار کیوں گئے ہیں؟“

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”کیا مطلب کیوں گئے ہیں.....؟ بھائی وہ صدیوں سے ان راستوں پر اسی طرح سفر کرتے رہے ہیں۔ یہ ان کا روٹ ہے اور وہ اس پر سفر کر کے زندگی بتاتے ہیں۔ یہ ان کی کمائی کا ذریعہ ہے۔“

”آپ دو باتوں پر یقین رکھتے ہیں بلکہ تین باتوں پر، اول بریف کیس اب تک ان خانہ بدوشوں کے قبضے میں ہے وہ نہ تو ضائع ہوا ہے اور نہ انہوں نے اس کا کسی سے سودا کیا ہے۔ دوسرے وہ اسے قیمتی سمجھتے ہیں لیکن اس کی اصل اہمیت سے بے خبر ہیں۔ تیسرے وہ اسے بدستور اپنے پاس رکھتے ہوئے واپس آئیں گے؟“

”تم نے ٹھیک کہا ہے میں تقریباً ان ہی خطوط پر سوچ رہا ہوں۔“

”یہ تو تیری خواہش ہوئی؟“ سفیر نے کہا۔

”تم اسے مثبت سوچ بھی کہہ سکتے ہو۔“ میں نے ملائمت سے کہا۔ ”اگر میں پہلے سے وہ ساری منفی باتیں سوچ لوں جو ممکنہ طور پر ہو سکتی ہیں تو میں بریف کیس کو تلاش کرنے اور واپس حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کروں گا۔ اس لیے ہمیں مثبت ذہن کے ساتھ اپنا کام کرنا چاہیے۔ اس میں نقصان کا اندیشہ نہیں ہے لیکن ہم کوشش ہی نہ کریں اور بعد میں پتا چلے کہ ہم بریف کیس حاصل کر سکتے تھے لیکن موقع گنوا دیا۔“

سفیر اور وسیم کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ میری بات سے متفق نہیں ہیں شاید ان کی خواہش تھی کہ میں اپنی ساری توجہ مرشد کی طرف رکھوں۔ وہ شاید بریف کیس کی اہمیت نہیں سمجھتے تھے یا سمجھتے تھے لیکن میرے لیے اس کی اہمیت تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے۔ میں اسے آنے والے وقت میں ایک بڑے رسک کے طور پر دیکھ رہا تھا۔ یہ حکومت کا معاملہ تھا کسی فرد واحد کا معاملہ نہیں تھا۔ حکومتوں کے معاملات ایک نتیجے پر پہنچنے بغیر بند نہیں ہوتے ہیں۔ جب کہ معاملہ ایک سپر پاور کا بھی ہو۔ جس سے ہمارے بہت اچھے تعلقات تھے اور ایک فرد واحد کی خاطر ان تعلقات کو خراب نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میرے ذہن میں یہ تلخ حقیقت پوری شدت سے واضح تھی کہ ایک پاکستانی کے طور پر میں ایک نہایت کمزور اور تقریباً غلام سمجھے جانے والے ملک کا شہری ہوں اور بین الاقوامی طور پر میرے کوئی حقوق ہیں تو انہیں تسلیم کرانے والی کوئی طاقت میری پشت پر نہیں ہے۔ مجھے اپنے دفاع کے لیے جو کرنا تھا خود ہی کرنا تھا۔ اپنے ساتھیوں کے تاثرات دیکھتے: میں نے فی الحال مزید بحث سے گریز کیا۔

”میرا خیال ہے ماہا کو چھوڑ دیتے ہیں۔“

”سو نے کی ڈلی کا کیا کرنا ہے؟“ سفیر نے پوچھا۔

”وہ بھی اسے دے دو.....“ میں نے کہا۔ ”وسیم اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے کسی ایسی جگہ چھوڑ آؤ

فصل نہیں تھا۔ یقیناً یہ رقم کسی خاص مقصد کے تحت وہاں رکھی گئی تھی اور قسمت نے اسے ہماری جھولی میں ڈال دیا تھا۔ یہ دشمن کا مال تھا اور ہمارے لیے حرام نہیں تھا۔ مرشد نے کوٹھی کے ساتھ رقم کو بھی صبر کر لیا ہوگا کیونکہ اگر اسے ہم نہ لاتے تو یہ کوٹھی میں جل کر تباہ ہو جاتی۔ اب یہ ہمارے کام آتی۔ مجھے حساب بتا کر مانی دوبارہ بیٹو کے ساتھ گیم میں لگ گیا اس نے کوئی چالاکی کی تھی جو بیٹو کی سمجھ میں نہیں آئی لیکن جب وہ بارنے لگا تو اس نے شور کر دیا۔ میں اسٹڈی سے نکلا تو ان کی باقاعدہ لڑائی شروع ہو گئی تھی۔

سفیر سونے چلا گیا تھا میں اوپر کمرے میں آیا وہاں لیپ ٹاپ دیکھ کر مجھے ایمن کا خیال آیا اس کی رہائی کے بعد سے مجھے اس سے رابطہ کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں نے اپنا ای میل اکاؤنٹ کھولا۔ حسب توقع اس میں ایمن کی کئی ای میل موجود تھیں۔ ہر میل میں اس نے مجھ سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی اس نے اپنے کو ٹیکٹ نمبر زد دیئے تھے۔ وہ یقیناً واپس جا چکی تھی کیونکہ یہ سارے نمبرز برطانیہ کے تھے اور ای میل دودن سے آ رہی تھیں۔ میں نے انٹرنیٹ سے اس کے ایک نمبر پر کال کی ایمن نے دوسری ٹیل پر کال ریسیو کی۔ ”ہیلو۔“

”ہیلو..... کیا حال ہیں؟“

”شہباز۔“ اس نے چیخ ماری۔ ”میرے خدام کہاں تھے میں تمہیں ای میل کر کر کے تھک گئی۔“

”حسب معمول اپنے مہربانوں کے پاس تھا۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”اپنے خان صاحب کے پاس۔“

”مجھے معلوم ہے شکر ہے تم چھوٹ گئے لیکن تم نے مجھے کیسے بچایا..... سچ پوچھو تو مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا ہے ایسا لگتا ہے جیسے میں نے کوئی بھیاںک خواب دیکھا تھا۔“

”بس یہ سب تمہارے چچا کی مہربانی ہے۔“ میں نے کہا اور مناسب اضافے و ترمیم کے ساتھ اسے اپنی کہانی سنائی۔ درمیان میں اس نے بہت سارے سوالات کیے تھے لیکن بالآخر میں نے اپنی بات مکمل کر لی۔

”شہباز تم اتنے مشکل مراحل سے گزرے۔“ وہ روہانے لہجے میں بولی۔ ”فتح خان کو تم سے کس بات کا خوف ہے؟“

”یہ تو میں نہیں جانتا۔“ میں نے غلط بیانی سے کام لیا میں نے اسے بریف کیس والے معاملے سے بے خبر رکھا تھا۔ ایمن کو اس معاملے سے بے خبر رکھنے کی ایک وجہ یہ کہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ گوری اقوام میں ملک و قوم کا مفاد اولیت رکھتا ہے اور یہ اس پر خون و محبت کے رشتوں کو قربان کر دیتے ہیں۔ ایمن مجھے پسند کرتی تھی اور اب شاید احسان مند بھی تھی لیکن اس کا بھی امکان تھا جب ملک کے مفاد کی بات آئے تو وہ یہ سب بھول جائے۔ میں نے اسے انٹیلی جنس والا حصہ بھی نہیں سنایا تھا۔ البتہ اس کے انکل کی خباثت کے بارے میں بتا دیا تھا۔

”ایمن اب تمہیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ ڈیوڈ شانے اس شرط پر تمہارے معاملے میں دخل اندازی سے گریز کا وعدہ کیا تھا کہ میں اس کے کام آؤں گا۔“

”دخل اندازی۔“ ایمن پھٹ پڑی تھی۔ ”اس نے مجھے مردانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔“

”یہ تو ہے لیکن عین آخری موقع پر جب جیکٹ کو ڈی ایکنی ویٹ کیا جاتا تھا تب ڈیوڈ شانے مداخلت سے گریز کیا۔ کوڈ تو نصیحت حکام کے توسط سے پہنچا تھا اور ان میں سے کوئی ڈیوڈ شا کے اشارے پر اس میں ایک نمبر

نے بنایا ہے اسے میں یا تم نہیں چلا رہے ہیں اسے اللہ چلا رہا ہے۔“

سفیر نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”شہباز تو اس طرح سوچتا ہے؟“

”ہاں بہت سارے لوگوں کے نزدیک یہ ایک احمقانہ آئیڈیلٹ سوچ ہے۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

”وہ لوگ جو اپنے منصوبوں، اپنی آل اولاد اور اپنے کاروباروں و کاموں کے لیے بدترین حالات میں بھی پڑ امید ہوتے ہیں لیکن جیسے ہی پاکستان کے مستقبل کی بات آتی ہے وہ یوں منہ بھر کر اس کی تباہی اور خاتمے کی پیش گوئیاں کرنے لگتے ہیں جیسے نعوذ باللہ اس ملک کے کاتب تقدیر وہی ہیں۔ انہیں اس ملک کے لیے ذرا بھی امید نظر نہیں آتی ہے اور جو امید کی بات کرتا ہے اسے یہ احمق قرار دیتے ہیں۔ میرا ایمان ہے یہ ملک قائم رہے گا۔ بنے گا۔ لیے بنا ہے اور قائم رہے گا۔ اس کی تباہی اور خاتمے کی پیش گوئیاں کرنے والے خود ختم ہو جائیں گے۔ نئے لوگ آئیں گے جو اسے آگے لے جائیں گے اور پرانے یوں صاف ہو جائیں گے جیسے خزاں میں تیز جالے والے پتے غائب ہو جاتے ہیں اور بہار میں نئے پتے نکل آتے ہیں۔ کوئی عمارت، کوئی باغ اور کوئی راستہ بنانے سے پہلے کچرہ صاف کیا جاتا ہے تو سفیر صاحب ہم وہی کچرہ ہیں ہم صاف ہوں گے تو کوئی نئی صورت سامنے آئے گی۔“

سفیر نے تالیاں بجا لیں۔ ”اتنی زبردست تقریر۔ شہباز تجھے تو سیاست دان ہونا چاہیے۔ شوب کو سیدھا کر دے گا۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”سیاست دان اسی معاشرے کی پیداوار ہیں اور عوام کا زیادہ منافقانہ ورثہ ہیں ہمیں خود کو ٹھیک کرنا ہے۔ جب ہم ٹھیک ہوں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

سفیر نے جمائی لی۔ ”ٹھیک ہے یا ٹھیک کر لیں گے۔ اتنی جلدی کیا ہے۔ مجھے تو نیند آ رہی ہے۔“

”ٹو سو جا۔۔۔ میں دیکھوں کہ ان لوگوں نے رقم من لی۔ چار گھنٹے سے اسی کام میں لگے ہوئے ہیں۔“

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ مانی اور بیٹو اب اسٹڈی میں تھے۔ انہوں نے کام مکمل کر لیا تھا اور اب کمپیوٹر پر کوئی گیم کھیل رہے تھے دونوں کے ہاتھ میں جوائے اسٹک تھی۔ اسے استعمال کرتے ہوئے ان کے جسم بھی حرکت کر رہے تھے۔ رقم انہوں نے واپس سوٹ کیس میں پیک کر دی تھی۔ میں نے رقم کے بارے میں پوچھا تو مانی نے گیم روک دیا اس پر بیٹو نے شور مچایا۔

”یہ بے ایمانی ہے تم ہمارا ہاتھ اس لیے گیم روک دیا۔“

”کوئی بات نہیں تم اسے دوبارہ ہرا دیتا۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ مانی نے پتہ اٹھایا جس پر اس نے سارا حساب لکھایا لکھوایا تھا۔

”شوبی بھائی..... سوٹ کیس میں نوٹس نوٹس تھری گڈیاں ہیں۔ ان میں فورٹی ہنڈرڈز کی، ون ہنڈرڈ اینڈ سیون فائیو ہنڈرڈ کی، ہائیکسی ون تھوڈرڈ اینڈ کی ہیں اور ففٹین فائیو تھوڈرڈ اینڈ کی ہیں۔“

میں حیران ہوا یہ سوا دو کروڑ روپے سے زیادہ کی رقم تھی جو مرشد نے یوں لاپرواہی سے اس کوٹھی میں ڈال رکھی تھی۔ بے شک مرشد کے لحاظ سے یہ کوئی بہت بڑی رقم نہیں تھی اس سے کئی گنا زیادہ مالیت کی تو کالی کوٹھی تھی۔ مگر مرشد جیسے آدمی کے لیے اپنے ایک ایک روپے کی بھی اہمیت تھی اور وہ اس معاملے میں کسی پر اعتبار کرنے والا

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر اس نے سرد آہ بھری۔ ”شہباز کاش.....“

اس نے آگے کچھ نہیں کہا اور میں نے پوچھا بھی نہیں۔ بات جتنی کہنی رہے اتنا اچھا ہوتا ہے۔ ایک بار کھل جائے تو معاملہ جب تک کسی ایک کروٹ نہ بیٹھ جائے حل نہیں ہوتا اور خواتین سے اللہ بچائے بندے کو بچھنجان کر اپنے موضوع پر لے آتی ہیں اس لیے میں ایمن سے سوچ کچھ کر بات کر رہا تھا۔ ”ایمن تم بہت محتاط رہو..... ڈیوڈ کمینڈ آؤں ہے۔ وہ اس سے پہلے بھی میرے ساتھ وعدہ خلافی کر چکا ہے۔“

”تم فکر مت کرو میں نے اسے بہت ڈھیل دے دی ہے اب میں معاملے کو عدالت تک لے جاؤں گی۔“

”تم حماقت کرو گی۔“ میں بے چین ہو گیا۔ ”تم ڈیوڈ شا کے اصل روپ سے واقف نہیں ہو یا سرسری سا جانتی ہو اس کا بھیا تک روپ میں نے دیکھا ہوا ہے۔ اس سے الجھنے کی کوشش مت کرو۔ ویسے تم عدالت میں بھی اس سے نہیں جیت سکتی ہو۔ تم نے حکومتی اداروں پر اس کا اثر و رسوخ دیکھ لیا ہے۔“

”ہاں لیکن برطانیہ میں عدالتیں آزاد ہیں۔“

”عمومی تاثر ایسا ہی ہے لیکن کیا برطانوی عدالتیں ہر معاملے میں انصاف کرتی ہیں۔“ میں نے کسی قدر چبھتے لہجے میں پوچھا۔ ”نہیں بہت سارے معاملات میں وہ حکومت یا عوام کی خواہش کے مطابق بھی فیصلہ کرتی ہیں حال ہی میں کئی ایسے فیصلے سامنے آئے ہیں۔ میں حوالہ نہیں دوں گا لیکن تم سمجھ گئی ہو گی۔ ڈیوڈ شا بھی کچھ ایسا ہی اشتہل رکھتا ہے۔“

وہ سمجھ گئی تھی کہ میرا اشارہ دہشت گردی کے حوالے سے بعض کیمرز کی فیصلوں کی طرف ہے جن پر انسانی حقوق کی تنظیموں کی جانب سے تنقید کی گئی تھی۔ ”تو تم چاہتے ہو میں ڈیوڈ شا کے خلاف عدالت میں نہیں جاؤں؟“

”میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ فی الحال چپ کر کے بیٹھ جاؤ۔ ڈیوڈ شا جو کھیل کھیل رہا ہے اس میں آدمی زیادہ عرصے اپنی پوزیشن برقرار نہیں رکھ سکتا ہے وہ مارا جاتا ہے یا اپنے عہدے سے ہاتھ دھو لیتا ہے دونوں صورتوں میں تم اس کے خلاف کچھ کر سکو گی۔“

”ٹھیک ہے تم نے کہا ہے تو میں غور کروں گی۔“ وہ بے دلی سے بولی اور موضوع بدل دیا۔ ”تم نے غور سے خود کو آئینے میں دیکھا ہے کتنے بدل گئے ہو؟“

”کیا ہوا ہے مجھے؟“ میں نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

”چہرہ ست گیا ہے آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں تم کمزور بھی لگ رہے ہو۔ گلتا ہے نہ ٹھیک سے کھاتے ہو اور نہ آرام کرتے ہو۔“

”ڈشمن مہلت ہی کہاں دیتے ہیں۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

”تم نے بہت عرصے سے شیو بھی نہیں بنائی ہے۔ بال بھی بے ہنگم ہو رہے ہیں۔“

”ڈشمنوں کی بد نظریوں سے بچنے کے لیے یہ حلیہ ضروری ہے۔“

”بالکل نہیں اس حلقے کے ساتھ تم نمایاں ہو رہے ہو کیونکہ بہت کم لوگ داڑھی اور بالوں کو اس طرح چھوڑتے ہیں اور ایسا آدمی نمایاں ہوتا ہے اگر تمہیں عام آدمی نظر آتا ہے تو اپنے بال اور شیو کو ترتیب دو۔ اس سے

کی تبدیلی کرو دیتا تو تم سوچ سکتی ہو تمہارے ساتھ کیا ہوتا۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”وہاں سب اس کے غلام بیٹھے ہیں۔ اپنی دے تم اب اس کے کام آؤ گے؟“

”اگر میرے معاملات سٹ گئے۔ یہاں مرشد نے ایک بار پھر میرا پیچھا لے لیا ہے اور فتح خان بھی پیچھے ہے۔ یہ دونوں ڈیوڈ شا کے بندہ بے دام ہیں اگر وہ چاہے تو ان سے میرا پیچھا چھڑا سکتا ہے اس کے بعد ہی میں اس کے کسی کام آسکوں گا۔“

”میں نے ابھی کچھ دیر پہلے ٹی وی پر مرشد کی ایک گٹھی کے بارے میں خبر دیکھی ہے۔“

”ہم بھی دیکھ رہے ہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”میرا خیال ہے یہ فتح خان کا کام ہے۔ اس کا ایک کزن مرشد کے آدمیوں کے ہاتھ مارا گیا تھا تب سے وہ اس کا دشمن بنا ہوا ہے۔ اس کی کئی فیکٹریاں اور جائیدادیں اسی طرح تباہ کر چکا ہے۔ مرشد بھی اس کے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔ خیر دلچ کرو اسے یہ بتاؤ تم کیسی ہو اور کہاں ہو۔؟ واپس کب پہنچیں..... میرا خیال ابھی آرام کر رہی ہو گی۔“

”میں گھر آگئی ہوں اور کیسی ہوں یہ دیکھنے کے لیے اسکا پ پر آ جاؤ۔“ اس نے ترغیب آمیز لہجے میں کہا۔ ”میں بھی تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔“

لیپ نائپ میں اسکا پ انشال تھا ایمن نے مجھے اپنی آئی ڈی بتائی میں نے پہلے اپنی آئی ڈی بتائی اور پھر ایمن کو ایڈ کیا اسے کال کی تو وہ فوراً آگئی۔ سامنے اسکرین پر اس کی لائیو ویڈیو آنے لگی وہ اپنے گھر میں تھی اور خاصے گھریلو لباس میں تھی۔ لندن میں یقیناً غضب کی سردی تھی لیکن ایمن کا گھر سنٹرلی بیڈ تھا اس لیے وہ آرام سے نہ ہونے کے برابر لباس میں بیٹھی تھی اور پہلی نظر پڑتے ہی میں نے دل میں لالچول پڑھی۔ مختصر سے ملاؤ ز اور مختصر ترین ٹیکر میں اس کا صحت مند سراپا چمکا پڑ رہا تھا۔ اس نے نہایت اشتیاق سے پوچھا۔ ”کسی لگ رہی ہوں؟“

”بالکل ٹھیک..... لگ ہی نہیں رہا ہے کہ تم اتنے بڑے حادثے سے گزر کر آ رہی ہو بلکہ لگتا ہے کسی صحت افزا مقام پر لمبی چھٹیاں گزار کر آ رہی ہو۔“

”پریشانیوں میری صحت پر زیادہ اثر نہیں ڈالتی ہیں۔“ اس نے کسی قدر جھنجھلاہٹ کے ساتھ کہا۔ ”میں اپنے بارے میں پوچھ رہی ہوں کہ کیسی لگ رہی ہوں۔“

”ہمیشہ کی طرح دل کش اور ہوش رہا۔“

اس بار وہ دل سے ہنسی۔ ”سچ میں تمہیں اچھی لگتی ہوں۔“

”ہاں بابا..... تم پہلے بھی کئی بار پوچھ چکی ہو اور میں کئی بار بتا چکا ہوں تم مجھے کتنی اور کس طرح سے اچھی لگتی ہو۔“

اس کی ہنسی بھگ گئی۔ ”یعنی میں تمہیں صرف دوست ہونے کی حیثیت سے اچھی لگتی ہوں میرا خوب صورت لوکی ہوتا تمہارے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا ہے۔“

”رکھتا ہے لیکن کسی اور معنی میں نہیں۔“ میں نے کہا۔

لوگ تمہاری طرف متوجہ نہیں ہوں گے۔“ اس نے مشورہ دیا۔

میں نے لیپ ٹاپ کے ویب کیم میں خود کو دیکھا تو ایمین کی بات درست لگی اس طرح بے ہنگم بالوں اور برہمی شیوے کے ساتھ میں نمایاں ہو رہا تھا۔ اس لیے میں نے پہلی فرصت میں اپنا حلیہ درست کرنے کا سوچا۔ ایمین موت سے بچ کر اور زندگی پا کر بہت خوش تھی میری احسان مند تھی۔ ایک موقع پر اس نے جذباتی ہو کر کہا۔ ”شہباز میں صبح میں تمہاری شکر گزار ہوں اگر تمہارے لیے جان بھی دینا پڑے تب بھی شکر یہ ادا نہیں کر سکوں گی۔ آج سے میری جان، میرا جسم، میرا دل اور میرا سب کچھ تمہارے لیے ہے۔ تم بس ایک بار مانگ کر دیکھنا۔“

”میں نے احسان نہیں کیا ہے دوستی نبھائی ہے اور دوستوں کے لیے تو آدمی اس سے بھی زیادہ کرتا ہے۔“ میں نے اس کی پیش کش کے جذباتی انداز سے صرف نظر کرتے ہوئے کہا۔ اس دوران میں کمرے کا دروازہ بجایا میں نے بلند آواز سے کہا۔ ”آ جاؤ۔“

وسیم نے اندر جھانکا اور مجھے لیپ ٹاپ کے ساتھ دیکھ کر ہاتھ سے اوکے کا اشارہ کیا اس کا مطلب تھا کہ ماما کو ڈراپ کرنے کا کام خوش اسلوبی سے تکمیل پا گیا تھا۔ میں نے سر ہلایا تو وہ دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ ایمین مجھ سے بات کرنے لگی۔ اس نے میرے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ اس سے بات کرتے ہوئے میرا ذہن پُر سکون ہوتا چلا گیا۔ جب سے میں نے شہلا کو دیکھا تھا میرے اعصاب منتشر تھے۔ واپسی کے بعد بھی میرے ذہن میں رہ رہ کر اس کا مسح جسم آرہا تھا۔ وہ جسم جو کبھی دیکھنے والوں کو باہل کر دیتا ہو گا اب اسے دیکھ کر آدمی کے روکتے کھڑے ہو جاتے۔ وہ جسم باقی بھی نہیں رہا تھا۔ ایمین سے بات کر کے میں نے اسے خدا حافظ کہا اور پھر وسیم کے کمرے کی طرف آیا ہلکی ٹاک کے جواب میں اس نے اندر سے کہا۔ ”یہ۔“

میں دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ وسیم سونے کے لیے لیٹ گیا تھا وہ سونے جا گئے اور کھانے پینے کے معاملے میں تقیم وضبط کا قائل تھا بنگالی حالات سے قطع نظر وہ اپنی روٹین برقرار رکھتا تھا۔ ”ماما کو کہاں چھوڑا؟“ ”راجا بازار میں ایک ساری رات کھلے رہنے والے ریستوران کے باہر چھوڑا ہے وہاں سے جیسی لے کر کہیں بھی جاسکتی ہے۔ سونے کی ڈلی میں نے اس کے حوالے کر دی تھی۔ ساتھ ہی اسے سمجھا دیا تھا کہ اس کی یہ بچت دوبارہ نظر نہ آنے کی حد تک ہے اب وہ ہماری نظروں میں آئی تو ہم خطرہ سمجھتے ہوئے اسے فوراً اٹھکانے لگا دیں گے۔“

”یہ تم نے اچھا کیا۔۔۔۔۔ وہ ویسے بھی ملک سے فرار ہو رہی تھی اس دھمکی کے بعد وہ مزید تاخیر نہیں کرے گی۔“ میں نے کہا اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔ ماما کا معاملہ منٹ گیا تھا۔ اب صابو کا معاملہ نمٹنا تھا۔ وسیم کے آدمیوں نے اس کے ڈرائیور کو بھی چھوڑ دیا تھا اور اسے کچھ نہیں معلوم تھا کہ اسے کن لوگوں نے پکڑا تھا۔ میں نے گرم پانی سے غسل کیا ایک گلاس دودھ گرم کر کے لیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ باقی سب بھی سوچے تھے صرف مانی جاگ رہا تھا حسب معمول۔ مجھے اس مختصر حسرت والے لڑکے نے اپنی صلاحیتوں سے حیران کر دیا تھا۔ کچھ ڈراؤں اس کی پروگرامنگ کے معاملے میں وہ جھٹکتا تھا۔ اگر وہ کسی اور ملک میں ہوتا تو کسی بہت اچھی آئی ٹی کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر ہوتا لیکن یہاں بے چارہ اپنے باپ کی طرح حرام کھانے پر مجبور کیا جا رہا تھا اور اس

سے بچنے کے لیے گھر سے بھاگا ہوا تھا۔

رات بارہ بجے کے قریب جب میں سویا تو بارش جاری تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ صبح موسم پرواز کے لیے سازگار نہ ملے۔ عبداللہ نے کہا تھا اگر موسم پرواز کے لیے سازگار ہوا تو وہ مجھے بتا دے گا اور میں ایئر کلب پہنچ جاتا۔ مزید حقائق انتظامات وسیم اور اس کے آدمی کرتے جو دور رہ کر گمرانی کرتے اور اگر کسی طرف سے مداخلت ہوتی تو وہ اس سے نمٹتے۔ میری آنکھ کھلی تو سات بج رہے تھے اور بارش رک گئی تھی۔ میں نے اٹھ کر پردہ ہٹایا سورج یقیناً نکل آیا تھا لیکن آسمان پر نہایت گہرے سرمئی بادل تھے اور صاف لگ رہا تھا کہ مزید بارش ہوگی اس موسم میں ٹیلی کمانچہ کی پرواز ممکن نظر نہیں آ رہی تھی۔ ابھی میں موسم کا معائنہ کر رہا تھا کہ عبداللہ کی کال آ گئی۔

”آپ اٹھ گئے ہیں۔۔۔۔۔ موسم دیکھا؟“

”ہاں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔“

”اس پورے علاقے میں ایسے ہی گہرے بادل ہیں آج شام تک موسم خراب رہنے کی پیش گوئی ہے۔“ اس نے موسم کی سرکاری رپورٹ پیش کی۔

”کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔ روانگی موسم ٹھیک ہونے کے بعد ہی ہوگی۔“ میں نے کہا۔ عبداللہ سے بات کر کے میں نیچے آیا تو سب ہی بخواب تھے۔ میں باہر نکل آیا۔ سردی غضب کی تھی لیکن مزہ دے رہی تھی۔ مسلسل بارش سے لان کی گھاس پانی آمیز کچھڑ میں ڈوب گئی تھی اس لیے میں نے لان پر جانے سے گریز کیا اور پورج کی جگہ ٹھنڈا رہا۔ ابھی ہمارے سامنے دو معاملات تھے ایک مرشد کا اور دوسرا بریف کیس کا۔ میرے ساتھی فی الحال بریف کیس کے معاملے کو پس پشت ڈالنا چاہتے تھے۔ وہ مرشد پر اپنی ساری توجہ مرکوز رکھنا چاہتے تھے۔ اس کے خلاف ہمارے پاس دو کارڈ تھے ایک کال گرل ٹیم کا، لیکن یہ کارڈ اصل میں نادر کے خلاف تھا اور وہ ہمارے ہاتھ میں نہیں گیا تھا۔ دوسرا کارڈ صابر کا تھا اور یہی اصل کارڈ تھا۔ صابر یقیناً مرشد کے بارے میں اور بھی بہت کچھ جانتا تھا۔ میں نے ابھی اس کے بارے میں فیصلہ نہیں کیا تھا کہ مجھے اس کا کیا کرنا چاہیے ات مزید اپنی تحویل میں رکھا جاسکتا تھا اگر اس کا کوئی فائدہ نظر آتا۔ شہلا کے ساتھ جو ہوا تھا اس میں صابر کا قصور بھی تھا اگر کسی موقع پر ہمیں اس سے چھٹکارا حاصل کرنا پڑتا تو یہ جواز بھی مناسب ہوتا۔ عقب سے دروازہ کھاتا تو میں نے مڑ کر دیکھا۔ سفیر جھانک رہا تھا اور سوتے سے اٹھ کر آیا تھا اس لیے خاصا بھنایا ہوا تھا۔ ”وہ منحوس شور مچا رہا ہے۔“

”کون۔۔۔۔۔ صابر؟“

”اور کون ہے نیند حرام کر دی ہے۔“ سفیر نے کہا اور دوبارہ غائب ہو گیا۔ میں اندر آیا تو اوپر سے دروازہ دھڑ دھڑانے کے انداز میں بجانے کی آواز آئی۔ صابر کا انداز بتاتا تھا کہ وہ کتنا بے تاب ہے۔ میں نے اوپر جا کر نقاب پہنا اور دروازہ کھولا تو وہ انداز میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ چہرے سے پریشانی ٹپک رہی تھی۔ ”مجھے معاف کر دو لیکن خدا کے لیے مجھے جانے دو۔“

”تمہیں معاف کر دوں اور جانے دوں۔“ میں نے اسے پیچھے دھکا دیا اور دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

”لگتا ہے رات کی پُر سکون نیند نے تمہیں کسی خوش فہمی کا شکار کر دیا ہے۔“

”نہیں مجھے ابھی خیال آیا ہے۔ میں گھر سے غائب ہوں۔ مرشد یا اس کے کسی آدمی نے مجھ سے رابطہ

گاہ صاحبِ ثروت لوگوں کو یہ سب چیزیں منہ مانگے داموں فراہم کی جاتی ہوں گی۔ خانقاہ میں اس گنگ کا مال ڈمپ ہوتا ہوگا۔ شہروں سے دولت مند اغوا کر کے وہاں رکھے جاتے ہوں گے اور ان کا تادان لیا جاتا ہوگا۔ لڑکیوں اور بچوں کو اغوا کیا جاتا ہوگا یا معمولی قیمت کے عوض خرید لیا جاتا ہوگا اور انہیں دلالوں اور خراکروں کو بیچا جاتا ہوگا۔ مجرموں کو پناہ دی جاتی ہوگی اور اس کے بدلے ان سے اپنے کام لیے جاتے ہوں گے۔ ملک دشمن، تحریک کار اور دشمن کے جاسوس ایسی جگہوں پر پناہ لیتے ہیں۔“

صابر کا منہ کھل گیا تھا۔ ”تمہیں کیسے پتا ہے یہ سب؟“

”مرشد جیسے ذباہرِ دین کی خانقاہوں میں یہی سب ہوتا ہے یہ روحانیت کے نہیں اصل میں شیطانیت کے مرکز ہیں اور جو جگہ شیطان کا مرکز ہو وہاں یہی سب ہو سکتا ہے۔“

”تم نے ٹھیک کہا وہاں یہی سب ہوتا ہے بلکہ شاید اس سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے۔“ صابر کے لہجے میں نفرت آگئی۔ ”ہر رات وہاں اہلس عریاں ہو کر قرض کرتا ہے۔“

”کیا تم مجھے یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہو کہ وہاں جو ہوتا ہے اس سے تم متفق نہیں ہو یا تمہیں وہ سب اچھا نہیں لگتا ہے۔“ میں نے طنز کیا۔ ”تم خود اس شیطانی کاروبار کا ایک حصہ ہو۔“

”یہ سچ ہے۔“ وہ بولا۔ ”میں اچھا آدمی نہیں ہوں مجرم ہوں لیکن میں شیطان نہیں ہوں۔ اس لیے وہاں جو ہوتا ہے میں سچ میں اس سے نفرت کرتا ہوں خود میری بھی دو بیٹیاں ہیں۔“

”تم کیا جانتے ہو اس جگہ کے بارے میں؟“

”بدی کے اس اڈے کے نیچے تہہ خانے سے ایک خفیہ راستہ نکلتا ہے جو تقریباً نصف کلومیٹر دور ایک ڈیرے تک جاتا ہے۔ بد ظاہر اس ڈیرے کا مرشد سے کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ عظیم سبانی نامی زمیندار کا ڈیرہ ہے۔ مرشد کے اڈے سے نکلنے والا یہ خفیہ راستہ اسی ڈیرے پر نکلتا ہے۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ عظیم سبانی کا مرشد سے تعلق ہے کیونکہ اس کے ڈیرے پر آنے یا جانے والا مال اصل میں مرشد کا ہی ہوتا ہے۔“

”خفیہ راستے کا مقصد؟“

”شاید مرشد نے برے وقت کے لیے یہ راستہ بنایا ہے پھر یہاں سے خفیہ مال کی ترسیل ہوتی ہے۔“

”جب یہ راستہ اتنا ہی خفیہ ہے تو تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”ایک بار ہمیں مرشد کی طرف سے غیر ملکی شراب کے کریٹ اس ڈیرے پر پہنچانے کا حکم ملا۔ کیونکہ اس کی طرف سے مجھے اس قسم کے کام ملتے رہتے تھے اس لیے میں نے یہ کام بھی کر دیا اور اس بارے میں زیادہ سوچنے سمجھنے کی زحمت نہیں کی لیکن جب میں ایک پک آپ میں کریٹ لے کر ڈیرے پر پہنچا تو ڈیرے کے محافظوں نے مجھے معتمد سمجھتے ہوئے میرے سامنے ہی وہ خفیہ راستہ کھول دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ راستہ خانقاہ تک جاتا ہے۔ اس وقت میں خاموش رہا۔ بعد میں بھی ڈرتا رہا کہ کہیں مرشد کو اس بارے میں پتا نہ چل جائے۔ کہیں محافظ اسے نہ بتا دیں اور میں یوں غائب کر دیا جاؤں جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”میرا خیال ہے محافظوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہوگا اور انہوں نے اس بات کو دہرایا اور نہ تم واقعی کسی نامعلوم قبر میں پہنچ گئے ہوتے۔ مگر ساتھ ہی غلطی کی پاداش میں وہ تمام محافظ بھی

کرنے کی کوشش کی ہوگی لیکن جب میں نہیں ملا ہوں گا تو وہ کھٹک جائے گا کہ۔“

میں نے اس کا جملہ مکمل کیا۔ ”کہ تم دشمنوں کے ہاتھ لگ گئے ہو اور تم نے ہی انہیں کالی کوشی کے بارے میں بتایا ہے۔“

صابر کی آنکھیں خوف سے پھٹ رہی تھیں۔ ”یہی بات ہے مرشد اسی نتیجے پر پہنچے گا اور پھر۔“

”وہ اپنے آدمی تمہارے گھر بھیجے گا۔ تم نہیں ملو گے لیکن تمہارے گھر والے تو ہوں گے۔“

”نہیں۔“ وہ چیخ مار کر میری طرف لپکا لیکن میں نے وحی سے لات مار کر اسے پیچھے پھینک دیا۔

”اپنے گھر والوں پر بات آئی تو یوں بلبلارہے ہو۔ تم نے کبھی ان لوگوں کے بارے میں سوچا جو تمہاری وجہ سے مارے گئے۔ ان میں شہلا بھی شامل ہے جسے تم نے مرشد جیسے درندے کے حوالے کیا تھا۔ یقیناً تم نے کبھی نہیں سوچا ہوگا لیکن اب تم سوچو گے جب تمہارے گھر والوں پر بات آئی ہے۔“

وہ دھواڑیں مار کر رونے لگا۔ ”خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔۔۔۔۔ بے شک مجھے مار دو لیکن میرے گھر والے۔۔۔۔۔“

”گیموں کے ساتھ گمن بھی پتا ہے یہ محاورہ تم نے سنا ہوگا۔ صابر یہ مکافات عمل ہے جو ہر ظالم کے ساتھ ہوتا ہے لیکن افسوس اسے دیکھ کر دوسرا ظالم عبرت نہیں پڑتا ہے۔ دوسرے مجھے شبہ ہے تم نے ابھی بھی مجھے پوری معلومات نہیں دی ہیں تم مرشد کے بارے میں اور بھی جانتے ہو لیکن بتا نہیں رہے ہو۔“

وہ بلبلانے لگا۔ ”میں بتاؤں گا۔۔۔۔۔ بالکل بتاؤں گا لیکن مجھے موقع دو میں اپنے گھر والوں کو کسی محفوظ مقام پر پہنچا دوں مرشد کی دھڑس سے دور۔“

”یہ کام کرنے کے بعد تم اپنے وعدے سے مکر جاؤ تو ہم کیا کریں گے۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں پہلے تم ہمیں مرشد کے بارے میں باقی سب بھی بتاؤ گے اس کے بعد ہی ہم تمہاری کوئی مدد کر سکتے ہیں۔“

وہ سوچ میں پڑ گیا تھا پھر اس نے کہا۔ ”باقی باتیں تو عام ہیں لیکن میں ایک ایسی خاص بات سے واقف ہوں جس کے بارے میں مرشد اور اس کے بہت ہی معتمد ساتھی جانتے ہیں اور اگر انہیں جینک بھی پڑ جاتی کہ میں اس بات سے واقف ہو گیا ہوں تو وہ مجھے کب کا ختم کر چکے ہوتے۔ یہ ان کے اندر کی بات ہے۔“

”ایسی کون سی بات ہے۔“

”تم نے خانقاہ مرشد یہ دیکھی ہے؟“

”تمہارا مطلب ہے اس کے دادا کی قبر جسے ان لوگوں نے مزار بنالیا ہے؟“

”بالکل وہی راو پٹنڈی سے کچھ دور واقع ہے اب تو وہ نئی تعمیر ہونے والی سڑک سے صرف ایک کلومیٹر دور ہے اور بہت بڑے رقبے پر پھیلی ہے۔ نہ صرف زمین کے اوپر اس کی کئی منزلیں ہیں بلکہ زیر زمین بھی اس میں بہت کچھ ہے۔“

”یہ کوئی خاص بات نہیں ہے اس قسم کے دھندے کرنے والے زیر زمین تہہ خانے بناتے ہیں تاکہ ساری دنیا سے چھپ کر اپنا کام کر سکیں۔ مجھے معلوم ہے وہاں عورتیں آتی ہوں گی مجبور و بے بس یا زر کے لالچ میں، ان کے ساتھ عیاشی کرنے مرشد اور اس کے قریبی لوگ آتے ہوں گے۔ وہاں شراب اور نشیات کا دھندہ بھی ہوتا ہو

”یہی ہوا ہوگا مرشد بے خبر رہا کہ میں اس کے ایک اہم راز سے واقف ہو گیا ہوں لیکن وہ اس بات سے بے خبر نہیں رہے گا کہ میں غائب ہوں اور اس کو بھی کوئی نہ آگیا۔ اس کے بعد وہ میرے لیے میرے گھر پر چڑھائی کرے گا اور جب میں نہیں ملوں گا تو وہ میرے بیوی بچوں کو اس کی آواز حلق میں پھنسن گئی۔ پھر اس نے کہا۔ ”دیکھو میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو اس لیے اگر میں مرشد کے ہاتھ آ گیا تب بھی تمہارے بارے میں اسے کچھ نہیں بتا سکوں گا۔ خدا کے واسطے مجھے جانے دو، ایسا نہ ہو وقت میرے ہاتھ سے نکل جائے۔“

اس کی حالت قابل رحم ہو رہی تھی وہ سخت جان شخص اپنے بیوی بچوں کی زندگی کے لیے گڑگڑا رہا تھا اگر اسے کتے کی طرح میرے قدموں میں اونٹا پڑتا تو وہ اس سے بھی کریز نہیں کرتا۔ مجھے ترس آنے لگا۔ ”جلو میں تمہیں جانے دیتا ہوں اور تم اپنے بیوی بچوں کو کسی محفوظ مقام پر پہنچا دیتے ہو لیکن تمہارے خیال میں اس طرح تم مرشد سے محفوظ ہو جاؤ گے؟“

اس نے جلدی سے کہا۔ ”میرے پاس ذرائع ہیں میں بیوی بچوں سمیت ملک سے باہر جاسکتا ہوں۔“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ صابر نے جو کہا تھا وہ صرف خدشہ نہیں تھا اس کا بہت زیادہ امکان تھا کہ یہ بات سچ ثابت ہو چکی ہو۔ مرشد رحم اور مردت کے نام سے بھی نا آشنا تھا۔ اگر اسے علم ہو چکا تھا کہ صابر غائب ہے تو اس کے آدمی اب تک صابر کے گھر پہنچ چکے ہوں گے اور اس کے بیوی اور بچوں کی عافیت سخت مشکوک تھی۔ مرشد خود جس درجے کا گھنیا آدمی تھا اس کے ساتھی اور ملازم بھی اسی درجے کے گھنیا تھے۔ عورتوں نے بارے میں ان کے روئے کا میں خود گواہ تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”تمہاری فیملی میں کتنے ممبر ہیں؟“

”میری بیوی اور دو بیٹیاں ہیں بڑی بیٹی کالج میں پڑھ رہی ہے اور اس سے چھوٹی ابھی اسکول میں ہے۔“

”صابر تمہیں کچھ دیر صبر کرنا ہوگا۔ اس کے بعد ہی میں تمہیں چھوڑنے کا فیصلہ کر سکوں گا لیکن تب تک آرام سے بیٹھو شرابا کرنے سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“

میں باہر آیا تو دسم جاگ گیا تھا اور کچن میں کافی کی کیتلی سے کافی نکال رہا تھا۔ ”کیا کہہ رہا ہے صابر؟“

اس نے میرے سامنے کافی رکھتے ہوئے پوچھا۔ میں نے اسے صابر اور اپنی گفتگو سنائی وہ عور سے سنتا رہا۔ جب میں نے بات مکمل کر لی تو اس نے پوچھا۔ ”آپ کیا چاہتے ہیں اسے چھوڑ دیا جائے؟“

”صرف چھوڑ نہیں دیا جائے۔“ میں نے کافی کے گرم گھونٹ کو حلق سے اتار کر کہا۔ ”میرے ذہن میں ایک اور خیال بھی ہے۔ ہم صابر کو اس کے گھر کے پاس چھوڑ دیتے ہیں اور پھر نگرانی کرتے ہیں میرا خیال ہے مرشد کے آدمی بھی وہاں ہوں گے۔ اگر اس نے سچ کہا ہے تو یہ بیوی بچوں کو لے کر نکل جائے گا لیکن اگر اس نے جھوٹ کہا اور مرشد کے پاس جانے کی کوشش کی تو.....“

”تو ہم اسے دوسری دنیا روانہ کر دیں گے۔“ دسم نے میری بات مکمل کی۔ ”لیکن فرض کریں صابر کا خدشہ درست ثابت ہوا تو.....؟“

”تب مرشد کے دشمنوں میں ایک کا اضافہ ہو جائے گا۔“

دسم نے نفی میں سر ہلایا۔ ”صابر بہت معمولی درجے کا آدمی ہے وہ مرشد کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے۔“

”دشمن کبھی معمولی نہیں ہوتا ہے۔ آدمی رہتے اور طاقت میں کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو صرف ایک گولی سے مر جاتا ہے۔ جو ایک آدمی ایک معمولی سے پستول سے بھی چلا سکتا ہے یہ شرط وہ ایسا کرنے کا ارادہ کر لے۔“ میں نے کہا۔ ”صابر کوئی شریف آدمی نہیں ہے بد معاشری کے دھندے اس کے لیے نئے نہیں ہیں۔ اگر وہ مرشد کے خلاف ہو جائے تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔“

”لیکن یہ ایک مفروضہ ہے کہ مرشد نے صابر کے گھر والوں کے خلاف کچھ کیا ہے؟“

”ہاں ہم مفروضات پر ہی آگے بڑھتے ہیں۔ ہمیں صابر کا اچار تو ڈالنا نہیں ہے اس لیے ایک چانس لینے میں کیا حرج ہے۔ ابھی تک ایسی ضرورت نہیں ہے کہ ہم اسے قتل کر دیں لیکن اگر اس نے وعدہ خلافی کرتے ہوئے مرشد سے رابطہ کی کوشش کی تو ہم اسے قتل کرنے کے لیے آزاد ہوں گے۔ اس کے لیے شہلا کے دردناک قتل کا جواز بھی کافی ہوگا۔“

”میں سمجھ گیا۔“ دسم نے سر ہلایا۔ ”لیکن ضروری نہیں ہے وہ خود مرشد کے پاس جائے ہو سکتا ہے وہ اسے فون پر اطلاع دے۔“

”تم نے اس کے گھر کو بگ کیا تھا وہاں لگے بگ اب بھی کام کر رہے ہوں گے؟“

”بالکل..... وہ ایک ہفتہ آن رہتے ہیں اس کے بعد ان کی بیٹری ختم ہو جاتی ہے۔“ دسم نے کہا۔

”بس تو اگر اس نے مرشد سے رابطہ کیا تو ہمیں معلوم ہو جائے گا۔“

”فحیک ہے میں رائڈر ٹیم کو بلا لیتا ہوں۔“

”انتظامات ہونے میں کتنا وقت لگے گا؟“

”تقریباً ایک گھنٹہ۔“ دسم نے جواب دیا۔

”میں فحیک ایک گھنٹے بعد صابر کو لے کر نکلوں گا۔“ میں نے کہا اور اٹھ کر فرنیچ سے ذیل روٹی اور انڈے نکالے۔ آدھے گھنٹے بعد میں ناشتہ کر چکا تھا۔ دسم نے کہا کہ وہ باہر ہی ناشتہ کر لے گا۔ میں نے بیٹو کو جگایا۔ ”اٹھ جاؤ بخور دار ہمیں جانا ہے۔“

”کہاں شو بی بھائی؟“ اس نے داش روم کی طرف جاتے ہوئے پوچھا اور جواب سے بغیر اندر چلا گیا میں نے سفیر کو اٹھایا۔

”میں صابر کو لے کر جا رہا ہوں۔“

”کہاں؟“ اس نے جمائی لے کر پوچھا۔

”اسے چھوڑنے۔“ میں نے سفیر کو اپنا پروگرام بتایا۔ اس نے سر ہلایا۔

”یہ اچھا منصوبہ ہے لیکن صابر سے بہت ہوشیار رہنا اس نے ہمیں پہلے بھی کیسے چکر دیا تھا۔“

”میں سمجھتا ہوں اگر اس نے دھوکا دیا تو خود بخٹکتے گا۔ میرا خیال ہے کافی کوشش کی تاہی ہر مرشد بھی اسے معاف نہیں کرے گا یہ بات وہ بھی جانتا ہے اس لیے وہ شاید ایسی کوئی حماقت نہ کرے۔“

وقت کم تھا اس لیے بیٹو ناشتہ کیے بغیر صرف ایک کپ چائے پی کر تیار ہو گیا۔ ”کھانا ہم آکر کھائے گا۔“

اس نے سفیر سے کہا۔ ”آپ کھانا تیار رکھے گا۔“

کے بعد بند کر لیا۔ صابر کا گھر اس جگہ سے کوئی نصف گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ میں نے صابر سے پوچھا۔ ”تمہارے آدمی بھی تمہارے لیے پریشان ہو رہے ہوں گے؟“

”ہاں وہ مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔“

”کیا تمہارے گھر والوں کی حفاظت بھی کریں گے؟“

صابر کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ ”نہیں میرے گھر والوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے وہ ان سے دور رہتے ہیں۔“

”گویا تم بزنس اور فیملی کے معاملات الگ الگ رکھتے ہو لیکن تمہیں کبھی خیال نہیں آیا تم جو کچھ کرتے ہو کبھی نہ کبھی اس کا اثر تمہاری فیملی پر بھی آ سکتا ہے۔“

”یہ خیال مجھے اکثر آتا تھا۔“ اس نے اعتراف کیا۔ ”لیکن میں اور کیا کر سکتا ہوں۔ میں اپنا پیشہ نہیں بدل سکتا اس کے لیے لازمی ہے میں یہ شہر ہی چھوڑ جاؤں لیکن جو لوگ میرے خوف سے اب تک خاموش ہیں وہ میرے شریف ہوتے ہی میرے پیچھے لگ جاتے اور اس ملک میں مجھے کہیں نہیں چھوڑتے۔“

”تم کو اس ملک سے نکل جانا چاہیے۔“ بیوٹے نے استمراء دیا۔ ”اب تم ادھر نہیں رہ سکتا۔“

”میں یہی کروں گا۔“ اس نے کہا۔

”اگر تمہیں اس کی مہلت ملی تو۔“ میں نے دل میں کہا۔ وسم کی بات سن کر مجھے اپنا اندیشہ درست ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد ہم صابر کے گھر کے پاس پہنچ گئے تھے۔ میں نے اسے ایک سنان سڑک پر اتار دیا۔ غلاف اس کے چہرے پر تھا۔ ”دل میں سو تک غنتی گن کر غلاف اتار دینا، اس وقت تم اپنے گھر کے پاس ہی ہو لیکن ہمیں یا گاڑی کو دیکھنے کی کوشش مت کرنا ورنہ مجبوراً ہمیں واپس آکر تمہیں ٹھکانے لگانا پڑے گا۔“

میں نے گاڑی آگے بڑھادی اور جب تک وہ عقبی آئینے میں نظر آتا رہا اس نے چہرے سے غلاف اتارنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں گاڑی کو مختلف گلیوں میں گھماتا رہا بالآخر صابر والی گلی سے اگلی گلی میں ایک خالی پلاٹ میں دین نظر آگئی میں نے گاڑی اس کے پاس لے جا کر روک دی۔ بیوٹے کو میں نے صابر والی گلی کے سرے پر چھوڑ دیا جہاں سے وہ اس کے مکان پر نظر رکھ سکتا تھا۔ دین میں وسم کے ساتھ شباب تھا شباب ناشتہ کر چکا تھا اور وسم کر رہا تھا۔ ناشتہ پکڑی کے تیار کیے، دسے سینڈویچ اور کسی کیفے سے چائے لے کر کیا جا رہا تھا۔ میں نے اندر آکر دروازہ بند کیا۔ ”کوئی پروگرام کریں؟“

”نہیں۔“ وسم نے منہ چلاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے گھر کے اندر کی خاموشی معنی خیز لگ رہی ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے گھر والے گھر میں نہیں ہیں یا ہیں تو کوئی حرکت کرنے یا آواز نکالنے کے قابل نہیں ہیں؟“

”جی یہی خیال ہے۔“ وسم بولا۔ ”اسے چھوڑ دیا آپ نے؟“

”ہاں وہ کچھ دیر میں اپنے مکان تک پہنچ جائے گا۔“

”فرض کریں اس نے مکان کی طرف آنے کے بجائے کہیں اور جانے کا فیصلہ کر لیا؟“

میں چونک گیا یہ خیال تو میرے ذہن میں آیا نہیں تھا میں نے بیوٹے کو کال کی اس نے کال ریسیو کی۔ ”ہم

”تم ساتھ لائے گا تو کھائے گا۔“ سفیر نے خبردار کیا۔

”آپ منگوائے گا ہم کھائے گا۔“ بیوٹے نے بھی اسی قافیے میں شاعری جاری رکھی۔ سفیر بھنا گیا۔

”کیا کھانا میرا ذمہ بن گیا ہے۔“

”یارتہا کیوں ہے کل تک ٹو دیسے بھی چلا جائے گا۔“ میں نے کہا۔ ”وہاں حویلی میں مزے سے رہنا۔“

مونا اور گھر کی دوسری خواتین کے ہاتھ کے بنے کھانے کھائے گا۔“

”نہیں یاران لوگوں نے میری چڑبالی ہے۔“ سفیر نے فریاد کی۔ ”کیا میری صورت باورچی جیسی ہوگی

”ہے۔“

”نہیں ہے تو ہو جائے گی۔“ بیوٹے نے دانت نکالے۔ ”ابھی آپ اباجی بھی بنے گا۔“

”باپ بننے کا اس سے کیا تعلق ہے؟“

”تعلق ہے مونا دیدی آرام کرے گا آپ کھانا بنائے گا تو باورچی ہی بنے گا نا۔“

اس سے پہلے کہ یہ بحث مزید طول کھینچی میں اوپر آیا۔ پہلے خود نقاب پہنا اور پھر اندر آیا۔ ”صابر تیار ہو جاؤ تمہیں چھوڑا جا رہا ہے۔“

”ج میں.....“ اس نے شک آمیز خوف کے ساتھ کہا۔ اسے شک تھا کہ شاید ہم اسے کہیں مار کر ڈالنے جا رہے تھے۔ وہ خود بھی اپنے دشمنوں کے ساتھ ایسا ہی کرتا آیا ہوگا۔

”ہاں۔“ میں نے کہا اور کچن سے لایا ایک کپڑے کا غلاف اس کے منہ پر چڑھا دیا۔ اس میں کچھ سامان آیا ہوگا۔ اب یہ دوسرے کام آتا۔ اس میں کھینچ کر بند کی جانے والی ڈوری بھی تھی میں نے ڈوری کھینچ دی اب وہ کوشش کرتا تب بھی غلاف آسانی سے نہیں اتر سکتا تھا۔ میں اور بیوٹے اسے بازوؤں سے پکڑ کر گاڑی تک لائے میں نے سفاری لے جانے کا فیصلہ کیا اس میں شیشے تاریک تھے اور اگلی پچھلی نشستوں کے درمیان اتنی جگہ تھی کہ صابر کو اس میں آرام سے فٹ کیا جا سکتا تھا۔ بیوٹے نے اسے دھکا دے کر لٹایا اور خود سیٹ پر بیٹھ کر اس پر پاؤں رکھ لیے۔ میں نے بیوٹے سے کہا۔ ”اگر یہ کوئی غلط حرکت کرے یا چیخے چلائے تو اسے بے دریغ شوٹ کر دینا۔ تمہارے پستول پر سالنسر ہے کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔“

یہ سب میں نے صابر کو ڈرانے کے لیے کہا تھا ورنہ بیوٹے کے پاس کوئی پستول نہیں تھا۔ میں گاڑی سے ذرا دور گیا اور وسم کو کال کی۔ ”کیا ہو رہا ہے؟“

”سیٹ آپ ہو گیا ہے..... ہم صابر کے گھر سے کچھ دور موجود ہیں۔ تین بائیک والے مختلف اطراف میں موجود ہیں۔ وہ ایک منٹ کے نوٹس پر آ سکتے ہیں۔“

”گھر کی کیا رپورٹ ہے؟“

”اندر مکمل خاموشی ہے جیسے اندر کوئی بھی نہ ہو۔“

”آس پاس کی کیا صورت حال ہے؟“

”فی الحال تو کھلی مشکوک فرد نظر نہیں آ رہا ہے۔“

”ہم آ رہے ہیں۔“ میں نے فون بند کیا اور گاڑی کی طرف آیا۔ سفیر نے گیٹ کھولا اور گاڑی کے نکلنے

”آپ کو اس سے ہمدردی ہے؟“

”نہیں بلکہ مرشد کے عزائم کا کام بنائے ہیں۔ اُس کے ساتھی اب مرشدت مل چکے ہیں تو ان کا بھی خاتمہ کرنا ہے۔“ میں نے فیصلہ کن سہجے میں کہا۔ ”نہیں مرشد اور اس کے ساتھیوں کے خلاف ہر ممکن قدم اٹھانا ہے۔ اس کی ہر ناکامی ہماری کامیابی ہے اور اس پر مذاکرہ نہیں ہوگا۔“

صابر اب اپنے جنون پر قابو پانے میں کامیاب رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کے بڑبڑانے کی آواز آتی تھی۔ اچانک کسی کی کراہ سنائی دی اور صابر چلا آیا۔ ”شازیہ“ میری بیٹی تو زندہ ہے۔“

”بابا۔۔۔ بابا۔۔۔ لڑکی چلائی۔“ بابا انہوں نے سہ کو مار دیا۔ ماما کو فوڈیز کو۔۔۔ مجھے بھی۔“ لڑکی اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اس کے اُسم تہہ تہہ سے تھے کہ اس پر کیا گزری تھی۔ صابر بھی رونے لگا تھا۔

”شازیہ وہ کون تھی؟“

”وہ جو آپ کے ساتھی ہیں عبدال اور اسمٰعیل کے ساتھ دو آدمی اور تھے انہوں نے“ لڑکی پھر رونے لگی تھی۔ اسی لمحے بیو کی آواز آئی۔

”شوبی بھائی دو آدمی خاموشی سے مکان میں داخل ہوا ہے۔“

”خاموشی سے کیسے؟“

”وہ نیل یاد روزہ بھائی کے بغیر اندر گیا ہے۔ ایک آدمی کے پاس پستول بھی ہے شاید۔۔۔ آپ بولے تو میں پاس جا کر دیکھوں۔“

”فحیک ہے لیکن مکان کے بالکل سامنے جانے کی ضرورت نہیں ہے ہم بھی آرہے ہیں۔“ میں نے کہا

اور دسیم اس دوران میں حرکت میں آچکا تھا۔ اس نے دین کے معاملات شہاب کے سپرد کیے۔ میرے پاس

پستول تھا۔ دسیم نے پاس بھی کوئی چھوٹا ہتھیار تھا لیکن اس نے دین کے ایک خانے سے ایک چھوٹی سی مشین گن

نکالی۔ یہ اسیار یہ پینٹا لیس کے پستول سے کچھ ہی بڑی ہوگی اور با آسانی دسیم کی جیکٹ میں چھپ گئی۔ میں اور

دسیم دین سے نیچے اترے اور تیز قدموں سے صابر کی گلی کی طرف بڑھے۔ وہ ابھی تک شازیہ سے بات کر رہا تھا۔

اسے خبر نہیں تھی کہ موت کے ہر کارے جو اس کے ساتھی ہیں مکان میں داخل ہو چکے ہیں۔ شازیہ کے انکشاف

نے اسے پاگل کر دیا تھا وہ جو اس کے ماتحت تھے اور جنہیں وہ اپنا دست و بازو سمجھتا تھا انہوں نے اس کے ساتھ

یہ کیا تھا۔ اس کی بیوی اور بیٹیوں کو پامال کر کے قتل کر دیا تھا شازیہ کی قسمت تھی جو وہ بچ گئی۔ صابر کہہ رہا تھا۔

”عبدال۔۔۔ مسلم میں انہیں کتنے کی موت ماروں گا ان کا پورا خاندان ختم کر دوں گا۔“

”نہیں استاد جی۔۔۔ ہیڈ سیٹ میں ایک نئی آواز آئی۔“ خاندان تک جانے کی ضرورت نہیں ہے ہم خود

یہاں آگئے ہیں۔“

”اسلم۔۔۔ عبدال ذلیل، کتو۔۔۔“ صابر دیوانہ وار چلانے لگا۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ پاگل ہو کر

ان دونوں پر حملہ کر دے اور وہ اسے قورما کر دیں وہ اسے مارنے کے لیے آئے تھے۔ چانک صابر کے کراہنے کی

آواز آئی اور شازیہ چلانے لگی۔

”خدا کے لیے۔۔۔ میرے لیے۔۔۔“

خود آپ لوگ اصرارے والا تھا وہ اپنے گھر میں آ گیا ہے۔“

اسی لمحے دین میں کسی کے چلانے کی آواز آئی۔ ”فریدہ۔۔۔ میرے خدا۔۔۔ شازیہ۔۔۔ فوڈیز۔۔۔ نہیں میرے خدا نہیں۔“

دسیم نے اُتیکر آن کیے ہوئے تھے اس لیے جب صابر نے گھر میں داخل ہو کر چلانا شروع کیا تو ہم مل کر

رہ گئے تھے دسیم نے جھپٹ کر اُتیکر کی کی آواز بند کی اور دسیم کو ہیڈ سیٹ پر منتقل کر دیا ہم نے چھوٹے ہیڈ سیٹ

کانوں پر چڑھا لیے تھے۔ اب صابر کے دھاڑیں مار کر رونے کی آواز زیادہ واضح لیکن صرف ہمارے کانوں تک

محدود تھی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اس کے گھروالوں پر کوئی سانحہ گزر گیا تھا اور وہ صابر کی پکاروں کا جواب دینے

کے قابل نہیں تھے۔ وہ باری باری یہی تین نام پکار رہا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کی بیوی اور دو بیٹیاں تھیں یہ ان

کے ہی نام ہو سکتے تھے۔ میں نے افسوس سے دسیم کی طرف دیکھا۔

”میرا خیال ہے مرشد کے آدمی اپنا کام کر گئے ہیں۔“

”لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔“ دسیم بولا۔

بیو لائن پر تھا میں نے اس سے کہا۔ ”نظر رکھنا جیسے ہی وہ اپنے گھر سے نکلے تو ہمیں بتانا۔“

”میرا خیال ہے ایک ریڈیو اس تک پہنچا دیا جائے کال ملنے میں دیر لگتی ہے۔“ دسیم نے کہا اور شہاب کو

ایک ریڈیو سیٹ دے کر روانہ کر دیا۔ صابر اب بھی دھاڑیں مار کر رو رہا تھا اور ساتھ ہی مرشد کو گالیاں دے رہا تھا

اسے اپنے ہاتھ سے قتل کرنے کے عزائم کا اعلان کر رہا تھا۔ مگر اس جنونی کیفیت میں وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا اگر مرشد

ہاؤس یا اس کے کسی اور گھرانے کا رخ کرتا تو خود بھی مارا جاتا۔ رفتہ رفتہ اس کی آواز دہنے لگی اور پھر اس نے کسی کو

کال ملائی۔ ”میں بات کر رہا ہوں۔“

”کیا بات ہے استاد؟“ دوسری طرف سے کسی نے مختاط انداز میں پوچھا۔ دسیم نے صابر کے گھر کا فون

بھی بگ کر دیا تھا اس لیے دوسرے آدمی کی آواز بھی آرہی تھی۔

صابر دھاڑا۔ ”تم لوگ کہاں مر گئے ہو۔۔۔ میرے گھروالوں پر قیامت گزر گئی ہے۔“

”کیا ہوا استاد؟“ اس شخص نے اسی طرح مختاط انداز میں کہا۔

”تم اور عبدال فوراً یہاں آ جاؤ۔“

دوسری طرف موجود شخص کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ ”ہم آرہے ہیں۔“

صابر نے فون بند کر دیا۔ وہ پھر دبی دبی آواز میں رونے لگا تھا۔ میں نے دسیم کی طرف دیکھا۔ ”تم نے

کچھ محسوس کیا؟“

”ہاں اگر یہ صابر کا آدمی ہے تو اس کا رویہ نہایت عجیب ہے۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”میرا خیال ہے اب وہ صابر کا آدمی نہیں ہے بلکہ مرشد کا آدمی ہے۔“ صابر نے

اسے نہیں اپنی موت کو خود پایا ہے۔“

”ایسا ہی لگ رہا ہے اس صورت میں میں کیا کرنا چاہیے۔“

”ہمیں صابر کو بچانا ہوگا۔“

”چپ کرکتیا... ٹوٹ کیسے گئی؟“ دوسرے آدمی نے لڑکی کو جھڑکا۔ انہوں نے صابر پر کوئی تشدد کیا تھا۔ پہلے اس سے منٹ لیں پھر تجھے بھی دیکھتے ہیں۔“

اس دوران میں ہم گلی میں داخل ہو گئے تھے۔ بیٹو بھی ہمارے ساتھ اندر ہونے والی گفتگو سن رہا تھا اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور پھر اندر چلا گیا میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”بیٹو احتیاط سے وہ مسلح ہیں۔“

”فکرمت کرو۔“ وہ بولا۔

”بیٹو۔“ اس بار میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”باہر آؤ اور جا کر جپ لے کر آؤ ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔ شہاب تم بھی ہوشیار ہو کر کوئی آجائے اور ہم پھنس جائیں تو تم پیچھے سے مدد کرو گے۔“

”میں پوری طرح ہوشیار ہوں۔“ شہاب نے کہا۔

بیٹو بادل نا خواستہ باہر آیا اور جپ لینے روانہ ہو گیا۔ میں اور وسم اندر داخل ہوئے۔ وسم نے مجھے دائیں طرف سے جانے کا اشارہ کیا اور خود بائیں سمت بڑھ گیا۔ صابر کا مکان زیادہ برا نہیں تھا یہ شاید نصف کنال پر بنا ہوا تھا اور مکان کے دونوں گلی تھی۔ سامنے پورچ اور ایک چھوٹا سا سردہ تھا۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ کیا ریاں تھیں جن میں پھولدار پودے تھے اور خوب صورت ٹیلیں دیواروں پر چڑھی ہوئی تھیں۔ مکان کی حالت بہت اچھی تھی۔ اس پر حال ہی میں کمر ہوا تھا۔ برآمدے میں مکان کا کھلنے والا دروازہ مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا جس پر ہاتھ سے نقش اٹھارے گئے تھے۔ میں دائیں طرف سے دیوار کے ساتھ لگا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور میرے کان بگ سے آنے والی آوازوں پر مرکوز تھے۔ صابر کے آدمی اس پر تشدد کر رہے تھے اور غلبہ زبان میں اسے بتا رہے تھے کہ انہوں نے اس کی بیوی اور بیٹیوں کے ساتھ کیا کیا تھا۔

صابر کا نہ جانے کیا حال تھا لیکن ان کی کبواس سن کر میرا خون کھول رہا تھا اور مجھے صابر پر بھی غصہ آرہا تھا جو اپنی آستین میں سانپ پال رہا تھا جنہوں نے بالآخر اسے ہی ڈس لیا۔ افسوس کہ اس نے جو دوسروں کے ساتھ کیا تھا آج وہی اس کے سامنے آ رہا تھا اور اس کے گھر والوں کو بھگتنا پڑا تھا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ جو آوازیں میں ہیڈ سیٹ سے سن رہا تھا وہی میرے پاس سے بھی آرہی تھیں۔ میں نے ہیڈ سیٹ ہٹا کر دیکھا۔ آوازیں اس کمرے کی کھڑکی سے آرہی تھیں جس کے مینے نیچے میں موجود تھا۔ یعنی وہ لوگ اسی کمرے میں موجود تھے۔ میں براہ راست جھانکنے کا خطرہ مول لے نہیں سکتا تھا اس لیے کھڑکی سے گھڑی اٹھا کر اس کے کھٹے میں اندر کا منظر دیکھا۔

اندر کا منظر اچھا نہیں تھا۔ یہ بیڈروم تھا بیڈروم دو لاشیں پڑی تھیں وہ بیڈروم پر لاشیں تھیں کیونکہ صابر نے ان پر چادر ڈال دی تھی۔ اس چادر پر بھی خون لگ گیا تھا اور بیڈروم کی حالت تو بری ہی تھی۔ بیڈروم کے سامنے قالین پر صابر کی لڑکی شازبے پڑی تھی اور اس کے پاس ہی صابر وسم دراز حالت میں بیٹھا تھا۔ ذرا سی دیر میں عبدل اور ائمہ نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ وہ دونوں اس کے پاس سے گزرے تھے۔ وہ دونوں ہی مسلح تھے ایک کے پاس بڑے کیلی بار کا پستول تھا اور دوسرے کے پاس ریولور تھا۔ مجھے تعجب تھا کہ انہوں نے اب تک اسے مارا کیوں نہیں تھا شاید وہ اس کی بے بسی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اچانک وہ لاشیں اٹھنے لگیں۔

”مگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو۔“ بیٹی تجوری کا کمرہ تھا۔

مگر صابر پوری طرح ہوں جس نہیں تھا وہ نیم غشی کی حالت میں جھول رہا تھا۔ اس نے شاید ان کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ کمرے کا اچھی طرح جائزہ لے کر میں ذرا پیچھے آیا اور آہستہ سے وسم سے پوچھا۔ ”تم کہاں ہو؟“

”میں اندر آ گیا ہوں۔“ اس نے بتایا۔

”انہیں دیکھ لیا ہے؟“

”ہاں۔“

”ایک ساتھ بینڈز آپ کراہتے ہیں ان میں سے کم سے کم ایک زندہ ہاتھ آنا چاہیے۔“

”میں سمجھ گیا تب بینڈز آپ کراہنے کے بجائے براہ راست ہاتھ اور پیر میں گولی ماری جائے۔“

”ٹھیک میں کھڑکی سے سیاہ شرٹ والے کو نشانہ بنانا گا۔“

”میں نیلی جرسی والے کو۔“ وسم نے کہا۔ ”لیکن کام ایک ساتھ ہونا چاہیے۔“

”ٹھیک تین تک گنتی گنتے ہی ہم حرکت میں آجائیں گے۔“

میں واپس کمرے تک گیا۔ ایک بار پھر گھڑی سے اندر موجود لوگوں کی جگہ دیکھی۔ سیاہ شرٹ والا صابر پر جھکا ہوا تھا اور پستول اس کی کینٹھ سے لگا رکھا تھا۔ ”تم نے بہت عرصے ہماری گردن پر سواری کی ہے اب تم سے ہمیشہ کے لیے نجات مل جائے گی لیکن تمہاری جان بخشی کی جا سکتی ہے بشرطیکہ تم تجوری کا نمبر بتا دو۔“

صابر نے جواب میں نفرت سے اس کے منہ پر تھوک دیا اور مجھے معلوم تھا کہ اب کیا ہوگا۔ میں نے تیزی سے کھڑکی میں آتے ہوئے سیاہ شرٹ والے کا نشانہ لیا وہ ذرا پیچھے ہو کر صابر پر گولی چلانے والا تھا لیکن اس سے پہلے میرے پستول سے نکلنے والا شعلہ اس کے شانے میں اتر گیا اور وہ ایک جھٹکے سے صابر پر ہی گرا تھا۔ مجھے ایک دو تین کہنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ مگر وسم بھی حرکت میں آ گیا تھا کمرے کا دروازہ ایک دھماکے سے کھلا، اس دوران میں نیلی جرسی والا میری طرف متوجہ ہوا تھا اور اس کا پستول والا ہاتھ میری طرف اٹھ رہا تھا لیکن وسم نے اسے مہلت نہیں دی اور عقب سے اس کے شانے پر گولی ماری میں نے غوطہ لگایا کیونکہ وسم کھڑکی کی سیدھ میں کھڑا ہوا تھا گولی نیلی جرسی والے کے بازو کو چھیدتی ہوئی کھڑکی کی طرف آئی تھی۔

نیچے ہوتے ہی میں دوبارہ سیدھا ہوا تو وسم صورت حال کو قابو میں کر چکا تھا اس نے دونوں کے پستول اور ریولور ان سے دور پھینک دیے تھے۔ فائر کی آواز بیٹو تک پہنچی تھی اس نے پریشانی سے پوچھا۔ ”شوٹی فائر کس نے کیا سب ٹھیک ہے؟“

”ہاں سب ٹھیک ہے ہم نے صورت حال پر قابو پا لیا ہے۔“ میں نے اسے تسلی دی اور واپس مکان کے سامنے والے حصے میں آیا اور ایک منٹ میں اس کمرے میں پہنچ گیا۔ صابر نیم غشی کی حالت میں قالین پر بیٹھا ہوا جھول رہا تھا اس کی لڑکی نے اسے تھام رکھا تھا۔ وہ بہت پیاری اور دل کشی کم عمر لڑکی تھی۔ مگر اس وقت وہ تباہ حال لگ رہی تھی اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا اور خون آلود تھا۔ چہرے اور جسم کے نظر آنے والے حصوں پر زخموں کے نشانات تھے۔ ان لوگوں نے اس کے ساتھ بہت برا سلوک کیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”صابر کو پیچھے کرو۔“

”بابا پیچھے آئیں۔“ شازیہ نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ عبدل اور اسلم نے صابر کے سر پر اپنے ہتھیاروں سے ضربیں لگائی تھیں اسی لیے وہ پوری طرح ہوش میں نہیں تھا۔ شازیہ اسے کھینچ کر پیچھے لے گئی تھی۔ میں نے جس پر گولی چلائی تھی وہ تقریباً بے ہوش ہو گیا تھا کیونکہ گولی نے شانے کی ہڈی تو زدی تھی اور وہ یقیناً سخت تکلیف میں تھا نیلی جرسی والا ہوش میں تھا۔ میں نے اس کے سر پر پستول کا دستہ مارا تو وہ بھی نیچے لڑھک گیا۔ میں نے وسم سے کہا۔

”ان کی تلاشی لو۔“

وسم ان کی تلاشی لینے لگا اور میں نے بیٹو سے پوچھا۔ ”تم کہاں ہو؟“

”ہم مکان کے سامنے آ گیا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کیا اندر آ جائے؟“

”تم جیب سامنے لاؤ میں دروازہ کھول رہا ہوں۔“

”انہیں لے کر جانا ہے۔“ وسم نے عبدل اور اسلم کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے سر ہلایا۔

”ظاہر ہے یہی تو اس معاملے میں ہمارا نفع ہیں۔“

میں باہر آیا تو بیٹو جیب کو گھٹ کے بالکل سامنے لے آیا تھا گیت کھولتے ہی وہ اندر آ گیا۔ اس دوران میں شہاب بھی وین گلی میں لے آیا تھا۔ میں بیٹو کے ساتھ اندر آیا اور باری باری عبدل اور اسلم کو جیب کے پچھلے حصے میں منتقل کیا وہ ذمی تھے اور خون بہہ رہا تھا لیکن ان کے مرنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میرے پستول پر سائلنسر لگا تھا اور وسم نے چھوٹا پستول استعمال کیا تھا وہ مکان کے اندر تھا اس لیے آواز بہت کم آئی تھی امید تھی کہ کسی نے اس سنیکل فائر کا نوٹس نہیں لیا ہوگا۔ آس پاس دیباہی ساٹا اور سکون تھا۔ وسم کے کہنے پر شازیہ نے ہاتھ روم میں جا کر کپڑے بدل لیے تھے لیکن وہ بہت خوف زدہ تھی۔ مردوں سے اس کا اعتبار اٹھ گیا تھا اور اسے خوف تھا کہ ہم بھی اس کے حق میں درندے نہ ثابت ہوں۔ اس نے صابر کو پانی پلایا اور کچھ پانی اس کے منہ پر ڈالا تو اسے ہوش آ گیا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ حیران ہوا۔ ”تم لوگ کون ہو اور ہمیں کیوں بچایا؟“

”تم دیکھ پہلی بار ہے ہو لیکن سنتے رہے ہو ہمیں۔“ میں نے کہا تو چونکا۔

”یہ تم ہو؟“

میں نے سر ہلایا۔ ”ہم تمہارے پیچھے تھے کیونکہ ایک تو تم پر اعتبار نہیں تھا کہ تم ہمیں دھوکا دے کر مرشد کے پاس دوڑے جاؤ۔ اس صورت میں تمہیں دوسری دنیا میں ہوش آتا۔“

”مرشد۔“ اس نے اس طرح کہا کہ اس کے چہرے کی دریڈیں ابھر آئی تھیں۔ میں نے افسوس سے چادر تلے موجود لاشوں کی طرف دیکھا۔

”دوسرے مجھے اسی بات کا خدشہ تھا۔ مرشد جیسے لوگ اپنے کسی معتب کو اکیلے سر نہیں دیتے ہیں اس سزا میں اس کا پورا خاندان شامل ہوتا ہے۔“

اس نے طیش سے کہا۔ ”کاش کہ تم مجھے پہلے چھوڑ دیتے تو میری بیوی اور بیٹی بچ جاتی۔“

”میرا خیال ہے یہ واردات بالکل صبح کسی وقت ہوئی ہے جب تم نے مجھ سے اس خدشے کا اظہار کیا تو اس وقت تک یہ سب ہو چکا تھا۔“

شازیہ ہوش میں آنے کے بعد خود کو سنبھالے ہوئے تھی اور پھر عبدل اور اسلم کے دوبارہ آنے سے بھی اسے جھک لگا تھا لیکن اب وہ صدمہ سہار نہیں پارہی تھی اچانک ہی فرش پر لڑھک گئی۔ صابر اس کی طرف جھپٹا۔

”میری بچی..... کیا ہوا تجھے؟“ وہ اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔

”میرا خیال ہے یہ صدمے سے بے ہوش ہو گئی ہے۔“ میں نے شازیہ کی نبض دیکھنے کے بعد کہا۔ ”صابر ہمارے پاس وقت کم ہے ہم اسلم اور عبدل کو لے کر جا رہے ہیں۔“

”تم انہیں نہیں لے جا سکتے وہ میرے مجرم ہیں۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ مرشد کے ساتھی ہیں اور ان سے ہمیں بہت کچھ معلوم کرنا ہے انہیں ہم لے جائیں گے۔ دوسرے تم ان کی نہیں اپنی فکر کرو میرا خیال ہے نمبر بنانے کے چکر میں یہ مرشد کو اطلاع دیے بغیر یہاں چلے آئے ہیں لیکن جلد یا بدیر مرشد کے دوسرے آدمی آئیں گے اور تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکو گے۔ اللہ نے تمہاری ایک بیٹی کو محفوظ رکھا ہے اسے لو اور کہیں نکل جاؤ۔“

”میں کہیں نہیں جا سکتا۔“ صابر نے مایوسی سے کہا۔ ”میرے تمام ٹھکانے ان دو حرا میوں کے علم میں ہیں اور لازمی بات ہے انہوں نے مرشد کو بتا دیا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے ابھی تو تم ہمارے ساتھ چلو۔“ میں نے کہا۔ ”بعد میں تم فیصلہ کر سکتے ہو کہ تمہیں کہاں جانا ہے۔“

صابر نے سوچا اور سر ہلایا۔ وہ اٹھا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ وسم نے آہستہ سے مجھ سے کہا۔

”اسے لے جانا ضروری ہے؟“

”بالکل ضروری ہے ایک تو یہ مرشد کے خلاف ہمارا ایک ممبرہ بن سکتا ہے دوسرے اگر اسے چھوڑ گئے تو جلد ہی یہ مرشد کے ہتھے چڑھ جائے گا اور ہمارے بارے میں سب بتا دے گا۔ اس وقت یہ بوکھلایا ہوا اور صدمے میں ہے جب تک یہ سنبھل کر اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے کے قابل نہ ہو جائے اسے اپنی تحویل میں رکھنا ضروری ہے۔“

وسم سمجھ گیا۔ ”انہیں لے جانا کہاں ہے؟“

”فارم ہاؤس لیکن وین میں تاکہ یہ اس کا محل وقوع نہ دیکھ سکیں۔“

کچھ دیر بعد صابر ایک بڑا سوٹ کیس اٹھاے نمودار ہوا۔ میں نے پوچھا۔ ”اس میں کیا ہے؟“

”میرا کچھ سامان ہے اور رقم ہے۔“ اس نے ٹالنے والے انداز میں کہا لیکن میں متاثر نہیں ہوا۔ میں حکمانہ انداز میں بولا۔

”صابر اسے کھول کر دکھاؤ۔“

”کیوں؟“ وہ بدک گیا۔ ”اس میں میری ذاتی چیزیں ہیں۔“

”ٹھیک ہے ان ذاتی چیزوں کے ساتھ تم جہاں جانا چاہو جا سکتے ہو ہم جا رہے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ وہ مجھے گھوڑتے ہوئے بولا۔

”مطلب یہ کہ ہمارے ساتھ چلنا ہے تو جو میں کہوں وہ کرنا ہوگا۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم اس سوٹ کیس میں

اسلمہ یا کوئی خطرناک چیز لے جا رہے ہو۔“

بادل ناخواستہ صابر نے سوٹ کیس کھول کر دکھایا۔ اس میں اس کے اور شازیہ کے کپڑوں کے علاوہ خاصی تعداد میں نوٹوں کی گلدیاں تھیں ایک عدد پستول تھا اور ایک چھوٹی شٹ گن تھی۔ میں نے اسلمہ کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ ہمارے حوالے کر دو۔“

”ایسا نہیں ہو سکتا۔“ اس نے مشتعل ہو کر کہا۔ ”کیا تم مجھے پھر قیدی بنا کر لے جا رہے ہو؟“

”نہیں ہم تمہیں اپنی حفاظت میں لے رہے ہیں لیکن اس کے لیے ضروری ہے تم خود کو پوری طرح ہمارے حوالے کر دو اسی صورت میں ہم تمہاری حفاظت کے ذمے دار ہوں گے۔“

”ورنہ تم اپنی حفاظت خود کرنے کے لیے آزاد ہو۔“ وسیم نے کہا۔

صابر کچھ دیر ہونٹ کا تار ہاتھ پھر اس نے پستول اور شٹ گن نکال کر میرے حوالے کر دیں۔ ”گلدیاں تم ہمارے ساتھ چل سکتے ہو ابیا کرو سوٹ کیس مجھے دو اور شازیہ کو تم اٹھا لو۔“

”اسے کسی ڈاکٹر کو دکھانا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے راستے میں تم کسی کلینک میں اسے دکھا سکتے ہو۔“ میں نے کہا اور وسیم کو اشارہ کیا وہ اسے اور شازیہ کو لے گیا۔ شہاب وین بھی اندر لے آیا صابر اور شازیہ کو اس میں منتقل کیا اور میں بیٹو کے ساتھ چپ میں آ گیا۔ ہم فوری طور پر حویلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ وسیم کے بائیک سوار میری رہنمائی کر رہے تھے اس نے تین آدمی بلوائے تھے ان میں سے ایک ہمارے ساتھ جا رہا تھا اور دو ابھی وسیم کے پاس رک گئے تھے جب وہ صابر اور شازیہ کو لے کر فارم ہاؤس پہنچ جاتا تب یہ دو بھی حویلی چلے جاتے۔ حویلی پنڈی شہر سے کوئی بیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ ہم پون گھنٹے میں وہاں پہنچے تھے اگر جی ٹی روڈ سے جاتے تو فاصلہ بڑھ جاتا لیکن وقت کم لگتا۔ پرانے شہر کے پُر ہجوم اور مختصر راستوں سے گزرنے میں وقت لگا تھا۔

حویلی ج جی آئیڈیل قسم کی تھی۔ کسی قدر نشیب میں ہونے کی وجہ سے یہاں زمین میں سیم تھی اور اسی وجہ سے اسے زرعی مقاصد کے لیے استعمال نہیں کیا جا رہا تھا پھر آس پاس اونچے نیچے نیلے تھے ہموار زمین بہت کم تھی۔ کسی شوقین نے آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے یہ حویلی تیار کرائی تھی مگر اس کی حالت بتا رہی تھی کہ یہ کم سے کم پندرہ بیس سال سے بے آباد پڑی ہوئی ہے۔ رہنما ہمیں حویلی کے عقبی طرف سے اندر لے گیا وہاں مگرانی کا سسٹم تھا کیونکہ جیسے ہی ہم بھاگ کر پہنچنے فلوادی گیٹ کھل گیا اور ہم اندر چلے گئے۔ ایک چھوٹے سے حصے کو صاف کر کے پارکنگ کی صورت دی گئی تھی۔ عمارت میں آمدورفت کا راستہ بھی پیچھے کی طرف تھا۔ سامنے والے حصے کو بالکل نہیں چھیڑا گیا تھا اور وہ ویسے ہی تھا اگر کوئی سامنے والے حصے میں آ کر دیکھتا تو اسے ذرا بھی شبہ نہیں ہوتا کہ حویلی زیر استعمال ہے۔ بائیک سوار تقریباً چالیس برس کا چاک و چوبند اور چھریرے جسم والا شخص تھا۔ اس نے ہیلت اتار تے ہوئے کہا۔

”آئیے جناب۔“

”ان دونوں کو اندر پہنچانا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”دیکھو گولیوں کے دھم ہیں ان کی مرہم پنی کرنی ہے اور سخت مگرانی کرنی ہے یہ بہت اہم قیدی ہیں۔“

”آپ بے فکر رہیں جناب یہاں ان کی صحیح سے دیکھ بھال ہوگی۔“ اس نے کہا اور دوسروں کو بلانے چلا گیا۔

میں اور بیٹو اندر آئے انہوں نے رہائش اور دوسرے کاموں کے لیے حویلی کے پانچ چھ کمرے صاف کر کے انہیں رہائش کے قابل بنالیا تھا۔ کچن بھی تھا کھانا وہ خود بناتے تھے۔ یہاں بجلی نہیں تھی لیکن انہوں نے مین روڈ سے گزرنے والی لائن سے کنڈا مار لیا تھا۔ پانی زمین سے نکالتے تھے اور اس کے لیے موٹی تھی۔ کھانا بنانے اور دوسرے کاموں کے لیے گیس سلینڈر استعمال کرتے تھے۔ کمروں میں فرنیچر ڈالنے کے بجائے انہوں نے انڈر لے کے ساتھ وال ٹو وال کارپٹ بچھا لیے تھے اور اسی پر سوتے تھے۔ واش روم ٹھیک کرانے کے لیے وہ پنڈی سے پلبر اور سامان لے آئے تھے اسی طرح الیکٹریٹیشن لاکر بجلی کا سارا کام کر لیا تھا۔ ایک کمرے میں کنٹرول روم تھا انہوں نے حویلی میں چاروں طرف خفیہ کیمرے لگا دیئے تھے جن سے بچ کر کوئی اس طرف چھپ کر نہیں آ سکتا تھا۔

قیدیوں کو رکھنے کے لیے تہ خانہ تھا۔ اس کی میٹریوں پر فلوادی دروازہ تھا جسے توڑنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ دروازہ بھی انہوں نے خود لگا دیا تھا۔ تہ خانہ اندر سے بہت بڑا اور کچا تھا اس میں جا بے جاستون تھے جنہوں نے اوپر کی عمارت کا جوہر سنبھال رکھا تھا۔ عبدل اور اسلم کو یہیں منتقل کر دیا گیا تھا۔ وسیم کے ایک درجن آدمیوں میں سے دو فرسٹ ایڈ جانتے تھے اور چھوٹا موٹا آپریشن بھی کر لیتے تھے۔ ذبحی ان کے سپرد کر دیئے گئے میں نے ان سے کہا۔ ”خیال رہے یہ مرنے نہ پائیں اور یہاں سے نکلنے بھی نہ پائیں یہ مرشد کے آدمی ہیں۔“

ہم وہاں دو گھنٹہ کے..... بیٹو نے چھوٹے کے سالن اور روٹی سے لے کر تناول فرمایا اور بہت حیران ہوا کہ گوشت کے علاوہ بھی کسی چیز میں اتنا ذائقہ ہو سکتا ہے۔ مجھے بھوک نہیں تھی اس لیے میں نے صرف چکھا تھا۔ روٹی کے لیے انہوں نے بنا بنایا تندور لے لیا تھا اس میں بیک وقت درجن روٹیاں لگ جاتی تھیں۔ وہ سب مزے سے اور بے فکری سے رہ رہے تھے۔ کھانا پینا کھلا تھا۔ کھلی فضا تھی۔ تفریح کے لیے انہوں نے ڈش کے ساتھ ٹی وی لگا لیا تھا ایک ڈی وی ڈی پلیئر تھا جس پر وہ موویز دیکھتے تھے۔ اخبارات اور رسائل بھی لے آتے تھے۔ باہر کے کاموں کے علاوہ وسیم نے ان سب کی ڈیوٹی بانڈی ہوئی تھی۔ ویراندہ ہونے کے باوجود یہاں موبائل سگنل تھی۔ اس لیے رابطے میں آسانی رہتی تھی۔ جن کے گھر والے تھے اور آس پاس رہتے تھے انہیں ہفتے میں دو دن چھٹی ملتی تھی کہ وہ جا کر گھر والوں سے مل آئیں۔ وسیم نے ان کی باقاعدہ تنخواہیں مقرر کی ہوئی تھیں اور انہیں دو مہینے کی پیشگی تنخواہیں دے دی گئی تھیں۔

دو بجے وسیم کی کال آئی۔ ”میں نے انہیں فارم ہاؤس پہنچا دیا ہے۔ لڑکی کو ٹریسٹ مل گئی ہے اس کی حالت بہتر ہے۔ اب ان کے ساتھ کیا کرنا ہے۔“

”مگرانی میں رکھو لیکن اس طرح کہ صابر کو احساس نہ ہو اور اسے کسی سے رابطہ مت کرنے دینا۔ میں اور بیٹو شام تک آئیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”میں ذرا ان دونوں سے ابتدائی پوچھ بچھ کر لوں۔“

مرہم پنی اور جراحی کے ماہر نے دونوں کے زخموں کی پٹی کر دی تھی میرے شکار کے شانے میں گولی اٹکی

ہوئی تھی اسے نکالنے کے لیے چھوٹا سا آپریشن کرنا پڑا تھا۔ بہر حال اب وہ دونوں ٹھیک حالت میں تھے۔ میں اور بیٹو نیچے تہہ خانے میں آئے۔ یہاں وہ ایک طرف دیوار میں نصب زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے فولادی کڑے ان کے پیروں میں تھے اور وہ ایک حد سے زیادہ حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ زمین پر سوکھی گھاس بچھی تھی جو دبیز اور آرام دہ تھی وہ اسی پر پڑے ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھے ان میں سے سیاہ شرٹ والے نے ناک پھلا کر کہا۔ ”تم نے اچھا نہیں کیا ہے تمہیں معلوم نہیں ہے ہم کس کے بندے ہیں۔“

”بندے سب اللہ کے ہوتے ہیں اور جو خود کو اللہ کا بندہ نہیں سمجھتے وہ یقیناً شیطان کے بندے ہوتے ہیں۔ تم کس کے بندے ہو؟“

”ہم مرشد بادشاہ کے آدمی ہیں۔“ سیاہ شرٹ والا بولا ابھی اس کا جملہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ میرے جوتے کی نوک اس کے منہ پر لگی اور وہ الٹ کر پیچھے گرا۔

”میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا تم شیطان کے بندے ہو اور تمہیں بھی سمجھ میں آ جانا چاہیے کہ مرشد تمہیں پہچانے نہیں آئے گا۔ اس کے نزدیک تمہاری حیثیت ہاتھ روم کے لونے سے زیادہ نہیں ہے۔“

وہ منہ دبائے کراہ رہا تھا یقیناً اس کے کئی دانت بل گئے تھے یا حلق میں اتر گئے تھے میں نیلی جرسی والے کی طرف متوجہ ہوا جو میرا جارحانہ رویے سے کسی قدر دہشت زدہ نظر آ رہا ہے میں نے اس سے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”اسلم۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ ”یہ عبدل ہے۔“

”پہلے تم دونوں صابر کے کتے تھے لیکن جب مرشد نے بڑی ہڈی دکھائی تو دم ہلاتے اس کے پاس چلے گئے اور اپنے سابق آقا کے احسانات کا صلہ یوں دیا کہ اس کے پورے گھر کو تباہ کر دیا۔ ان عورتوں کا کیا قصور تھا؟“ میں غصے میں آ گیا۔

”صابر کا رویہ ہمارے ساتھ اچھا نہیں تھا۔“ اسلم نے کہا۔ ”وہ مشکل کام ہم سے لیتا تھا اور ہمیں بہت کم معاوضہ دیتا تھا۔ ہمارے ساتھ اس کا رویہ کچ کچ کتوں جیسا تھا۔“

”تم مجبور نہیں تھے اسے چھوڑ کر جاسکتے تھے۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ ممکن نہیں ہے اگر ہم اسے چھوڑتے تو وہ ہمیں نہیں چھوڑتا۔“

”ٹھیک ہے لیکن اس کے گھر والوں کا..... ان بے گناہ عورتوں کا کوئی قصور نہیں تھا ان کے ساتھ جو ہوا اس میں تم برابر کے شریک ہو۔“ میرے لہجے سے اسلم خوف زدہ ہو گیا۔

”دیکھو ان کے ساتھ جو ہوا وہ مرشد کے حکم سے ہوا تھا۔“

”چپ کر کتے.....“ عبدل نے منہ دبائے دبائے کہا۔

”میرا خیال ہے پہلے تمہارا منہ بند کرنا ہو گا۔“ میں نے عبدل کی طرف دیکھا۔ ”تمہیں مرشد سے وفاداری کا بخار چڑھا ہوا ہے لیکن جلد یہ بخار اتر جائے گا۔“ میں نے اسلم کی طرف دیکھا۔ ”تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ صابر کے گھر والوں کے ساتھ جو ہوا اس میں تمہارا قصور نہیں تھا۔“

اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”ہمارا قصور صرف اتنا ہے کہ ہم مرشد کے آدمیوں کو صابر کے گھر

لے گئے تھے۔“

اس بار میں نے اسلم کو لات ماری تھی۔ وہ لڑھکا اور جلدی سے سیدھا ہوا گیا۔ ”میں کچ کتہ رہا ہوں۔“ میں نے دوبارہ لات مار کر اسے لڑھکا دیا۔ ”صابر اور اس کی بیٹی شازیہ ہمارے پاس ہے بھی وہ ٹھیک نہیں ہے لیکن جلد اس کی حالت سدھر جائے گی اور وہ تم دونوں کے بارے سب بتائے گی۔“

میری بات سن کر ان کے چہرے پر زرد پڑ گئے تھے۔ میں بے مات جاری رکھی۔ ”جب میں اس لڑکی کے الزامات سن کر آؤں گا تو تم لوگ اپنی صفائی تیار رکھنا دوسری صورت میں اس تہہ خانے سے صرف مہاسا وحش باہر جا سکیں گی جسم بیہوش زمین کھود کر دفن کر دیئے جائیں گے تم سے پہلے بھی بہت سارے بیہوش دفن کیے گئے ہیں۔“

ان کو ہمکنی دے کر میں بیٹو کے ساتھ باہر آیا۔ ان لوگوں نے چائے تیار کر لی تھی اس لیے اب اس کے ہمیں روک لیا چائے پی کر ہم روانہ ہوئے۔ اس دوران میں ان لوگوں نے جیپ کا پیچھا حصہ صاف کر دیا تھا جہاں عبدل اور اسلم کا خون گرا تھا۔ بیٹو کو یہ جگہ اچھی لگی تھی وہ ویسے بھی جنگجو اور ویرانوں کا پرورہ تھا۔ اس شہری زندگی کا عادی ہو گیا تھا لیکن اسے اچھے دیرانے ہی لگتے تھے اس نے راستے میں کہا۔ ”تو بی بھائی ہم یہاں آ جاتا ہے دشمن کی نظر سے بھی بچے گا۔“

”یہ جگہ اچھی ہے لیکن شہر سے دور ہے اگر ہمیں فوری کام ہو تو یہ جگہ گنیمت ہے۔“ میں کسی ٹیک ٹھکانے تک محدود نہیں رہنا چاہنے۔ دو تین ٹھکانے تیار رہنے چاہیں تاکہ کسی ایک جگہ سے ہمارے نوٹس نہ ہٹ جائے۔“

”عبداللہ بھائی کی کوٹھی کے ساتھ ایک فارم پاس اور ایک چھوٹی جگہ پاس ہے۔“ میں جگہ دیکھا ہے۔

”ایک جگہ ہمیں اور لینی چاہیے جو اسلام آباد کی ہڈی و نور کے پاس ہے۔“ کوٹھ مرشد نے اشارہ کیا کہ ان ہی جگہوں پر ہیں۔ عبداللہ کی کوٹھی اب اس کام کے لیے مناسب نہیں ہے اس کے پاس کوٹھ مرشد کے خانہ سمیت ہمارے تمام دشمن جانتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی جگہ مونی چاہیے۔“

”آپ ٹھیک بولا ایک جگہ اور ہونا چاہیے۔“

ہم ایک گھنٹے بعد فارم ہاؤس پہنچے۔ شام کا وقت تک صبح غروب ہونے کے قریب تھا۔ سارا دن بادل اور وقفے وقفے سے بارش کے بعد اب مطلع صاف ہو گیا تھا۔ اگر موسم صبح تک ایسا ہی رہتا تو سفیر مونا اور سعد یہ جا سکتے تھے۔ عبداللہ بھی آیا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ”کیا حال ہیں شہباز صاحب، میں نے ابھی بات کی ہے حل صبح اچھے موسم کا امکان ہے اس لیے ہیلی کاپٹر جائے گا۔“

”گڈ یہ اچھی خبر سنائی ہے تم نے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اتار تے ہوئے کہا۔ سفیر چپ بیٹھا تھا ظاہر ہے وہ ہم سے دور جانے کے خیال سے آ زردہ تھا۔ عبداللہ نے کہا۔

”ایک اچھی خبر اور بھی ہے۔ نادر کا سراغ مل گیا ہے۔“

میں چونک کر سیدھا ہو گیا۔ ”نادر۔ کہاں ہے؟“

”بالکل ان سے کام کی باتیں اگلو کر ان کا پارسل بنا کر مرشد کو بھیج دیں گے۔ وہ جیسے چاہے ان کا کرم کرے۔“

عبداللہ اور وسیم کل کے منصوبے کے لیے تبادلہ خیال کرنے لگے اور میں ادھر آیا۔ کئی دن سے میری سو سے بات نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اس کا موبائل نمبر ملایا۔ اس نے فوراً کال ریسیو کی اور دھڑکتے لہجے میں بولی ”ہیلو..... کون؟“

”بوجھ تو جانیں۔“ میں نے جان کو آواز بدلی لیکن اس نے پہچان لیا۔
 ”آپ۔“ وہ کھل اٹھی تھی۔ ”کتنی لمبی عمر ہے آپ کی ابھی میں آپ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔“
 میں نے شرارت سے کہا۔ ”اچھا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میرے بارے میں نہ سوچ رہی ہو؟“
 وہ ایک لمحے کو چپ ہوئی۔ ”ہاں یہ تو میں نے خیال ہی نہیں کیا میرا شاید ہی کوئی بل آپ کی سوچ سے خالی جاتا ہو۔“

”اور یہاں جب فرصت ملتی ہے صرف تمہارا ہی خیال آتا ہے۔“
 ”شہباز میں آپ کے بارے میں بہت سوچتی ہوں اور بہت دعا مانگتی ہوں اس کے باوجود میرا دل ڈرتا ہے۔“

”اپنے دل کو سمجھاؤ.....“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”جو میرے نصیب میں لکھا ہے اس سے زیادہ اس سے کم کچھ نہیں ہوگا۔“

”میں کیا کروں..... اندر سے کمزور ہوں۔“ وہ رودی۔ ”شہباز کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم دونوں سب چھوڑ کر یہاں سے کہیں دور چلے جائیں۔“
 ”بس ہم دونوں.....؟“ میں نے کہا تو وہ چپ ہو گئی کیونکہ وہ سمجھ گئی تھی کہ میرا کیا مطلب ہے۔ اس نے سرد آہ بھری۔

”ٹھیک کہا آپ نے معاملہ صرف ہم دونوں کا نہیں ہے میں شاید خود غرض ہو کر سوچنے لگی ہوں۔“
 ”اس میں تمہارا قصور نہیں ہے ہم سب ایک ایسی دلدل میں پھنس گئے ہیں جس سے نکلنا چاہتے ہیں لیکن نکلنے کا کوئی راستہ بھائی نہیں دے رہا ہے بس اللہ ہی ہماری مدد کرنے والا ہے۔“

”مجھے اللہ سے امید ہے وہ ہمارے لیے بہتر کرے گا۔“ سویرا بولی اس نے زبردستی لہجہ شکفتہ کر لیا تھا۔
 ”آپ بھی کیا سوچتے ہوں گے جب مجھ سے بات کرتے ہیں میں رو دیتی ہوں۔“
 ”میں یہی سوچ کر کال کرتا ہوں کیونکہ تم کسی اور سامنے نہیں رو سکتی ہو صرف میرے سامنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی ہو۔“

”آپ مجھے اتنا جانتے ہیں؟“ اس نے کسی قدر تعجب سے کہا۔
 ”ہاں ایسے جیسے میں خود کو جانتا ہوں۔“ میں نے یقین سے کہا۔ ”ایسے ہی تم کو جانتا ہوں۔“
 ”آپ ٹھیک ہیں نا اپنا خیال رکھتے ہیں؟“ اس نے شرما کو موضوع بدل دیا۔ ”آپ کی صحت کیسی ہے؟“
 ”ہاں رکھتا ہوں تمہاری خاطر اور صحت بدلنے سے بہتر ہو رہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کل جو ملی میں دو

”سیٹلائٹ ٹاؤن پنڈی کی ایک کوٹھی میں ہے۔ اتفاق سے میرے آدمیوں نے اسے ایک فزیو تھراپی سینٹر سے روانہ ہوتے دیکھ لیا وہاں اپنا چیک آپ کرانے آیا تھا۔ میرے آدمیوں نے اس کا چچھا کیا اور اس کے ٹھکانے کا پتا چلا لیا۔“
 ”کوٹھی کس کی ہے؟“

”کسی شمس اللہ قادری کی ہے۔“ عبداللہ نے بتایا۔ ”دیکھنے میں بہ ظاہر عامی اور بغیر کسی حفاظتی انتظام کے لگتی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے نادر وہاں چھپ کر رہا ہے۔“
 ”ہاں فزیو تھراپی سینٹر میں بھی اس کے ساتھ صرف ایک ڈرائیور اور ایک ملازم ٹائپ شخص تھا جو اسے سنبھال رہا تھا۔ ان دونوں میں سے کوئی محافظ نہیں لگ رہا تھا۔“
 ”کیا نادر کی مالی حالت اتنی خراب ہو گئی ہے کہ اب وہ محافظ بھی نہیں رکھ سکتا ہے۔“
 ”ممکن ہے اس کے پاس رقم نہ ہو مرشد نے اس سے سب چھین لیا ہو۔“ وسیم نے کہا۔ ”ہمارے آدمی کوٹھی کی نگرانی کر رہے ہیں۔“

”ٹھیک ہے نگرانی جاری رکھو اور اگر ممکن نظر آئے تو نادر کو ابھی اٹھا کر حویلی کے تہ خانے میں پہنچا دو۔“
 میں نے کہا اور پھر وسیم سے پوچھا۔ ”صابر اور اس کی لڑکی کی حالت کیسی ہے؟“
 ”ابھی تو ٹھیک ہے۔“ وسیم نے افسوس سے سر ہلایا۔ ”لیکن اس بے چاری کے ساتھ برا ہوا ہے۔“
 ”وہ تو میں اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا۔“

”لیڈی ڈاکٹر جس نے اس کا معائنہ کیا ہے اس کا کہنا ہے کہ اسے کئی افراد نے زیادتی کا نشانہ بنایا ہے اور اسے بھرپور توجہ اور نفسیاتی ٹرینٹ منٹ کی ضرورت ہے ورنہ وہ خودکشی بھی کر سکتی ہے۔“
 ”ہم یہ دونوں چیزیں اسے نہیں دے سکتے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”اس کا باپ ساتھ ہے شاید وہ اسے سنبھال لے۔ لیڈی ڈاکٹر نے کوئی مسئلہ تو کھڑا نہیں کیا؟“

”نہیں وہ سمجھدار تھی اسے معلوم تھا پولیس تک کیس لے جانے کی صورت میں اسے بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ویسے باپ سے زیادہ ایسے سوا قہوں پر ماں کام آتی ہے لیکن وہ بھی دنیا سے جا چکی ہے۔“
 ”یہ کیسے بچ گئی..... جب کہ اس کی ماں اور بہن کو وہ مار کر گئے تھے؟“

وسیم نے وضاحت کی۔ ”لڑکی کا کہنا ہے اس پر عبدال نے گولی چلائی تھی لیکن نشانہ خطا گیا اور گولی اس کے پہلو کے پاس سے گزر کر زمین پر لگی تھی۔“ عبدال سمجھا گولی نشانے پر لگی ہے اس نے چیک نہیں کیا اور اسی وجہ سے شازیہ کی جان بچ گئی اس کا کہنا ہے کہ اس کی ماں اور چھوٹی بہن کو بھی عبدال نے گولی ماری تھی۔ ان ماں بیٹیوں کی بے حرمتی میں عبدال اور اسلم برابر کے شریک تھے۔“

”ایسا لگتا ہے وہ صابر سے کسی بات پر پہلے سے خار کھائے بیٹھا تھا اسے موقع ملا تو اس نے بدلہ لے لیا۔“
 ”ہم کو بھی ایسا ہی لگتا ہے۔“ بیتہ بولا۔ ”کیسا اکڑ رہا تھا کتے کا بچہ۔“
 ”یہ دونوں قاتل اور مجرم ہیں ان کے لیے کوئی معافی نہیں ہے۔“ وسیم نے کہا تو میں نے اس کی تائید کی۔

جب کہ کچھ دیر پہلے میں ایک بڑی کامیابی حاصل کرنے کے باوجود اندر سے ٹینس اور فکر مند تھا۔ آدھے پون گھنٹے کے لیے میرا ماحول بدل گیا تھا اور میں حویلی پہنچ گیا تھا۔ میں نے صابر کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ ان دونوں باپ بیٹی کو ایک کمرہ دے دیا گیا تھا۔ صابر نے دروازہ کھولا۔ اس کے سر پر دو جگہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں جہاں عبدال اسلم نے ضربیں لگائی تھیں لیکن نہ ہوا کر اور کپڑے بدل کر وہ بہتر لگ رہا تھا۔ ”مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“ میں نے کہا تو اس نے بیڈ پر سوتی شاز یہ کو دیکھا۔ ”اس کی حالت کیسی ہے؟“

”بہتر ہے ڈاکٹر نے اسے چند دن مکمل آرام کرنے اور دواؤں کے زیر اثر رکھنے کا مشورہ دیا ہے۔“ اس نے کہا اور ہر گھنٹہ آیا۔ اوپری منزل پر بھی ایک چھوٹا سا لاؤنج تھا ہم وہیں آ گئے۔ ”کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔“ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ”مرشد کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

اس کا چہرہ تن گیا۔ ”اگر مجھے اپنی زندگی دس بار قربان کر کے ایک بار اسے مارنے کا موقع ملے تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔“

”کیا تم اسے اتنا آسان سمجھتے ہو؟“

”نہیں میں جانتا ہوں وہ درجنوں مسلح اور چوکس محافظوں کے حصار میں رہتا ہے اور کوئی شخص اس کے قریب بھی نہیں پہنچ سکتا ہے لیکن میں اب تک سمجھ نہیں سکا ہوں کہ اس سے تمہاری کیا دشمنی ہے۔“

”پرانی دشمنی نہیں ہے یہ سال پرانا قصہ بھی نہیں ہے میرا نام ملک شہباز ہے۔“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ”تم..... شہباز ہو..... میرے خدا..... تمہیں مرشد کے سارے دشمن اور دوست جانتے ہیں۔“

”ہاں میں وہی شہباز ہوں۔ وہ مجھے اپنے بھائی نادر کی معذوری کا سبب سمجھتا ہے اور وہ میرے بھائی میجر شاہد کا قاتل ہے لیکن تم مجھے کیسے جانتے ہو؟“

”تم یوں مشہور ہو کہ مرشد تم پر قابو نہیں پاسکا۔ اس نے تمہارے ہاتھوں نقصان اٹھائے ہیں۔ ورنہ اس علاقے میں کوئی اس سے دشمنی کر کے رہ نہیں سکتا ہے۔“

”تمہارے گھر والوں کے ساتھ جو ہوا مجھے اس کا افسوس ہے میں نے تمہارے دو مجرم پکڑ لیے ہیں فی الحال میں ان سے مرشد کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہا ہوں۔“

”تم انہیں میرے حوالے کر سکتے ہو؟“ اس نے بے چینی سے پوچھا۔

”ہاں لیکن بدلے میں مجھے تم سے کیا ملے گا؟“

”دیکھو میں تمہارے کام آ سکتا ہوں جیسے میں نے خانقاہ میں جانے والے خفیہ راستے کے بارے میں بتایا اس طرح میں مرشد کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں۔“

”اس کے بارے میں، نہیں خود بھی بہت کچھ جانتا ہوں مجھے مہر کی تلاش میں تمہاری مدد درکار ہے۔“

”اگر تم مرشد کے خلاف میری مدد کرو تو میں اس عورت کی تلاش میں زمین آسمان ایک کر دوں گا۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”بھول جاؤ کہ اب تم کبھی آزادانہ کچھ کر سکو گے میرا تو مشورہ ہے تم اپنی بیٹی کو

نوا میں سہی سعد۔ ورمونا کا اضافہ ہو جائے گا، سفیر بھی وہیں آکر رہے گا۔ سفیر اور مونا کے لیے ایک کمرہ سیٹ کر دو۔“

”سچ میں۔“ اس نے خوشی سے کہا۔

”ماں میں نے سوچا ہے کہ ان خواتین کی وہاں زیادہ بہتر حفاظت ہو سکے گی۔ مونا امید سے ہے اسے دیکھ بھال، آرام اور بہترین غذا کی ضرورت ہے۔“

”اچھا اس لیے سفیر بھائی بھی آرہے ہیں۔“

”ہاں، بابا کیا کر رہے ہیں؟“

”بابا آج کل مصروف رہتے ہیں پیچھے کی طرف جو زمین لی ہے اس کو ہموار کرا لیا ہے اور اس پر کچھ کاشت

کار بھی بٹھا دیئے ہیں وہ اپنے کچے کیے مکان بنارہے ہیں۔“

”وہ صرف کاشت کار ہیں؟“

”نہیں وہ سب فوج سے ریٹائر ہیں اور ان کے پاس اسلحے کا لائسنس بھی ہے وہ پیچھے کی طرف سے حویلی حفاظت بھی کریں گے۔“ سویرا نے تفصیل سے ان کے بارے میں بتایا۔ ”حویلی کی حفاظت کے لیے اب چھ آدمی ہیں۔“

میرا اندازہ تھا کہ ان سارے انتظامات پر ہر مہینے لاکھ سے زیادہ ہی خرچ آ رہا ہوگا۔ بابا دولت مند تھے لیکن اتنا خرچ کرنا ان کے لیے بھی ذرا مشکل ہی تھا۔ میں نے سویرا سے اس بارے میں پوچھا تو وہ بولی۔ ”نہیں بابا کے پاس رقم ہے آپ جانتے ہیں وہ کھل کر خرچ کرتے ہیں لیکن فضول خرچی اور بے جا نمائش سے جڑتے ہیں اس لیے ان کی آمدنی ہمیشہ خرچ سے زیادہ رہی ہے میں نے بھی بابا سے یہی بات کہی تھی۔ اپنی زمین اور دولت بابا کو پیش کی تھی۔“

”پھر جھاڑ کھائی ہوگی؟“

”ایسی ویسی..... سچ میں مزہ آ گیا تھا۔ بابا نے زندگی میں پہلی بار مجھ پر غصہ کیا۔ بہر حال جب ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ ان کے پاس رقم ہے۔ انہوں نے بینک اسٹیٹمنٹ بھرا دکھائی تھیں۔“

میں نے سکون کا سانس لیا۔ ”یہ اچھی بات ہے میں نے سوچا ہے جہاں میں رہنس کر رہا تھا۔ وہ جگہ سچ دیتا ہوں رہنس تو ختم ہو گیا لیکن جگہ کی قیمت مل جائے گی۔“

”بالکل نہیں۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”جب حالات ٹھیک ہوں گے اور ہم دوبارہ نائل لائف کی طرف آئیں گے تب ہم اسی جگہ سے دوبارہ کام شروع کریں گے۔“

اس نے واضح کیے بغیر بھی واضح کر دیا تھا کہ وہ اس زندگی میں میرا ساتھ دے گی۔ سویرا کے بعد میں نے ماں جی سے بات کی سردی کم ہونے سے ان کے جوڑوں کا درد بھی کم ہوا تھا۔ بھائی جان ان کے لیے ایک مساج مشین لائے تھے جس سے انہیں بہت فائدہ ہوا تھا اور ان کی یہ سردیاں سکون سے گزری تھیں۔ ماں جی کے بعد بابا سے بات ہوئی۔ انہوں نے میرے فیصلے سے مکمل اتفاق کیا کہ خواتین کو حویلی منتقل کر دینا چاہیے۔ آپا اور ششی نے مختصر بات کے بعد میں نے ان دنوں بند کیا تو اپنی کیفیت پر حیران رہ گیا میں اندر سے بہت خوش اور ہنس مٹا تھا۔

”تم نے کونسی کیوں تباہ کی؟“

”وہاں کوئی ایسا ریکارڈنگ سسٹم تھا جو آوازیں ریکارڈ کرتا ہے اور ہمارے پاس وقت نہیں تھا اسے تلاش کرنے کا اس لیے کونسی میں آگ لگا دی مگر ہوا یہ کہ کونسی میں بڑی مقدار میں گولہ بارود بھی تھا آگ اس تک پہنچی اور پوری کونسی دھماکے سے تباہ ہو گئی۔“

”وہ مرشد کا بہت اہم ٹھکانہ تھا اس کی تباہی نے اسے دیوانہ کر دیا ہوگا۔“ اس نے کہا۔ ”میری بیوی اور بیٹی اسی دیوانگی کی بجھت چڑھ گئی۔“

میں اس سے کہہ نہیں سکا کہ یہ مکافات عمل تھا۔ اس نے جو بویا تھا اسے وہی کاٹنا پڑا تھا لیکن میں دل آزاری نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ صابر اس صدمے سے سنبھل گیا ہے اور وہ کسی فکر میں ہے۔ شروع میں اس کے لہجے میں مرشد کے لیے جو آتش فشاں تھی وہ اب باقی نہیں رہی تھی۔ شاید اس نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ مرشد کے مقابلے میں بہت معمولی حیثیت کا بد معاش تھا جو نقصان ہو چکا تھا وہ اس سے زیادہ نقصان نہیں چاہتا تھا اور اس کی بہترین صورت یہ تھی کہ وہ مرشد سے دور رہے اس سے انتقام کا چکر بھول جائے۔ ابھی وہ مجھ سے مرشد سے بدلہ لینے کے صلے میں تعاون کی بات کر رہا تھا تو مجھے اس کا لہجہ مصنوعی لگا تھا۔ اس کے انداز میں تبدیلی نے مجھے چونکا دیا تھا۔

”ابھی تو تم کچھ دن آرام کرو اس کے بعد سوچنا کہ تم نے کیا کرنا ہے۔“

”کیا میں باہر جا سکتا ہوں؟“ اس نے بہ ظاہر سرسری انداز میں پوچھا

میں نے انکار کر دیا۔ ”نہیں ابھی مرشد کے آدمی پاگلوں کی طرح پورے شہر میں تمہیں تلاش کر رہے ہوں گے تمہارا اور شاہیہ کا باہر جانا ٹھیک نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“

میں کھڑا ہو گیا۔ ”اب تم آرام کرو لیکن بلا ضرورت کمرے سے باہر آنے کی کوشش مت کرنا جس چیز کی ضرورت ہو وہ مہیا کر دی جائے گی۔“

”میں اس پناہ کے لیے تمہارا شکر گزار ہوں۔“ اس نے جیسے سوچ کر کہا۔ ”تم نے میرے لیے جو کیا ہے وہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔“

اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔ میں نے اس کے لیے کیا کیا تھا کیا وہ اپنے گھر کی تباہی کے حوالے سے یہ بات کر رہا تھا مجھے اس کا ذمے دار قرار دے رہا تھا۔ یک لخت میں نے محسوس کیا کہ اسے یہاں لانا میری غلطی تھی اس کے بجائے دسیم اسے شہر سے باہر کہیں چھوڑ آتا جہاں وہ جان بچانے کے لیے مرشد سے دور جا سکتے تھے۔ اب وہ ہمارا یہ ٹھکانہ دیکھ چکا تھا بے شک اسے اس کے درست محل وقوع کا علم نہیں تھا لیکن ایک بار وہ یہاں سے نکل جاتا تو اس کے لیے فارم ہاؤس کی لوکیشن دیکھنا مشکل نہیں ہوتا۔ میں اسے کمرے تک لایا اور جب اس نے اندر سے دروازہ بند کیا تو میں نے باہر سے بھی کنڈی لگا دی۔ کنڈی میں نے بلند آواز کے ساتھ لگائی تھی تاکہ اسے بھی پتا چل جائے۔ فوراً ہی اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی اور ناکامی پر پلٹا۔

”شہباز یہ کیا حرکت ہے؟“

لے کر یہاں سے نکل جاؤ بلکہ ملک سے بھی باہر چلے جاؤ۔“

”تب میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

”تمہارے پاس مہر دے متعلق جو بھی معلومات ہوں وہ مجھے دے دو باقی میں خود دیکھ لوں گا۔“

اس نے کچھ دیر بعد پوچھا۔ ”تمہیں اس عورت کی تلاش کیوں ہے؟“

”یہ میں تمہیں نہیں بتا سکتا ہوں۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ”یوں سمجھ لو کہ میں اسے مرشد کی گرفت میں آنے سے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”میں اس کے بارے میں جو جانتا تھا وہ تمہیں بتا چکا ہوں ہاں اگر تم چاہو تو میں خود کشمیر تک جا کے اسے تلاش کر سکتا ہوں وہاں میرے روابط ہیں یہ کام میرے لیے آسان ہے۔“

اس کی بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اگر وہ مہر دے کی تلاش کا ذمہ اٹھا لیتا تو میں اپنی توجہ دوسرے کاموں کی طرف لگا سکتا تھا۔ مگر اس کی شرط تھی کہ میں مرشد کے خلاف اس کا ساتھ دوں۔“

”تم مرشد کے خلاف کس قسم کی مدد چاہتے ہو؟“

”میں اسے فائدہ دینا چاہتا ہوں۔“ اس نے شعلہ فشاں لہجے میں کہا۔ ”اس کے لیے مجھے اپنی جان بھی دینا پڑے تو میں اسے سنا سو دیکھوں گا۔“

”تم جانتے ہو یہ کام آسان نہیں ہے دوسرے میں انتقام برائے انتقام کا قاتل نہیں ہوں۔ مرشد میرے بھائی کا قاتل ہے اور ایک بار موقع آیا جب میں دنیا سے اس کا وجود مٹا سکتا تھا لیکن میں نے ایسا کرنے سے گریز کیا۔“

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ”جب تمہیں موقع ملا تھا تو تم نے اس کا فائدہ کیوں نہیں اٹھایا۔“

”میں نے کہا تھا میں صرف انتقام لینے کا قاتل نہیں ہوں۔ میں کوئی مجرم یا پیشہ ور قاتل بھی نہیں ہوں جو لوگوں کو قتل کرتا پھروں۔“

اس نے کسی قدر مایوسی سے کہا۔ ”پھر مرشد کے خلاف تمہاری اس جدوجہد کا فائدہ..... تم اسے موقع دیتے رہو گے لیکن جب اسے موقع ملا تو وہ ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرے گا۔“

میں مسکرایا۔ ”ایسا نہیں ہے میں بھی کئی بار مرشد کی گرفت میں آیا لیکن وہ مجھے رعایت دینے پر مجبور ہوا ہمارے درمیان کچھ اس قسم کی دشمنی ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کی جان لینے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تم اس بات کو نہیں سمجھو گے۔ بہر حال اگر تم مرشد کو خود کش انداز میں ہلاک کر کے اپنے گھر والوں کا بدلہ لینا چاہتے ہو تو میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“

”تب تم مجھے بے کار میں یہاں لائے۔“ وہ مایوسی سے بولا۔

”نہیں بے کار میں تو نہیں لایا میں تمہیں مرشد کے ہاتھوں جانے سے بچانا چاہتا ہوں مجھے اندازہ تھا کہ تم جذباتی ہو کر اس کا رخ کرو گے اور انجام کار پکڑے جاؤ گے یا مارے جاؤ گے اگر پکڑے گئے تو میرا نام بھی لے دو گے اس طرح مرشد کو پتا چل جائے کہ کالی کونسی کی تباہی میرے ہاتھوں ہوئی ہے اور فی الحال میں ایسا نہیں چاہتا۔“

علحدگی کا اعلان کرتے ہوئے ایک سیاسی جماعت میں شمولیت اختیار کر لی تھی وہ ابھی تک آزاد امیدوار کی حیثیت سے سیاست کے میدان میں تھا لیکن اس نے آنے والی سیاست کا رخ بھانپتے ہوئے یہ چال چلی تھی۔ مرشد نے کوئی نیا کام نہیں کیا تھا ہمارے اکثر سیاست دان ساری عمر یہی ڈھائی گھر کی چال چلتے رہتے ہیں تاکہ ان کا سفر اقتدار کی سڑک پر رہے اور وہ اپوزیشن کی صفوں سے بچ سکیں۔ بہر حال یہ ایک اچھی خبر بھی تھی کیونکہ اب مرشد حکومت کی چھتری سے محروم ہو گیا تھا اگرچہ اس سے اس کی ذاتی قوت اور اثر و رسوخ پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا کیونکہ یہ سب اس کے پاس جڑی پھٹی تھا۔ اس نے اس میں مزید اضافہ کیا تھا۔

”یہ حرا مزادہ اب پٹری بدل کر اس پارٹی میں آ گیا جس کے آنے والے الیکشن جیتنے کے امکانات روشن ہیں۔“

”ظاہری بات ہے پارٹی کو بھی جیتنے والے امیدوار چاہئیں اور اپنے علاقے سے مرشد کی سیٹ چکی ہے۔ بلکہ وہ دو صوبائی نشستیں بھی حاصل کر سکتا ہے۔“

وسیم نے میری طرف دیکھا۔ ”یہ وقت آنے سے پہلے ہمیں مرشد کے خلاف کچھ کرنا ہوگا ورنہ وہ مزید طاقتور اور مزید بے لگام ہو جائے گا۔ اس کی کامیابی ہماری ناکامی ہوگی۔“

”وسیم ہمیں مرشد کے خاندان کے دوسرے لوگوں سے بھی رابطہ کرنا چاہیے جو اندر ہی اندر اس کے خلاف ہیں لیکن گدی اس کے قبضے میں ہونے کی وجہ سے اس کے خلاف کچھ کرنے سے قاصر ہیں۔“

”یہ اچھا آئیڈیا ہے۔“ وسیم بولا۔ ”مرشد کے خاندان کے دوسرے لوگوں تک ہماری رہنمائی کرنے والا فرد بھی ہمارے پاس موجود ہے۔“

”رائٹ۔“ میں نے چٹکی بجاتی۔ ”صابر سے زیادہ اچھی طرح اس خاندان کو اور کون جانتا ہوگا۔“

”لیکن اگر اس کا ذہن پھر چکا ہے تو وہ اتنی آسانی سے نہیں بتائے گا۔ بلکہ ممکن ہے ہمیں گم راہ کرنے کی کوشش کرے۔“

”ہم اتنی آسانی سے گمراہ ہونے والے لوگ نہیں ہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”بہر حال ان سارے مسائل سے سفیر اور خواتین کی روانگی کے بعد نمٹیں گے۔ صبح کا کیا پروگرام ہے؟“

”صبح چھ بجے عبداللہ فلائٹ کا وقت کنفرم کرے گا اور اس کے فوراً بعد وہ کوشی سے روانہ ہوگا۔ میں یہاں سے پہلے ہی بیچ جاؤں گا اور میرے آدمی اس سے بھی پہلے ایئر کلب کے آس پاس موجود ہوں گے کوئی مشکوک فرد ان کی نظروں سے بچ نہیں سکے گا۔“

یہ حفاظتی انتظامات ٹھیک تھے لیکن میرا دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ پہلے طے ہوا تھا کہ میں نہیں جاؤں گا۔ دوپہر کا کھانا اچھا خاصا بچا ہوا تھا رات کو بھی وہی گرم کر کے چلایا۔ کھانے کے دوران میں نے فیصلہ کر لیا۔ ”صبح میں بھی چلوں گا۔“

”مرضی آپ کی لیکن یہاں پیچھے کون رہے گا؟“

”بیٹو ہوگا۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو وہ سنبھال لے گا۔ وہ اپنے ساتھ مانی کی حفاظت بھی کر سکتا ہے۔“

”یہ ہماری حفاظت کے لیے ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ابھی ہمیں آرام کی ضرورت ہے اس لیے آرام کرو۔“

اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے بغیر نیچے آ گیا۔ عبداللہ سفیر کو لے کر جا چکا تھا۔ وسیم فی وی دیکھ رہا تھا اس نے میری طرف دیکھا۔ ”کیا کہہ رہا ہے صابر۔۔۔۔۔“

میں اس کے پاس صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ ”مجھے اس کی نیت میں فوراً نظر آ رہا ہے۔“

”مجھے بھی محسوس ہوا ہے اپنے گھر میں جب وہ صدمے میں تھا تو سچ مچ مرشد کے خلاف بول رہا تھا لیکن یہاں آنے کے بعد مجھے لگا جیسے اس کا لہجہ مصنوعی ہو گیا ہے اور وہ صرف ہمیں سنانے کے لیے مرشد کے خلاف بات کر رہا ہے۔“

”یہی چیز میں نے بھی محسوس کی اور اسے کمرے میں بند کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ مرشد سے ڈر گیا ہے اور اب اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا لیکن یہ بات ہمیں کہتے ہوئے ڈرتا ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ اسے آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ بیٹی کو لے کر کہیں بھاگ جائے گا؟“

”ہو سکتا ہے لیکن اس کا بھی امکان ہے کہ وہ اسے ہمارا کیا دھرا سمجھ کر مرشد کے پاس دست بستہ حاضر ہو جائے۔“

”ہمارا کیا دھرا۔۔۔۔۔؟“

”مطلب کہ ہماری وجہ سے مرشد نے یہ کارروائی کی ہے اس لیے وہ ہمیں قصور وار سمجھ رہا ہے۔“

وسیم نے سر ہلایا۔ ”اگر اس نے یہ حماقت کی تو مرشد کا کام آسان ہو جائے گا وہ اس کی بیٹی کو تو زندہ رکھے گا اور اسے اپنے جلا دوں کے حوالے کر دے گا۔“

”ابھی اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی ہے۔ ایک خطرہ اور ہے وہ مرشد کو ہمارے بارے میں بھی بتا دے گا تاکہ مرشد اسے معاف کر دے۔“

”تب یہ بات یقینی ہے وہ زیادہ سے زیادہ نمبر بنانے کی کوشش کرے گا۔“

”اس لیے ابھی اسے قید رکھنا ہے کل ان لوگوں کی روانگی کے بعد اس کا فیصلہ کریں گے۔“ میں نے کہا۔

”میں نے سوچا ہے کہ ہمیں ایک ایسا ٹھکانہ مزید تلاش کرنا چاہیے جو چنڈی اور اسلام آباد کے نزدیک ہو اور ہم وہاں سے با آسانی ہرجگہ جاسکیں۔“

”مل جائے گا۔“ وسیم نے کہا۔ ”کیا اسے مرشد کے خلاف استعمال کریں گے؟“

”ہاں اس کے سارے ٹھکانے ان دونوں شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ صابر نے خانقاہ مرشدیہ کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں ہم ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔“

وسیم فکر مند ہو گیا۔ ”کیا ہم اتنے بڑے اڈے میں گھس کر کوئی کارروائی کر سکیں گے؟“

”کوشش کی جاسکتی ہے ہمیں اسے سبوتاژ کرنا ہے اس لیے اندر گھس کر مارو اور بھاگو والی پالیسی پر عمل کریں گے۔ مرشد کے لیے یہ بہت بڑا دھچکا ہوگا کیونکہ یہ اڈہ اس کا مرکزی مقام ہے۔“

فی وی پر ہیڈ لائن آنے لگیں۔ مرشد کا مام آیا تو ہم چوکنے لگے تھے۔ خبر کے مطابق مرشد نے حکومت سے

”تب ٹھیک ہے۔“ دیم نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ”صبح جلدی اٹھنا ہے اور فریش ہونا ہے اس لیے میری طرف سے گڈ نائٹ۔“

”گڈ نائٹ۔“



کھانے کے بعد میں چہل قدمی کرنے باہر نکل آیا۔ بارش کے بعد سردی میں دوبارہ شدت آگئی تھی لیکن یہ اچھی لگ رہی تھی۔ بیٹو اور مانی اسٹڈی میں گھسے نہ جانے کیا کر رہے تھے انہوں نے کھانا بھی پہلے ہی کھا لیا تھا۔ بیٹو نے صابر اور شاز سے کو اوپر کھانا پہنچا دیا تھا سب کو پتا چل گیا تھا کہ اب ان کی حیثیت قیدی کی سی ہے۔ کل مونا اور سعد یہ جولی چلی جاتیں اور اس کے بعد نہ جانے ان سے کب ملاقات ہوتی مجھے خیال آیا کہ میں ابھی جا کر ان سے مل لوں لیکن یہ احتیاط کے خلاف ہوتا۔ عبداللہ کی کوٹھی ہمارے تمام دشمنوں کی نگاہ میں آچکی تھی۔ خود عبداللہ بہت احتیاط سے وہاں آمد و رفت کرتا تھا۔ اگر کوٹھی کی نگرانی ہو رہی تھی تو یقیناً نئے آنے جانے والوں پر نظر رکھی جاتی ہوگی۔ اس کا بھی امکان تھا کہ مرشد یا فتح خان کے آدمی صرف میرے لئے وہاں نظر رکھے ہوئے ہوں جیسے ہی میں نظر میں آؤں وہ حرکت میں آجائیں۔

کچھ دیر بعد میں اندر آیا وقت گزاری کے لیے ٹی وی کھول لیا مگر اس میں بھی ہر جگہ سے یوریت زدہ پروگرام آرہے تھے۔ اس لیے ٹی وی بند کر کے اخبار اٹھالیا۔ سفیر روز باہر سے آتے ہوئے تازہ اخبارات لیتا آتا تھا۔ آج وہ اردو کا ایک معروف اخبار لایا تھا۔ اتفاق سے اتوار کا دن تھا اس لیے ایڈیشن بڑا تھا۔ میں نے ذرا دیر میں سارا اخبار دیکھ لیا۔ پھر اشتہارات والا حصہ دیکھنے لگا۔ اچانک ہی مکانات اور جائیداد والے حصے میں ایک اشتہار نے میری توجہ حاصل کر لی۔ یہ راول چوک سے آگے مین مری روڈ پر کسی مکان کو کرائے پر دینے کا اشتہار تھا مالک باہر جا رہا تھا اور کوٹھی کو مکمل فرش حالت میں سال بھر کے لیے کرائے پر دے رہا تھا۔ کرایہ پچاس ہزار روپے ماہانہ تھا اور پورے سال کا کرایہ ایڈوائس دینا تھا یعنی چھ لاکھ روپے اور چار لاکھ سیکورٹی تھی یعنی دس لاکھ روپے ادا کرنے تھے۔

ایک کنال پر بنی اس کوٹھی میں دو منزلہ عمارت تھی جس میں اوپر تین بیڈروم بیچ باجھ کے ساتھ۔ نیچے ایک بیڈروم، ایک ڈرائنگ اور ایک ڈائینگ روم تھا۔ کچن ایک ہی تھا۔ آگے اور پیچھے مختصر لان بھی تھے۔ پورچ میں دو سے تین گاڑیاں کھڑی کرنے کی گنجائش تھی۔ گھر تمام سہولتوں سے آراستہ تھا ٹھنڈے گرم پانی کی لائین تھیں۔ مجھے یہ اشتہار دلچسپ لگا۔ ہمیں ایک ٹھکانے کی اور ضرورت تھی۔ میں نے اشتہار میں دیئے نمبر پر کال کی۔

”ہیلو۔“ دوسری طرف سے مردانہ آواز نے کہا۔ ”افغان احمد بات کر رہا ہوں۔“

”شہباز ملک..... آپ نے اخبار میں اشتہار دیا۔ اس سلسلے میں بات کرنی ہے۔“

”فرمائیے جناب۔“ آدمی نے پڑھے لکھے اور مہذب لہجے میں کہا۔

”مجھے ایک مکان کرائے پر درکار ہے۔ تقریباً اتنا ہی بڑا جتنا آپ نے اشتہار میں بتایا ہے۔“

”آپ آکر دیکھ لیں..... لیکن خیال رہے کہ یہ رہائشی مکان ہے اسے کسی تجارتی یا معاشی مقصد سے

استعمال نہیں کرنا ہے۔“

”مجھے رہائشی مقصد کے لیے ہی درکار ہے۔ میری ایک چھوٹی سی فیملی ہے۔“ میں نے غلط بیانی سے کہا۔

لیا۔

”ٹھیک ہے آپ آکر دیکھ لیں اور مناسب سمجھیں تو ایگری منٹ سائن کر لیں۔ اپنا اصل شناختی کارڈ ساتھ لیتے آئیے گا۔“

میرا اصل شناختی کارڈ اور دوسری دستاویزات عبداللہ کے پاس موجود تھیں میں احتیاطاً اپنے پاس نہیں رکھتا کیونکہ میں آئے۔ نا۔ شمنوں کے ہاتھوں اٹھتا رہتا ہوں۔ اس لیے اب اپنے پاس سوائے موبائل اور نقد رقم کے کچھ نہیں رکھتا ہوں۔ ”ٹھیک ہے میں کل آپ سے وقت لے کر حاضر ہوا جاؤں گا۔“

”صبح دس سے رات دس بجے تک۔“ افغان احمد نے کہا۔ ”میں ابھی اسی کوٹھی میں مقیم ہوں۔ ہاں ایک بات اور ہے آپ سوچ کر آئیے گا کہ کرایہ اور دوسری شرائط حتیٰ ہیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔“

”کرایہ اور شرائط مناسب ہیں۔“ میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ یہ اچھا ہوا کہ ایک اہم کام بیٹھے بٹھائے ہو گیا۔ میں نے انگریزی لی اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے بارہ بج گئے تھے۔ مجھے نیند نہیں آرہی تھی لیکن میں نے مناسب سمجھا کہ آرام کر لوں تاکہ صبح فریش اٹھوں۔ جانے سے پہلے میں نے اسٹڈی میں جھانکا توانی اور بیٹو بڑے سائز کے ایل سی ڈی پر مودی دیکھ رہے تھے۔ دونوں نے دائر لیس ہیز فون لگا رکھے تھے اس لیے انہیں کچھ کہنا پڑا تھا۔ وہ سننے ہی نہیں۔ انہوں نے مخصوص میٹکس بھی لگا رکھی تھیں شاید یہ تھری ڈی ایل سی ڈی تھا اور یقیناً حال ہی میں لیا گیا تھا کیونکہ اس سے پہلے میں نے یہ ایل سی ڈی ٹی وی نہیں دیکھا تھا۔ میں دروازہ بند کر کے اوپر آیا۔ کچھ دیر صابر اور شاز سے والے کمرے کے باہر نکل گیا لیکن وہ سوچکے تھے۔ اندر خاموشی طاری تھی۔ دیم بھی سوچکا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آیا۔ کپڑے بدل کر ہلکا نائٹ سوٹ پہنا اور کبل میں گھس گیا۔ کچھ دیر بعد میں گہری نیند سوچکا تھا۔

صبح پانچ بجے دیم نے دروازے پر دستک دی میں نے بیدار ہو کر کہا۔ ”آ جاؤ یار۔“

اس نے اندر جھانکا۔ ”میں تیار ہو رہا ہوں..... آپ بھی اٹھ جائیں..... میرے ساتھ چلیں گے یا الگ سے جائیں گے؟“

”میں الگ سے جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے عبداللہ جی! کا پڑ کے لیے کال کر چکا ہے۔ ایک گھنٹے بعد کنفرم ہو جائے گا۔“

میں نے اٹھ کر گرم پانی سے غسل کیا۔ دوسرے کپڑے نکالے۔ جوتوں میں لیدر شوز کے بجائے سینٹھلیک ربر کے جاگرتھ پہنے۔ بھاگ دوڑ کے لیے یہ بہتر ہیں جوتے تھے۔ نیچے آیا تو سونہ نکل رہا تھا اس نے کافی کامگ میرے سامنے رکھا۔ ”میرے آدمی ایئر کلب کے آس پاس پہنچ رہے ہیں میں بھی جا رہا ہوں۔“

میں نے مگ اٹھالیا۔ ”میں کچھ دیر میں نکلتا ہوں۔“

دیم کے جانے کے بعد میں نے گیٹ بند کیا اور واپس اندر آیا۔ صبح کی روشنی پھیل رہی تھی۔ میں نے بیٹو کو اٹھایا جو ہمیشہ کی طرح نشست گاہ میں سو رہا تھا مانی اسٹڈی میں پڑی لیدر کا ڈچ پرسو جاتا تھا۔ ”بیٹو میں ایئر کلب جا رہا ہوں۔“

اس نے آنکھیں ملے ہوئے کہا۔ ”شوہی بھائی ہم بھی چلے گا۔“

”نہیں تمہیں یہیں رکنا ہے اب یہاں صرف تم اور مانی ہو۔ مانی لڑنے بھڑنے والا آدمی نہیں ہے تمہیں اپنے ساتھ اس کی حفاظت بھی کرنی ہوگی۔“

”ٹھیک شوہی بھائی۔“ وہ مستعد ہو گیا۔

”بس تو اٹھ کر گیس بند کرو اور کوئی بھی مسئلہ ہو تو ہمیں فوراً کال کرنا۔۔۔۔۔۔ خود اس سے نمٹنے کو کوشش مت

کرنا۔ ٹھیک ہے؟“

”ہم سمجھ گیا شوہی بھائی۔۔۔۔۔۔ پر ایسا ہو کہ مہلت نہ ملے تو۔۔۔۔۔۔؟“

”تب اپنی عقل سے کام لینا اور جو سمجھ میں آئے وہ کرنا۔۔۔۔۔۔ پر یاد رکھنا جان سب سے اہم ہے اس کے

علاوہ کچھ اہم نہیں ہے۔ اگر خطرہ محسوس کرو تو سب چھوڑ کر نکل جانا۔“

میں نے بایک لی تھی۔ ہیلاسٹ کے ساتھ میں خود کو زیادہ محفوظ سمجھتا تھا۔ میرے پاس پستول اور اس کے دو اضافی میگزین تھے۔ میرے خیال میں اتنا اسلحہ کافی تھا۔ عبداللہ نے مجھے اس نجی ایئر کلب کا پتا سمجھا دیا تھا ایک بار کئی سال پہلے میں نے اسے دیکھا بھی تھا جب ایک دولت مند گاہک کے لیے یہاں سے ایک چھوٹا طیارہ

چارٹرڈ کرایا تھا۔ جب میں روانہ ہوا تو سورج طلوع ہو رہا تھا۔ دھند نہیں تھی اور آسمان بھی صاف تھا یعنی موسم ہر طرح سے پرواز کے لیے موزوں تھا۔ آدھے گھنٹے بعد میں ایئر کلب کے پاس تھا۔ داخلے سے پہلے انٹری گیٹ پر

مجھے گارڈز نے روک لیا۔ انہوں نے مہذب لہجے میں مجھ سے کہا۔

”سر شناخت اور پاس کے بغیر آپ اندر نہیں جاسکتے۔“

”میں یہاں کسی کوئی آف کرنے آیا ہوں۔“

گارڈ نے آگاہ کیا۔ ”تب فلائٹ چارٹرڈ کرانے والا ہی آپ کو اندر لے جاسکتا ہے۔“

میں نے عبداللہ کو کال کی۔ ”میں آگیا ہوں اندر آنے کے لیے پاس مانگا جا رہا ہے۔“

”آپ ایک منٹ رکیں میں آ رہا ہوں۔“ عبداللہ نے کہا اور فون بند کر دیا پانچ منٹ بعد اس کی گاڑی

آئی دکھائی دی۔ اس دوران میں مجھے نہ تو وسیم والی دین دکھائی دی تھی اور نہ اس کے آدمی کہیں نظر آئے تھے۔

عبداللہ نے آکر گارڈز کو پاس دکھایا تو انہوں نے پیریز اٹھا کر مجھے اندر جانے کی اجازت دی تھی میں بایک پر ہی

رہا۔ عبداللہ آگے میری رہنمائی کر رہا تھا ہم ایک چھوٹی سی ایک منزلہ عمارت کے سامنے رکے جس سے کچھ ہی دور

ایک دیو جیٹل ہیلی کاپٹر کھڑا تھا اس کے پچھلے ساکت تھے اور دو افراد اس کی دیکھ بھال یا آخری چیکنگ میں

مصروف تھے۔ ایک طرف ایک بارودی شخص ہاتھ میں کلپ بورڈ لیے دیکھ رہا تھا۔ میں بایک سے اترا تو عبداللہ

نے کہا۔ ”وہ سب اندر ہیں۔“

میں نے اس کے ساتھ اندر جاتے ہوئے پوچھا۔ ”وسیم اور اس کے ساتھی کہاں ہیں؟“

”وہ اندر نہیں آئے ہیں آس پاس موجود ہیں دین بھی یہاں سے کچھ دور موجود ہے اور وہ اسی سے نگرانی

کر رہے ہیں۔“

مونا اور سعدیہ سفیر کے ساتھ ایک لاؤنج میں موجود تھے۔ مونا خوش تھی کیونکہ سفیر اس کے ساتھ جا رہا تھا

جب کہ سعدیہ کچھ بھیجی ہوئی تھی۔ میں نے سلام دعا کے بعد اس سے پوچھا۔ ”تمہیں کیا ہوا ہے؟“

”وسیم جو یہاں رہ گیا ہے۔“ سفیر نے کہا۔ ”میں نے تو اس سے کہا تھا کہ وہ میری جگہ چلا جائے لیکن اس نے پتا ہے کیا کہا؟“

”کیا کہا؟“ سعدیہ نے استیقا سے پوچھا۔

”یہی کہ بھائی اتنی مشکل سے تو جان چھوٹ رہی ہے اور تو چاہتا ہے کہ میں اس کے ساتھ چلا جاؤں۔“

”جھوٹ نہ بولیں۔“ سعدیہ نے خفگی سے کہا۔ ”وسیم ایسا نہیں کہہ سکتے۔“

سفیر نے قہقہہ مارا۔ ”لوسنو۔۔۔۔۔۔ وہ ایسا نہیں کہہ سکتے۔“

”تھک نہ کر یار۔“ میں نے سفیر سے کہا اور پھر سعدیہ کو تسلی دی۔ ”تم فکر مت کرو کچھ عرصے بعد وسیم بھی

حویلی کا پکڑ لگا رہے گا۔“

”ہمیں کیوں بھیج رہے ہیں؟“ مونانے پوچھا۔

”بھئی ایک وجہ تو یہ ہے کہ عبداللہ کی کونھی دشمنوں کی نظر میں آچکی ہے اس کے علاوہ کوئی محفوظ جگہ نہیں

ہے جہاں آپ جیسی نازک چیزوں کو رکھا جائے۔ دوسری وجہ ایک نھا مٹا ہے جو ابھی اس دنیا۔۔۔۔۔۔“

”شوہی۔“ مونا جھینپ کر چلائی۔ ”شرم نہیں آتی؟“

”پہلے اکثر آتی تھی اب کئی دن نہیں آتی۔“ میں ہنسا اور سعدیہ کی طرف دیکھا۔ ”تم کیوں شرماری ہو

حالا کہ تمہیں شرم آتی چاہیے موناتم سے آگے نکل گئی۔“

”شوہی بھائی۔“ سعدیہ نے احتجاج کیا۔ ”آپ واقعی بے لگام ہو گئے ہیں۔“

”ظاہر ہے لگام دینے والی جو دور ہے۔“ مونا بولی۔

”ٹھیک کہاتم نے بی بی۔۔۔۔۔۔ تم دونوں نے تو ٹھیک سے لگام دے رکھی ہے ان بے چاروں کو۔“

عبداللہ بلی کا پٹر کے معاملات دیکھنے چلا گیا تھا۔ وہاں صرف میں اور سفیر تھے اس لیے وہ دونوں شرمانے

کے ساتھ اس مذاق کو بھی انجوائے کر رہی تھیں۔ سفیر نے بتایا۔ ”یہ کل پینتیس منٹ کی پرواز ہے۔ حویلی میں بات

ہوگئی ہے تیرے اباجی نے حویلی کے سامنے والے حصے کو صاف کرا کے وہاں عارضی ہیلی پیڈ بنوا دیا ہے۔“

سفیر کے ساتھ جانے کے باوجود مونا بھی اداس تھی اور سعدیہ کا انداز بتا رہا تھا کہ اسے ذرا بھی چھیڑا گیا تو

وہ رو دے گی۔ اس لیے میں بننے ہنسانے والی باتیں کر رہا تھا سعدیہ کو چھیڑا کہ مونا اس سے آگے نکل گئی ہے وہ

شرمائی اور جھنجھلائی لیکن اس کا موڈ خوشگوار ہو گیا تھا۔ پرواز ٹھیک سات بجے روانہ ہوئی۔ اس کے لیے روٹ اور

بلندی کی اجازت لے لی گئی تھی۔ ابھی چھن کر پچاس منٹ ہوئے تھے۔ ان لوگوں کا سامان ہیلی کاپٹر میں لا دیا

گیا تھا۔ میں باہر آ گیا۔ ایئر کلب کے آس پاس زیادہ تر کھیت تھے اور ہموار زمین تھی صرف شمال کی طرف کچھ

چھوٹی پہاڑیاں تھیں جن کے پچھلے دور تک ادھیچ ہوتی پہاڑیاں چلی گئی تھیں ایک طرح سے یہ میدانی جگہ کی آخری

حد اور پہاڑیوں کا آغاز تھا۔

میں نے چاروں طرف معائنہ کیا۔ اتنی صبح کے وقت ایئر کلب تقریباً دیران تھا۔ ایک طرف کچھ ہیلی کاپٹر

اور چھوٹے طیارے کھڑے تھے۔ یہاں ایئر کنٹرولر کا بند بست نہیں تھا اس کے لیے اسلام آباد یا اس ریجن کے

سے کسی چیز کی چمک محسوس ہوئی تھی یہ چمک بس ایک لمحے کے لیے تھی اور پھر غائب ہو گئی۔ عبداللہ نے میری کیفیت محسوس کر لی۔

”کیا ہوا جناب؟“

”عبداللہ اس طرف پہاڑی سے مجھے کوئی چیز چمکتی دکھائی دی صرف ایک لمحے کے لیے۔“
سورج کی روشنی ذراترجمی ہو کر اس پہاڑی پر پڑ رہی تھی عبداللہ نے کہا۔ ”ممکن ہے وہاں کوئی چمک دار چیز یا شیشے کا کھڑا ہوا ہو۔“

”ہو سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اگر وہاں کوئی چیز ساکت ہے تو اس کو بار بار چمکنا چاہیے۔“
میں نے آگے پیچھے ہو کر دیکھا لیکن چمک دوبارہ نہیں دکھائی دی تھی یہ ایک عام سی بات تھی اور عبداللہ نے اس کی وضاحت بھی کر دی تھی لیکن مجھے اندر سے خلش محسوس ہو رہی تھی اور میں خلش پالنے والا آدمی نہیں ہوں اس لیے میں نے عبداللہ سے کہا۔ ”تم ہوشیار رہو..... مجھ سے رابطے میں رہو۔“

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”میں ذرا اس پہاڑی کا قریب سے جائزہ لینے جا رہا ہوں۔“

عبداللہ نے میرے موبائل پر کال ملائی۔ میں نے ویم کو کال ملائی اب ہم تینوں رابطے میں تھے میں نے ہینڈ فری موبائل سے لگایا اور بائیک سنبھالی۔ ”ویم دین کس جگہ ہے.....؟ شمال میں نظر آنے والی پہاڑی کے لحاظ سے بتاؤ۔“

ویم نے دین کی پوزیشن بتائی۔ ”ہم شمالی پہاڑی سے کوئی ایک کلومیٹر دور ٹھیک جنوب میں ہیں۔“

”مجھے وہاں کوئی چیز چمکتی نظر آئی ہے۔“

ویم ہنسا۔ ”بزرگ کہتے ہیں کہ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی ہے۔“
”بزرگ ٹھیک کہتے ہیں ممکن ہے یہ چیز کسی دور بین کا شیشہ ہو جو کسی رائفل پر لگی ہو۔“ میں نے کہا تو ویم سنجیدہ ہو گیا۔

”میں چمک کرتا ہوں آپ کہاں ہیں؟“

”میں اسی طرف جا رہا ہوں۔“ میں نے کہا اور بائیک اشارت کر کے آگے بڑھا دی۔ یہاں کچھ حصہ تو پختہ تھا جہاں گاڑیوں کی آمد و رفت ہوتی تھی۔ ایئر کلب کی عمارتیں تھیں لیکن ان سے آگے سب کچا تھا۔ ضرورت کے تحت اسے ہموار کیا گیا تھا لیکن زمین کچی تھی اور مسلسل بارشوں سے اس میں جا بجا گڑھے پڑ گئے تھے میں ان گڑھوں سے بچتا ہوا جا رہا تھا جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ پانی کی وجہ سے یہ جاننا ناممکن تھا کہ کس گڑھے کی گہرائی کیا ہے۔ بچ کر جانے کی وجہ سے مجھے دیر ہو رہی تھی لیکن یہ اس سے بہتر تھا کہ میں کسی گڑھے میں اتر جاؤں اور بائیک سمیت فلا زیاں کھاؤں۔ پہاڑی میرے اندازے سے زیادہ دور اور بڑی تھی دوری کی وجہ سے یہ چھوٹی لگ رہی تھی۔

جب میں اس کے دامن میں پہنچا تب مجھے صحیح معنوں میں اس کی وسط اور بلندی کا پتا چلا یہ کوئی ہزار فٹ سے زیادہ اونچی تھی اور شرفاغر بائیک کلومیٹر تک چوڑی تھی اس کی ڈھلان تقریباً ساٹھ درجے زاویے سے اوپر جا

ایئر ٹریفک کنٹرولر سے اجازت لینا پڑتی تھی۔ طیاروں کے لیے رن وے بہت سادہ اور بغیر روشنیوں کا تھا یعنی اسے صرف دن میں استعمال کیا جاسکتا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا نجی ایئر کلب تھا جس میں دولت مندوں کے ذاتی طیارے اور ہیلی کاپٹر کھڑے تھے۔ یا کرائے پر چارٹرڈ ہونے والے طیارے اور ہیلی کاپٹر موجود تھے۔ طیارے تمام پروں والے اور دو یا چار نشستوں کے تھے۔ اس قسم کے طیاروں اور ہیلی کاپٹروں کے لیے زیادہ جدید مواصلاتی آلات، تنصیبات یا کسی بڑے لمبے چوڑے ایئر پورٹ کی ضرورت نہیں ہوتی ہے یہ چھوٹی سی جگہ سے بھی پرواز کر سکتے ہیں اور اتر سکتے ہیں۔

میں ہیلی کاپٹر کے پاس آیا جہاں عبداللہ فلائنگ سوٹ میں ملبوس اسی شخص سے بات کر رہا تھا جسے میں نے کلب بورڈ کو دیکھتے پایا تھا۔ وہ عبداللہ کو ہاتھ میں موجود ک بورڈ کی مدد سے کچھ حساب کتاب سمجھا رہا تھا۔ عبداللہ نے بتایا کہ اس فلائیٹ کی ادائیگی چالیس ہزار روپے کی گئی تھی۔ فلائنگ سوٹ والا پائلٹ تھا۔ عبداللہ نے میرا تعارف کرایا تو اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ وہ جوان العمر اور مضبوط جسامت کا لیکن چھوٹے قد کا شخص تھا۔ ”میرا نام شفاعت ہے دو پہلے برس ایئر فورس سے نکالا گیا ہوں۔“

”میں وجہ پوچھ سکتا ہوں؟“

اس نے شانے اچکائے۔ ”میں پابند زندگی نہیں گزار سکتا ہوں پتا نہیں چھ سال فورس میں کیسے رہ لیا بہر حال اب میں آزاد ہوں اور بہت خوش ہوں۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ میں نے کہا تو اس نے چوٹک کر میری طرف دیکھا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ تمہیں نا اہلی کی وجہ سے نہ نکالا گیا ہو۔“ میں نے کہا تو اس کا منہ بن گیا تھا۔ میں نے پروا نہیں کی کیونکہ وہ شخص مجھے پسند نہیں آیا تھا۔ ہمارے ملک میں فورس میں جانا پیشہ نہیں اعزاز اور جنون سمجھا جاتا ہے اور ہر شخص اگر نظم و ضبط کا پابند نہیں ہو سکتا تھا تو اسے فورس میں جانا ہی نہیں چاہیے تھا جہاں ایک ایک فرد کی تربیت پر لاکھوں اور کروڑوں خرچ کیے جاتے ہیں تاکہ وہ وقت آنے پر وطن کی حفاظت کر سکے۔ اکثر سپاہی اور افسران ایک بھی جنگ لڑے بغیر ریٹائر ہو جاتے ہیں لیکن یہ ان کا قصور نہیں ہوتا ہے بلکہ ملک اور قوم کی خوش قسمتی ہے کہ اسے کسی جنگ سے واسطہ نہیں پڑا لیکن فورس جوائن کر کے چھوڑ دینا میرے نزدیک انتہائی بڑا جرم ہے جتنا کوئی شخص ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد دوسرا کوئی پروفیشن اختیار کر کے کرتا ہے۔ وہ اس سیٹ کو ضائع کرتا ہے جس پر کوئی دوسرا ڈاکٹر بن کر بیماروں کا علاج کر سکتا ہے۔

”میں نا اہل نہیں ہوں۔“ اس نے تلخ انداز میں کہا اور ہیلی کاپٹر میں اپنی سیٹ پر بیٹھ کر اوپر اور ہینٹل کے بنیوں سے چھینر چھاؤں کر لگا۔ میں عبداللہ کو اس سے ذرا سے لے گیا۔

”تمہیں یقین ہے کہ یہ اچھا پائلٹ ہے؟“

”میں نے اس کے بارے میں چھان بین کرائی ہے یہ واقعی نظم و ضبط کا پابند نہیں ہو سکتا ہے لیکن جب یہ فلائنگ سیٹ پر ہوتا ہے تو اس کا شمار بہترین پائلٹوں میں ہوتا ہے۔“

”ٹھیک ہے تم مطمئن ہو تو.....“ میں بولتے بولتے رک گیا کیونکہ مجھے شمال کی سانسے والی پہاڑی ڈھلان

رہی تھی اور یہ ڈھلان زیادہ تھی۔ اس پر چڑھنا آسان نہیں تھا۔ جب مجھے چمک محسوس ہوئی تھی تو میں نے اس جگہ کو دیکھ لیا تھا اور پھر ذہن نشین کر لیا تھا جہاں سے چمک محسوس ہوئی تھی۔ یہاں گھنے درخت تھے اور ایک درخت پر سفید رنگ کے بے شمار پھول آئے ہوئے تھے اس لیے وہ سب سے الگ محسوس ہوتا تھا۔ میں نے اوپر جانے سے پہلے عبداللہ سے کہا۔ ”سنوکیا فلائیٹ کچھ دیر کے لیے روکی جاسکتی ہے؟“

”اس سے بہت ساری مشکلات ہو سکتی ہیں فلائیٹ پلان کینسل ہو جائے گا اور دوبارہ سے اے ٹی ایف سے اجازت لینی پڑے گی۔“

”پائلٹ سے بات کرو پانچ دس منٹ کی تاخیر سے کچھ نہیں ہوتا ہے۔“ میں نے کہا اور اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔

”میں کوشش کرتا ہوں۔“ عبداللہ نے کہا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا یہاں سے پہلی کا پڑا ایک معمولی کھلونے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اس کے آس پاس حرکت کرتے لوگ بمشکل ہی دکھائی دے رہے تھے اور ان میں مرد عورت کی تمیز کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ میری گھڑی کے مطابق سات بج گئے تھے یعنی پرواز کا وقت ہو گیا تھا۔ نیچے سے ہی دشوار نظر آنے والی پہاڑی چڑھنے میں دشوار تر ثابت ہوئی بارش سے بھیگ جانے والی مٹی اب پھسل رہی تھی اور اس میں میرے بہترین جوگر بھی پھسل رہے تھے۔ مجھے خود کو واپس جانے سے روکنے کے لیے جھوٹی جھوٹی جھاڑیوں کا سہارا لینا پڑ رہا تھا۔ اکثر جھاڑیاں گیلی مٹی سے اکڑ کر میرے ہاتھ میں آ رہی تھیں لیکن میں اس سے پہلے ہی دوسری جھاڑی پکڑ چکا ہوتا تھا اور اس کے اکھڑنے سے پہلے اگلی جھاڑی پکڑ لیتا۔ اس کے علاوہ اوپر جانے کی اور کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔

”جناب۔“ عبداللہ کی آواز آئی۔ ”پائلٹ کہہ رہا ہے وہ صرف پانچ منٹ رک سکتا ہے۔ اس کے بعد فلائیٹ پلان کینسل ہو جائے گا اور دوبارہ فلائیٹ پلان حاصل کرنے میں دو گھنٹے بھی لگ سکتے ہیں کیونکہ سورج نکلنے ہی فلائیٹس کا رخ شروع ہو جاتا ہے۔ آگے سے اجازت مشکل سے ملتی ہے۔“

”ٹھیک اس سے کہو پانچ منٹ بعد پرواز کرے۔“ میں نے کہا اور دوبارہ چڑھنا شروع کر دیا۔ سفید پھولوں والا درخت تقریباً سات سو فٹ کی بلندی پر تھا۔ وہاں پہنچنے میں مجھے پانچ منٹ سے زیادہ کا وقت لگ جاتا۔ عبداللہ کے انداز سے لگ رہا تھا کہ پائلٹ اس سے زیادہ وقت نہیں دے گا دیے بھی وہ مجھ سے تھا تھا اس لیے رعایت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ممکن ہے وہ اپنی طرف سے کہہ رہا ہو کیونکہ اس قسم کے معاملات میں وقت کی اتنی پابندی کہیں نہیں ہوتی ہے۔ شیڈول ایئر لائنوں کی پرواز میں تاخیر عام سی بات ہے۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا پانچ منٹ پورے ہوئے تو عبداللہ نے کہا۔

”اب فرمائیں جناب۔“

”عبداللہ اسے باتوں میں لگاؤ بس دو منٹ اور..... میں اس جگہ کے پاس ہی ہوں۔“

”جناب میں دیکھ رہا ہوں۔“ وسم نے کہا۔ ”لیکن اس ڈھلان میں مجھے کوئی خاص چیز نظر نہیں آئی ہے۔“

سفید پھولوں والے درخت کے آس پاس کونو کس کرو۔“ میں نے وسم سے کہا۔ ”مجھے اسی جگہ سے چمک دکھائی دی تھی۔“

”میں اسی کے آس پاس دیکھ رہا ہوں۔“

عبداللہ پائلٹ سے مذاکرات کر رہا تھا لیکن صاف لگ رہا تھا پائلٹ مزید تاخیر کے لیے تیار نہیں تھا اس نے عبداللہ سے کہا۔ ”اگر فلائیٹ پلان کینسل ہوتا ہے تو آپ کو تاخیر کے چار جز بھی دینا ہوں گے۔“

”چار جز کس بات کے؟“ عبداللہ نے غالباً وقت گزاری کے لیے بحث جاری رکھی۔

”چار جز اس بات کے کہ اگر میری آگے بھی کوئی فلائیٹ ہوئی تو وہ اس تاخیر کی وجہ سے رہ جائے گی اور

مجھے نقصان ہوگا۔ تاخیر کی صورت میں آپ مجھے دس ہزار روپے مزید ادا کریں گے۔“

میں ان کی باتیں سنتے ہوئے ہر ممکن تیزی سے اوپر جا رہا تھا مسلسل چڑھنے سے میرا سانس پھول رہا تھا اور اب میں بات کرنے کی کوشش کرتا تو آواز کے بجائے پھونک زیادہ نکلتی۔ بالآخر میں اس ڈھلان تک پہنچ گیا یہاں زمین کسی قدر ہموار ہو گئی تھی اور اسی وجہ سے یہاں بڑے درخت بھی آگ آئے تھے۔ یہ درختوں کا جھنڈ تھا۔ اب تک میں بیروں کے ساتھ ساتھ بھی استعمال کرتا آیا تھا لیکن ذرا ہموار زمین آئی تو میں دوبارہ دوپایہ بن گیا اور میرے ہاتھ آزاد ہو گئے جن کا میں نے مصروف یوں نکالا کہ پستول نکال لیا اگر میرا خدشہ درست تھا اور یہاں کوئی شخص دور مار رائفل سمیت چھپا بیٹھا تھا تو پستول کا استعمال ناگزیر تھا۔ میں یہاں آتے ہی غلط ہو گیا۔ اب تک میں آوازیں پیدا کرتا آ رہا تھا۔ مگر یہاں آواز پیدا کرنے کا مطلب اچانک ہو سکتا تھا۔

دبے قدموں میں درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوا۔ یہاں نیم تاریکی تھی اور شاخوں و پتوں سے جھن کر آتی سورج کی شعاعیں بہت عجیب سے ڈیزائن بنا رہی تھیں۔ درختوں کے نیچے تاریکی کے ساتھ یہ روشنی دھندلا پیدا کر رہی تھی۔ مگر ان شعاعوں کی وجہ سے اندر کا منظر واضح نہیں تھا۔ یہاں کوئی نہیں تھا بس خاموشی اور ویرانی تھی۔ عبداللہ وقفے وقفے سے مجھے پکار رہا تھا وہ فلائیٹ کے بارے میں میرا فیصلہ جانتا چاہتا تھا۔ وسم نے اسے کہا۔ ”یاروہ کسی ایسی جگہ ہیں جہاں بول نہیں سکتے ذرا صبر کرو۔“

”بھائی میں تو صبر کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن یہ پائلٹ بے صبر اہوا جا رہا ہے۔“

وسم نے کہا۔ ”اس سے کہو اپنا منہ بند رکھے اگر فلائیٹ میں تاخیر ہوئی تو اسے ادائیگی کر دی جائے گی۔“

میں ان کی باتیں سن رہا تھا اور یہ گفتگو میرے کان تک محدود تھی اس سے آگے یہاں موجود کوئی فرد اسے نہیں سن سکتا تھا۔ میری نظر اندھیرے سے مانوس ہو گئی تھیں اور اب مجھے کسی قدر بہتر دکھائی دے رہا تھا۔ کسی حد تک اطمینان ہو جانے کے باوجود کہ یہاں کوئی نہیں ہے میں محتاط تھا۔ اچانک مجھے ذرا آگے کسی چیز کی چمک دکھائی دی میری تیزی سے زمین پر لپٹ گیا۔ یہاں خشک پتوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا جو گزشتہ سہ ماہیوں کا ٹوٹ کر گرے تھے اور اب زمین کا حصہ بننے والے تھے بارش کی نمی سے وہ کھل سڑھ رہے تھے اور میرے لباس سے چپک رہے تھے۔ نیچے لینے پر بہت تیز بومیرے نقتوں سے ٹکرائی تھی لیکن اس وقت مجھے گندگی اور بدبو کی پروا نہیں تھی میری نگاہ وہاں مرکوز تھی جہاں کوئی چیز چمکی تھی اور یہ جگہ زیادہ دور نہیں تھی مجھ سے مشکل سے دس فٹ دور ہوگی۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ کوئی انسان ہے تو اسے لازمی میری موجودگی کا علم ہو جانا چاہیے تھا کیونکہ میرے پیچھے نہایت روشن پس منظر تھا جس میں بالکل نمایاں تھا۔

مگر دوسری طرف سے کوئی مزاحمت نہیں ہوئی تھی۔ اس کے باوجود میں نے احتیاط سے کام لیا اور زمین

میں چونکا، وہاں کچھ نہیں تھا، نہ بیلی کا پٹر آگ کا گولہ بنا تھا اور نہ کوئی دھماکہ ہوا تھا۔ واقعات کی تیز رفتاری نے میرے تخیل کے ساتھ مل کر مجھے وہ دکھایا تھا جو ہو سکتا تھا جس کا خدشہ میرے ذہن میں تھا لیکن وہ حقیقت میں ہوا نہیں تھا۔ بیلی کا پٹر ٹھوڑا اور پراٹھا تھا اور گولیاں گننے کے بعد دھواں اگلنے ہوئے دوبارہ زمین پر آ بیٹھا تھا وہ جس طرح گرا تھا اسے بیٹھنا ہی کہا جاسکتا۔ اس کا انداز بے ڈھب تھا یہی وجہ تھی کہ اس کی ایک انگی ٹوٹ گئی۔ ذرا جھکے سے اس کا پٹر گھومتے ہوئے زمین سے ٹکرایا اور اس نے کنکریٹ کو چھیل دیا اور پھر تصادم نے ایک پڑاؤ دیا۔ وہ اڑ کر دور رن وے پر جا گرا۔ عبداللہ اور دوسرے لوگ جو بیلی کا پٹر کی کریش لینڈنگ سے بچنے کے لیے دور بھاگ رہے تھے مجازاً طور پر اس سے محفوظ رہے۔ اب بیلی کا پٹر ایک انگی پر نکلا ترچھا کھڑا تھا اور اس کا پٹر گھومتے ہوئے بار بار فرش سے ٹکرا رہا تھا۔ اگر وہاں کنکریٹ کے ٹھوس فرش کی جگہ مٹی کا میدان ہوتا تو کھومتا پڑ زمین میں ڈھنس جاتا اور پھر پڑ رک جانے سے انجن بیلی کا پٹر کے جسم کو گھماتا اور امکان تھا کہ وہ دو ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔ مگر کنکریٹ پر بیلی کا پٹر کے پڑ پڑ کر اچٹ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دوسرا پڑ بھی ٹوٹ گیا اور اڑ کر اس طرف گیا جہاں چھوٹے طیارے کھڑے تھے۔ وہاں اس نے کیا تباہی مچائی میں دیکھ نہیں سکا تھا۔ اب بیلی کا پٹر کا ایک پڑ گھوم رہا تھا اور وہ اسے بھی جھلارہا تھا۔ اچانک مجھے دسیم کی آواز نے چونکایا۔ وہ چلا رہا تھا۔

”شہباز صاحب..... اس حرامی کورویں وہ بیلی کا پٹر پر فائرنگ کر رہا ہے..... شہباز صاحب۔“

”میں دیکھ رہا ہوں۔“ میں نے سنہیل کر کہا۔ ”دسیم دین کی گن سے اس جگہ کو نشانہ بناؤ۔“

”نہیں وہاں آپ ہیں۔“ اس نے انکار کر دیا۔ ”اے روکیں اس سے پہلے وہ چور کے ٹینک کو ہٹ کر دے۔“

میں پستول نکالتے ہوئے درختوں کے اوپری حصے کی طرف بڑھا دور مار گن والا وہیں کہیں تھا۔ آواز اسی طرف سے آرہی تھی۔ دسیم۔ سے گفتگو کے دوران میں جھنڈ میں داخل ہو گیا اور دسیم سے کہا۔ ”دین لے کر فوراً وہاں پہنچو اور انہیں نکالو۔“

”میں پہلے ہی روانہ ہو چکا ہوں۔“ دسیم نے کہا تو میں نے پلٹ کر دیکھا۔ سیاہ دین رن وے پر آ چکی تھی اور تیزی سے بیلی کا پٹر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جس کا انجن بند ہو گیا تھا لیکن باقی رہ جانے والا پر گھوم رہا تھا اور جب تک یہ نہیں رک جاتا تو اس کے پاس نہیں جاسکتا اور نہ کوئی بیلی کا پٹر سے اتر کر باہر آ سکتا تھا۔ میں نے فی الحال بیلی کا پٹر اور اس میں موجود افراد کو ذہن سے نکال دیا اور محتاط قدموں سے اوپر کی طرف بڑھا۔ محتاط ہونے کے باوجود میرے قدموں تلے آنے والے سوکھے پتے جو بارش میں بھگنے سے محفوظ رہے تھے چر مر رہے تھے اور معمولی آوازیں نکال رہے تھے۔ وہاں سناٹا تھا اس لیے خود مجھے آوازیں بہت بلند لگ رہی تھیں۔ اوپر موجود بھاری مشین گن رہ رہ کر گولیاں برس رہی تھیں۔ میں نے آواز سے شناخت کر لیا تھا یہ میدان جنگ میں استعمال ہونے والا پیدل دستوں کے خلاف سب سے مؤثر ہتھیار تھا۔ اس بھاری مشین گن کی مار ایک کلومیٹر سے زیادہ ہی ہوتی ہے اور اس کی تین انچ لمبی گولی ایک فٹ موٹی ٹھوس کنکریٹ کی دیوار کے پار ہو جاتی ہے۔ اسٹیل کی دو انچ موٹی پلیٹ بھی اسے نہیں روک سکتی ہے۔ اس کی خوفناک مار کے مقابلے میں اس کی آواز بہت کم ہوتی ہے۔ دسیم نے یقیناً اس جگہ کو سپاٹ کر لیا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ میں کہیں آس پاس تھا اگر وہ دین کی دور مار سنا پڑ گن

پر لیٹے لیٹے آگے بڑھا۔ عبداللہ نے مجھے پکارنا بند کر دیا تھا اب وہ صبر سے میرے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ پھر میں نے اس چیز کو دیکھ لیا وہ دوبارہ چمکی تھی۔ میں نے گہری سانس لی اور کھڑا ہو گیا یہ لوک کی شیشے کی بوتل تھی جو نصف زمین میں ڈھنسی ہوئی تھی اور اس کا اوپری حصہ باہر نکلا ہوا تھا۔ نہ جانے کب سے مٹی میں وہی اس بوتل کو گزشتہ روز ہونے والی بارش نے دھو دیا تھا اور اب روشنی پڑنے پر اس کا شیشہ چمک رہا تھا۔ یقیناً میں نے اسی بوتل کے شیشے کی چمک دیکھی تھی۔ میں نے گہری سانس لی۔ مشکل سے تین انچ کی نکلی ہوئی بوتل نے مجھے ڈیڑھ کلومیٹر دور اس پہاڑی پر آنے پر مجبور کر دیا۔

”عبداللہ۔“ میں نے درختوں سے باہر آتے ہوئے کہا۔ ”پائلٹ کو کا پٹر اڑانے کے لیے کہو۔“

عبداللہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”یعنی خطرے کی کوئی بات نہیں ہے؟“

”ہاں خطرہ نہیں ہے۔“

”معاملہ کیا تھا جناب؟“ دسیم نے پوچھا۔

”ہاں یار لوک کی ایک بوتل تھی فساد کی جڑ وہی چمک رہی تھی بار بار۔“

عبداللہ پائلٹ سے بات کر رہا تھا۔ وہ چلا رہا تھا کہ اب بہت تاخیر ہو گئی ہے لیکن عبداللہ نے اسے قائل کر لیا کہ وہ چانس لے اور اسے ٹی ایف کو اپنی روا نگی کی اطلاع دے۔ میں دیکھ رہا تھا سفیر، موتا اور سعد یہ بیلی کا پٹر میں بیٹھ رہے تھے۔ اتنی دور سے یہ اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا کہ خواتین کون ہی ہیں اور حضرت کون ہیں۔ ان ہی تینوں نے جانا تھا پہلے عبداللہ کے دواؤں بھی چارہ تھے لیکن بابا نے حوبلی پاس حفاظتی انتظامات کر لیے تھے اس لیے ان کی ضرورت نہیں تھی۔ بیلی کا پٹر کے پچھے گردش کرنے لگے۔ اس کے انجن کی آواز یہاں تک آ رہی تھی۔ عبداللہ اور دوسرے لوگ پیچھے ہٹ گئے تھے۔ اب پر پوری رفتار سے گھوم رہے تھے اور پھر بیلی کا پٹر آہنگی سے بلند ہوا۔ ابھی وہ ڈول رہا تھا پھر پائلٹ شفاعت نے پیشہ ورانہ مہارت سے اسے سنہیل لیا ایک ہموار ردھم میں بیلی کا پٹر اوپر اٹھا اور ساتھ ہی اس نے اپنا رخ جنوب مغرب کی طرف موڑنا شروع کر دیا۔

اسی لمحے میرے کانوں نے مسلسل ایسی آوازیں سنیں جیسے لوہے کے تھوڑے کوخت لکڑی پر تواتر سے مارا جائے۔ اس کے ساتھ ہی بلند ہوتے بیلی کا پٹر نے لڑکھڑاتا شروع کر دیا۔ اس کے پچھلے حصے سے دھواں لگنا شروع ہو گیا تھا۔ چند لمحے کے لیے تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہوا ہے۔ پھر دسیم کے چلانے کی آواز آئی۔ ”کوئی پہاڑی سے فائرنگ کر رہا ہے..... دور مار رائل ہے..... شہباز صاحب..... آپ سن رہے ہیں..... میرے خدا اس نے چور کو ہٹ کر دیا ہے۔“

میں سن رہا تھا لیکن میں کچھ نہیں سن رہا تھا میری نظر لڑکھڑاتے بیلی کا پٹر پر مرکوز تھیں۔ فائرنگ نے اس کے کنٹرول سسٹم کو تباہ کر دیا تھا۔ اچانک اس نے تیزی سے گھومنا شروع کر دیا وہ شفاعت کے قابو سے باہر ہو رہا تھا اور تیزی سے زمین کی طرف جا رہا تھا۔ پھر وہ ایک دھماکے سے زمین پر گر آ اور آگ کے گولے میں بدل گیا۔ دسیم چلا رہا تھا عبداللہ چلا رہا تھا لیکن میرے کان کچھ نہیں سن رہے تھے۔ زمین و آسمان میرے گرد گھوم رہے تھے اور مجھے لگا میں چکر اکر پیچھے گرنے والا ہوں۔

استعمال کرتا تو امکان تھا میں نہ نشانے پر آ جاؤں۔

اب میں اس جگہ کے بہت پاس تھا جہاں سے مشین گن گولیاں برسا رہی تھیں گولیوں کے راہ میں آنے والی گھاس اور پودے۔ یہہ ریزہ ہو کر ہوا میں کھڑ رہے تھے۔ کوئی پون صدی پہلے جرمنوں کی ایجاد کردہ یہ گن آج بھی پروڈکشن میں تھی اور اب اس کے کئی نئے ماڈل آگئے تھے۔ فائرنگ کرنے والوں نے یقیناً اسے اسٹینڈ پر لگا یا ہوگا اسے ہاتھ میں لے کر صرف ریوہو چلا سکتا تھا اور وہ بھی فلوں میں۔ عملی طور پر ایسا ممکن نہیں تھا۔ زمین پر اسے جمانے کے لیے جگہ بنانی گئی ہوگی اور اسے یہاں تک اس کی گولیوں کی ہیلت یا بکس سمیت لانا بھی کسی ایک آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہاں ایک سے زیادہ آدمیوں کی موجودگی عین ممکن تھی۔ میں ان کے اتنے قریب تھا کہ انہیں شبہ ہو جاتا تو وہ صرف مشین گن کا ہلکا سا رخ بدلتے اور میں فوت ہو جاتا۔

مجھے حیرت تھی کہ انہیں اب میری آمد کا پتا کیوں نہیں چلا۔ حالانکہ میں نے درختوں کے باہر آ کر بات کی بھی تھی اور جب اوپر جا رہا تھا تب بھی خاصی آہٹیں ہوتی تھیں۔ بے شک وقفے وقفے سے مشین گن بھی چل رہی تھی اور اس کا بھی خاصا شور تھا لیکن وہ خاموش بھی ہوتی تھی اور اس دوران میں انہیں میری آواز سن لیتی چاہیے تھی۔ مگر ایسا لگ رہا تھا وہاں موجود لوگ بہرے تھے۔ یہ چالاکی بھی ہو سکتی تھی کہ میں پاس آؤں اور وہ اچانک مجھے گولی مار دیں۔ جس جگہ سے گولیاں گزر رہی تھیں میں اس سے ذرا بائیں طرف سے اوپر نکلا اور پھر میری آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ہکی مٹی میں مشین گن کا اسٹینڈ گاڑ کر فکس کیا گیا تھا اور مشین گن کی لمبی نال خود کار طریقے سے گولیاں برسا رہی تھی۔ اس کے اوپر ایک دور بین لگی تھی۔ مشین گن کے ساتھ اس کا گولیوں کا بکس تو فٹ تھا۔ ساتھ ہی کچھ اور چیزیں بھی لگی ہوئی تھیں۔ گن کے نیچے ایک موٹر اور بیٹری کا سسٹم لگا تھا اور اس کے اوپر کنٹرولنگ سسٹم تھا۔ یہ سب میں نے ایک نظر میں دیکھ لیا تھا دوسرے لمبے میں اسے بند کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور مجھے اس کے لیے زیادہ کوشش بھی نہیں کرنا پڑی۔ اس کے اوپر ہی ایک چھوٹا سا کھینچنے والا سرخ بن لگا تھا میں نے اسے نیچے کیا تو اگلے ہی لمبے مشین گن خاموش ہو گئی۔ میں نے نیچے کی طرف دیکھا ہیلی کا پڑ کا واحد پر بھی رک گیا تھا اور لوگ اس کے آس پاس جمع ہو رہے تھے۔ میں نے موبائل پر وٹیم سے کہا۔

”وٹیم یہاں ریوٹ سے آپریٹ ہونے والی مشین گن ہے۔ اسے چلانے والا آس پاس ہوگا۔ اس کے پاس شاید لیپ ٹاپ جیسا کوئی آلہ ہوگا لیکن کوئی بھی آدمی ہوا سے چپک ہوئے بغیر جانے مت دینا اگر کوئی رکنے کے بجائے بھاگے تو اسے گولی مارتا۔“

وٹیم میری بات سمجھ گیا اور اس نے فوری طور پر اپنے آدمیوں کو ہدایت دینا شروع کر دی۔ میں نے عبداللہ

سے پوچھا۔ ”سب خیریت ہے؟“

”ہم انہیں چو پر سے نکال رہے ہیں۔ باقی سب ٹھیک ہیں لیکن مونابا بی.....“

”کیا ہوا موناکو؟“

”بظاہر چو پر گرنے سے کوئی چوٹ آئی ہے۔ شکر ہے کہین فائرنگ سے محفوظ رہا ہے۔ ہم انہیں اسپتال

لے جا رہے ہیں۔“

”عبداللہ اپنے دوسرے آدمی بھی بلا دو وٹیم تم بھی اپنے سارے آدمی بلاؤ۔ دشمن کا کوئی بھروسہ نہیں ہے

وہ دوسرا وار بھی کر سکتے ہیں۔“ میں نے کہا ان سب کے محفوظ ہونے کا سن کر میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ میں نے اس دوران میں گن کا سسٹم مزید سمجھ کر اسے بے کار بنانے کا آغاز کر دیا تھا اس کی بیٹری نکال کر اس کے تار توڑ دیے اور بیٹری نیچے اچھال دی۔ پھر اس کے اوپر لگی دور بین جس میں کیمرا بھی لگا تھا اسے توڑ کر گن سے اتار لیا۔ آخر میں وائرلیس کنٹرول سسٹم کے تار بھی کھینچ کر توڑ دیے اب یہ کسی صورت سے استعمال نہیں ہو سکتی تھی۔ میں حیران تھا کہ یہ کام کرنے والا کون ہو سکتا ہے مرشد اس قسم کی کارروائی کا قائل نہیں تھا اس کے پاس مرنے کے لیے آدمی نمائکوں کی کوئی کی نہیں تھی۔ پھر مجھے فاضلی کا خیال آیا۔ مرشد کے آدمیوں میں وہی یہ کام کر سکتا تھا۔ فاضلی کا خیال آتے ہی میں چونکا ہو گیا تھا۔

دن کا وقت تھا ورنہ میں وٹیم سے کہتا کہ دین کی دور بین کا ٹائٹ موڈ استعمال کر کے اس ڈھلان میں کسی اور کو تلاش کرنے کی کوشش کرے لیکن دن میں یہ ممکن نہیں تھا۔ میں نے ایک بار پوری ڈھلان کا جائزہ لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ جس نے بھی یہ کام کیا تھا اس نے سب سے پہلے اپنی حفاظت کا بندوبست کیا ہوگا اور اسی لیے اس نے یہ نہایت مزیدار سسٹم یہاں لگا دیا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ بین الاقوامی مارکیٹ میں اس سسٹم کی قیمت ایک ملین ڈالر تھی۔ یعنی کوئی چھ کروڑ پاکستانی روپے۔ (اس زمانے میں ایک ڈالر ساٹھ پاکستانی روپے کا تھا۔) گن استعمال کرنے والا یقیناً کسی ایسی جگہ تھا جہاں سے وہ اپنا کام کر کے فوری فرار ہو سکے۔ اسے ڈھلان پر موجود رہنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ گن کے ساتھ نہایت مؤثر قسم کا وائرلیس سسٹم تھا اور یقیناً اسے خاصی دوری سے آپریٹ کیا جاسکتا تھا۔ میں نے گن سے اتاری دور بین سے کام لیا۔ یہ خاصی طاقتور دور بین تھی ایک میل دور کھڑے آدمی کے نعوش واضح دکھائی دیتے تھے میں نے پہلے ہیلی کاپٹر کی طرف رخ کیا اس وقت دین ان سب کو لے کر وہاں سے روانہ ہو رہی تھی۔ میں نے آس پاس کا معائنہ کیا لیکن جہاں تک میں دیکھ رہا تھا مجھے کوئی شخص دکھائی نہیں دے رہا تھا جب کہ گن کو آپریٹ کرنے والا لازمی آس پاس ایسی جگہ تھا جہاں سے وہ با آسانی اپنی کارروائی کر سکے اور اس کے بعد فرار ہو جائے۔

”وٹیم تم کہاں ہو؟“

”میں یہیں ہوں جناب..... عبداللہ اپنے آدمیوں کے ساتھ دین کے پیچھے ہے۔“

”تمہارے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟“

”تین بائیک والے ہیں۔“

”میرا خیال ہے گن آپریٹ کرنے والا نیچے کسی ایسی جگہ موجود ہے جہاں سے وہ اپنا کام کر کے آسانی

سے فرار ہو سکے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔ وہ ڈھلان پر ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا ہے۔“

”وٹیم نہ جانے کیوں مجھے خیال آ رہا ہے یہ حرا مزادے فاضلی کا کام ہے مرشد کے آدمیوں میں وہی اتنا

شاطر اور شیطانی دماغ رکھتا ہے۔“

”آپ نیچے آ جائیں ہم یہاں سے نکلنے والے راستوں پر نظر رکھتے ہیں۔“

”نہیں یہاں سے نکلنے کی کرو کچھ دیر میں پولیس آ جائے گی ویسے عبداللہ کو یہاں رکنا چاہیے تھا دی پولیس

والے کو ڈرانے کے لیے لگا تار کئی فائر کیے۔ وہ فوراً اندر چلا گیا۔ اس کے بال اس طرح اڑ رہے تھے کہ اس کی صورت صاف نہیں دکھائی دے رہی تھی اس کے باوجود میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہی فاضلی ہے۔ فائرنگ رکتے ہی میں نے رفتار بڑھائی۔

پھر ایک غیر متوقع مدد سامنے آئی۔ ایک سینٹ ڈپو کے سامنے بڑا ٹرک لوڈ ہونے کے بعد ٹرن لے کر ہماری طرف آنے کے لیے مڑ رہا تھا اس نے پوری سڑک بلاک کر دی تھی۔ سلور کار کے ڈرائیور نے اسے ذرا تاخیر سے دیکھا شاید اس کی توجہ عقب کی طرف زیادہ تھی۔ اچانک ٹرک سامنے آیا تو اس نے بریک لگائے لیکن کار کی رفتار خاصی تیز تھی وہ رکتے رکتے بھی ٹرک سے جا ٹکرائی۔ تصادم بہت شدید نہیں تھا لیکن پھر بھی اس میں موجود افراد کے لیے غیر متوقع تھا۔ میں نے رفتار بڑھائی کار کے پاس لوگ جمع ہو رہے تھے اچانک میں نے فائرنگ کی آواز سنی اور لوگ پلٹ کر بھاگے۔ میں نے بائیک کچھ فاصلے پر روک لی بالکل پاس جانا بھی مناسب نہیں تھا ورنہ ان لوگوں کے آسان ہو جاتی اور وہ شکر بے کے ساتھ ہمیں گولی رسید کرتے کہ خود مرنے کے لیے سامنے چلے آئے میں نے بائیک اور ہیملٹ وسم کے حوالے کیے۔ ”میرے پیچھے آؤ۔“

دسم کا ساتھی دوسری طرف سے گھوم کر جا رہا تھا۔ میں مختلف گاڑیوں اور چیزوں کی آڑ لیتا ہوا کار تک پہنچا لیکن اس میں سوائے ایک ڈرائیور اور ایک عقبی نشست پر لیٹے آدی کے کوئی نہیں تھا اور ڈرائیور اسٹیرنگ پر سر رکھے ہمیشہ کی نیند سو رہا تھا۔ اس کی کینپی میں سوراخ تھا جس سے وہ رہ کر خون ابل رہا تھا۔ پیچھے لیٹے آدی کی پیشانی میں سوراخ تھا اور لمبے بالوں والا غائب تھا۔ لوگ اب ذرا فاصلے سے حیرت اور خوف سے گاڑی میں موجود لاشوں کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے ایک نوجوان لڑکے کا بازو پکڑا۔ ”ان کو مارنے والا کہاں گیا؟“

”اس طرف.....“ نوجوان نے ایک گلی کی طرف اشارہ کیا تو میں وقت ضائع کیے بغیر اس طرف دوڑا تھا۔ میں نے کنارے سے گلی میں جھانکا تو مجھے لمبے بالوں والا گلی کے سرے پر دائیں طرف مڑتا دکھائی دیا۔ میں نے موبائل پر دسم کا نمبر ملا یا فری ہینڈ میرے کان پر پہلے ہی لگا ہوا تھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔

”میں آپ کو دیکھ رہا ہوں۔“ دسم بولا۔

”تم میرے پیچھے مت آؤ میں روڈ پر ہر وہوہ ہمیں کہیں نکلے گا۔ اپنے آدی سے کہو وہ آگے چلا جائے۔“ میں گفتگو کے دوران گلی کے سرے تک آیا اور جب اندر جھانکا تو سامنے سے گلی بند دکھائی دی لیکن لمبے بالوں والا غائب تھا۔ وہ یقیناً کسی گھر میں گھس گیا تھا۔ اکثر دروازے بند تھے لیکن ایک دروازے پر صرف پردہ تھا اور ظاہر ہے کوئی بھی اس سے اندر گھس سکتا تھا۔ میں دبے قدموں دروازے تک آیا اور ذرا سا پردہ ہٹا کر اندر جھانکا۔ یہ بہت چھوٹا شاید ایک کمرے کا مکان تھا جس میں سامنے دس بائی دس کا مکن تھا ایک طرف چھوٹا سا غسل خانہ یا لیٹرین تھا اور اس کے ساتھ باورچی خانہ تھا جس پر صرف چھت تھی وہ بھی سینٹ شیت کی۔ کمرے کے اوپر کچی چھت تھی۔ مکن میں ایک عورت اپنے دو بچوں کے ساتھ سہی کھڑی تھی۔ مگر لمبے بالوں والا یہاں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ کمرے یا لیٹرین میں گھسنے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا اس چوہے دان میں گھس کر وہ آرام سے پکڑا جاتا ورنہ مارا جاتا۔ اچانک چھت کی طرف سے سایا لہرایا اور میں اندر گھس گیا۔ ایک اور مسلح آدی کو دیکھ عورت نے چیخ مارنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ میں نے پستول اس کی طرف اٹھا دیا اسے خاموش رکھنے کا یہی ایک

”ہاں یار میں نے مرشد کے پاس صرف گدھے دیکھے ہیں یا بھیڑیے ہیں جو بغیر کسی احساس کے آدی کو چیر پھاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ فاضلی پہلا آدی ہے جو اپنا ذہن استعمال کرتا ہے اور بہت مشکل کام کر جاتا ہے یاد ہے اس نے ایبولفس کو اغوا کر کے ہمیں کس طرح حیران کر دیا تھا؟“

”آپ نے ٹھیک کہا اگر اس حملے میں مرشد ملوث ہے تو یقیناً اس کی پلاننگ فاضلی نے کی ہے اور شاید مکن بھی وہی آپریٹ کر رہا تھا۔“

سلور کار اب آبادی والے علاقے میں داخل ہو گئی تھی اور یہاں سڑک خالی نہیں تھی۔ شروع میں تو بچے سڑک پر کرکٹ کھیل رہے تھے انہیں اپنی لکڑی کی وکٹ ہٹانے کا موقع نہیں ملا اور کار اسے اڑاتی ہوئی نکل گئی۔ میں نے کہا۔ ”دسم وقت آگیا ہے کار کا نائز برسٹ کر کے اسے روکنا ہے۔“

دسم نے اپنے آدی کو ہدایت کی۔ اس کے دو بائیک والے ابھی پیچھے تھے لیکن وہ بھی چند منٹ میں پہنچ جاتے اگر ہم کار روکنے میں کامیاب ہو جاتے۔ میرا اندازہ درست نکلا تھا آگے سڑک پر ٹریفک تھا اور دوسرا ٹریفک جس میں انسانی اور حیوانی ٹریفک دونوں شامل تھا سڑک پر ٹریفک جام کر رہے تھے۔ ہم بائیک پر تھے اس لیے بہتر پوزیشن میں تھے اور رفتہ رفتہ کار کے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ دسم کا آدی آگے نکل گیا تھا۔ مجھے یقین تو نہیں تھا لیکن شبہ تھا کہ سلور کار والے ہمارے تعاقب سے باخبر ہو گئے تھے اور اب اس ٹریفک سے نکلنے کی دیوانہ وار جدوجہد کر رہے تھے اس میں ان سے غلطیاں بھی ہو رہی تھیں۔ پہلے انہوں نے ایک رکشے کو ٹکرائی اور وہ ایک ریڑھی میں گھس گیا ریڑھی والا سرعام ہالے بچ رہا تھا۔ لوگ ابھی اس حادثے سے محظوظ ہو رہے تھے۔ اور مدد کے بہانے ہالے لوٹ رہے تھے کہ سلور کار نے غلط سائیڈ سے آنے ایک بائیک سوار کو بچانے کی بالکل کوشش نہیں کی اور بائیک والا بوٹ سے ہوتا ہوا سڑک پر دوسری طرف گرا اس کی بائیک بوٹ کے اسی طرف رہ گئی تھی۔ میں نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے دیکھا وہ نوجوان لڑکا تھا۔ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور وہ زار زار در رہا تھا۔

کار کے ان دو حادثوں نے آگے والے ٹریفک کو ہوشیار کر دیا لوگوں نے فرض کر لیا کہ کار میں کوئی نشہ کر کے ڈرائیو کر رہا ہے یا کوئی جرم کر کے بھاگ رہا ہے دونوں صورتوں میں اس کے سامنے آنا خودکشی کرنے کے مترادف تھا اس لیے اب لوگ رضا کارانہ اسے راستہ دے رہے تھے۔ اس وقت ہم کار سے سوگڑ کے فاصلے پر آ گئے تھے۔ ابھی ہتھیار استعمال کرنے کا موقع نہیں تھا فاصلہ بہت تھا اور درمیان میں اور بھی ٹریفک تھا گولی کسی اور کو بھی لگ سکتی تھی۔ میں اور دسم کا آدی کار سے فاصلہ کم کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ ان حادثات سے واضح ہو گیا تھا کہ کار والے ہمارے تعاقب سے واقف ہو چکے تھے اور اب ہم سے جان چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اچانک کار سے لمبے بالوں نے اپنا نصف دھڑ باہر نکالا اور ہماری طرف پستول سے فائرنگ شروع کر دی۔ میں نے بائیک لہرائی اور دسم کا آدی بھی یہی کرنے لگا۔ فائرنگ کی آواز نے دہشت پھیلادی تھی اور ہمارے بچ میں موجود ٹریفک تیز تر ہونے لگا۔ ایک گولی ایک گدھا گاڑی والے کو لگی اور وہ اپنے گدھے پر گر کر واویلا کرنے لگا اس کے شور سے بدحواس گدھا ایک گلی میں گھس گیا۔ میں نے راستہ صاف ہونے پر خدا کا شکر ادا کیا ورنہ گدھا وہیں رک کر راستہ بھی روک سکتا تھا۔ اس فائرنگ کا جواب دسم نے دیا اس نے اپنے پستول سے لمبے بالوں

حربہ تھا ورنہ جتنی دیر میں زبان یا اشارے سے اس سے چپ رہنے کی استدعا کرتا وہ بیچ چلا کر سارے محلے کو اکٹھا کر چکی ہوتی۔ پتول نے اٹھ کیا عورت کی آنکھیں اوپر چڑھ گئیں اور وہ آرام سے فرش پر دراز ہو گئی۔ دونوں بچے نو دس سال کے تھے ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی۔ میں نے سرگوشی میں ان سے کہا۔

”آپ شور مت کرنا اپنی امی کے منہ پر پانی مارو اور پلاؤ بھی۔“

لڑکی ہوشیار تھی اس نے سر ہلایا اور کونے میں رکھے گھڑے کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے آس پاس دیکھا ایک طرف جگہ بچنے کے لیے چار پائی کو لمبا کیے رخ سے دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا تھا۔ دیوار اس سے دو فٹ اوپر تھی اور چھت دیوار سے دو فٹ اوپر تھی۔ میں نے پھتول جیکٹ میں رکھا اور پائے پکڑ کر چار پائی پر چڑھ گیا۔ شکر ہے اس نے میرا جوہ برداشت کر لیا اور ٹوٹی نہیں۔ دیوار پر ہاتھ رکھ کر میرا کام آسان ہو گیا لیکن میں نے فوراً چھت پر جانے سے گریز کیا عین ممکن تھا وہ میرا غنظر ہوتا کہ میرے سر میں بھی سوراخ کرے اور اس کے بعد اطمینان سے یہاں سے فرار ہو جائے۔ میں نے ذرا سا سر نکال کر فوراً نیچے کر لیا لیکن کسی طرف سے بھی گولی نہیں آئی تھی۔ دوسری بار سر نکال کر نیچے کیا اور تیسری بار میں چھت پر چڑھ گیا۔ چھت خالی تھی۔

وہ غیبیث دوسری چھت سے ہوتا تیسری چھت پر جا رہا تھا اس نے میرے انتظار میں وقت ضائع کرنے کی حماقت نہیں کی تھی۔ اس کی بجائے اسی میں تھی کہ جلد از جلد یہاں سے نکل جائے۔ اس مکان کے تینوں طرف موجود مکان تین منزلہ تھے۔ اوپر کوئی ایسی چیز بھی نہیں تھی جس کی مدد سے وہ اوپر چڑھتا۔ پھر میری نظر ایک مکان کی نکل ہوئی اینٹوں پر گئی۔ دیوار مضبوط بنانے کے لیے اینٹیں سیدھی نہیں رکھتے ہیں بلکہ اینٹ پر آدھی اینٹ رکھتے ہیں اور آدھی دوسری اینٹ پر ہوتی ہے اس طرح دیوار مضبوط بنتی ہے اور ایک ڈیزائن بھی بن جاتا تھا۔ یہی ڈیزائن آدھی اینٹ کو دیوار کے کونے سے باہر نکال دیتا ہے۔ وہ یقیناً ان ہی اینٹوں کے سہارے دوسری چھت تک گیا تھا میں بھی اسی ترکیب سے اوپر آیا اور نیچے جاتے جاتے بچا کیونکہ آخری اینٹ ہاتھ میں لیتے ہی ٹوٹ گئی تھی اگر میں بردقت چھت کا کنارہ نہ تھا م لیتا تو نیچے جاتا البتہ اینٹ دھماکے سے نیچے گری اور کوئی چلایا۔

”اے کی اے اوتے۔“

لسبے بالوں والا تیسرے مکان کی چھت پر پہنچ گیا تھا شور پر اس نے چونک کر دیکھا اور اس بار میں نے اسے واضح کر دیکھ لیا وہ منحوس صورت فاضلی ہی تھا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا اور ایک فائر کر کے دوڑ پڑا۔ گولی نہ جانے کہاں گئی اور میں اس کی پروا کیے بغیر چھت پر آ گیا۔ فاضلی مجھ سے مشکل سے پچاس فٹ دور تھا میں نے اطمینان سے اس کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ میں نے خیال رکھا تھا کہ گولی اوپر نہ لگے اس کے پیروں پر لگے۔ تیسری فائر پر اس نے قلابازی کھائی اور میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے دوڑ کر دو چھتیں پار کیں اور تیسرے چھت پر آیا فاضلی یہیں سے غائب ہوا تھا لیکن غائب ہونے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ چڑھتے دن میں آس پاس گری سوئی بھی صاف دکھائی دیتی۔ فاضلی جن یا بھوت بھی نہیں تھا۔ چھت کے کنارے والی جگہ پر تازہ خون گرا تھا میں نے انگلی لگا کر چپک کیا یہ خون ہی تھا۔

اگلی چھت ذرا نیچی تھی اور شاید کسی خاندانی کباڑی کی تھی کیونکہ اس چھت پر لوہا لکڑ، ٹوٹی چار پائیاں،
فرنیچر، ڈبے، ٹن اور نہ جانے کیا کیا بڑا تھا اور کب سے بڑا تھا چھت یقیناً بہت مضبوط تھی ورنہ اس ننوں وزنی لمبے

تیلے سے بیٹھ جانا چاہیے تھا۔ فاضلی قلابازی کھا کر یقیناً اسی چھت پر گیا تھا لیکن وہ کہاں تھا یہ نہیں معلوم تھا اگر وہ اس کباڑ میں کہیں چھپ گیا تھا تو اسے تلاش کرنا آسان نہیں تھا اور وہ مسلح بھی تھا جیسے ہی میں نیچے اترتا وہ آرام سے مجھے گولی مار دیتا۔ اس کا بھی امکان تھا کہ وہ بیڑھیوں سے نیچے اتر گیا ہو۔ میں نے ذرا پیچھے ہو کر دس کم تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا۔ ”تم اگلی گلی کے سرے تک آ جاؤ اور آس پاس سے ہوشیار رہنا اس کے پاس موبائل ہو گا وہ مدد منگوا سکتا ہے۔“

”فکر نہیں..... میرے آدمی بھی آگئے ہیں۔“ وسیم نے کہا۔ ”وین مونا کو اسپتال چھوڑ کر واپس آرہی ہے۔“

”سفیر اور سعد یہ کہاں ہیں؟“

”سعدیہ کو عبداللہ نے واپس کوٹھی بھیج دیا ہے۔“

”وسیم ہمیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے مرشد ہمارے پورے پلان سے واقف ہے۔ اس نے بھی متبادل منصوبے سوچ رکھے ہوں گے۔“

”ہوسکتا ہے جناب۔“

میں نے محفوظ رہ کر چھت کا جائزہ لیا۔ بیڑھیوں والا حصہ کا ٹھکباز سے صاف تھا یہ جگہ استعمال کی جاتی تھی کپڑے سکھانے کے لیے اور گرمیوں میں چھت پر سونے کے لیے۔ یہاں دو عدد تخت کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے ایک بار سوچا اور پھر خطرہ مول لیتے ہوئے دوڑ کر نیچے کودا اور قلابازی کھاتا ہوا ایک تخت کے پیچھے جا گرا۔ فاضلی کی چلائی گولی میرے پاس سے گزری تھی۔ میں بچ گیا اور فوراً ایک تخت کی آڑ میں ہو گیا۔ فاضلی لوہے کی ایک پٹنی کے پیچھے تھا۔ میرا دل باغ باغ ہو گیا۔ وہ بالکل ٹھیک جگہ پھنسا تھا۔ اس مکان کے تین طرف دو منزلہ مکان تھے اور اتارنے کے واحد راستے یعنی بیڑھیوں پر میں بیٹھا تھا۔

”فاضل میرا خیال ہے کوئی تمہاری..... میں لگی۔“ میں نے ایک ناقابلِ ذکر جگہ کا ذکر کیا۔ ”اب عافیت اسی میں ہے کہ تمہارا ڈال کر سانے آ جاؤ ورنہ کتے کی موت مارے جاؤ گے۔“

جواب میں مشتعل فاضل نے کئی وزنی گالیوں کے ساتھ ایک گولی بھی ارسال کی تھی جو تخت میں سوراخ کرتی مزر گئی۔ میں محتاط ہو گیا میں اسے محفوظ آؤ سمجھ رہا تھا وہ بالکل بھی محفوظ نہیں تھی۔ میں نے جلدی سے دوسرے تخت کی آؤ لے لی۔ اگرچہ یہ بھی محفوظ نہیں تھا لیکن ایک کے بجائے دو تختوں سے مزر کر آنے والی گولی یقیناً کم خطرناک ہوتی۔ میں نے قہقہہ مارا۔ ”صرف ایک گولی اور تین گالیاں..... لگتا ہے تمہارے پاس دونوں کا شاک کم ہو گیا ہے۔“

جواب میں اس نے ایک فائر اور کیا۔ شاید یہ بتانے کے لیے کہ اس کے پاس گولیاں کم نہیں ہیں لیکن اس کی ایک فائر کی حکمت عملی بتا رہی تھی کہ گولیاں سچ جگہ کم پڑ گئی تھیں۔ میں نے دسہم کمرخان کی نشاندہی کی۔ ”تم“ نہیں آ جاؤ..... بچے کوئی ہوتا اسے قابو کر لیتا۔“

”ٹھیک ہے لیکن آپ جلدی کریں فائروں کی آواز یہاں تک آرہی ہے اور جلد یا بدیر پولیس آجائے گی۔“

وسیم کی بات سے ایک خدشہ اور میرے ذہن میں آیا تھا۔ فاضلی کے پاس موبائل کی موجودگی یقینی تھی اور اس نے مدد تو طلب کی ہوگی ساتھ ہی پولیس کو بھی کال کر دی ہوگی۔ پولیس مرشد کی خادمہ تھی اس لیے فاضلی کے طلب کرنے پر دوڑی چلی آتی۔ فاضلی اسی وجہ سے فرار کے بجائے اس محفوظ جگہ دبک گیا تھا۔ میں نے گھڑی اتار کر اس کا چکیلا ڈائل تخت سے باہر کر کے اس مکنہ جگہ کا جائزہ لیا جہاں فاضلی دبکا ہوا تھا وہاں زیادہ لوہے کا کاٹھ کھاڑا تھا جو اسے پناہ مہیا کر رہا تھا۔ میں نے گھڑی ساکت رکھتے ہوئے کہا۔ ”فاضلی کتے کی اولاد..... باہر آ جا تیرے پاس صرف تین منٹ کی مہلت ہے۔“

”اس کے بعد تم ایٹم بم پھینک دو گے؟“ اس نے طنز کیا۔

”نہیں میں مرشد کی طرح بے پناہ مال حرام نہیں رکھتا کہ اس خود کار گن جیسا ہنگامہ اسلحہ خرید سکوں لیکن تم جانتے ہو دہشتی بم ہمارے ہاں کتنی آسانی سے مل جاتا ہے۔ میرے پاس ایک عدد دہشتی بم ہے وہ میں نے پھینک دیا تو تم یہیں مارے جاؤ گے۔“

اسے سانپ سونگھ گیا تھا پھر اس نے کہا۔ ”اگر تم نے دہشتی بم استعمال کیا تو کیا خود بچ جاؤ گے؟“

”ہاں کیونکہ میں میٹر جیوں کے پاس ہوں بم ارسال کرتے ہی میں نیچے اتر جاؤں گا اور جھپٹ بیٹھ کر تب بھی میٹر جیاں بچ جائیں گی۔“

”پھینک دو۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔ ”تمہارے سامنے ہتھیار ڈالنے سے بہتر ہے میں یہیں مر جاؤں۔“

”فکرمات کرو تمہیں اتنی آسانی سے مرنے نہیں دیں گے۔“

”میں مکان کے سامنے ہوں جناب۔“ وسیم کی آواز آئی۔ ”یہاں تالا لگا ہے اور محلے والے بھی جمع ہیں۔“

میں نے مکنہ حد تک دھیمی آواز میں جواب دیا۔ ”تالا توڑ کر اندر آ جاؤ خود کو کسی ایجنسی کا نمائندہ ظاہر کرو اور لوگوں سے کہو کہ اندر خطرناک مجرم ہیں جنہیں گھیر لیا گیا ہے۔ ایک ایس ایم ایس کر رہا ہوں وہ دیکھو۔“

دھیمی آواز میں بات کرنے کے باوجود مجھے شبہ تھا کہ فاضلی تک آواز جاری ہوگی۔ میں نے اصل بات ایس ایم ایس میں کی اور وسیم کا جواب آیا کہ دو منٹ اور لگیں گے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ آئے والی تھی۔ تین منٹ بعد نیچے مکان کا تالا ٹوٹنے کی آواز آئی اس سے پہلے وسیم نے خود کو کسی خفیہ ایجنسی کا نمائندہ ظاہر کر کے لوگوں کو منتشر ہونے پر مجبور کر دیا تھا وہیں گلی میں آگئی تھی۔ اس دوران میں گھڑی کے شیشے سے فاضلی پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ اس کاٹھ کھاڑے میں سکون سے بیٹھ تھا۔ مسلسل حرکت کر رہا تھا۔ شاید اس کا زخم بھی اس بے چینی کی وجہ تھا تالا ٹوٹنے ہی میں نے اعلان کیا۔

”اب تمہارے پاس صرف دو منٹ کی مہلت ہے اس کے بعد.....“

مشغول فاضلی نے ناقابل اشاعت الفاظ میں بتایا کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ وہ محسوس کر چکا تھا کہ وہ بری طرح پھنس گیا ہے زخمی الگ ہے اور اس کے مددگار بھی نہیں پہنچے تھے جب کہ دشمن آگئے تھے اس لیے اس کا حوصلہ جواب دے رہا تھا۔ وسیم نے سرگوشی کی۔ ”میں اندر آ گیا ہوں جناب۔“

”ٹھیک ہے خاموشی سے اوپر آ کر وہ چیزیں مجھے دے دو اور واپس نیچے جا کر انتظار کرو۔“

”ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ نیچے آ جائیں اور میں.....“

”مجھے معلوم ہے وہ کہاں ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹی۔

وسیم دبے قدموں میٹر جیوں تک آیا۔ میں نے اسے خبردار کیا کہ مرمت نکالنا۔ اس نے سامنے آئے بغیر دونوں چیزیں میری طرف اچھال دیں اور میں نے انہیں کچھ کر لیا۔ یہ دو چیزیں تھیں ایک گیس ماسک اور دوسرا گیس بم۔ ماسک چہرے پر چڑھا کر میں نے چھوٹے باڈی اسپرے ساز اور صورت کے گیس بم کی چابی گھمائی اور فوراً اس سے دھواں خارج ہونے لگا۔ میں نے بم اس کاٹھ کھاڑے میں پھینک دیا جس میں فاضلی چھپا ہوا تھا۔ میں نے جان بوجھ کر اسے ذرا دور پھینکا تھا تاکہ وہ اسے فوراً کہیں اور نہ پھینک دے۔ بم سے گیس خارج ہونے کی رفتار بہت تیز تھی۔ فاضلی نے چلا کر گالی دی اور میری طرف اندھا دھند فائرنگ کی۔ میں پہلے ہی نیچے لیٹ گیا تھا اور سر باز دوں میں چھپا لیا۔ گولیاں دونوں تختوں کے پار ہو رہی تھیں اور اس کی چوٹی یا پانچویں گولی میری کمرے سے گزر کھائی گزر گئی۔ ایسا لگا جیسے کسی نے گرم چھری مرچیں لگا کر کمر پر پھیر دی ہو۔ میں بے ساختہ کرہا تو وسیم نے بے چینی سے کہا۔

”کیا ہوا جناب؟“

”کچھ نہیں ایک گولی کمر کو چھوتی گزر گئی ہے۔“ میں نے زخم ٹٹولتے ہوئے کہا میری انگلیوں سے خون لگ رہا تھا۔ زخم لمبا تھا لیکن گہرا نہیں تھا۔ فاضلی کا پستول خالی ہو گیا تھا اور وہ اسے بھرنے کے قابل نہیں رہا تھا کیونکہ گیس اس تک پہنچ گئی تھی اور وہ کھائے کھائے کر بے حال ہو رہا تھا۔ گیس سے بچنے کے لیے وہ اپنی پناہ گاہ سے نکل آیا تھا اور اب کھلی جگہ کے پاس ہی تھا لیکن میں نے اٹھ کر سامنے آنے کی حثیت نہیں کی۔ اس کے پاس لازمی ایک سے زیادہ ہتھیار تھے۔ مجھے سامنے آنے کی ضرورت بھی نہیں گیس خود اس کا کام کر دیتی۔ چھت اب دھواں دھار ہو رہی تھی۔ فاضلی کھلی جگہ تھا اور میں اسے آسانی سے نشانہ بنا سکتا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ میں اسے مارنا نہیں چاہتا ہوں زندہ گرفتار کر کے لے جانا مقصد ہے اسی لیے وہ چائے لے کر کھلی جگہ آیا تاکہ میں بھی کھلی جگہ آؤں تو وہ مجھ پر وار کر سکے۔ میں اسے موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ ایک ٹانگ سے لنگڑا رہا تھا شاید گولی اسی میں لگی تھی۔

”شباز۔“ اس نے مجھے لاکار۔ ”سامنے آ.....“

جملے کے خاتمے پر اس نے چار پانچ مرصع گالیاں شامل کی تھیں۔ اس کی آواز سے لگ رہا تھا کہ گیس اس پر اثر کر گئی ہے اور وہ زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ جیسے ہی وہ سانس لیتا اسے کھانسی کا دورہ پڑ جاتا تھا گیس اب مجھ تک آگئی تھی لیکن میں ماسک کی وجہ سے محفوظ تھا۔ بالآخر فاضلی لڑکھڑایا اور فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے ایک منٹ اور انتظار کیا اور پھر آڑے نکل آیا فاضلی بے ہوش ہو چکا تھا میں نے اس کی کھلی اور ایک چھوٹا پستول برآمد کر لیا یہ بھرا ہوا تھا اور فاضلی اس کے استعمال کی حسرت لیے بے چینی سے جھٹکتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس سے ایک بڑا خطرناک قسم کا کمانڈو چاقو بھی نکلا تھا۔ میں نے یہ سارے ہتھیار اسے سے لے لیے۔ اسے کھینچ کر میٹر جیوں تک لے آیا۔ گیس یہاں تک آگئی تھی اور وسیم میری مدد کو نہیں آ سکتا تھا اس مرد کے

ڈھو کر نیچے لے جانا تھا لیکن اس وقت میں نے شکر کا سانس لیا جب وسیم کو ماسک سمیت بیڑھیوں پر موجود پایا۔
 ”پکڑا گیا نا“ وسیم نے فاضلی کی طرف دیکھا اور کھینچ کر شانے پر ڈال لیا۔ ”اس حرامی کو بھی پہنچاتے ہیں حویلی کے تہہ خانے۔ آپ ٹھیک ہیں نا؟“

”ہاں یار معمولی سا زخم ہے۔“ میں اس کے پیچھے نیچے اترا۔ گھر والے کہیں گئے ہوئے تھے اور اچھی بات تھی کہ بچ گئے ورنہ فاضلی ان کو پرغمال بنا سکتا تھا یا راستہ روکنے پر بے دریغ اڑا دیتا۔ وسیم نے وین پہلے ہی دروازے تک منگوائی تھی۔ اس نے ماسک نہیں اتارا تھا میں نے بھی ماسک اتارنے سے گریز کیا اچھی بات تھی جتنے کم لوگ ہماری صورت دیکھتے اتنا ہی اچھا ہوتا۔ وسیم نے فاضلی کو دین کے عقبی حصے میں ڈالا اور میں اس سے ہیلمٹ لیتا ہوا بایک کی طرف بڑھا۔ میں آگے نکلا اور سن پیچھے آئی تھی۔ خفیہ ایجنسی کا نام سن کر لوگ گلی سے غائب ہو گئے تھے اور اب کھڑکیوں اور دروازے کے جھروکوں سے جھانک رہے تھے۔ وسیم نے موبائل پر میرے زخم کے بارے میں پوچھا۔ ”وین میں ڈریسنگ کا انتظام ہے۔“

”نہیں میں جا کر ڈریسنگ کرا لوں گا۔ فاضلی کی پوری تلاشی لو یہ بہت خطرناک آدمی ہے اس کا موبائل آف کر دو اور اس کا الیکٹرانک چیک بھی کرو اس کے پاس کوئی سگنل دینے والا آلہ نہ ہو۔“
 ”آپ نے فکر کریں میں ابھی چیک کر رہا ہوں اوہ..... اس کے تعویذ میں کچھ ہے۔“
 وسیم نے فاضلی کے گلے میں موجود تعویذ میں کوئی سگنل دینے والا آلہ دریافت کر لیا تھا وہ اس نے وین سے باہر پھینک دیا۔ میں نے کال کاٹ کر عبداللہ کا نمبر ملایا۔ ”عبداللہ مونہ کا کیا حال ہے؟“
 عبداللہ کچھ دیر خاموش رہا تھا پھر اس نے کہا۔ ”ڈاکٹر اسے آپریشن روم میں لے گئے ہیں۔ شہباز صاحب آئی تھنک شی از مس کیرج۔“

میرے دل میں ایک کانٹا سا چھب گیا۔ کیا بچ مونا اور سفیر کی یہ پہلی خوشی چھن جائے گی؟ میں نے سفیر کا پوچھا۔ ”وہ مونا بی بی کے ساتھ ہے۔“
 ”اس کے پاس موبائل ہے؟“

”ہاں موبائل ہے۔“ عبداللہ نے بتایا۔ ”آپ کہاں ہیں؟“

”میں اور وسیم فاضلی کے پیچھے تھے یہ سب اسی حراخراڈے کا کیا دھرا ہے۔“

عبداللہ یہ سن کر بے تعلب ہو گیا۔ ”تو آپ نے اسے پکڑ لیا؟“

”ہاں شکر ہے وہ ہاتھ آگیا وسیم اسے لے جا رہا ہے تم اس سے بات کر لو۔“ میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ میں اس آبادی سے غاصا دور نکل آیا تھا۔ اور اب خطرے کی بات نہیں تھی اس لیے میں نے سڑک سے ہٹ کر ایک درخت کے ساتھ بایک روک دی اور سفیر کو کال کی۔ اس نے چند تیل کے بعد کال ریسیو کی۔
 ”شہباز۔“ اس نے بوجھل لہجے میں کہا تو میں سمجھ گیا۔

”سفیر کیا ڈاکٹر نے تصدیق کر دی ہے؟“

”ہاں یار انہوں نے تو آپریشن کے لیے سائن بھی کرا لیے ہیں اگر دیر ہوئی تو مونا کی زندگی کو بھی خطرہ ہو جائے گا۔“ سفیر بولا۔ ”تو کہاں ہے؟“

”ہم نے اس واقعے کے ذمے دار کتے کو پکڑ لیا ہے وسیم اسے لے گیا ہے۔“

”کون ہے وہ؟“

”مرشد کا پالتو..... فاضلی۔“ میں نے کہا۔ ”تو فکر نہ کر میرے یار نقصان تو ہوا ہے لیکن مجرم بھی نہیں بچے گا۔“

”فاضلی صرف ایک مہرہ ہے اصل مجرم مرشد ہے۔“ سفیر نے تعنی سی کہا۔

”میرا اشارہ اسی کی طرف ہے۔ فاضلی اکھاڑ کا بہت اہم آدمی ہے وہ اس کے بارے میں بہت کچھ بتائے گا۔“

سفیر کو تلی دے کر میں نے موبائل بند کیا۔ وسیم کا ایک آدمی میرے ساتھ رک گیا تھا۔ میں نے اسے بھی رخصت کیا اور دوبارہ عبداللہ کو کال کر کے سعدیہ کے بارے میں پوچھا اس نے بتایا کہ وہ واپس کوٹھی پہنچا دی گئی ہے اور اس نے کوٹھی کی سیکورٹی کو الٹ کر دیا ہے اس کے چھ آدمی اسپتال میں تھے۔ اسپتال کے باہر دو آدمی وسیم کے بھی تھے۔ اس طرف سے تسلی ہوئی تو میں نے فارم جانے کا سوچا لیکن پھر مجھے خیال آیا۔ گزشتہ روز میں نے جس بنگلے کے لیے بات کی تھی وہ یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس کے مالک افغان احمد نے مجھ سے کہا تھا کہ دن میں کسی وقت اس سے مل لوں۔ میں نے وسیم اور عبداللہ کو اس بارے میں ایس ایم ایس کیا اور روانہ ہو گیا۔ مری روڈ پر واقع یہ بنگلہ مین روڈ کے ساتھ ہی تھا اور اس کے آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی۔ پورا بنگلہ ایک چھوٹے سے ٹیلے پر تھا۔ مین گیٹ تک جانے کے لیے پتھروں سے بنا خوب صورت ڈرائیو دے تھا اور گیٹ ہی سڑک سے کوئی بیس فٹ بلند تھا اندر بنگلے کی اصل عمارت اس سے زیادہ بلندی پر تھی۔ یہ کوئی باقاعدہ اسکیم نہیں تھی پتا نہیں افغان احمد نے یہاں مکان بنانے کی اجازت کس طرح حاصل کی تھی۔ میں نے کال تیل بجائی تو کچھ دیر بعد اندر سے ایک تقریباً چالیس برس کا گورا چٹا اور سفید فرنج کٹ والا آدمی نکلا اس کی داڑھی اور سر کے بال بالکل سفید تھے۔ یہ سفیدی عمر کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ یہ بالوں کا اصلی رنگ تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”افغان احمد؟“

”جی میں ہی ہوں۔“

”شہباز احمد..... آپ سے مکان کے سلسلے میں بات ہوئی تھی کل۔“

اس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ ”میں نے پہچان لیا آئیے اندر آئیں۔“

وہ مجھے اندر لے گیا کوٹھی کے سامنے والے حصے میں چھوٹا سا خوب صورت لان تھا ٹیلے کی ڈھلان کو برقرار رکھتے ہوئے باغ ترتیب دیا گیا تھا۔ پورچ تک ڈرائیو دے ڈھلان کی صورت میں تھا لیکن پورچ ہموار تھا اور اسی طرح رنگ برنگے پتھروں سے بنا کر ہموار کیا گیا تھا۔ مکان دو منزلہ اور خوب صورت جدید انداز کا بنا ہوا تھا اس میں شیشے کا کام بہت زیادہ تھا اوپر کم سے کم دو کمروں میں گلاس والی تختی ممکن ہے پیچھے کی طرف بھی ہو لیکن ساتھ ہی ڈیزائن والی فولادی گرلز سے حفاظت کا بھی پورا انتظام تھا۔ پورچ کے ساتھ ایک بڑا کمرہ تھا یہ نشست گاہ ثابت ہوئی۔ اس میں وال ٹوال وال کارپٹ کے ساتھ سادہ لیکن خوب صورت انداز کے دو بڑے صوفہ سیٹ تھے۔

ایک طرف بڑی سی گلاس ٹاپ والی ڈاننگ ٹیبل تھی جس کے گرد دس کرسیاں تھیں۔ صرف یہی کمرہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ باقی گھر کس طرح سے فرنش ہوگا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ اپنا سجا سجا گھر اس طرح سے کرائے پر دے رہا تھا۔ میرے اس سے پہلا سوال یہی کیا تھا۔

”مجبوری ہے۔“ افنان احمد نے گہری سانس لی۔ ”میرا ایک ہی بیٹا ہے جو امریکہ میں پڑھ رہا ہے۔ آج کل وہاں کے جیسے حالات چل رہے ہیں میں چاہتا ہوں کہ اس کے پاس جا کر رہوں۔ حالانکہ یہ گھر میں نے رہنے کے لحاظ سے بنایا ہے اور ایک سال پہلے ہی مکمل ہوا ہے۔“

اس نے پہلے مجھے چائے بنا کر پیش کی۔ پھر اس نے پورا گھر دکھایا۔ اوپر تین بہت اچھی طرح فرنش کیے ہوئے تین بیڈروم تھے تینوں منجھتاہ کے ساتھ تھے۔ نیچے بھی ایک بیڈروم تھا۔ کچن مکمل تھا اور اس میں ضرورت کی ہر چیز لگی ہوئی تھی۔ جب ہم واپس ڈرائنگ روم میں آئے تو میں نے کہا۔ ”مجھے آپ کا مکان پسند آیا ہے۔ شرائط بھی مناسب ہیں۔ یہ بتائیں کہ معاہدہ کرنے کب آؤں۔“

”آج شام کو آجائیں۔“ اس نے کہا۔ ”میرے پاس معاہدہ نامہ تیار ہے بس اس پر میرے آپ کے اور دو گواہوں کے سائن اور این آئی سی کی کاپی لگانی ہوگی۔“

”ٹھیک ہے میں آج شام یا کل صبح حاضر ہو جاؤں گا اور ادائیگی کیش کی صورت میں کروں گا۔“

اس نے کسی قدر تامل کے ساتھ کہا۔ ”لیکن میں بینک ڈرافٹ کو ترجیح دوں گا۔“

”ٹھیک ہے لیکن اس صورت میں یہ کام کل صبح ہی ہو سکے گا۔“

”کوئی مسئلہ نہیں ہے کل صبح سہی۔“ وہ خوشدلی سے بولا۔ ”دراصل آج کل حالات ایسے نہیں ہیں کہ آدمی اتنے بڑے کیش کو سنبھالے اس میں مالی نقصان کے ساتھ جان کا رسک بھی ہوتا ہے۔“

وہ مجھے چھوڑنے باہر نکل آیا تھا۔ میں نے واپس جانے کے بجائے اسپتال جانے کو ترجیح دی۔ پہلے میں نے اوپنی ڈی میں جا کر اپنے کمرے کے زخم کی مرہم پٹی کرائی۔ کپاؤڈر نے زخم صاف کر کے اس پر خشک کرنے والا کپاؤڈر چھڑک کر اوپر سے چکنی پٹی رکھ کر سخت ٹیپ لگا دیا۔ اس نے مجھے ایک دن پانی سے احتیاط کا کہا اور ایک انجکشن بھی لگا دیا۔ زخم معمولی خراش کی صورت میں تھا۔ اوپنی ڈی سے باہر آ کر اندر جانے کے بجائے میں نے سفیر کو کال کر کے باہر بلا لیا تھا۔ اس کے ساتھ عبداللہ بھی آیا تھا۔ مونا آپریشن کے بعد کمرے میں شفٹ کر دی گئی تھی اور اس کی حالت خطرے سے باہر تھی لیکن اسے دو دن اسپتال میں ہی رہنا تھا۔ عبداللہ نے اسپتال انتظامیہ سے بات کر کے اندر دو مسلح محافظ رکھوا دیئے تھے۔ باہر اس کے چار آدمی مستقل موجود رہتے اور ان کا اندر کے آدمیوں سے ریڈیو پر رابطہ رہتا۔ اندر والے چھوٹے اسٹے سے مسلح تھے لیکن باہر موجود گارڈز کے پاس جدید خود کار اسلحہ اور دو عدد گاڑیاں تھیں۔ میں نے سفیر سے کہا۔ ”یاد رہے انتظامات کے بجائے مونا کو کوٹھی منتقل کر کے ڈاکٹر اور نرس کو وہیں نہ بلوایا جائے؟“

”میں نے بھی یہی کہا تھا لیکن جس لیڈی ڈاکٹر نے آپریٹ کیا ہے اس کا کہنا ہے کسی بھی امیر جنسی کی صورت میں مونا بی بی کو دوبارہ اسپتال ہی لانا پڑے گا۔ اس لیے اسپتال میں رکنا لازمی ہے۔“

”ایئر کلب والے معاملے کا کیا ہوا؟“

عبداللہ بولا۔ ”مجھے علاقے کے ایس پی کی کال آئی تھی میں کچھ دیر میں اس سے ملنے جا رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے کوشش کرنا کہ سعدیہ کا ذکر نہ آئے صرف مونا اور سفیر کا ذکر بھی کافی ہے۔“

”میں سمجھ گیا۔ میری کوشش ہوگی لیکن اس میں ایئر کلب والے بھی شامل ہیں اور وہ غلط بیانی نہیں کریں گے۔“

”راجا صاحب سے بات کرو وہ اوپر سے کوئی جیک لگائیں۔“

”راجا صاحب سے میں نے بات کی ہے امید ہے وہ کسی مشکل کی صورت میں معاملے کو سنبھال لیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں نے مری روڈ پر راول چوک سے ذرا آگے ایک کوٹھی دیکھی ہے جو ایک بلند نیلے پر ہے۔“

”جائے ہوئے بائیں طرف آتی ہے اوپر والے حصے میں گلاس وال بھی ہے۔“ عبداللہ نے تصدیق چاہی۔

”بالکل یہی کوٹھی ہے فرنش حالت میں پورے سال کے لیے کرائے پر مل رہی ہے۔ میں نے لینے کا فیصلہ کیا ہے میرا آئی ڈی کارڈ تمہارے پاس پڑا ہے وہ مجھے چاہیے اور ہاں ایک دس لاکھ کا بینک ڈرافٹ افنان احمد کے نام سے چاہیے۔“

”ہو جائے گا لیکن یہ کام کل ہی ہو سکے گا۔“

”ظاہر ہے میں تم سے کل صبح لے لوں گا۔ وسم سے بات ہوئی؟“

”ہاں اس غیبیٹ کے بارے میں سنا تھا۔“ عبداللہ بولا۔ ”میری بھی خواہش ہے اسے دیکھوں اس نے بہت چلر دیے ہیں۔“

”جلد تم دیکھ سکو گے۔“ میں نے کہا۔ ”سفیر نہیں رہے گا۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں اسے اس حال میں چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔“

میں نے سوچ کر کہا۔ ”چلو ٹھیک ہے مونا کو ویسے بھی اس کے مورال سپورٹ کی ضرورت ہے۔“

”میں نے ایاز کو اسپتال کے باہر رہنے کے لیے بلا لیا ہے۔“

”باہر کے بجائے وہ اندر رہے تو زیادہ بہتر ہوگا۔“ میں نے ہدایت کی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میرا زیادہ دیر یہاں ٹھہرنا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ مرشد کے دوسرے کتوں کی یہاں موجودگی کا امکان تھا۔ راستے میں، میں نے وسم کا نمبر ملایا۔ ”کہاں ہو تم؟“

”ہم پہنچ گئے ہیں ابھی اس ولد الحرام کی مرہم پٹی کر رہے ہیں پھر اس سے پوچھ گچھ کرتے ہیں۔“

میں خود فاضلی سے بات کرنے کا مشتاق ہو رہا تھا۔ ”میں آ رہا ہوں۔“

”یہ اور اچھا رہے گا۔“

میں نے راستے میں بیٹو کو کال کی اور اسے مختصر ا صورت حال سے آگاہ کرنے کے بعد صابر اور اس کی بیٹی کا پوچھا۔ مونا کا سن کر اسے دکھ ہوا تھا اس نے صابر کے بارے میں بتایا۔ ”وہ بہت شور کر رہا تھا لیکن ہم نے نہیں

فاضلی کے لیے تو یہ بات ناقابل یقین تھی۔ دسم نے بھی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے سر ہلایا کہ بعد میں بتاؤں گا پھر میں عبدل اور اسلم کی طرف آیا۔ ”تم دونوں نے کیا فیصلہ کیا ہے، مرشد کے بارے میں بتاؤ گے۔“

اسلم خوف زدہ تھا اس نے دیکھ لیا تھا کہ ہم مرشد کے اہم ترین آدمی کو بھی پکڑ لائے تھے اس نے کہا۔ ”میں جو جانتا ہوں وہ سب بتا دوں گا۔“

فاضلی نے عقب سے قہقہہ لگایا۔ ”تم جانتے ہی کیا ہو کتے کے پلے تم صرف بھوکا کتے ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

میرا بھی یہی خیال تھا انہیں مرشد کے ساتھ ملے ہوئے چند دن ہوئے تھے اور مرشد ان پر اس حد تک بھروسہ نہیں کر سکتا تھا کہ انہیں کوئی اہم بات معلوم ہو۔ عبدل ابھی حوصلے کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ شاید اسے امید تھی کہ اسے چھڑا لیا جائے گا۔ میں نے دسم کی طرف دیکھا۔ ”فاضلی ٹھیک کہہ رہا ہے یہ صرف بھونکنے والے پلے ہیں مرشد کا اصل کتا یہ خود ہے جو بھونکتا بھی ہے اور کتا بھی ہے یہی اس کے بارے میں بتائے گا۔ ان دونوں کو ناگ دو۔“

”کیا۔“ عبدل تڑپ کر چلا یا۔ ”تم ہمیں قتل کر رہے ہو؟“

”اسے قتل نہیں انصاف کہتے ہیں۔“ میں نے ہنسی کی۔ ”تم نے مرشد کے آدمیوں کے ساتھ مل کر تین بے قصور عورتوں کے ساتھ جو سولک کیا صرف اسی پر تم کئی بار سزائے موت کے مستحق ہو چکے ہو۔ اس کے علاوہ تم نے انہیں قتل بھی کیا۔ ایک لڑکی اپنی قسمت سے بچ گئی۔ صابر کے ساتھ مل کر تم لوگ اس سے پہلے بھی جرائم کرتے رہے ہو۔“

دسم کے اشارے پر اس کے آدمیوں نے تہہ خانے کی چھت سے لگے کڑوں سے رے گزارے اور پھر ان کا پھندہ بنا کر پہلے اسلم کی گردن میں ڈالا۔ اس کی ہتھکڑی کھول دی تھی اس نے بھر پور مزاحمت کی لیکن اس کی ایک نہیں چلی۔ رسی کھینچتے ہی پھندہ اس کے گلے میں فٹ ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں نہیں بندھے تھے اس لیے وہ ہاتھوں سے پھندہ ڈھیلا کرنے کی کوشش کے ساتھ لائیں بھی چلا رہا تھا۔ ایک بار اس نے پھندہ ڈھیلا کر لیا تھا لیکن دسم کے آدمیوں نے اچانک رسی چھوڑ کر دوبارہ کھینچ لیا۔ اس بار پھندہ سختی سے اس کی گردن میں جھنس گیا اور اس کا دم گھٹنے لگا تھا چند منٹ میں اس کی سانس رک گئی اور زبان باہر نکل آئی تھی۔ موت کے کرب نے اس کے نقوش بگاڑ دیے تھے۔ عبدل دہشت زدہ انداز میں اس کی موت کا تماشا دیکھ رہا تھا اور خوف سے اس کی حالت بری ہو رہی تھی۔ جیسے ہی اسلم کا دم نکلا اس نے چلا تا شروع کر دیا۔

”خدا کے لیے..... مجھے معاف کر دو..... مجھے معاف کر دو۔“

”ان عورتوں نے بھی تم سے زندگی اور عزت کی بھیک اسی طرح مانگی ہوگی۔“ دسم نے اسے لات رسید کی جو سیدھی جڑے پر لگی اور اس کا جڑہ ٹوٹ گیا جب دسم کے آدمی اسے لٹکا رہے تھے تو وہ مضحکہ خیز آواز میں رورہا تھا۔ دو منٹ سے پہلے اس کی لاش بھی رسی سے جھول رہی تھی۔ میری زندگی میں ایسے مواقع کم آئے تھے جب میں نے کسی انسان کو سوچ سمجھ کر موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ عبدل اور اسلم کے لیے میں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا وہ

ساب آرام سے ہے۔“

”ہوشیار رہنا خطرناک آدمی ہے۔ وہ ایک سوٹ کیس لایا تھا میں نے اس میں سے اسلحہ نکال لیا تھا لیکن ممکن ہے کوئی چھپا ہوا اسلحہ ہو اس لیے اگر اس کے کمرے میں جانا پڑے تو بہت محتاط رہنا۔“

”آپ فکر مت کرو۔“ اس نے کہا۔ ”ہم ہوشیار رہے گا۔“

چند دن میں بایک نے خاصی بھاگ دوڑ کی تھی اور مجھے اس میں پیٹرول ڈالنے کا خیال نہیں رہا تھا یہ سارے کام ایاز نے اپنے ذمے لے رکھے تھے لیکن وہ ابھی کوئی تھا اس لیے کسی اور نے زحمت نہیں کی۔ ٹینک تقریباً خالی ہو رہا تھا۔ میں نے راستے میں آنے والے پہلے پیٹرول پمپ سے ٹینک فل کرایا اور جویلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ کھلی سڑک پر بایک نے یہ فاصلہ آدھے گھنٹے میں طے کر لیا جب کہ گاڑی کو پون گھنٹہ لگتا تھا۔ دسم ایک کمرے میں قالین پر شرم دراز چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کا آدمی مجھے دیکھ کر فٹ پائے لے آیا میں بھی اس کے پاس نیم دراز ہو گیا۔ ”یار کھانے کے وقت چائے۔“

”شہباز صاحب پی کر دیکھیں بہت عرصے بعد مرے کی چائے ملی ہے۔“

”کوئلے پر بنائی ہے جی۔“ چائے لانے والا بولا۔

واقعی مرے کی چائے تھی۔ پی کر تھکن اتر گئی اور میں فاضلی کے دیدار کے لیے تازہ دم ہو گیا تھا۔ دسم سونا کے بارے میں جان گیا تھا۔ اس نے افسوس کا اظہار کیا۔ میں نے عبدل اور اسلم کے بارے میں پوچھا دسم بولا۔

”ان کے دم خم خاصے نکل گئے ہیں۔“

”چلو بات کرتے ہیں۔“

فاضلی کو ایک ستون کے گرد لمبی فولادی زنجیر کے دوسرے سرے پر موجود تالے والے کڑے سے باندھا ہوا تھا وہ ایک مخصوص دائرے سے زیادہ حرکت نہیں کر سکتا تھا اور فی الحال وہ حرکت کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔ اس کی ٹانگ سے گولی آپریشن کر کے نکالی گئی تھی۔ عبدل اور اسلم اس سے دور بندھے تھے۔ دسم نے انہیں بھی ستونوں کے ساتھ لگی زنجیروں سے بندھوایا تھا۔ یہ زنجیریں اتنی مضبوط تھیں کہ وہ کسی صورت نہیں کھول سکتے تھے۔ فاضلی نیم غشی کی حالت میں تھا اس کی پینٹ کا پانچ خون میں بھیگا ہوا تھا۔ دسم کے آدمی نے مہارت سے جراحی کی تھی۔ اس نے بتایا۔ ”کل تک اس کی حالت بہتر ہو جائے گی۔“

اچانک فاضلی مٹھ بیٹھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ”شہباز تم نے بلاوجہ مجھے یہاں لانے کی زحمت کی تم مجھ سے کچھ نہیں اگوا سکتے بہتر ہو گا مجھے مار دو۔“

”تمہاری یہ خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن یہ تمہاری خوش فہمی ہے کہ تمہاری زبان بند رہے گی۔ چند دن رک جاؤ اسی جگہ تم سب اگل رہے ہو گے۔“

فاضلی یوں مسکرانے لگا جیسے میں لاف گزاف کر رہا ہوں۔ دسم کو غصہ آ گیا۔ ”تین دن کی کیا ضرورت ہے یہ حرامی آج ہی بولے گا۔ ایک گھنٹے میں اس کے سارے کس بل نکل جائیں گے۔“

”نہیں یار یہ ایسے ہی بولے گا اور اسے ہاتھ لگانے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی یہ خود گز گزاکر بتائے گا۔“

سزائے موت کے پوری طرح مستحق تھے۔ وسیم کے آدمی ان کی لاشیں اوپر لے گئے۔ فاضلی آرام سے ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اس نے ان دونوں کی موت کا ذرا بھی اثر قبول نہیں کیا تھا۔

”مرشد کو اس سے اتنا فرق بھی نہیں پڑے گا جتنا اپنے گندے ہاتھ دھونے سے پڑتا ہے۔“

”تمہارے مرنے سے تو پڑے گا؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مرشد کے پاس آدمیوں کی کمی نہیں ہے بس فرق صرف اتنا ہے کہ وہ گلدھے ہیں اپنی صحیح قیمت وصول نہیں کر پاتے۔“

”تم عقل مند ہو اپنی قیمت صحیح وصول کرتے ہو۔“ میں نے طنز کیا۔ ”لیکن یہ قیمت اپنی قبر میں تو استعمال کرنے سے رہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔ ”یہ قیمت میں نے اپنے لیے نہیں لی ہے جن کے لیے لی ہے وہ ساری عمریش و آرام سے رہیں گے۔“

”تم مرشد کے قریب ترین آدمی ہو اس کے بارے میں سب جانتے ہو۔“

”یہ دعویٰ تو مرشد کی کوئی بیوی بھی نہیں کر سکتی۔ میں بہت کچھ جانتا ہوں لیکن سب نہیں جانتا۔ جو جانتا ہوں وہ تمہیں بتاؤں گا نہیں کیونکہ یہاں مجھے موت ملے گی چاہے میں زبان کھولوں یا نہ کھولوں اور اگر زبان کھول دی تو مرشد میرے گھر والوں کو نہیں چھوڑے گا ورنہ وہ ان سے تعرض نہیں کرے گا۔“

میں اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ میں وسیم کے ساتھ اوپر آیا۔ وسیم نے کہا۔ ”اب اس کا کیا کرنا ہے آپ نے دعویٰ بہت بڑا کر دیا ہے۔“

”میرے ذہن میں ایک خیال ہے۔“ میں نے کہا اور وسیم کو اپنے آئیڈیے سے آگاہ کیا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

”ممکن ہے فاضلی کے معاملے میں یہ حربہ کام نہ کرے۔ ہر شخص کی قوت ارادی مختلف ہوتی ہے۔“

”ہو سکتا ہے لیکن ہمیں کوشش کرنی چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”تم اپنے آدمیوں سے کہو اس پر کام شروع کر دیں۔ دوسری صورت میں اس سے کچھ اگلا لینا بہت ہی مشکل کام ہوگا ہمیں بھی درندگی کی ان انتہاؤں سے گزرنا پڑے گا جن سے شاید ہم نہ گزر سکیں۔ فاضلی نے بتا دیا ہے کہ معاملہ اس کے گھر والوں کی سلامتی کا بھی ہے اس لیے وہ ہر اذیت سے گزر جائے گا۔“

”ٹھیک ہے اس پر عمل کرتے ہیں۔“ وسیم نے کہا۔ ”اب ان دونوں کا کیا کرنا ہے؟“

”ان کا خوب صورت پارسل بنواؤ اور کسی گاڑی والے کو دے کر مرشد ہاؤس بھیج دو۔“

”ساتھ ہی پولیس کو اطلاع نہ کر دیں؟“ وسیم نے تجویز پیش کی۔

”نہیں یار پولیس اس کی نمک خوار ہے۔ وہ فوراً اسے بتا دیں گے۔ اس کے بجائے تم میڈیا کو اطلاع کر دو۔ وہ اپنے کمرے لے کر پہنچ جائیں گے تو مرشد مشکل میں پڑ جائے گا۔“

وسیم نے سوچا۔ ”لیکن اس میں بائسنگ پرفیکٹ ہونی چاہیے ادھر یہ پارسل مرشد ہاؤس پہنچیں ادھر میڈیا والے پہنچ جائیں۔“

”بس کوئی ایسی ہی کوشش کرنی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”بہتر ہوگا ان کا پارسل تابوت اسٹائل میں ہو لیکن لے جانے والے کو شک بھی نہ ہو اسے عام چار جڑ سے زیادہ دو گے تو وہ خوشی خوشی لے جائے گا۔“

”میں عبد اللہ سے بات کر کے سینک کرتا ہوں۔“

وسیم کے آدمیوں نے کمرے کی بجی تیار کی تھی۔ جب ہم اوپر آئے تو دسترخوان بچھا جا رہا تھا کچھ دیر بعد ایک بڑے سے تھال میں بجی کو سچائے دو افراد اندر لائے۔ اسے درمیان میں رکھ دیا۔ بجی سے بھاپ اور اشتہا انگیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ سوائے نگرانی پر مامور افراد کو چھوڑ کر سب کھانے کے لیے آگئے تھے۔ بجی کے ٹانگے کھولے تو اس کے اندر بھرے چاول اور میوے باہر آگئے۔ سب نے اپنی اپنی طرف سے گوشت کاٹ کر اور چاول نکال کر کھانا شروع کر دیا۔ بنانے والا باہر تھا۔ آج ہم بڑے حادثے سے دوچار ہوتے ہوئے رہ گئے تھے۔ مونا اور سفیر کو دھچکا لگا تھا۔ پھر مار دھاڑ اور بھاگ دوڑ کے بعد ابھی ہم نے دو بد بخت افراد کو ان کے کیے کی سزا دی تھی۔ اس کے باوجود ہماری بھوک برقرار تھی اور میں نے ٹھیک طرح سے کھایا تھا۔ یہ پیٹ ایسی چیز ہے جو کسی بھی حالت میں اپنا کام نہیں چھوڑتا ہے۔ کھانے کے بعد میں اور وسیم باہر نکل آئے۔

”یہ ٹھکانہ اچھا ہے لیکن میں نے ایک اور جگہ دیکھ لی ہے۔ کل اس کی بات کر لیں گے۔“

”یہ ضروری ہے ہمارے پاس کئی ٹھکانے ہوں اب تو رقم کا کھن مسئلہ نہیں ہے اپنے پیر صاحب نے مدد فرمائی ہے۔“

”آج بھی فرماتے رہیں گے۔ ان شاء اللہ ان کی مدد سے ان کا پیر غرق کریں گے اور انہیں جہنم رسید کریں گے۔“

”آپ کا کیا ارادہ ہے؟“

”میں سوچ رہا ہوں واپس جا کر صابر سے بات کرتا ہوں۔ میں اسے بریف کیس کی تلاش پر لگاؤں گا۔“

”وہ قابل بھروسہ نہیں ہے۔“

”ہے نہیں لیکن رہے گا۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے سوچ لیا ہے اس کی لڑکی ہمارے قبضے میں رہے گی۔“

وسیم چونکا۔ ”یہ فعال؟“

”بالکل درست..... آج کل شرافت کا دور ہی نہیں ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”لڑکی کو عبد اللہ والی کو بھی پہنچا دیا جائے گا اور صابر کو چھوڑ دوں گا اگر وہ اپنی بیٹی کی صحیح سلامت واپسی چاہتا ہے تو بریف کیس حاصل کرے اور اس کے بدلے اپنی بیٹی لے جائے۔“

وسیم خوش ہو گیا۔ ”آپ نے اس آدمی کا بالکل صحیح مصرف تلاش کیا ہے ورنہ میں تو سوچ رہا تھا کہ اس کا کیا کریں اگر چھوڑتے ہیں تو خدشہ ہے یہ سیدھا مرشد کے پاس جائے گا اور اپنے ساتھ ہمیں بھی مردادے گا۔“

دوسری طرف اسے مارنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا ہے۔ کم سے کم اس کی بیٹی بالکل بے گناہ اور مظلوم ہے۔

”درست..... ہم اسے سعدیہ اور مونا کے ساتھ رکھ سکتے ہیں۔ اسے یہاں یا فارم ہاؤس میں رکھنا تو ممکن نہیں ہے۔“

”آپ صابر سے دو ٹوک بات کریں گے؟“

”مصدق ملک صاحب؟“ لڑکی نے خود تصدیق چاہی تو مجھے ملک مصدق بننے میں کیا اعتراض ہو سکتا تھا کچھ دیر بعد مرشد لائن پر تھا۔

”یار ملک..... کل ہی تو پارٹی میں ملاقات ہوئی تھی۔ سب طے ہو گیا تھا اب کون سی بات یاد آگئی۔“

”بات نہیں تمہاری موت یاد آگئی۔“ میں نے سر دلچھے میں کہا۔

اسے جھکا لگا کیونکہ اس نے میری آواز پہچان لی تھی۔ ”شہباز ملک..... تم.....“

”تم مجھے کوئی بھی نام دے سکتے ہو۔“ میں نے لا پرواہی سے کہا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ کال ریکارڈ ہو رہی ہو گی اس لیے میں نے شہباز ملک ہونے کا اعتراف نہیں کیا۔ ”اصل بات وہی ہے جو میں نے کہی ہے۔“

”تم نے کیوں کال کی ہے؟“

”صرف یہ بتانے کے لیے کہ تمہارا خاص آدمی فاضلی میرے پاس ہے اور اس نے سب اگل دیا ہے۔“

”فاضلی میرا ملازم تھا۔“ مرشد نے کوئی رد عمل ظاہر کیے بغیر سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”لیکن کل رات وہ مرشد ہاؤس سے رقم اور دوسری قیمتی اشیاء چرا کر فرار ہو گیا تھا اس کے خلاف تھانے میں رپورٹ درج کرائی جا چکی ہے۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے اس کی زبان تمہارے کالے کروت کے بارے میں جو اگلے گی وہ مجھے کسی عدالت میں پیش نہیں کرنا ہے۔ مرشد میں تمہیں خود جواب دوں گا اور یہ جواب ایسا ہو گا کہ تمہارے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔“

”تم مجھے..... مرشد علی کو دھمکی دے رہے ہو۔“

”نہیں کالی کوشی کا واقعہ تمہیں سمجھانے کے لیے کافی ہونا چاہیے اس کے باوجود تم نہیں سمجھتے ہو تو مرشد ہمارے پاس دوسرے طریقوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تم بعد میں پچھتاؤ اس لیے ابھی سنبھل جاؤ۔“

”تم تسلیم کر رہے ہو کہ کالی کوشی تم نے تباہ کی ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے اس کی عیاری کا عیاری سے دیا۔ ”مجھے علم ہوا ہے کہ وہاں تمہارے آدمیوں نے شہلا نامی ایک عورت کو غرضی اور جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا تھا اور پھر اسے قتل کر دیا۔ اس کے بعد وہاں کچھ ہوا شاید شارٹ سرکٹ سے آگ لگ گئی اور وہاں موجود گولہ بارود کا ذخیرہ آگ لگنے سے پھٹا اور پوری کوشی تباہ ہو گئی۔ یہ قدرت کی طرف سے تمہیں ایک اشارہ ہے اگر تم سمجھو تو۔“

”شہباز..... مجھے اس کوشی کی تباہی میں بہت بڑے نقصان کا سامنا کرنا پڑا ہے اور یہ تمہیں بھی سُستی نہیں پڑے گی۔“

”تم اس کی فکر مت کرو جلد تمہیں دو تحفے اور ملیں گے۔“

”کیسے تحفے؟“ اس نے پوچھا۔ اسی لمحے کسی نے اس کی خلوت میں مداخلت کی۔ میں نے ایک آواز

سنی۔

”مرشد بادشاہ باہر ایک گاڑی والا دو بجے لایا ہے۔ کسی نے آپ کے لیے بیسجے ہیں۔“

”میرے لیے۔“ مرشد بولا۔ ”میں نے کسی سے کچھ نہیں منگوایا اور نہ کسی نے مجھے کچھ بھیجا ہے جسکے کہاں

میں نے سر ہلایا۔ ”بہتر یہی ہے وہ اپنی بیٹی کو سمجھا دے گا اگر ہم نے زبردستی سے کام لیا تو لڑکی شور مچائے گی یا اسے قابو میں رکھنے کے لیے کہیں قید میں ڈالنا پڑے گا۔“

دسم نے سر ہلایا۔ ”میں فی الحال یہیں ہوں کیونکہ کئی آدمی ابھی چلے جائیں گے عبداللہ کے پاس نفری کم پڑ رہی ہے۔“

”فارم ہاؤس پر ہم تین بھی کافی ہیں۔“ میں نے کہا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ راستے میں ہمیں نے بہت ساری کھانے کی تیار اور ڈبا بند چیزیں لیں اسی طرح بیکری کا سامان لیا۔ میرا ارادہ تھا کہ مانی اور بیٹو کے سپرد یہ چیزیں کروں گا اور ان سے کہوں گا کہ یہی کھاؤ ورنہ باہر لان میں گھاس بہت ہے۔ روز کھانے کے لیے باہر جانا یا بار بار کوریئر سے کھانا منگوانا ٹھیک نہیں تھا اس طرح یہ جگہ اتفاق سے بھی دشمن کی نظر میں آ سکتی تھی۔ وہ دونوں بھوکے پیٹھے تھے اس لیے بیٹو نے جھپٹ کر سارا سامان اٹھایا اور کچن کی طرف روانہ ہو گیا۔ کھاپی کران کے حواس بحال ہوئے تو انہیں آج کے واقعات کا خیال آیا۔ میں نے انہیں کسی قدر تفصیل سے بتایا کہ آج کیا ہوا۔ بیٹو فاضلی کے یکرے جانے کا سن کر خوش ہو گیا اس نے کہا۔

”شونی مجھے اُدھر لے جانا میں دیکھوں گا کیسے اپنی زبان بند رکھتا ہے۔“

”برخوردار وہ بہت اونچی چیز ہے۔ اس کے چکر میں مت پڑو یہ بتاؤ کہ صابر نے کوئی اور ہنگامہ تو نہیں

کیا؟“

”نہیں شرافت سے بیٹھا ہے۔ میں نے صبح ناشتہ دے دیا تھا پھر دوپہر میں کھانا دیا تھا۔“

مانی کھانے کی چیزیں چیک کر رہا تھا اس نے مایوسی سے کہا۔ ”شونی بھائی یہ کیا لانے ہیں؟“

”صبر شکر کر کے کھا لو..... آج کے واقعے سے اندازہ ہو گیا ہے کہ دشمن کس حد تک ہماری نگرانی کر رہا ہے

اور اگر کوئی بلاوجہ باہر گیا تو وہ اس کی نظر میں آ سکتا ہے۔ اب کم سے کم باہر جانا ہو گا۔“

”مونا دیڈی کیسا ہے؟“

”ٹھیک ہے لیکن ابھی اسپتال میں ہے دو دن بعد واپس جاسکے گی۔“ میں نے کہا۔ فاضلی سے یہ تو ثابت ہو گیا تھا کہ مرشد اس کارروائی کے پیچھے ہے اور وہ اب کھلی دشمنی پر اتر آیا ہے غالباً اس نے کالی کوشی کی تباہی کو ہمارے کھاتے میں ڈال کر ہمیں سبق سکھانے کے لیے یہ کام کیا ہے۔ میں فکر مند ہو گیا تھا مرشد نے پہلے بھی اس طرح کھل کر کارروائی نہیں کی تھی وہ مجھے ڈرانے کے لیے ضرور بہت کچھ کرتا رہا تھا اور شاید بھائی کی موت میں بھی اس سے زیادہ نادر کی خواہش کا عمل دخل تھا۔ وہ اپنی معذوری کا انتقام لینے کے لیے پاگل ہو رہا تھا اور جب مجھ پر بس نہیں چلا تو میرے گھر والوں کے خلاف کارروائی کرنے لگا۔ مرشد کو لگا کہ دینا ضروری ہو گیا تھا۔ میرے پاس مرشد ہاؤس کے نمبر تھے۔ انٹرنیٹ کی مدد سے مرشد ہاؤس کے ایک نمبر پر کال ملائی۔ کچھ دیر بعد ایک لڑکی نے کال ریسیو کی۔

”مرشد سے بات کراؤ۔“

وہ میرے جھکمانہ انداز سے مرعوب ہو گئی۔ ”آپ کون بول رہے ہیں؟“

”میں ایم این اے ملک بات کر رہا ہوں۔“

”باہر پورچ میں رکھے ہیں مرشد بادشاہ۔“

”پورچ میں..... تمہارا دماغ خراب ہے کسی نے ان میں بم رکھ کر بھیج دیا تو پوری عمارت تباہ ہو جائے گی۔“ مرشد چلایا اور اس نے آنے والے کو چند خاص گالیاں دیں۔ وہ بدحواس ہو گیا۔

”مرشد بادشاہ مجھے کیا معلوم تھا؟“

”دفع ہو جاؤ سیکورٹی سے کہو اسے چپک کرے اور پہلے عمارت سے دور لے جائے۔“

اس آدمی کے جانے کے بعد مرشد کو خیال آیا کہ میں فون پر یہ ساری بات سن رہا تھا۔ اس نے ریسپورس کہا۔ ”شہباز یہ تمہاری حرکت ہے؟“

”کون سی حرکت؟“ میں نے مصمیت سے پوچھا۔

”یہ دو بکس تم نے بھیجے ہیں؟ ابھی تم نے مجھے دو تختے بھیجنے کی بات کی تھی۔“

”ہاں میرا ارادہ تمہارے انتقال اور سوئم والے دن تمہاری قبر پر پھولوں کی چادر بھیجنے کا ہے۔ بکس کسی اور نے بھیجے ہوں گے۔“

اسی لمحے اسی بدحواس ملازم کی آواز آئی۔ ”مرشد بادشاہ ان بکسوں میں لاشیں ہیں۔“

اس بار مرشد نے لائن کو ہولڈ کر دیا اور اپنے غلام سے سننے لگا جو اسے اتنی اہم اطلاعات عین دوران فون سنار ہاتھ۔ مجھے اندازہ تھا کہ وسیم اور عبداللہ نے بہت تیزی سے کام دکھایا تھا اگر عبداللہ کی لاشوں والے بکس آگئے تھے تو ساتھ ہی میڈیا والوں کو بھی آنا چاہیے تھا۔ میں نے نمبر کاٹ کر عبداللہ کو کال کی۔ کال ملتے ہی وہ پُر جوش انداز میں بولا۔ ”اگر مرشد کو ہارٹ ایٹک ہو جائے تو تعجب کی بات نہیں ہوگی۔“

”اللہ تمہاری زبان مبارک کرے کیا میڈیا والے مرشد ہاؤس پہنچ گئے ہیں۔“

”میں یہیں ہوں اور میڈیا والے اب بکسوں سے نکلنے والی لاشوں کی تصویریں اور ویڈیو بنا رہے ہیں۔ مرشد خود باہر نہیں آیا ہے لیکن اس کے ملازم بدحواس ہیں وہ میڈیا والوں کو روک رہے ہیں۔ اب گارڈ آگئے ہیں اور وہ سب کو دھمکیاں دے کر باہر نکال رہے ہیں۔“ عبداللہ رنگ کنٹری کر رہا تھا۔ ”مگر میڈیا والے کہاں کسی سے دبتے ہیں وہ اپنا کام کر رہے ہیں۔“

”پولیس کا کچھ اتا پتا ہے؟“

”پولیس جائے بھاڑ میں اب کچھ دیر بعد ٹی وی چینلوں پر جب یہ فوٹیج اور ویڈیوز چلیں گی تو آپ سوچ سکتے ہیں پولیس کتنی مجبور ہو جائے گی۔“

”عبداللہ تم نے وہاں پہنچ کر خطرناک کام کیا ہے مرشد کے آدمیوں میں تمہیں پہچاننے والے ہوں گے۔ اس لیے بہتر ہے اب وہاں سے کھسک لو۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ویسے میں اکیلا نہیں ہوں میرے ساتھ دو گارڈز ہیں اور کوئی مجھے آسانی سے ہاتھ نہیں لگا سکتا ہے ابھی تو مرشد کو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ وہ ان لاشوں کے بارے میں کیا جواب دے گا؟“

”زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے دوست مرشد سیاست دان ہے وہ لاشوں کو اپنے سیاسی مخالفین کے سر قہو پ سکتا ہے کہ انہوں نے اسے بدنام کرنے کے لیے یہ لاشیں بکسوں میں بند کر کے اس کے گھر بھیجی ہیں اور ساتھ ہی میڈیا کو اطلاع دے دی۔“

”وہ کچھ بھی وضاحت کرے اس چکر میں تو آئے گا۔ وہ لاشوں کو خاموشی سے دفن کر معاملہ نمٹا نہیں سکتا ہے اور ممکن ہے اس کے خلاف ایف آئی آر بھی درج کر دادی جائے۔“

”یار قانون اس جیسے لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے۔ اس لیے بس اسے دل خوش کرنے کا ایک تماشہ سمجھو۔“ میں نے کہا۔ ”ٹی وی چینل والے بھی ایک دو دن اس خبر کو چلائیں گے اور چند دن بعد وہ اسے بھول چکے ہوں گے ہمارے ہاں لوگوں کی یادداشت کچھ ٹی یا ڈسٹ کی ہے جلد سب بھول جاتے ہیں۔“

عبداللہ یائس ہوا۔ ”یعنی ہماری اتنی تک دود کا کوئی فائدہ نہیں ہوا ہے؟“

”فائدہ تو ہوا ہے مرشد کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہم اینٹ کا جھپٹ پتھر سے دینا جانتے ہیں ابھی میں نے اسے فون کر کے خوش خبری سنادی ہے کہ فاضلی ہمارے پاس زندہ سلامت موجود ہے۔ اس نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے فاضلی کے غائب ہوتے ہی اس کے خلاف تھانے میں چوری کی رپورٹ لکھوا دی ہے اس طرح وہ اس کے کپے سے بری الذمہ ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”ایسا ہو گا نہیں..... اس نے جو حرکت کی ہے اس کے بعد ہم اسے اتنی آسانی سے بچ کر نکلنے کا موقع نہیں دیں گے۔“

”فاضلی کی زبان کھل جائے تا تو پھر مرشد کے گرد قانونی گھیرا بھی ڈالا جاسکتا ہے۔“

”مجھے امید ہے آپ نے جو ترکیب کی ہے اس کی زبان کھل جائے گی۔“

”مگر اس کے بیان کی عدالت میں کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوگی۔ ہاں فاضلی ہمیں مرشد کی کمزوریوں سے آگاہ کر سکتا ہے ہم ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔“

اس گفتگو کے دوران عبداللہ وہاں سے روانہ ہو گیا تھا۔ اس سے بات کر کے میں نے دوبارہ انٹرنیٹ سے مرشد ہاؤس کا نمبر ملایا کال اسی لڑکی نے ریسوکی اور میری آواز پہچان کر رونے والے انداز میں بولی۔ ”آپ نے مجھے مروا دیا جی.....“

”فکرمت کرو مرشد تمہیں کچھ نہیں کہے گا اسے کو میری کال ہے میں اس سے بات کر لوں گا۔“

”میں پوچھتی ہوں پتا نہیں وہ آپ سے بات کرتے ہیں یا نہیں۔“

لیکن مرشد نے مجھ سے بات کرنا قبول کر لی اور وہ مشتعل تھا اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”بڑا اچھا ڈرامہ تیار کیا ہے تم نے لیکن تم کیا سمجھتے ہو اس طرح مرشد کا بال بھی بکا ہو گا۔“

”نہیں..... میں احمق نہیں ہوں۔ یہ تو تمہارا دل خوش کرنے کے لیے تھا۔ ایسے چھوٹے موٹے معاملات سے تو تمہارے ملازمین بھی نمٹ لیتے ہیں باقی رہے میڈیا والے تو وہ دو تین دن تمہیں رگڑیں گے اور اس کے بعد بھول کر کسی اور معاملے میں الجھ جائیں گے۔ بہر حال اسے گولی مارو مجھے تم سے دواہم باتیں کرنی ہیں۔ اول میں نے اس لڑکی کو بے وقوف بنایا کہ میں ایم این اے ملک ہوں۔ امید ہے تم اسے کچھ نہیں کہو گے۔“

”خواہش تو یہی ہے میں تو تم جیسے موذی انسان کو بھی بے دریغ مار دینے کا قائل نہیں ہوں وہ تو بے چاری عامی لڑکی ہے۔“

مرشد میرا جملہ پل گیا۔ ”ٹھیک ہے وہ اس قائل تو نہیں ہے لیکن میں تمہارے کہنے پر اسے معاف کرتا ہوں۔“

”اب آتے ہیں فاضلی کے معاملے کی طرف.....“

وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ ”فاضلی نے جو کیا وہ اپنے طور پر کیا ہے میں نے اس سے ایسا کرنے کو نہیں

کہا تھا۔“

”گو یا تم کہنا چاہتے ہو کہ فاضلی نے از خود فیصلہ کیا اور پہلی کا پٹا اڑانے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔“

”میں اس سے انکار نہیں کروں گا کہ یہ معاملہ میرے علم میں تھا۔ دراصل تمہارا معاملہ میں نے فاضلی کے

سپر دکر دیا ہے اور وہ اپنے طور پر تم سے منٹ رہا ہے۔“

”مرشد تم مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”تم جانتے ہو اب

میں اس جنگ میں اکیلا نہیں ہوں مجھے بہت سارے لوگوں کی مدد و حمایت حاصل ہے۔“

”راجا عمر دراز.....“ اس نے کہنا چاہا۔

میں نے قہقہہ لگایا۔ ”مرشد اس سے اندازہ ہوتا ہے تمہاری انفارمیشن کتنی ناقص ہیں۔ راجا عمر دراز بہت

پہلے سے میرے ساتھ ہے لیکن تم نے یہ سوچا ہے کہ تمہارے کتنے دشمن ہیں تمہارے اپنے خاندان میں ایسے کتنے

ہیں جو جلد از جلد تمہیں جہنم میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔ میں نے اس فارمولے پر عمل کیا

ہے۔ ڈیوڈ شااب غیر جانبدار ہے یقین نہیں ہے تو اس سے معلوم کر لو اور عین ممکن ہے کہ کسی وقت اس کی طرف

سے حکم آجائے کہ شہباز کے ساتھ پنگا لیتا بند کر دو۔“

”تمہارا کیا خیال ہے میں اس کی بات مان لوں گا۔“ مرشد نے حقارت سے کہا۔

”مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے میں تمہیں صرف یہ بتا رہا ہوں کہ جب میں اپنے زور بازو پر بھروسہ کرتا

تھا تب بھی تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے لیکن اب طاقت کا توازن تقریباً برابر ہو گیا ہے۔ اس لیے کسی حماقت سے

باز رہو۔“

”پہلے تم نے کی تھی۔“ اس نے الزام دیا۔

”نہیں تمہارے آدمیوں نے شہلا کو اٹھا کر میرے کام میں مداخلت کی۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ اسے

واپس لینے کے لیے میں وہاں گیا تھا۔“

مرشد سوچ میں پڑ گیا تھا خاصی دیر بعد اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں تم سے صلح کے لیے تیار ہوں لیکن

تمہیں فاضلی کو چھوڑنا.....“

”اے بھول جاؤ اس کے جرائم کی فہرست خاصی لمبی ہو گئی ہے۔ اس نے ہمیشہ مجھے ذاتی نقصان پہنچانے

کی کوشش کی ہے اور مجھے شک ہے کہ شاہد بھائی کا قاتل بھی وہی ہے۔ اگر تم صلح کرنا چاہتے ہو تو تمہاری طرف

سے اس کی قیمت فاضلی ہوگا۔“

”جواب میں تم کیا دو گے؟“

”میں تمہارے معاملے میں مداخلت نہیں کروں گا دوسرے تم میرے کیس ختم کرانے کی کوشش میں ناگ

نہیں اڑاؤ گے۔ اگر ایسا ہوا تو سیز فائر ختم ہو جائے گا۔“

”مجھے.....“ ہے۔“ اس نے بادل ناخواستہ کہا۔ میری طرف سے اتنی تیز کارروائی پھر فاضلی کی ناکام

کوشش اور اس کے بعد اس کا پکڑا جانا مرشد کے لیے کم دھچکا نہیں تھا۔ اسے اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم

اتنے ترنوالے نہیں تھے جتنا اس نے سوچا تھا۔ میں نے کال کاٹ دی۔ باہر شام ہو چکی تھی اور کچھ دیر میں سورج

غروب ہو جاتا۔ عبد اللہ نے جیلی کا پٹر کے کریش کے بعد حویلی کال کر کے باباجان کو مطلع کر دیا تھا لیکن میں نے

کال نہیں کی تھی۔ میں نے باباجان کا نمبر ملایا۔ سلام دعا کے بعد میں نے کہا۔

”اللہ نے نرم کیا لیکن ہمارے دشمن بہت ہوشیار ہیں۔“

”اس واقعے نے مجھے بھی فکر مند کر دیا ہے اب میں حویلی کی حفاظت بڑھانے کا سوچ رہا ہوں۔ پیچھے کی

طرف کی زمین لے کر میں نے اس پر فوج سے ریٹائر ہونے والے کچھ لوگوں کو آباد کیا ہے وہ اپنے خاندان سمیت

آگئے ہیں۔ مگر بھی بنا لیے ہیں وہ عقب سے حویلی کی حفاظت کرتے ہیں ان کے پاس لائسنس یافتہ اسلحہ ہے۔“

”باباجان میرے پاس ایک الیکٹرانک سیکورٹی کا ماہر ہے میں اسے کچھ دن میں حویلی بھیجتا ہوں وہ وہاں

ایسا سیکورٹی سسٹم لگا دے گا جس کے ہوتے ہوئے کوئی بے خبری میں حویلی میں نہیں گھس سکے گا۔“

”یہ اچھا ہوگا، میں نے تہہ خانے کا ایک حصہ الگ کر لیا ہے کسی مشکل میں حویلی کے لوگ وہاں پناہ لے

سکتے ہیں۔ کوئی اس کا سراغ نہیں لگا سکتا ہے اور اگر لگا لے تو اسے آسانی سے کھول نہیں سکتا ہے۔“

”یہ آپ نے اچھا کیا ہے۔“



ماں جی اور دوسرے لوگوں سے بات کر کے میں نے فون بند کر دیا سویرا سے بات کرنے کا سوال ہی پیدا

نہیں ہوتا تھا اسے میں صرف براہ راست کال کر سکتا تھا۔ میں نے اب صابر سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں

دبے قدموں اس کے کمرے تک آیا بغیر آواز کے کنڈی کھولی اور اچانک دروازہ کھول دیا۔ کرسی پر بیٹھا ہوا صابر

چونک گیا۔ شاز یہ بستر پر نیم دراز میں اور اس کی حالت خاصی بہتر لگ رہی تھی۔ میرے اچانک دروازہ کھولنے سے

وہ خوف زدہ نظر آنے لگی تھی۔ میں نے صابر سے کہا۔

”میرے ساتھ آؤ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“

اس نے ناگواری سے کہا۔ ”تم نے ہمیں دھوکا دے کر یہاں قید کیا ہے اور اس طرح اچانک اندر کیوں

آئے؟“

”بکواس کرنے کے بجائے باہر آ جاؤ۔“ میں نے اسے گھورا۔ ”اگر تم اپنی بیٹی کی سانس بے عزتی کرنا

چاہتے ہو تو تمہاری مرضی۔“

بادل ناخواستہ وہ باہر آیا میں اسے خالی کمرے میں لایا اور اچانک اسے پیچھے سے دھکا دے کر منہ کے بل

گر ایسا اور اس کے پشت پر گھٹنا رکھتے ہوئے اس کی تلاشی لینے لگا۔ وہ چیخا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟“
میں کوئی جواب دیے بغیر اپنے کام میں لگا رہا وہ گالیاں دینے لگا۔ اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ میں نے گھٹنا ہٹا لیا۔ وہ شکل سے اٹھا اور چیخا۔ ”تمہارا دماغ خراب ہے۔“

میں پیچھے ہٹا اور اچانک باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔ وہ دروازہ پینے اور شور کرنے لگا میں اس کے کمرے میں آیا تو شاز یہ جو پہلے ہی باپ کی چیخ و پکار سے پریشان تھی مجھے دیکھ کر ہڈیانی انداز میں چیخنے لگی۔ میں نے اسے چپ کرانے کی کوشش کی لیکن پھر اسے نظر انداز کر کے صابر کے سوٹ کیس کی تلاشی لی۔ اس میں بھی کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ میں مطمئن نہیں تھا اس لیے اب پورے کمرے کی تلاشی لی اور بالآخر مجھے بیڈ کے پاؤں والی طرف سے گدا ہٹانے پر وہ چھوٹا سا ریو اور مل گیا جسے صابر نے یہاں چھپایا تھا۔ صرف ریو اور مل جانے سے میرا اطمینان نہیں ہوا تھا میں نے باقی کمرے کی تلاشی بھی لی اور پھر شاز یہ سے کہا۔ ”اٹھو..... تمہیں تمہارے باپ کے پاس جانا ہے۔“

وہ لرزرتے کانپتے ہوئے کھڑی ہو گئی اس کے منہ سے از خود ڈری ڈری آوازیں نکل رہی تھیں اور اس کی حالت افسوسناک تھی لیکن میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اپنے باپ کا کیا دھرا بگھٹنا پڑا تھا میں اسے بھی خالی کمرے میں لایا۔ صابر دروازہ کھلتے ہی جھپٹا لیکن شاز یہ اور میرے ہاتھ میں اپنا ریو اور مل دیکھ کر دیکھ کر چونک گیا۔ میں نے ریو اور مل نمایاں کیا۔ ”اسے پچھانتے ہو اسے میں نے تمہارے کمرے کے بیڈ کے نیچے سے برآمد کیا ہے۔“

اس نے سر ہلایا اور شکست خوردہ نظر آنے لگا۔ ”تم نے اسے تلاش کر لیا۔“
”ہاں تم نے مجھے دھوکا دیا بے وقوف بنانے کی کوشش کی لیکن میں تمہیں ایک موقع اور دیتا ہوں اپنی اور اپنی بیٹی کی جان بچانے کا۔“

”کیسا موقع؟“ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

”جیسا کہ مجھے مہر و تلاش کر کے لا دو یا اس کے بارے میں یقینی اطلاع ہو اس کے قبیلے کو تلاش کرو۔“

”میں یہ کام کیسے کر سکتا ہوں۔“

”تم کر سکتے ہو تمہارے رابٹل ہیں۔“

”لیکن میں تمہارے لیے کیوں کروں؟“

”اگر تمہیں اپنی بیٹی پیاری ہے تو تمہیں یہ کام کرنا ہو گا۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”تب تک شاز یہ ہمارے پاس رہے گی۔“

یہ سنتے ہی شاز یہ نے پھر چیخا چلانا شروع کر دیا۔ صابر نے میری طرف دیکھا۔ ”یہ نہیں رہ سکتی یہ مر جائے گی۔“

”نہیں مرے گی تم اسے سمجھا سکتے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”تمہارے پاس آج رات تک کی مہلت ہے اگر تم نے کل تک فیصلہ نہیں کیا تو میں تم دونوں کو مرشد کے حوالے کر دوں گا۔“

صابر لرز گیا۔ ”نہیں تم ایسا نہیں کرو گے۔“

”تم خود اس کے پاس جانے کا سوچو تو ٹھیک ہے اور میں اس کے حوالے کروں تو غلط ہے۔“ میں نے طنز کیا اور کمرے سے نکل آیا دروازہ باہر سے بند کر کے میں نیچے آیا تو مانی نشست گاہ میں بیٹھا تھا اس نے میری طرف دیکھا۔

”شوٹی یہ لڑکی کیوں چیخ رہی تھی؟“

”تمہارا کیا خیال ہے میں اس سے کوئی غیر انسانی سلوک کر رہا تھا۔“ میں نے کسی قدر سخت لہجے میں پوچھا

کیونکہ مانی کا لہجہ شک والا تھا۔ وہ بوکھلا گیا۔

”نہن..... نہیں شوٹی بھائی..... میرا مطلب ہے وہ کیوں چلا رہی ہے۔“

”میں نے اسے کوئی بھیجے کا فیصلہ کیا اور وہ اپنے باپ سے الگ ہونے کو تیار نہیں ہے۔“

”کوئی کیوں بھیج رہے ہیں؟“

بیو کبھی مجھ سے اس طرح سوال نہیں کرتا تھا اسے معلوم تھا مجھے جو مناسب لگے گا میں اسے بتا دوں گا۔

مانی اس سے مختلف مزاج کا تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی مار دھاڑ نہیں دیکھی تھی اسی لیے وہ ایسی باتوں پر پریشان ہو جاتا تھا۔ میں نے اس بار زنی سے کہا۔ ”برخوردار تم اس قسم کے معاملات میں اپنے ذہن پر زیادہ زور مت دو۔“

اس سے تمہیں سوائے پریشانی کے اور کچھ حاصل نہیں ہو گا۔“

”اور کیا تم کمپیوٹر چلاؤ..... گیم کھیلو اور مزے کرو۔“ بیو بولا۔ ”شوٹی کا معاملہ شوٹی جانے۔“

مانی خاموش ہو گیا لیکن میں نے محسوس کیا وہ مطمئن نہیں تھا۔ شاید اس کے خیال میں ہم نے صابر اور اس کی بیٹی کو یہاں قید کر کے زیادتی کی تھی۔ بہر حال وہ ایسا سمجھتا تھا تو سمجھتا رہے۔ سفیر اپنے پاس تمام اقسام کی دوائیاں رکھتا ہے میں اس کے کمرے میں آیا تو مجھے دواؤں کے فیلٹ میں مطلوبہ گولیاں مل گئیں یہ بنیدگی گولیاں تھیں۔ میں نے اس میں سے پانچ گولیاں نکال لیں اور بیو کے حوالے کیں۔ ”کھانے کے بعد کافی بنانا اور اس میں یہ گولیاں ملا کر صابر اور اس کی بیٹی کو دے دینا۔“

”ہم سمجھ گیا۔“ وہ بولا مانی کے چہرے پر سوالیہ نشان نظر آیا تھا لیکن اس نے زبان سے نہیں پوچھا اور اچھا

ہو اور ندوہ مجھ سے جھڑکھاتا۔ صبح والے واقعے کے بعد بہ ظاہر میں پرسکون تھا لیکن میرے اعصاب سخت کشیدہ ہو گئے تھے ہم سب ایک بہت بڑے سانحے سے دوچار ہوتے ہوئے رہ گئے تھے۔ اللہ کی مہربانی کے بعد یہ پائلٹ

شفاعت کی مہارت تھی جو اس نے بے قابو بے یلی کا پڑ کو کامیاب طریقے سے لینڈنگ کرائی۔ شروع میں وہ مجھے اچھا

نہیں لگا تھا لیکن بعد میں اس نے ثابت کر دیا کہ وہ غیر ذمے دار سبکی لیکن اپنے کام میں ماہر تھا اور انعام کا مستحق

تھا۔ عبداللہ ایئر کلب اور پولیس کے معاملات سے نمٹ کر آچکا تھا۔ میں اس سے پوچھنا بھول گیا تھا۔ میں نے

دوبارہ اسے کال کرنے کا ارادہ کیا تھا کہ اس کی کال آگئی۔

”سوری میں ایئر کلب والی بات بتانا بھول گیا تھا۔ مرشد ہاؤس میں جو ہوا اس نے مجھے ایکسا نیڈ کر دیا

تھا۔“

”بیلی کا پٹر کس کا ہے اور اس کا نقصان کون پورا کرے گا؟“

”بیلی کا پٹر کلب کا ہے اور وہ انشورڈ ہے کلب خود انشورنس والوں سے رقم وصول کر لے گا۔“

”شفاعت نے کمال کر دیا وہ انعام کا مستحق ہے۔“

”جی میں اسے پچاس ہزار دے آیا ہوں۔“ عبداللہ نے کہا۔ ”وہ لے نہیں رہا تھا بلکہ شرمندہ تھا کہ ایک مسافر زخمی بھی ہوا۔“

”تم نے ٹھیک کیا وہ انعام کا مستحق ہے۔ پولیس میں کیا رپورٹ کرائی ہے؟“

”نامعلوم افراد کے خلاف جنہوں نے ہیلی کاپٹر پر فائرنگ کر کے اسے تباہ کرنے کی کوشش کی۔“

”یہ تم نے اچھا کیا۔“

”ایک اچھا کام اور کیا ہے میں نے پولیس کے ش کرنے سے پہلے ہی وہ خود کار گن وہاں سے ہٹا لی اب وہ ہمارے پاس ہے۔ آپ نے اسے خاصا نقصان پہنچایا ہے لیکن وہ سب ٹھیک ہو سکتا ہے۔ یہ بڑا کارآمد ہتھیار ہے جو کبھی ہمارے کام آ سکتا ہے۔“

”یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔“ میں نے کہا۔ ”عبداللہ میں نے صابر سے کام لینے کا سوچا ہے اور اس سے کام لینے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اس کی بیٹی کو بریغمال بنالیا جائے۔ آج رات انہیں کافی میں نیند کی دوا دے دی جائے گی اور اس کے بعد تم اپنے آدمی بھیج کر لڑکی کو کوٹھی بلوالینا یہ وہیں رہے گی۔ اگر یہ نازل رہتی ہے تو اسے سعدیہ اور مونا کے ساتھ رکھنا اور نہ اسے تہ خانے میں منتقل کر دینا۔“

”صابر سے کیا کام لینے کا سوچا ہے؟“

”مہر کی تلاش کا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اگر مہر مل گئی تو اس کا بھی امکان ہے کہ بریف کیس بھی مل جائے۔“

”یہ ٹھیک ہے لیکن وہ مرشد کے ہتھے چڑھ گیا تو.....؟“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا..... ایک منٹ میں وسیم کو بھی کال ملا لوں تاکہ ایک ساتھ سب جان جائیں۔“ میں نے کہا اور وسیم کو کال ملائی پھر عبداللہ کو کافرنس کال میں لیا۔ میں نے انہیں مرشد سے ہونے والی ذیل کا بتایا اور ساتھ ہی صابر کے معاملے سے آگاہ کیا۔ انہوں نے مجھ سے اتفاق کیا کہ اس وقت اس سے بہترین حکمت عملی ممکن نہیں تھی۔ مرشد پر اصل وار کرنے سے پہلے اسے دھوکے میں رکھنا ضروری تھا۔ عبداللہ نے کہا کہ وہ اپنے دو آدمی بھیج رہا ہے جو شازیہ کو لے جائیں گے۔ وسیم نے فاضلی کے بارے میں بتایا۔

”اسے پہلا ڈوز دیا جا چکا ہے۔“

”گڈ..... وقفے وقفے سے ڈوز جاری رکھو تاکہ وہ جلد از جلد تیار ہو جائے۔“

”امید ہے ایسا ہی ہوگا۔“ وسیم نے کہا۔ ”اب خواتین کی منتقلی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“

”انہیں منتقل کرنا ہے لیکن دیکھ بھال کر۔“

”سوال یہ ہے کہ اتنی احتیاط کے باوجود مرشد ہمارے پلان سے کیسے واقف ہو گیا؟“

”اس سوال کا جواب فاضلی دے گا اور ابھی اسے دو تین دن لگیں گے۔ بہر حال ہمیں مزید محتاط ہو جانا چاہیے۔ جیسے ہم مرشد کو دھوکا دے رہے ہیں اسی طرح وہ بھی ہمیں دھوکا دے رہا ہے اور اسے جیسے ہی موقع ملے گا وہ پھر وار کرے گا۔“

وسیم نے کہا۔ ”کیا ایسا نہ کیا جائے کہ خواتین کو نئے ٹھکانے پر منتقل کر دیا جائے؟“

”نہیں وہ صرف چھپ کر رہنے کے لحاظ سے ٹھیک ہے خواتین کے لیے وہاں رسک ہے۔ اگر وہاں کھلی سیکورٹی رکھی گئی تو جگہ مشکوک ہو جائے گی۔“ میں نے کہا۔ ”فی الحال عبداللہ والی کو بھی یہی ٹھیک ہے۔“

”میرا خیال آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں کسی نئی جگہ یا تو نئے سرے سے حفاظتی انتظامات کرنے پڑیں گے یا پھر چھپ کر رہنا ہوگا۔ دونوں صورتوں میں خطرہ باقی رہے گا۔“

ان سے بات کر کے میں نے سفیر کو کال کی تو اس نے اچھی خبر سنائی۔ ”مونا کی حالت اتنی بہتر ہو رہی ہے کہ ڈاکٹر نے اسے کل صبح لے جانے کی اجازت دے دی ہے۔“

”وہ جاگ رہی ہے تو میری بات کراؤ۔“

مونا میری آواز سن کر سر سکیاں لینے لگی تھی میں نے پیار سے کہا۔ ”گڑا اس میں رونے کی بات نہیں ہے اللہ دینے والا ہے وہ پھر تم دونوں کو اولاد دے گا اور اس کا شکر ہے کہ تم سب محفوظ رہے۔“

مونا نے خود پر قابو پایا۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ہیلی کاپٹر بے قابو ہو کر جس طرح گھوم رہا تھا مجھے لگا ہمارا آخری وقت آ گیا ہے۔ مگر جب وہ زمین پر گرا اور ہم سب صحیح سلامت رہے تو مجھے یقین نہیں آیا تھا اور پھر میں بے ہوش ہو گئی۔“

”بس تو اب دیکھ مت ہونا اور اللہ کا شکر ادا کرنا۔ تم دونوں سلامت رہو گے تو ایسی خوشیاں بہت دیکھنے کو ملیں گی۔“

”ادہ بھائی کیا بددعا دے رہا ہے۔ پندرہ سولہ بچوں کے بعد ہماری لائف کہاں باقی رہے گی۔“

”ٹھیک کہا پھر ٹو بوجھ ڈھونے والا گدھا بن جائے گا۔“

”تب اللہ کرے تیرے ساتھ بھی ایسا ہی ہو۔ میں حویلی جاتے ہی تیری شادی کی قراداد پیش کرتا ہوں۔“

”بکواس بھڑک کر کے ذرا میری بات توجہ سے سن۔“ میں نے کہا اور اسے بھی مرشد اور صابر کے بارے میں آگاہ کیا۔ ”کل صبح تک بہت محتاط رہنا مرشد جیسے لوگ اسپتال کا احترام بھی نہیں کرتے ہیں۔“

”ٹو نے ٹھیک کہا ہے میں اور ایاز نہیں ہیں ایک آدمی اور ہے اور باہر بھی لگی ہیں۔“

”ڈاکٹر ز اور نرس کے معاملے میں بھی محتاط رہنا اگر ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر یا نرس کے علاوہ کوئی پاس آنا چاہے تو اسے مونا کے پاس پھنکنے بھی مت دینا۔ فاضلی ڈاکٹر بن کر ہی اسپتال میں گھسا تھا۔“

”میں محتاط رہوں گا۔“ سفیر نے یقین دلایا کیونکہ معاملہ مونا کا تھا اس لیے مجھے یقین تھا وہ جج محتاط رہے گا۔ رات ہو چکی تھی بیٹو نے مانی کے ساتھ صابر اور شازیہ کے لیے اوپر کھانا پہنچایا۔ باپ کو پاس پا کر شازیہ بہل گئی تھی۔ مگر اس کی حالت سے لگ رہا تھا کہ وہ عبداللہ والی کو بھی میں خواتین کے ساتھ بھی آسانی سے رہنے پر آمادہ نہیں ہوگی اور اسے تہ خانے میں دواؤں کے زیر اثر رکھنا پڑے گا۔ وہ نیچے آئے تو ہم نے کھانا کھایا اور پھر بیٹو کافی بنانے لگا میں نے لاؤنج میں ٹی وی آن کیا تو حسب توقع مختلف مجنلوں سے مرشد ہاؤس پہنچنے والی دو لاشوں کا ذکر تھا۔ پولیس نے لاشیں اپنے قبضے میں لے کر انہیں وہاں لانے والے پک آپ ڈرائیور کو گرفتار کر لیا تھا۔ کیونکہ وہ غریب تھا اور اس کی کوئی شناخت نہیں تھی جب کہ مرشد با اثر اور دولت مند شخص تھا۔ لیے پولیس

سامنے تو وہ لیس ماسٹر بنے رہتے تھے۔ میں نے بیٹو کو اشارے سے الگ بلایا۔ ”تم ان کے ساتھ جاؤ گے اور ان پر نظر رکھو گے لڑکی تمہاری تحویل میں ہے اگر یہ ذرا بھی گڑبڑ کریں تو عبداللہ کو کال کر دیتا۔“

بیٹو نے سر ہلایا اور تیار ہونے چلا گیا۔ میں نے عبداللہ کے ان دونوں آدمیوں کو روک لیا۔ وہ گاڑی کے پاس کھڑے تھے۔ ”بیٹو بھی تم دونوں کے ساتھ جائے گا۔“

ان کے چہرے پر واضح مایوسی کے آثار نظر آئے تھے۔ بیٹو نیچے آیا تو میں نے اس سے کہا کہ اگر یہ آپس میں کوئی بات کریں تو مجھے اس سے بھی آگاہ کرنا۔ بیٹو ان کے ساتھ چلا گیا۔ میں اندر آیا تو مانی اکیلا اداس بیٹھا تھا۔

”کیا ہوا یار؟“

”آج میرا بیٹو کے ساتھ گیا تھا۔“

”کوئی بات نہیں کل بیٹو آجائے گا جب تم کھیل سکو گے۔“ میں نے کہا۔ ”کیا خیال ہے ابھی کچھ کام نہ کر لیا جائے؟“

مانی مستعد ہو گیا۔ ”نیٹ سے متعلق ہے؟“

”بالکل۔“

ہم اسٹڈی میں آئے جہاں مانی نے بڑے سائز کے ایل سی ڈی ٹی وی کو اپنے لیپ ٹاپ سے بھی منسلک کر دیا تھا اور اب یہ مانیٹر بھی تھا۔ یہ چھتیس انچ کا ٹی وی تھا اور ظاہر ہے اس پر ہر چیز بہت واضح دکھائی دیتی۔ میں نے مانی سے گولگ ارتھ اکاؤنٹ کھولنے کو کہا۔ پھر اسے خانقاہ و مرشدیہ دکھانے کو کہا۔ اس نے پوچھا۔ ”یہ عمارت ہے کہاں؟“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ صابر نے مجھے اس کی لوکیشن سمجھائی تھی۔ میں نے وہ نئی سڑک تلاش کرنے کو کہا خانقاہ اس سے کچھ ہی دور واقع تھی۔ مانی نے سڑک تلاش کر لی۔ اس سڑک کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ اس نے لائیو ویڈیو کے بجائے ہائی ریزولوشن امیج کھولے تھے جن میں ہر چیز بہت واضح تھی۔ اس میں کچھ وقت لگا لیکن بالآخر ہم نے خانقاہ و مرشدیہ تلاش کر لی۔ یہ اس سڑک سے کوئی ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھی اور خانقاہ تک جانے کے لیے پختہ چوڑی سڑک شاید حال ہی میں بنی تھی۔ صابر نے میاں سبحان نامی زمیندار کے ڈیرے کا بتایا تھا جو اصل میں مرشد کا آدمی تھا اور اس کے ڈیرے سے ایک خفیہ سڑک مرشد کے اڈے تک جاتی تھی۔ یہ مرشد کے اڈے سے شمال میں تھا۔ مانی نے اسے بھی تلاش کر لیا۔ ڈیرے کی عمارت بہ ظاہر ایک منزلہ اور اینٹوں سے بنی ہوئی تھی۔ قابل ذکر بات اس کا احاطہ تھا یہ بہت بڑا تھا اور شاید نصف ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا تھا جب کہ اس کا کوئی جواز نہیں تھا اگر یہاں گاڑیاں پارک کرنی تھیں تو ایک کنال جگہ بھی بہت ہوتی کیونکہ تصویر بالکل اوپر سے لی گئی تھی اس لیے دیواروں کی اونچائی کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا لیکن احاطے کی تفصیل ایک فٹ سے زیادہ چوڑی تھی اور اتنی چوڑی تفصیل کم سے کم آٹھ دس فٹ بلند دیوار کی ہوتی ہے۔ گویا اس احاطے کو دوسروں کی نظروں سے چھپانے کا خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔ مانی نے حساب لگا کر بتایا کہ یہ ڈیرہ نئی سڑک کے متوازی مرشد کے ٹھکانے سے کوئی چھ سو میٹر شمال میں تھا۔

کے نزدیک مستند تھا اس کا فرمایا ہوا۔

مرشد نے لاشوں کو شناخت کرنے یا ان سے کسی قسم کے تعلق سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے اسے اپنے سیاسی مخالفین کی سازش قرار دیا تھا۔ جھوٹو اپنے اپنے حساب سے واقعے پر تبصرہ کر رہے تھے۔ انتظامیہ اور پولیس نے مرشد کو اس واقعے میں ملوث قرار دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ڈرائیور کے بیان کے بعد کہ لاشوں والے بکس کسی اجنبی آدمی نے بک کرائے تھے مرشد کی پوزیشن خود بہ خود صاف ہو گئی تھی۔ انتظامیہ اور پولیس کو جواز مل گیا مرشد کو بے قصور قرار دینے کا۔ اس دوران میں بیٹو کافی لایا تو مانی نے اپنا گ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ ”دوا احتیاط سے ملائی تھی کہیں ہم نہ سوتے رہ جائیں۔“

”میں تمہاری طرح کام نہیں کرتا ہوں۔“ بیٹو نے غلگی سے جواب دیا۔ ”میں انہیں کافی دے آیا ہوں۔“

”کچھ دیر میں عبداللہ کے آدمی آکر شاذیہ کو لے جائیں گے۔“

”شوٹی بھائی کیا اسے بھیجنا ضروری ہے۔“ مانی نے کسی قدر بے چینی سے کہا تو بیٹو نے معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

”مانی..... کیا بات ہے تم لڑکی کے جانے کا سن کر بے چین ہے۔“

مانی جھینپ گیا۔ ”ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“

”بات یہ ہے برخوردار کہ ہمیں جلد یہاں سے کوچ کرنا ہے۔ ممکن ہے کل یا پرسوں ہم اپنے نئے ٹھکانے کی طرف چلے جائیں۔“

”اور یہ جگہ؟“ بیٹو نے پوچھا۔

”صابر اس جگہ کو دیکھ چکا ہے اس لیے یہاں رہنا مناسب نہیں ہوگا۔“

”اچھا خاصا ٹھکانہ ہے۔“ مانی مایوسی سے بولا۔ ”اگلی جگہ بتائیں یہ سب سہولتیں ملیں یا نہ ملیں۔“

”وہ جگہ اس سے بھی اچھی ہے اور سڑک کے بالکل ساتھ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اسلام آباد اور پنڈی دونوں کے پاس سے۔ کوٹھی اس سے بھی جدید انداز کی بنی ہوئی ہے اور ارد گرد کا منظر بھی برا نہیں ہے۔ وہاں ہر قسم کی سہولت بھی تھی۔“

”لیکن یہاں سارا سیٹ اپ ہے اسے لے جا کر پھر سے لگانا پڑے گا۔“

”یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ جیسے یہاں لگایا ہے ویسے ہی وہاں لگا دیتا۔ یہ اس سے تو بہتر ہے کہ دشمن یہاں آجائیں اور جنہیں لے جائیں۔“

دشمن کا سن کر مانی تیار ہو گیا تھا۔ بیٹو تو تھپی لیس ماسٹر ٹائپ کا آدمی۔ ہر حال میں اور ہر حکم پر خوش ہونے والا۔ مانی کو مبینہ بیخ نکالنے کی عادت تھی۔ آدھے گھنٹے بعد بیٹو نے آکر رپورٹ دی کہ دونوں باپ بنی بے ہوش کی نیند سو رہے تھے۔ اسی لمحے فارم کے گیٹ پر ایک گاڑی آکر رکی۔ اس کی اطلاع مانی نے دی تھی۔ بیٹو نے جا کر گیٹ کھولا اور عبداللہ کے آدمی گاڑی اندر لے آئے۔ انہوں نے شاذیہ کو ایک چادر میں لپیٹ کر گاڑی میں منتقل کیا۔ وہ دونوں اجنبی نہیں تھے۔ میں کئی بار انہیں عبداللہ کے ساتھ دیکھ چکا تھا لیکن نہ جانے کیوں میرا دل نہیں مانا کہ لڑکی کو صرف بھروسہ کر کے ان کے ساتھ کر دوں۔ میں ان کو اتنی اچھی طرح بھی نہیں جانتا تھا ہمارے

اصل چیز مرشد کا اذہ تھا۔ میں اسے خانقاہ کا لفظ نہیں دینا چاہتا کیونکہ ہمارے ذہن میں خانقاہ سے ایک الگ تاثر ابھرتا ہے ایک زمانے میں جب منکولوں کے حملے کے بعد پورے عالم اسلام میں ایک مایوسی اور قنوطیت کی کیفیت پیدا ہوئی تھی لوگوں کا جینے مرنے سے اعتقاد ٹھک گیا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ اللہ اور دین سے اعتبار بھی اٹھ جاتا۔ ایسے میں صوفیوں نے دین کو بچانے کے لیے خانقاہوں کا جال بچھا دیا۔ ہندوستان سے لے کر وسط ایشیا تک صوفی تحریک نے دین بچانے کی مہم چلائی اور مسلمانوں کو اس مایوسی کی کیفیت سے نکال لیا جس نے بالآخر یورپ کی عیسائی اقوام کو سیکولر ازم کی طرف دھکیل دیا۔ صلیبی جنگوں میں عبرت کا گھسٹ کا وہی نتیجہ نکلا تھا اور عیسائیت کو بچانے کے لیے کوئی صوفی تحریک سامنے نہیں آئی اس کا انجام آج سامنے ہے۔

لیکن ان بزرگان دین اور خانقاہوں کی کوششوں کو سبوتاژ کیا خود ان کی آل اولاد اور مقابر کے مجاوروں نے جنہوں نے خانقاہوں کو محاروں اور اس کی سجادہ نشینی کو موروثیت میں بدل دیا۔ جب یہ حربہ کامیاب رہا تو موقع شناس لوگوں نے نت نئے محار ایجاد کرنا شروع کر دیے اور وہاں سے خلق خدا کو گمراہ اور ان کا جذباتی استحصال کیا جانے لگا۔ خانقاہ و مرشد یہ ایسی ہی ایک ایجاد تھی جہاں اب تمام شیطانی کام پورے زور و شور سے جاری تھے لوگ جانتے تھے۔ حکام واقف تھے لیکن کوئی اس کا رو بار کو روکنے والا نہیں تھا۔ مرشد جیسے لوگ اب بے لگام ہو گئے تھے۔ یہ جگہ کوئی نصف مرلے کلومیٹر رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے چاروں طرف فصیل نما احاطہ تھا۔ وسط میں مرکزی عمارت تھی جس کا کورڈ ایریا کم سے کم دس ہزار مرلے میٹر تھا۔ احاطے کے داخلی دروازے کے ساتھ ایک چھوٹی عمارت تھی لیکن یہ بھی کم سے کم دو ہزار گز پر پھیلی ہوئی تھی اور شاید مسجد تھی۔ تیسری عمارت مرکزی عمارت کے عقب میں کوئی پچاس ساٹھ میٹر کے بعد تھی اور یہ ظاہر یہ جگہ باغ لگ رہی تھی۔ اسے باقی احاطے سے الگ کرنے کے لیے دیوار بنائی گئی تھی اور چھوٹی عمارت کے گرد بھی دیوار تھی جیسے کسی کوٹھی کے گرد ہوتی ہے۔ یہ عمارت کوئی ایک ہزار مرلے میٹر پر تھی۔ اس کا ڈرائیو دے بھی الگ تھا جو سڑک احاطے کے اندر آتی تھی وہ درمیان میں پارکنگ کی طرف گھوم جاتی تھی جس میں گھنے سایہ دار درخت لگے تھے اسی سے ایک سڑک الگ ہو کر مرکزی عمارت کے گرد گھومتی ہوئی اس چھوٹی عمارت تک جاتی تھی اور راستے میں دو جگہ مزید گیٹ سے گزرتی تھی ایک باغ کے احاطے کے گیٹ سے اور پھر کوٹھی کے احاطے کے گیٹ سے۔

”جناب اس عمارت میں کوئی خاص بات ہے اس کی خاص سیکورٹی کی گئی ہے۔“

”میرا خیال ہے یہ مرشد کی ذاتی رہائش گاہ ہے جہاں وہ اپنے اہل حرم کے ساتھ رہتا ہوگا۔“

”لیکن مرشد ہاؤس؟“

”وہ اس کی سیاسی رہائش گاہ ہے۔ یہاں اس کی ایک آدھ بیوی ہوگی یا صرف ملازمین کے ساتھ رہتا ہوگا۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں عورتوں کی کمی تو اسے یہاں بھی نہیں ہوگی بلکہ یہاں کھل کر عیاشی کرتا ہوگا۔“

”بالکل مرشد ہاؤس کو وہ ان ہی سرگرمیوں کے لیے استعمال کرتا ہوگا اپنے گھر میں تو اسے کئی بیویوں سے

مقابلہ کرنا پڑتا ہوگا۔ دنیا والوں کے نزدیک وہ مرشد ہے لیکن بیوی تو جوتی کی نوک پر رکھتی ہے۔“

مافی ہنسے لگا۔ ”بالکل جی، بیوی تو اسے سب سے زیادہ جانتی ہوگی۔“

مافی نے مجھے مرشد ہاؤس کا لائیو منظر بھی دکھایا لیکن ایک تورات کا وقت تھا دوسرے لائیو بہت واضح نہیں تھا۔ بس روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ احاطے میں چند لوگ ہی چلتے پھرتے دکھائی دے رہے تھے عام لوگوں کے لیے حرام مغرب کے بعد بند ہو جاتا تھا۔ اس لیے یہ اندر کے ملازمین یا گارڈز ہو سکتے تھے۔ احاطے کی دیواروں پر طاقتور سرچ لائٹیں لگی تھیں اور اندر بھی بہت روشنی تھی کوئی تاریکی کا فائدہ اٹھا کر چوری چھپے اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ مافی بہت متاثر تھا اس جگہ کی وسعت دیکھ کر۔ ”یہ تو بہت بڑی جگہ ہے۔“

”ہاں ایسے ہی لوگ اس ملک اور اس کی زمین پر قابض ہیں میرا خیال ہے زمین بھی قبضے کی ہے مرشد یا اس کے خاندان کی ملکیت نہیں ہے لیکن کوئی ان سے چھڑا نہیں سکتا ہے۔“

کچھ دیر بعد بیوی کی کال آگئی۔ ”شوبی آپ کا اندازہ درست تھا یہ بہت غلط لوگ ہیں میری وجہ سے وہ کوئی حرکت تو نہیں کر سکے لیکن وہ شازیہ کے بارے میں غلط باتیں کر رہے تھے۔“

”عبداللہ کو ان کے بارے میں بتا دو اور اس سے کہہ دو ان کی چھٹی کر دے اور انہیں سمجھا دے کہ کوئی الٹا سیدھا خیال بھی ذہن میں نہ لائیں ورنہ ہمیشہ کے لیے غائب کر دیئے جائیں گے۔“

”میں ابھی عبداللہ بھائی کو بتاتا ہوں۔“

”شازیہ کو کہاں رکھا ہے؟“

”اسے ابھی تو دیدی کے کمرے میں رکھا ہے انہوں نے کہا ہے وہ اسے سنبھال لے گی لیکن اگر اس نے شور مچایا تو اسے نیچے تہ خانے میں ڈال دیں گے۔“

”عبداللہ سے کہنا اس کا خیال رکھے وہ مظلوم لڑکی ہے اس سے سختی سے نہ پیش آئے اگر زبردستی کی ضرورت پڑے تو ڈاکٹر کو طلب کر کے اسے کوئی ٹرکولائزر دلواد۔“

”عبداللہ بھائی بھی یہی کہہ رہا ہے۔“ بیو نے کہا پھر التجا آمیز لہجے میں بولا۔ ”شوبی میں ادھر رک جاؤں بہت عرصے بعد دیدی کے ہاتھ کا کھانا ملا ہے۔“

”عیش کرو برو خود دار جب تک تمہاری یہاں ضرورت نہ پڑ جائے۔“

میں نے سو بائبل بند کیا تو مافی فکر مند تھا۔ ”آج رات بس ہم دو ہوں گے؟“

”ہاں تمہیں کیا فکر ہے؟“

”فکری بات تو ہے جناب آپ اوپر جا کر سو جائیں گے اور دشمن آگئے تو نیچے میں مارا جاؤں گا۔“

”تب تم اوپر جا کر سو جاؤ۔“

”مجھے کام کما رہا ہے۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”آج کل ایک پروجیکٹ ملا ہے اگر کام ہو گیا تو دس ہزار ڈالر زلیں گے۔“

”یہ تو اچھا معاوضہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”چلو میں ایسا کرتا ہوں یہاں کوچ پر سو جاؤں گا۔“

مافی خوش ہو گیا۔ ”آپ میری خاطر یہاں سو جائیں گے؟“

”ہاں یا تم ہم سے کوئی الگ تھوڑی ہو۔ تمہاری مشکلات ہماری ہیں اور ان کو حل کرنا سب کی ذمہ داری ہے۔“

مائی تھوڑا سا جذباتی ہو گیا۔ ”سچ کہہ رہے ہیں شوہن بھائی..... آپ مجھے ملازم نہیں سمجھتے۔“
 ”برخوردار میں کوئی کمپنی نہیں چلا رہا ہوں جس میں کوئی ملازم ہو۔ ہم سب ساتھی ہیں۔ سفیر، مونا، وسیم
 سعدیہ، بیٹو، عبداللہ اور اب تم۔“

”سفیر بھائی مجھے چھیڑتے ہیں۔“ اس نے منہ لٹکا کر کہا۔ ”مجھے دو کچلے کا ملازم قرار دیتے ہیں۔“
 میں ہنس پڑا۔ ”بے وقوف چیخیں اگر وہ تمہیں دو کچلے کا ملازم سمجھتا تو تمہارے لیے کھانے بناتا۔ سفیر تمہیں
 چھیڑتا ہے دل کا وہ ہیرہ بندہ ہے۔“

مائی مسکرانے لگا۔ ”ہاں یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں خاص طور سے سفیر بھائی کے پراٹھوں کا جواب ہی نہیں
 ہے۔ اب کھانے پڑیں گے بازار کے پراٹھے یا ڈبل روٹی۔“
 ”فکر نہیں کرو جب موقع ملے کچلے اور پڑے بھی منگو لینا لیکن ابھی کچھ دن احتیاط کرو مرشد پاگل ہو رہا
 ہے۔“

مائی نے جھرجھری لی۔ ”خدا کا شکر ہے آپ نے اس کی سازش ناکام بنا دی ورنہ سفیر بھائی، مونا باجی اور
 سعدیہ باجی تو مارے جاتے۔“

”نہیں یا رب اللہ کی ذات کرتی ہے۔ اگر اس کی مرضی نہ ہوتی تو ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔“
 مائی میرے لیے کافی لے آیا اور اس نے رضا کارانہ پیش کش کی کہ وہ صبح کا ناشتہ بھی تیار کر دے گا۔ میں
 کبل لے کر کاؤچ پر لیٹ گیا یہ کاؤچ پانچ فٹ کی قامت رکھنے والے شخص کے لیے موزوں تھی میرا تقریباً چھ
 فٹ قد اس میں مشکل سے سہا تھا۔ بہر حال نیند کے بارے میں حکما فرما گئے ہیں کہ وہ سولی پر بھی آجاتی ہے۔ یہ تو
 پھر بھی آرام دہ گدلی کاؤچ تھی۔ میں سو گیا اور اٹھا تو مائی نیچے قالین میں کبل میں لپٹا سو رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ
 میری آنکھ ایسے ہی کھل گئی ہے لیکن کچھ دیر بعد اوپر سے دروازہ بجانے کی آواز آئی۔ یہ صابر تھا جو جاگ گیا تھا
 اسے کافی میں دوا دیے ہوئے دس گھنٹے سے اوپر ہو گئے تھے اور اب تک دوا کا اثر ختم ہو گیا تھا۔ میں اوپر آیا منہ
 ہاتھ دھوئے اور پھر صابر کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ بیٹو نے وہاں کبل اور ٹیکے دے دیئے تھے۔ دروازہ کھلتے ہی
 صابر اچھل کر کھڑا ہو گیا اس نے چلا کر کہا۔ ”شہباز شاز یہ کہاں ہے؟“

”اس کی فکر مت کرو وہ بالکل آرام اور حفاظت سے ہے۔ ایک مہینے تک وہ اسی طرح رہے گی۔“ میرا لہجہ
 سرد تھا

”کیا مطلب ہے تمہارا.....؟ ایک مہینے تک..... اس کے بعد؟“
 ”اس کے بعد میں اسے مرشد کے حوالے کر دوں گا۔“

”نہیں۔“ وہ چیخ کر میری طرف جھپٹا۔ میں نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ ”تم ایسا نہیں کر سکتے۔“
 ”تم شاید میرے شریفانہ رویے سے دھوکا کھا رہے ہو میں نے تمہارے ساتھ وہ نہیں کیا جو تم اور مرشد
 جیسے لوگ دوسروں کے ساتھ کرتے ہیں۔“ میں نے حقارت سے کہا۔ ”میں نے کل ہی تمہیں بتا دیا تھا کہ مجھے بہر
 صورت مہر دیا اس کا یقینی پتہ رکاز ہے۔ اس کے لیے تمہارے پاس صرف ایک مہینے کی مہلت ہے۔“

”مجھے یقین نہیں ہے کہ شاز یہ خیریت سے ہے۔“ اس نے سوچ کر کہا۔ ”کیا تم مجھے اس کی خیریت کا

یقین دلا سکتے ہو۔“

میں نے سوچا اور عبداللہ کو کال کی۔ ”لڑکی کا کیا حال ہے؟“

”سعدیہ کو دیکھ کر نہ سکون ہے سعدیہ نے اسے سنبھال لیا ہے۔ میں نے ڈاکٹر کو بھی بلایا ہے۔“

”گڈ..... اس کا باپ اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔“

ایک منٹ بعد شاز یہ کی آواز آئی تو میں نے موبائل صابر کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے بے تابی سے کہا۔
 ”شاز یہ میری بچی تم ٹھیک ہو..... ہاں میں ٹھیک ہوں..... ہاں میں نے خود تمہیں بھجوا یا ہے..... میں ایک ضروری
 کام سے جا رہا ہوں..... کچھ دن بعد آکر تمہیں لے جاؤں گا..... ہاں تب تک تم ان کے ساتھ رہو..... یہ بہت
 اچھے لوگ ہیں..... انہیں شک نہ کرنا..... یہ تمہارا خیال رکھیں گے..... خدا حافظ میری بچی۔“ صابر کی آواز بھرا گئی
 اور اس نے موبائل میری طرف بڑھا دیا۔ عبداللہ کال پر تھا میں نے اس سے کہا۔ ”میں کچھ دیر میں تمہیں کال کرتا
 ہوں۔“

میں نے کال کاٹ کر صابر کی طرف دیکھا تو اس نے گہری سانس لی۔ ”ٹھیک ہے میں تیار ہوں لیکن تم
 نے کوئی دھوکا کیا تو.....؟“

”تو تم مرشد کے پاس جانے کے لیے آزاد ہو گے۔“ میں نے کہا۔ ”تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے
 تمہارے دونوں مجرم اپنے کیے کی سزا پا گئے ہیں اور ان کی لاشیں پیک کر کے مرشد ہاؤس پہنچا دی گئی تھیں یہ کل
 شام کی بات ہے۔“

اس کے ہونٹوں پر پہلی بار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”تم عبدل اور اسلم کی بات کر رہے ہو تو مجھے یہ سن کر
 واقعی خوش ہوئی ہے مرشد کا کیا راجل تھا؟“

”پیچھے سے میڈیا بھی پہنچ گیا اور اس نے لاشوں کی تصویریں اور ویڈیو بھی بنالی تھیں وہ ابھی بھی چینلوں پر
 چل رہی ہوں۔“

”یہ مرشد کی سیاسی ساکھ پر بہت بڑا دھبہ ہوگا۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مرشد کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس کا حلقہ انتخاب اس کا حلقہ ارادت
 بھی ہے اگر میڈیا مرشد کو شیطان قرار دے تب بھی اس کے لوگ اسے ہی ووٹ دیں گے۔ ہمارے ہاں
 سیاست تو نام ہی گند کا ہو گیا ہے اس میں موجود افراد کے بارے میں پہلے سے یقین کر لیا جاتا ہے وہ بدترین قسم
 کے لوگ ہوں گے۔ بہر حال اسے دھچکا تو لگا ہے۔ اب تم اپنا ارادہ بتاؤ۔“

”اگر تم مجھے چھوڑتے ہو تو میں ابھی روانہ ہو جاتا ہوں۔ اس وقت قافلے واپس آنے لگتے ہیں۔ کیونکہ
 گرمی میں بہت سارے مقامات جو سردیوں میں خالی پڑے ہوتے ہیں۔ یہ قافلے ان مقامات سے سرحد پار
 کرتے ہیں اور سرحدی چوکیوں کے آباد ہونے سے پہلے یہ کنٹرول لائن کے اس طرف آ جاتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے آج کسی وقت میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔“ میں نے کہا اور کمرے سے نکل آیا۔ کچن میں آکر
 ناشتہ تیار کیا خود ناشتہ کر کے صابر کو بھی ناشتہ دیا اور مائی کو اٹھا دیا وہ ابھی تک پڑا سو رہا تھا۔ ”برخوردار ناشتہ کر لو اور
 ہوشیار ہو جاؤ میں باہر جا رہا ہوں شاید دو تین گھنٹے میں واپسی ہو اور اگر میں تمہیں کال کر کے سب سمیٹے دکھوں تو

”کم سے کم تین گھنٹے۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے سوٹ کیس سے دس لاکھ کی رقم نکالی۔ یہ صرف دو پانچ ہزار کی گزلیوں کی صورت میں آگئی تھی اور میری جیکٹ کی ایک جیب میں سماگئی تھی۔ سوٹ کیس کے لاک ٹوٹ گئے تھے میں نے مانی سے کہا۔ ”جب نکلنے کا وقت آئے تو اس سوٹ کیس کا خیال رکھنا اسے یہیں نہ چھوڑ جانا۔“

”آپ فکر نہ کریں۔“ وہ بولا۔

میں باہر آیا اور پہلے عبداللہ کو کال کی راستے میں ٹریفک کا شور بہت ہوتا تھا اور آواز ٹھیک سے سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ”عبداللہ میں مکان کی بات کرنے جا رہا ہوں تم مجھ سے باہر کہاں مل سکتے ہو دس لاکھ کا ڈرافٹ بنواتا ہے اور ہاں میرا این آئی سی لینے آتا۔“

عبداللہ نے ایک بنک کا بتایا جہاں اس کا اکاؤنٹ تھا ڈرافٹ وہیں سے بنتا۔ میں روانہ ہوا آدھے گھنٹے بعد وہاں پہنچا تو عبداللہ پہلے سے موجود تھا۔ وہ مجھے بنک میں لے گیا میں نے اسے دس لاکھ کی رقم دی تو اس نے کسی قدر بحث کے بعد لے لی اور اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرادی۔ میں نے افنان احمد کو کال کی اور اس سے ڈرافٹ کے لیے کچھ تفصیلات پوچھیں۔ ”میں ایک گھنٹے کے اندر آپ کے پاس آ رہا ہوں۔ میرے ساتھ میرا ایک ساتھی ہوگا جو گواہ کے طور پر دستخط کرے گا ایک آدی آپ بلوالیں۔“

”میں نے یہ کام کر لیا ہے آپ آجائیں۔“

ڈرافٹ بنوا کر ہم افنان احمد کی کوٹھی پہنچے تو عبداللہ نے کہا۔ ”مکان تو بہت خوب صورت ہے لیکن نمایاں نہیں ہے؟“

”ہاں ہم نے اسی چیز کا فائدہ اٹھانا ہے۔ یہاں کم سے کم آمدورفت رکھیں گے اور وہ بھی زیادہ تر رات کو۔ فرنٹ کا حصہ استعمال نہیں کریں گے یہاں بس ایک آدھ گاڑی رہے گی وہ بھی کور سے ڈھک کر رکھیں گے۔“

اسی لمحے کال بیل کے جواب میں افنان احمد آگیا۔ وہ ہمیں ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ اس کی سخاوت دیکھ کر عبداللہ حیران ہوا تھا۔ افنان احمد چائے کا پوچھ کر اندر گیا تو عبداللہ نے سرگوشی میں کہا۔ ”جناب یہ اتنی فرنٹ کوٹھی دے رہا ہے؟“

”اندر سے بھی بالکل فرنٹ ہے اس سے بھی زیادہ۔“ میں نے جوابی سرگوشی کی۔

”اسنے کرائے میں تو خالی کوٹھی ملتی ہے یہ پورے سامان کے ساتھ دے رہا ہے۔“

”اس نے اپنے لیے ہائی ٹیٹی اب بیٹے کی وجہ سے باہر جا رہا ہے۔ اگر خالی چھوڑ کر جاتا ہے تو خطرہ ہے کوئی گھس کر سامان چرا کر لے جائے گا اور چوکیدار رکھتا ہے تو اس کی تنخواہ الگ دینی پڑے گی۔ یہاں زیادہ سے زیادہ پانچ لاکھ کا سامان ہوگا وہ ہم سے یک مشت دس لاکھ لے جا رہا ہے اگر ہم اس کا سامان اٹھا کر لے جاتے ہیں تب بھی وہ نقصان میں نہیں رہے گا۔ اس کے گھر کی حفاظت بھی ہوتی رہے گی۔“

عبداللہ نے سر ہلایا۔ اسی لمحے افنان احمد ایک اور شخص کے ساتھ اندر آیا۔ اس نے تعارف کرایا۔ ”یہ جلیل خانزادہ ہیں میرے وکیل۔۔۔۔۔۔ معاہدے کے گواہ یہ ہوں گے اور میرے بعد کوٹھی کی دیکھ بھال اور کسی بھی مسئلے سے

نمنٹان کی ذمہ داری ہے یہ مبینہ میں ایک بار آکر کوٹھی کا معائنہ کریں گے اور آپ معائنہ کرانے کے پابند ہوں گے۔ یہ بات معاہدے میں شامل ہے۔“

افنان احمد سادہ نہیں تھا اس نے پورا بندوبست کیا تھا۔ میں نے بنک ڈرافٹ اسے دیا اپنی اور عبداللہ کی آئی ڈی کارڈ کی کاپی دی جو جلیل خانزادہ نے کرائے داری کے معاہدے پر چن کر دی یہ ایک سال کا معاہدہ تھا۔ ہم نے دستخط کیے۔ یہ مارچ کی اٹھائیس تاریخ تھی۔ افنان احمد نے کہا۔ ”آپ دودن بعد یکم کو آ سکتے ہیں۔“

”یعنی فرسٹ اپریل کو۔“ عبداللہ بولا۔ ”بڑی غلط تاریخ دے رہیں آپ قبضے کی۔“

”مگر مجھے امید ہے ہم میں سے کوئی فول نہیں بنے گا۔“ افنان احمد نے کہا اور چائے لے آیا۔ بہ ظاہر وہ اکیلا ہی تھا اور سارے کام خود کرتا تھا۔ چائے پی کر ہم کھڑے ہوئے تو میں نے معاہدے کی فائل اٹھانی چاہی تو جلیل نے کہا۔

”اسے چھوڑ جائیں میں اس کی کاپی کرا کے یہ اور بجٹل آپ کو لا دوں گا۔“

”نہیں جناب ہمارے پاس یہی تو ایک پروف ہے کہ ہم نے یہ مکان سال بھر کے لیے دس لاکھ روپے ادا کر کے لے لیا ہے۔“ میں نے انکار کیا۔ ”جہاں تک کاپی کا تعلق ہے تو وہ ہم کرا کے لے آئیں گے پرسوں۔“

افنان احمد اور جلیل خانزادہ کے چہرے پر فکر مندی کے آثار نظر آئے تھے انہوں نے کوشش کی کہ میں فائل نہ لے جاؤں لیکن میں نے ان کی سنی نہیں اور فائل اٹھالی۔ ”افنان صاحب معذرت کے ساتھ میں نے ادائیگی کر دی ہے اور چیز مجھے دودن بعد ملے گی اس لیے میرے ہاتھ میں کچھ پروف تو ہونا چاہیے کیوں میں نے غلط تو نہیں کہا۔“

مجبوراً ان دونوں نے میری تائید کی تھی۔ ہم باہر آئے تو عبداللہ نے فوراً کہا۔ ”شہباز صاحب مجھے معاملہ مشکوک لگ رہا ہے۔ آخر یہ کرایہ داری کا معاہدہ کیوں قبضے میں کرنا چاہا رہے تھے۔“

وہاں سے کچھ دور ایک مناسب قسم کے اوپن ایئر ریسٹوران میں بیٹھ کر ہم نے فائل کا بغور مطالعہ کیا لیکن اس میں کوئی بات الگ سے نہیں تھی۔ افنان احمد اور جلیل خانزادہ کے این آئی سی بھی اصلی تھے۔ اس پر ان کی تصاویر بھی اصلی تھیں۔ ان کے پتے پنڈی اور اسلام آباد کے تھے۔ معاہدے میں بھی کوئی دھوکے والی بات نہیں تھی ہر شق صاف الفاظ میں لکھی تھی۔ میں نے عبداللہ کو قائل کرنے کی کوشش کی وہ شاید پرسوں تک بہر صورت معاملہ نمٹانے کے لیے فائل اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے انہیں خدشہ ہوگا کہ کہیں ہم کاپی دینے میں تاخیر نہ کریں اور افنان احمد کی روانگی کا پروگرام متاثر ہو۔ مگر عبداللہ کچھ سوچ رہا تھا اس نے کہا۔

”ممکن ہے آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں لیکن مجھے اپنی تسلی کی اجازت دیں؟“

”وہ کس طرح؟“

”میں اپنا ایک آدمی ان کی نگرانی پر لگا تا ہوں۔“

”تمہاری مرضی۔“ میں نے شانے اچکائے۔ ”ویسے ہمارے پاس دودن تو ہیں۔“

”بس تو میں اپنے آدمی ان کے پیچھے لگا تا ہوں۔“ عبداللہ نے کہا۔ ”اور ہاں، میں نے ان دونوں کی مٹی کر دی ہے اس سے پہلے بھی ان کے بارے میں شکایت ملتی رہی ہے اور میں انہیں وارننگ دیتا رہا ہوں۔“

تھالین میرا نام لینے سے گریز کیا۔ ”آئیے میں نے آپ کے لیے کچھ اسپیشل چیزیں رکھی ہیں۔“
شفقت مجھے ایک الگ پارلر میں لے آیا اس کا مقصد مجھے دوسروں کی نظروں سے بچانا تھا۔ اس نے اندر
آتے ہی دروازہ بند کیا اور سرگوشی میں بولا۔ ”شہباز صاحب یہ کیا غضب کر رہے ہیں اس طرح سرعام مہم کر۔“
”تم نے مجھے پہچان لیا؟“

”جی اور پولیس بھی دیکھ گئی تو پہچان لے گی۔“
میں فکر مند ہو گیا۔ ”تب کیا کروں؟“

”میں کچھ کرتا ہوں جناب۔“ اس نے کہا اور مجھے کرسی پر بٹھایا۔ پہلے تو اس نے تقریباً دس منٹ میرے
چہرے کا معائنہ کیا۔ ”آپ کا چہرہ کسی قدر گول بھی ہے اور لمبا بھی ہے اگر بالوں اور داڑھی کی ترتیب رکھی جائے تو
اسے دونوں میں سے کوئی بھی صورت دی جاسکتی ہے۔ بالوں کا رنگ ریڈش بلیک ہے۔ اسے ریڈش براؤن یا
ریڈش لائٹ گولڈن کیا جاسکتا ہے۔ کونٹیکٹ لینس لگانے سے آپ کی آنکھوں کا رنگ اور کلر بدل جائے گا۔ آپ
کا رنگ سرخ و سفید ہے۔ میں ایک کریم دیتا ہوں اسے لگائیں گے تو آپ کا رنگ کسی قدر سائولا ہو جائے گا۔“
”اوکے میرا حلیہ بدلنے کے لیے تم جو مناسب سمجھتے ہو وہ کرو لیکن جلدی ایسا نہ ہو پولیس یا میرے دشمن
یہاں آجائیں اور میرے ساتھ تمہیں بھی لے جائیں۔“

وہ ہنسا۔ ”ایسا نہیں ہے جی..... پولیس میرے سیلون میں قدم نہیں رکھ سکتی ہے۔ ان کو پتا ہے کہ ان کے
ڈی آئی جی تک یہیں آتے ہیں۔ میری ایک فون کال پر ان کی چینی اتر جائے گی۔“
”مگر میرے دشمن اس کی پروا نہیں کریں گے۔“

اس نے پہلے میرے بال شیپو کیے پھر انہیں کاٹا۔ اس کے بعد دوبارہ دھو کر ڈرائر سے خشک کیے۔ یہ
سارے کام اس نے مشکل سے بیس منٹ میں کر لیے تھے۔ اس کے بعد اس نے کلر کا عمل کیا۔ اس نے ریڈش
براؤن کا انتخاب کیا تھا کیونکہ میری سانولی ہو جانے والی رنگت سے میچ کرتے گولڈن براؤن بال مصنوعی لگتے
اس نے بہت اعلیٰ درجے کا کلر استعمال کیا تھا۔ کلر کرنے کے نصف گھنٹے بعد اس نے پھر کنڈیشنر سے میرے بال
دھوئے۔ انہیں ڈرائر سے خشک کیا۔ میں نے آئینے میں خود کو دیکھا تو بال بالکل مختلف لیکن اصلی لگ رہے تھے۔
اس کے بعد اس نے میری شیپو پر کام کیا اور اسے قلموں سے گول شیپو کی صورت دی۔ میرا ہینئر اسٹائل بھی ایسا تھا کہ
میرا چہرہ گول لگ رہا تھا۔ میری براؤن آنکھوں کو اس نے سرمئی رنگ کے لینس سے تبدیل کیا ان کا تاثر بھی بدل
گیا تھا۔ مونچھیں اس نے صاف کر دی تھیں۔ دو گھنٹے بعد آئینے میں میرے سامنے ایک اجنبی تھا میں اس حد تک
بدل گیا تھا کہ مجھے دن رات دیکھنے والے بھی مشکل سے شناخت کرتے۔ شفقت واقعی فن کار آدمی تھا۔

اس کے بعد اس نے مجھے کچھ مشورے اور دیے۔ ایک تو یہ کہ بالکل پتلے پتلے کے جوتے استعمال کروں
اور ذرا جھک کر چلا کروں۔ اس سے میری طویل قامتی کا تاثر زائل ہو جائے گا۔ اگر میں گردن ایک طرف جھکا کر
رکھوں اس سے چہرہ بھی واضح نظر نہیں آئے گا۔ اس نے ٹی شرٹ یا جری کے بجائے ہاف آستین کی شرٹ اور
سادہ ڈریس پینٹ کا مشورہ دیا۔ ”اس سے آپ کا تاثر نرم اور معزز شخص کا ابھرے گا۔“
”وہ تو میں اب بھی ہوں۔“ میں نے کہا۔

”تم نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ اپنی زبانیں بند رکھیں؟“

عبداللہ مسکرایا۔ ”بالکل جی..... ان کے گھروالوں کا پتا ہے انہیں سمجھا دیا تھا کہ کوئی ایسا کام نہ کریں جس
سے انہیں اپنے گھروالوں سے محروم ہونا پڑے۔“
”آدمی کم رکھو لیکن بالکل بکے رکھو۔“

”میں یہی کر رہا ہوں۔ پچھلے کچھ عرصے میں خاصے بندے بھرتی کیے اور ان میں سے کام کے رکھ کر باقی
فارغ کر دیئے۔“

میں نے اسے صابر کے بارے میں بتایا۔ ”میں اسے چھوڑ رہا ہوں لیکن اس کے بعد ہم فارم بھی چھوڑ
دیں گے۔ وہاں رہنا رکی ہوگا۔“

”بالکل ٹھیک سوچا آپ نے..... صابر جیسے لوگ کبھی بھروسے کے قابل نہیں ہوتے ہیں تب بہتر یہ ہے کہ
اسے اس وقت چھوڑیں جب آپ خود وہاں سے نکل آئیں۔“

”اس سے پہلے چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔“ میں نے سر ہلایا اور کھڑا ہو گیا۔ ”میں سوچ رہا
ہوں ڈرامرشد کے اڈے کا قریب سے جائزہ لوں۔“

”یہ بہت رکی ہے جناب۔“ عبداللہ جلدی سے بولا۔ ”آپ پہچان لیے گئے تو.....“

”یار میں پہلے کے مقابلے میں خاصا تبدیل ہو گیا ہوں۔“

”عام لوگوں کے لیے جناب، مرشد اور اس کے آدمی آپ کو اچھی طرح پہچانتے ہیں۔“

میں نے اچھے بڑے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ ”میرا خیال ہے میں کسی سیلون کا چکر لگا لوں اور وہاں مشورہ
کرتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔“

”ہاں کسی ماہر سے مشورہ کر لیں لیکن پلیز ہمیں بتائے بغیر کہیں جانے کی کوشش مت کیجئے گا۔“ عبداللہ
نے التجا کی۔ ”آپ تو آرام سے دشمن کی تحویل میں چلے جاتے ہیں اور قسمت کے دھنی ہیں کہ صحیح سلامت واپس
بھی آجاتے ہیں۔ یہاں ہماری جان پر بن جاتی ہے۔ جب تک آپ واپس نہیں آجاتے۔“
میں ہنس پڑا۔ ”اچھا یا نہیں جاؤں گا بغیر بتائے یا مشورہ کیے۔“

عبداللہ رخصت ہوا تو میں نے اسلام آباد کے ایک پوش ایریہ میں واقع ایک مہنگے سیلون کا رخ کیا کسی
زمانے میں، نہیں یہیں آتا تھا۔ اس وقت میرے بال بڑے اسٹائلش انداز میں بنے تھے۔ اب تو بال بنائے ہی
مہینے گزر جاتے تھے۔ میں اندر داخل ہوا تو آرائش اور عملہ بدلا ہوا تھا۔ یہ اس سیلون کے مالک کا شوق تھا۔ آرائش
وہ ہر سال بدلتا تھا اور اس کا عملہ خود بدل جاتا تھا اس کے پاس کام کرنے والے لڑکے جب کام سکھ جاتے تو خود
کہیں جا کر اپنا سیلون کھول لیتے تھے یا اچھی تنخواہ پر ملازم ہو جاتے تھے۔ وہ بھی پروا نہیں کرتا تھا نئے لڑکے لے
آتا تھا اور ان سے معمولی معاوضے پر کام لیتا تھا۔ دو تین اچھے لڑکوں کو اتنا معاوضہ دیتا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر نہیں
جاتے تھے اور دو تین سال کام کرتے تھے۔ میرا خیال تھا وہ مجھے نہیں پہچان سکے گا میں تقریباً سال بعد اس کے
پاس آیا لیکن اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

”آپ..... اتنے عرصے بعد آئے؟“ اس نے مجھ سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ اس کا نام شفقت

”نہیں جی میں ان کے نکتہ نظر سے کہہ رہا ہوں جن کو آپ کی تلاش ہے۔ آدمی کا لباس اور حلیہ بھی دوسروں کو متوجہ کرتا ہے۔“

شفقت نے مجھے ایک شاپ کا پتا بتایا جہاں ہر قسم کے ریڈی میڈ سوٹ ملتے تھے اور اگر ساز میں مسئلہ ہوتا تھا۔ تو دکان پر موجود ٹیلر اسے آدھے گھنٹے میں ٹھیک کر کے دے سکتا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور معاوضہ پوچھا اس نے نیاز مندی سے کہا۔ ”آپ جو اپنی خوشی سے دے دیں جناب۔“

مجھے اس کے معاوضے کا اندازہ تھا لیکن یہ سارے کام میں نے پہلی بار کرائے تھے اس لیے اندازے سے معاوضہ دیا۔ اس کے تاثرات نے بتا دیا کہ وہ اس کی توقع سے بڑھ کر ہی تھا۔ کپڑوں کی شاپ شفقت کے بھائی کی ثابت ہوئی تھی۔ اس نے اپنا معاوضہ وصول کر لیا تھا اور اپنے بھائی کا بھی بھلا کر دیا تھا۔ شفقت کا بھائی نزاکت خوش خلقی سے پیش آیا۔ میں نے اس سے تین شرٹس اور تین ہی پتلونیں لیں۔ اتفاق سے سب چیزیں میرے ساز کی مل گئیں اس لیے ان کو ٹھیک کرانے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ شاپ سے نکلتا تو زوروں کی بھوک لگ رہی تھی۔ ایک ہوٹل میں کھانا کھایا اور مانی کے لیے بیک کر لیا اسے معلوم ہوتا کہ میں نے باہر سے کھایا ہے تو وہ شور مچاتا۔ گھر میں موجود چیزیں اس کے حلق سے کہاں اترتیں؟ گزشتہ رات بھی اس نے منہ بنا کر کھایا تھا۔

میں واپس پہنچا تو مانی حسب توقع بھوکا بیٹھا تھا پہلے تو وہ مجھے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ ”شوبی بھائی یہ آپ ہیں..... جاتے وقت تو کچھ اور تھے۔“

”بس بھائی ایسے ہی دل چاہا حلیہ بدل لیا۔ یہ خواتین بھی تو بیوٹی پارلر جا کر حلیہ بدل لیتی ہیں بعض اوقات بے چارہ شوہر بھی نہیں پہچان پاتا ہے خیر چھوڑو یہ بتا کھانا کھایا۔“

”نہیں۔“ اس نے فریادی لہجے میں کہا۔

میں نے کہا۔ ”اتنی ساری چیزیں پڑی ہیں ان سے کیوں پیٹ نہیں بھرا؟“

”جناب میں ایسی چیزیں نہیں کھا سکتا ہوں۔ صبح بھی بڑی مشکل سے ناشتہ کیا تھا۔“

”یہی سوچ کر تمہارے لیے کھانا لے آیا ہوں ایک ہوٹل سے، مٹن کڑا ہی ہے اور اسٹیشل آئس کریم ہے۔ آئس کریم فرنچ میں رکھ دی ہے۔“

مانی اچھل کر بھاگا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ٹرے سجا کر لایا اور کھانے میں مصروف ہو گیا۔ اس کی مصروفیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے وسیم کو کال کر کے تازہ ترین احوال لیا اور اسے یہاں کے احوال سے آگاہ کیا۔ اس نے فاضلی کے بارے میں بتایا کہ اسے اب تک تین ڈونڈ دیئے جا چکے تھے۔ فی الحال اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”اب ایک کام اور کرو..... ہو سکتا ہے تادور کو بھی اٹھا لو۔ عبد اللہ نے اس کا موجودہ ٹھکانہ دیکھ لیا ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہیں یہ مرشد پر ایک دار اور ہوگا۔“

”مرشد کو تادور کی پروا نہیں ہے لیکن اسے خاندان کے دوسرے لوگوں کی پروا یقیناً ہوگی وہ سب سے ایک ساتھ نہیں لڑ سکتا ہے۔“

”ہم ایسا تاثر دے سکتے ہیں کہ تادور کو مرشد نے غائب کر لیا ہے۔“ وسیم نے کہا۔ ”لیکن تادور کے ساتھ مسئلہ ہے وہ مکمل معذور ہے اور اسے کسی کی دیکھ بھال کی ضرورت ہوگی۔“

”میرا خیال ہے تمہارے آدمی اس کی دیکھ بھال کر سکتے ہیں۔“

”ہاں یہ بہت مشکل بھی نہیں ہے اسے کب اٹھانا ہے؟“

”تم دیکھو عبد اللہ کا کوئی آدمی اس کے ٹھکانے کی نگرانی کر رہا ہے اس سے بات کرو اور اپنے آدمی لگا دو اگر موقع آسان لگے۔“ لگے ہاتھوں اسے اٹھا لو۔ ایسا نہ ہو کہ مرشد پہل کر جائے پہلے اس کے ساتھ سیکورٹی تھی لیکن اب وہ ایسے ہی رہا ہے۔“

”میں جلدی کرتا ہوں۔“

وسیم سے بات کر کے میں نے عبد اللہ کا نمبر ملایا۔ ”افنان احمد کی نگرانی کرنے والوں کی طرف سے کوئی آپ ڈیٹ آئی ہے؟“

”نہیں جب میرے آدمی یہاں پہنچے تو مکان خالی تھا افنان احمد کہیں چلا گیا ہے۔“

”کہیں چلا گیا ہے؟“

”ہاں ابھی مکان خالی ہی ہے اور باہر تالا لگا ہے۔“

”ابھی زیادہ دیر تو نہیں ہوئی ہے ممکن ہے کسی کام سے گیا ہو۔“

”ممکن ہے لیکن خاص بات یہ ہے جو کلٹس ہم نے کھڑی دیکھی تھی وہ بدستور وہاں موجود ہے۔“

”ممکن ہے وہ ٹیکسی یا کسی اور ذریعے سے گیا ہو۔ اگر شہر کا کام ہو تو بہت سارے لوگ پارکنگ کے مسئلے کی وجہ سے گاڑی لے جانا پسند نہیں کر سکتے ہیں۔“

”ہو سکتا ہے۔“ عبد اللہ بولا۔ ”افنان احمد نے آپ کو بتایا تھا کہ اس کا بینک اکاؤنٹ کس بینک میں ہے؟“

میں نے نفی میں جواب دیا۔ ”نہیں اس نے ایسی کوئی بات نہیں بتائی۔ مجھے بھی پوچھنے کا خیال نہیں رہا۔“

”اب مجھے دال میں پہلے سے زیادہ کالا لگ رہا ہے۔“

”فکر مت کرو یا دال میں جو بھی کالا ہے وہ جلد سامنے آجائے گا۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”وسیم سے بات کر لو..... میں نے اسے تادور کو اٹھانے کا مشورہ دیا ہے۔“

”میں خود بھی یہی مشورہ دیتا چاہ رہا تھا خوش قسمتی سے تادور اس وقت بے یار و مددگار ہے اسے اٹھانا زیادہ مشکل نہیں ہوگا وہ مرشد کے خلاف بہت کچھ بتا سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے میرا تو خیال ہے اسے اس طرح اٹھاؤ کہ اسے شبہ ہو اسے کسی سرکاری ایجنسی نے اٹھالیا ہے۔ آخر مرشد ملک دشمن سرگرمیوں میں بھی ملوث ہو سکتا ہے۔“

”میں ابھی وسیم سے بات کرتا ہوں میرا خیال ہے آج یا کل تک یہ کام ہو جانا چاہیے۔“

کمر کے زخم کی بینڈیج کو چوبیس گھنٹے ہو گئے تھے۔ مانی نے اسے تبدیل کر کے دوسری بینڈیج لگائی اور مجھے آگاہ کیا کہ زخم پر کھرنڈ آگئی ہے۔ میں چاہوں تو نہا بھی سکتا ہوں۔ مانی کو میں نے صابر والے کمرے میں

جانے سے منع کیا تھا وہ اس کے بس کی چیز نہیں تھا۔ اسے خود جا کر کھانا دیا اور کچھ تسلیاں بھی دیں کہ جلد اسے رہا کر دیا جائے گا تب تک وہ صبر و سکون سے یہاں بیٹھے۔ مانی کھانے کے بعد اپنے دس ہزار ڈالر والے پروجیکٹ میں مگن ہو گیا۔ میں نے سفیر سے معلوم کیا اس نے موناکو واپس کوٹھی منتقل کر دیا تھا۔ یہ وہی بات ہوئی تھی کہ کھایا پیا کچھ نہیں اور گلاس توڑا بارہ آنے۔ جس کام کے لیے ہم نے اتنی بھاگ دوڑ کی اور رازداری سے کام لیا۔ وہ تو ہوا نہیں الٹا ہمیں نقصان اٹھانا پڑا تھا اگرچہ سب کی جان بچ گئی تھی۔ مگر موناکو اور سفیر کو بہت بڑا ذاتی نقصان اٹھانا پڑا تھا ہم اس غم میں ان کا بار بھی ہلکا نہیں کر سکتے تھے۔ اگرچہ موناکو اور سفیر نے مجھ سے بہت حوصلے سے بات کی تھی لیکن میں ان کی دلی کیفیت کا اندازہ کر سکتا تھا۔

مرشد نے فون پر مجھ سے خاصی لا پرواہی سے بات کی تھی لیکن فاضلی جیسے آدمی۔ ہر عروہی اس کے لیے چھوٹا نقصان نہیں تھی اس کے پاس فاضلی جیسا ایک آدمی بھی نہیں تھا یہ فاضلی تھا جس نے کئی محاذوں پر مرشد کو کامیابی دلوائی۔ فاضلی کے بعد نادر بھی غائب ہو جاتا تو مرشد کی مشکلات میں یقیناً اضافہ ہو جاتا۔ اس کے گرد گھیرا تنگ کرنا ضروری تھا کیونکہ مرشد کے پاس وسائل اور آدمیوں کی کمی نہیں تھی وہ خود کو محفوظ رکھتے ہوئے لا محدود مدت تک یہ جنگ جاری رکھ سکتا تھا جب کہ ہم لا محدود جنگ کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ ہمارے پاس نہ تو وسائل تھے اور نہ افراد جنہیں بے دریغ استعمال کیا جاسکے۔ میری اور میرے ساتھیوں کی مرشد جیسی فطرت بھی نہیں تھی وہ وقت پڑنے پر اپنے سگے بھائی کو بے جان مہرے کی طرح پڑا سکتا تھا دوسرے لوگوں کی تو اس کی نظر میں کوئی اہمیت ہی نہیں تھی لیکن ہمارے لیے ہمارا ایک ایک فرد قیمتی تھا۔ ایسے میں ضروری ہو گیا تھا کہ مرشد کو اس طرح گھیرا جائے کہ وہ کھل کر ہمارے خلاف کارروائی کرنا بھول جائے۔ اس کی حرکت کا اسے فوری اور بھرپور جواب ملنا تھا وہ اپنے مقصد میں تو کامیاب رہا تھا ساتھ ہی اپنے اہم ترین آدمی سے ہاتھ بھی دھو بیٹھا تھا۔

فتح خان اور کرل کا مجھے علم نہیں تھا فی الحال دونوں منظر عام سے غائب تھے۔ شہلا کی موت یقیناً فتح خان کے لیے بڑا دھچکا ثابت ہوئی ہوگی کیونکہ وہ بریف کیس والے معاملے میں برابر کی شریک تھی۔ ممکن ہے وہ اس کا سودا کرانے میں مددگار ہو۔ جیسے وہ فتح خان کے لیے ہیرے بیچنے کے لیے تیار ہو گئی تھی یقیناً اس میں اس کا حصہ ہوگا۔ بریف کیس کے معاملے کو شہلا دیکھ رہی تھی۔ اب وہ نہیں رہی تھی اور شاید فتح خان کو اس کی موت کا علم بھی نہیں تھا کیونکہ وہ دھوکے میں ماری گئی تھی۔ نہ صابر پر بھروسہ کرتی اور نہ وہ اسے اتنی آسانی سے مرشد کے حوالے کرتا۔ اس کا امکان تھا کہ شہلا نے فتح خان کو صابر کے بارے میں بتایا ہو لیکن یہ فتح خان کیسے جان سکتا تھا کہ شہلا کی گمشدگی میں صابر کا کوئی کردار ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ شہلا کی گمشدگی کا علم ہوگا۔ اگر اسے علم بھی ہو جاتا کہ شہلا مرشد کے آدمیوں کے ہاتھوں ماری جا چکی ہے تب بھی اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ فتح خان کے لیے شہلا اہم ہستی نہیں تھی وہ صرف کاروباری لحاظ سے اس کی شریک تھی۔ مرشد سے فتح خان پہلے ہی اپنے کزن شہباز خان کا خاصا انتقام لے چکا تھا۔ صرف شہلا کے لیے وہ مرشد پر چڑھ دوڑتا اس کا کوئی امکان نہیں تھا۔

شام کے وقت دسیم کی کال آئی۔ ”میرے آدمی نادر کے گھر کی ریکی کر رہے ہیں ممکن ہے آج رات ہم اسے اٹھالیں۔“

”ٹھیک ہے عبداللہ کو میں نے کہا تھا کہ اندازاً بجبھی والا رکھنا۔ نادر کو ہم پر شبہ نہ ہو۔“

”بالکل ایسا ہی کریں گے۔ اسے الگ رکھا جائے گا اور پوچھ گچھ بھی اسی انداز میں کی جائے گی۔“

”بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے مرشد کو شک نہ ہو کہ نادر کو اٹھانے والے ہم ہیں۔“

”اس کا پہلا شک ہم پر ہی جائے گا جناب۔“

”شک سے کچھ نہیں ہوتا بس تم کوئی ثبوت مت چھوڑنا اس کے گھر میں کتنے افراد ہیں؟“

”بہ ظاہر وہی ملازم ہیں وہی اس کے اور گھر کے سارے کام کرتے ہیں۔“

”کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ مرشد نے اسے یوں چھوڑ دیا ہے۔ اگر مرشد نے اس سے قطع تعلق کر لیا

ہے اور اس سے مالی وسائل بھی چھین لیے ہیں تو اس خاندان میں اور افراد بھی تو ہیں۔“

”میرا خیال ہے وہ بھی مرشد سے ڈرتے اور کھل کر اس کے سامنے آنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس لیے

کوئی نادر سے نہیں ملتا ہوگا اور نہ کسی نے اس کی مدد کرنے کی کوشش کی ہوگی“

”ظاہر ہے دولت اور گدی کے ساتھ بد معاش مزیدوں کی ساری طاقت بھی مرشد کے پاس ہے۔ وہ اس

سے کھل کر لڑ نہیں سکتے ہیں لیکن اگر ہمارا تعاون حاصل ہو جائے تو وہ بھی ہمت کر سکتے ہیں۔ وہ اندر کے راز

جاننے ہیں۔“

”وہ مرشد کے دشمن ہیں میری مریدی کے اس دھندے کے دشمن نہیں ہیں۔ وہ ہمیں ایسا کوئی راز نہیں

بتائیں گے جس سے اس کا روبرو خطرہ ہو۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن اگر ان کو یقین دلادیا جائے کہ ہمیں صرف مرشد سے جان چھڑانی ہے۔

کیونکہ وہ ہماری جان چھوڑنے کو تیار نہیں ہے تب مجھے یقین ہے وہ ہم سے تعاون پر آمادہ ہو جائیں گے۔“

”لیکن اس کے لیے ضروری ہے ہم اپنی طاقت کا کوئی مظاہرہ کر کے دکھائیں۔“

”کالی کوٹھی کی تباہی کافی نہیں ہے؟“

”نہیں مرشد نے اسے حادثہ ظاہر کیا ہے اور جلد یا بدیر پولیس بھی یہی رپورٹ کرے گی۔ ہمیں مرشد کے

اڈے کو نشانہ بنانا ہوگا۔“ میں نے کافی مگ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ دسیم سے گفتگو کے دوران میں نے یہ کام کر لیا

تھا۔ مانی کے لیے بھی کافی نکالی اور دوسری چیزوں کے ساتھ اسے پہنچا دی وہ کریم اور ڈھیروں چینی کے ساتھ کافی

نوشی کرتا تھا۔

”شہباز صاحب آپ نے وہ جگہ دیکھی ہے؟“ دسیم نے ہچکچا کر کہا۔

”ہاں اچھی طرح دیکھ لی ہے مانی نے اس کی سیٹلائٹ تصاویر نکال کر دکھائی ہیں۔“

”میرے آدمیوں نے وہاں کا سروے کیا ہے وہ مزار پر حاضری اور دیکھی فریادی کے بہانے ہر جگہ گھوم پھر

کر آئے ہیں۔ عورتوں والا حصہ بھی دیکھا ہے وہاں حفاظتی انتظامات بہت سخت ہیں۔ گارڈز کی تعداد جو جدید ترین

سلاح سے لیس ہیں سو سے بھی زیادہ ہے اور ان میں سے اکثر چھٹے ہوئے مجرم ہیں۔ وہاں جانا تو آسان ہے لیکن

ہاں سے واپس آنا آسان نہیں ہوگا۔“

”کوئی کام نامکن نہیں ہوتا ہے۔ اگر صحیح پلاننگ کی جائے تو ہم جا بھی سکتے ہیں اور واپس بھی آ سکتے

ہیں۔“

”درست پلاننگ میں تھوڑا وقت لگے گا۔“

”یار مجھے کون سی جلدی ہے کہ میں آج کل میں مرشد کے اڈے کا رخ کروں گا یہ کام آرام سے اور خوب سوچ سمجھ کر کرنے والا ہی ہے۔ پہلے تو تم برادر خرد کو منتقل کرو اس کے بعد مرشد کا رول مل دیکھتے ہیں۔“



فی الحال کوئی کام نہیں تھا اس لیے وقت گزاری کے لیے ٹی وی لگا لیا۔ مانی نے دن میں مزے کر لیے تھے لیکن رات میں اسے وہی شبن بند کھانا پڑا ساتھ میں فردوزن پر اٹھے تھے۔ میں نے دودھ اور سیریل کو ترجیح دی تھی کیونکہ کئی دن سے ایسے ہی کھانے کھا رہا تھا۔ مانی نے سیریل کے پیالے کو دیکھا۔ ”شوبی بھائی آپ یہ کیسے کھا لیتے ہیں؟“

”بس مجھے عادت ہے جب میں اسلام آباد آیا تو اکیلا تھا اور کچھ بنانا نہیں آتا تھا یا ہر سے میں کم ہی کھاتا ہوں اس لیے زیادہ تر اس قسم کی چیزوں پر گزارا ہوتا تھا۔ میں تو سادہ ولیہ نمک مرچ کے بغیر بھی شوق سے کھا لیتا ہوں۔“

مانی کانپ اٹھا۔ ”میں شاید بھوک سے قریب المرگ ہوں تو اس صورت میں جان بچانے کے لیے یہ چیزیں کھا سکتا ہوں ورنہ تو.....“

”ٹھیک کہا تم نے برخوردار جان بچانے کے لیے سب حلال ہے۔ یہ کیا کبھی ایسا موقع آیا تو تم کتڑ پتھر، چمپکیاں اور جو ہے تک کھانے کے لیے تیار ہو جاؤ گے۔“

مانی نے منہ بنایا۔ ”جی نہیں ایسا بھی نہیں ہے۔“

کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔ ”وہ آپ کا منتقل ہونے کا پروگرام تھا؟“

”ہاں بات ہو گئی ہے چابی یکم کو ملے گی۔“

”فرسٹ اپریل۔“ مانی نے سوچ کر کہا۔ ”کہیں وہ آپ کو بے وقوف تو نہیں بنا رہا ہے؟“

”عبداللہ بھی یہی کہہ رہا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے اس نے اپنے آدمی ان کے پیچھے لگائے ہیں اگر ایسا کچھ ہوا تو پتا چل جائے گا۔“

مانی مسکرانے لگا۔ ”میں تو ایسے ہی فرسٹ اپریل کی وجہ سے کہہ رہا تھا لیکن عبداللہ بھائی نے کیوں کہا؟“

میں نے مانی کو بتایا کہ کس طرح افغان احمد نے فائل لینے کی کوشش کی تھی۔ وہ بولا۔ ”آپ نے اچھا کیا اسے فائل نہیں دی۔ ویسے مکان کیا اسی شخص کا ہے؟“

”ہاں اسی کا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ مالک ہے اور بنوایا بھی اسی نے ہے۔“

”جب میں چیک کر سکتا ہوں کہ مکان جج جج اس کے نام پر ہے یا نہیں۔“

”تم چیک کر سکتے ہو؟“

”بالکل جنتاب..... اسلام آباد کی حد میں زمین اور جائیداد کا ریکارڈ کمپیوٹر انڈا ہو گیا ہے۔“

”ابھی چیک ہو سکتا ہے؟“

”کوشش کرتا ہوں دراصل رات میں جب سرکاری دفاتر بند ہوتے ہیں تو عام طور سے کمپیوٹر بھی بند کر

دینے جاتے ہیں۔ اگر وہ آن ہوں گے اور انٹرنیٹ ایکسیز ہوگی تب ہی کام ہو سکے گا ورنہ کل صبح تک کا انتظار کرنا پڑے گا۔ جب کمپیوٹر آن ہوں گے اور ان کا انٹرنیٹ بھی کام شروع کرے گا۔“

”چلو برخوردار ابھی چیک کرو اگر کمپیوٹر آن ہیں تو۔“

کھانے کے بعد مانی نے نہایت شرافت سے برتن اٹھائے اور دھو کر بھی رکھے آخر میں کچن بھی صاف کیا تھا۔ وہ کچرے کا شاہراہ کا باہر پھینکنے جا رہا تھا کہ میں نے روک دیا۔ ”بس یار جتنا کر دیا ہے اتنا کافی ہے۔ تمہیں ویسے بھی ان کاموں کی عادت نہیں ہے۔“

”نہیں جی یہ سفیر بھائی نے بدنام کیلہ تھا اور کچھ ان کی ضد میں نہیں کرتا تھا ورنہ میں امریکہ سے پڑھ کر آیا ہوں وہاں رہنے والا لازمی اپنے کام خود کرنے کا عادی ہوتا ہے۔“

”پھر بھی شاپر میں پھینک آتا ہوں۔ تم جب تک اپنی کوشش کا آغاز کرو۔“

”میں پہلے کافی بنا لوں..... جب تک آپ آئیں گے میں بنا لوں گا۔ معاف کیجئے گا آپ بہت خراب کافی بناتے ہیں۔“

”کیونکہ مجھے تلخ کافی پسند ہے۔“ میں نے باہر جاتے ہوئے کہا ویسے یہ سچ تھا مانی بہت شاندار کافی بناتا تھا میں بھی اسی نیس کیف گولڈ کی کافی بناتا تھا مگر مانی کی کافی کا ذائقہ مختلف ہوتا تھا۔ میں روڈ کے ساتھ رکھے ایک کچرے دان میں شاپر ڈال کر آیا تو مانی کافی بنا چکا تھا اس نے اپنا لیپ ٹاپ آن کیا اور کام میں لگ گیا۔ میں کاؤچ پر نیم دراز ہو گیا۔ مانی جو کر رہا تھا وہ بڑے ایل سی ڈی پر بھی آ رہا تھا اس نے کوئی ایسا سسٹم کر دیا تھا کہ کمپیوٹر کی اسکرین دونوں جگہ آتی تھی۔ اس نے اپنی کوشش کا آغاز کر دیا تھا۔ اس قسم کا سینٹرلائزڈ ریکارڈ بڑے کمپیوٹر میں ہوتا ہے جن کو مین فریم کہتے ہیں اور وہ ہمہ وقت آن رہتے ہیں ان کو صرف کسی مرمت یا خرابی دور کرنے کے لیے بند کیا جاتا ہے۔ مگر شاید یہاں ان کو بھی عام پی سی کی طرح بند کر دیا جاتا ہو۔ مانی کوشش کرتا رہا لیکن اس کی کوشش کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوئی تھی۔ ایک گھنٹے بعد اس نے کوشش ترک کر دی اور مایوسی سے بولا۔

”ایکسیز نہیں مل رہی ہے۔“

”یعنی کمپیوٹر کا نیٹ سے رابطہ نہیں ہے۔“

”عین ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ عام طور سے اداروں کے درمیان کوئٹرائٹ استعمال ہوتا ہے یعنی اس میں صرف ادارے کے کمپیوٹر ایک دوسرے سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ مگر اس نیٹ میں بھی دراندازی ممکن ہے یہاں شاید سرے سے کوئی کوئٹرائٹ ہی نہیں ہے۔“

”کوئی بات نہیں تم دن میں کوشش کرنا۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ صابر کو کھانا دے یا تھا میں نے بچی ہوئی کافی بھی اسے ڈال کر دے دی۔ اس نے پوچھا۔

”تم مجھے کب جانے دو گے میری بچی پر ایک ایک لمحہ بھاری گزر رہا ہے۔“

”اس پر بھاری لمحات گزر چکے ہیں اور وہ جہاں ہے بالکل آرام سے ہے۔ اتنی محفوظ وہ تمہارے ساتھ نہیں ہوگی جتنی کہ اس وقت ہے۔ بہتر ہوگا کہ میرا کام کرنے کے بعد بھی تم اس وقت اسے وہاں سے لینا جب

کسی محفوظ ٹھکانے کا انتظام کر لو۔“

”میرے پاس محفوظ ٹھکانے ہیں لیکن میں شازیہ کو لے کر باہر چلا جاؤں گا۔“

”یہی تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔“ میں نے کہا اور برتن اٹھا کر باہر آ گیا۔ اپنے کمرے کی طرف آیا تھا کہ دسیم کی کال آ گئی۔

”جناب ہم نادر کے گھر میں داخل ہونے والے ہیں۔“

”کس طرح داخل ہو گئے؟“

”براہ راست گیٹ سے..... ہم نادر سے بات کرنے کے بہانے اندر داخل ہوں گے اور پھر اسے ساتھ لے جائیں گے اس کے نوکر بعد میں یہی بتائیں گے کہ نادر کو لے جانے والے انجینی والے تھے۔“

”وہ تمہیں پہچانتا ہے۔“

”میں اس کے سامنے نہیں جاؤں گا میرا ایک آدی لیڈنگ رول ادا کرے گا۔“

”کتنے آدی ہیں تمہارے ساتھ؟“

”دو گاڑیاں اور سات آدی ہیں چھ اندر جائیں گے اور میں باہر ہوں گا۔“

”اگر نادر اور اس کے آدمیوں نے مسلح مزاحمت کی تو؟“

”تب اسلحہ کا جواب اسلحہ سے دیا جائے گا۔“

”لیکن خیال رہے نادر کو پہچانا ہے۔“

”اصل خدشہ اس کے آدمیوں سے ہے۔“ دسیم نے کہا۔ ”میرے آدی ان کو چھڑکریاں لگا کر بے بس کر دیں گے۔“

دسیم یہ سب مجھے راستے میں بتا رہا تھا۔ اس نے اپنے موبائل کا اسٹیکر فون آن کر دیا اب مجھے آس پاس کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ وہ نادر کی کوٹھی کے دروازے پر پہنچ گئے تھے دسیم کے آدی اتر کر کوٹھی میں داخل ہو رہے تھے وہ دبے لہجے میں مجھے بتا رہا تھا کہ اس کے آدی کیا کر رہے تھے۔ اس چھاپے میں اس نے دین استعمال نہیں کی تھی بلکہ دو سیاہ گاڑیاں لے کر گیا تھا جیسا کہ سرکاری آدی استعمال کرتے ہیں۔ اس کے آدی ریڈیو سے منسلک تھے۔ دسیم کے آدمیوں نے اندر داخل ہوتے ہی نادر کے دونوں آدمیوں کو قابو میں کر لیا تھا اور اب کوٹھی کی تلاشی لیتے پھر رہے تھے۔ نادر اپنے کمرے میں تھا اس نے شور شرابا سن لیا تھا اور وہیں سے نوکروں سے پوچھ رہا تھا کہ یہ ہنگامہ کیا ہے؟

بالآخر دسیم کے آدی نادر کے کمرے میں داخل ہوئے۔ دسیم کے لیڈنگ مین نے کھر دے لہجے میں نادر کو بتایا کہ بعض وجوہات کی بنا پر اسے سرکاری تحویل میں لیا جا رہا ہے۔ نادر یہ سن کر چیخنے چلانے لگا تھا کہ وہ کسی کے ساتھ نہیں جائے گا لیکن جانے والے پوری تیاری کے ساتھ گئے تھے انہوں نے نادر کو بے ہوشی کا انجکشن لگایا اور پھر اسے بوری کی طرح لا کر گاڑی میں لے آئے۔ اس کے ذہن نوکر بے بس کر دیئے گئے تھے لیکن وہ ہوش میں تھے اور ساری کارروائی دیکھ رہے تھے دسیم کے آدی نے ان سے کہا کہ وہ شور نہ کریں اور اس بارے میں پولیس کو رپورٹ نہ کریں کیونکہ نادر کو لے جانے والے خود بھی سرکاری آدی تھے جلد اسے چھوڑ دیا جائے گا تب

تک وہ آرام سے بیٹھیں اور چاہیں تو نادر کے بھائی کو اطلاع کر دیں۔

دسیم اور اس کے آدمیوں نے خلاف توقع یہ کام بہت آسانی سے کر لیا تھا جب کہ مجھے توقع تھی کہ وہاں مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ نادر تو الٹ نہیں تھا اس کا اتنی آسانی سے ہاتھ آ جانا حیران کن تھا۔ مرشد نے جج جج اسے بارود دگاڑ چھوڑ دیا تھا۔ عبداللہ اور اس کے آدی بیک آپ میں موجود تھے کہ کوئی غیر متوقع صورت حال درپیش آئے تو وہ مداخلت کریں۔ مگر اس کا موقع ہی نہیں آیا دسیم آرام سے نادر کو حاصل کر کے حویلی کی طرف روانہ ہو گیا جہاں پہلے ہی اس کے لیے ایک کمرہ تیار کر لیا گیا تھا۔ میں نے عبداللہ کو کال ملائی اور ہم کافرئس میں آگئے میں نے عبداللہ سے پوچھا۔ ”افنان احمد کی نگرانی کی کوئی رپورٹ ملی؟“

”ہاں رپورٹ ملی ہے وہ رات آٹھ بجے واپس آیا تھا اور اب تک گھر میں ہے۔“

”شاید اس کے بارے میں ہمارا شبہ غلط ہے۔“ میں نے کہا پھر ہنس۔ ”ویسے مانی بھی اپریل فول والی بات کہہ رہا تھا۔ اس نے انٹرنیٹ سے معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ یہ مکان افنان احمد کے نام پر ہی ہے یا نہیں لیکن رات کے وقت سرکاری کمپیوٹر بند ہوتے ہیں۔“

دسیم نادر کو لے کر شہر سے نکل گیا تھا عبداللہ اطمینان کرنے کے بعد کہ کوئی اس کے پیچھے نہیں واپس لوٹ گیا تھا اور آدھے گھنٹے بعد نادر بھی حویلی پہنچ چکا تھا اسے اسٹیشن کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ فاضلی کے بارے میں بتایا کہ اسے چوتھا درجہ بھی دیا جا چکا تھا اور وہ خاموش پڑا تھا۔ میں نے وی آن کیا مجھے امید تھی کہ مرشد علی نادر کی گمشدگی کی اطلاع پاتے ہی میڈیا پر داؤدلا کرے گا کہ اس کے بھائی کو انجینیئروں نے اٹھا لیا ہے تاکہ اسے حکومت کا ساتھ چھوڑنے پر مزہ چکھا جائے۔ مگر رات بارہ بجے تک ایسی کوئی بریکنگ نیوز نہیں آئی تھی اس لیے میں نے اوپر آ گیا۔ مانی اپنے کام میں ایسا گم تھا کہ اسے خیال ہی نہیں آیا کہ وہ اکیلا ہے ورنہ وہ مجھے اوپر نہیں جانے دیتا۔ کاؤچ پر سونے سے میری کمر میں کبڑے عاشق جیسا غم نکل آیا تھا اور صبح میں بڑی مشکل سے سیدھا ہوا تھا اس لیے آج رات میرا وہاں سونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ زخم بھر گیا تھا اور میں نے دو دن بعد غسل کیا تو طبیعت کو بڑی فرحت ملی تھی۔

اگلے دن بھی خاموش اور بورگزرا تھا۔ بس دسیم نے نقاب پہن کر نادر سے ذرا پوچھ گچھ کی تھی اور اسے ڈرایا دھمکا یا تھا کہ وہ اپنے بھائی کے غیر قانونی کاموں میں برابر کا شریک ہے۔ مگر ابھی نادر کا حوصلہ برقرار تھا۔ فاضلی کو ڈوز دینے کا سلسلہ جاری تھا۔ بوریت دور کرنے کے لیے میں نے دوپہر کا کھانا باہر کھانے کا فیصلہ کیا جس کی مانی کو بہت خوشی ہوئی تھی کیونکہ جب سے وہ یہاں آیا تھا اسے باہر نکلنے کا موقع کم ملا تھا۔ ہم نے پی سی اسلام آباد کا بوئے آزمانے کا فیصلہ کیا جس کی بڑی تعریف سن تھی۔ مانی مزید خوش ہوا تھا کہ اس طرح اسے اپنی پسند کی ہر چیز کھانے کا موقع ملے گا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اتنا کھالیا کہ اس کے لیے سانس لینا بھی محال ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”مجھے لگ رہا ہے اب تمہیں اسپتال لے جانا پڑے گا تمہیں لازمی ہیضہ ہو جائے گا۔“

”ہو جائے۔“ اس نے کولڈ ڈرنک پیٹ میں انڈیلے ہوئے کہا۔ ”بھوکے مرنے سے کھانپ کر مرنا بہتر ہے اور سمجھ لیں میں نے رات کا کھانا بھی ابھی کھالیا ہے ورنہ گھر میں وہی سب چیزیں زہر مار کرنا پڑیں گی جو آپ اٹھالائے ہیں۔“

پینک میں پیک کرالیا۔ یہ سارے آلات دو بڑے کارٹن میں آگئے تھے اور جب ادائیگی کا مرحلہ آیا تو تقریباً آٹھ لاکھ کابل دیکھ کر میں حیران ہوا تھا۔

”یہ سب اتنا ہنگامہ ہے؟“

”آپ کیا سمجھتے ہیں شوبی یہ سب جدید ترین چیزیں ہیں اور اگر میں نہیں ہوتا تو آپ کو دس سے بھی اوپر کی ملتی۔“

”میں اعتراض نہیں کر رہا حیران ہو رہا ہوں۔ یہ مغرب والے ہم سے چند ڈالرز کے عوض خام مال اور دھاتیں خریدتے ہیں اور انہیں آلات کی شکل دے کر ہم سے ہزاروں ڈالرز وصول کر لیتے ہیں۔“

”یہی تو ٹیکنالوجی کا کمال ہے انہوں نے سائنس میں ترقی کر لی اور ہم پیچھے رہ گئے اس لیے قیمت تو ہمیں ادا کرنی ہوگی۔“ مانی نے پتے کی بات کی۔ ”اب ان آلات کو کیا کرتا ہے۔“

”تم بیٹو کے ساتھ جاؤ گے وہاں جا کر پہلے سے سیکورٹی پر موجود افراد کو یہ سسٹم لگا کر سمجھاؤ گے۔ اس میں تین چار دن لگ سکتے ہیں۔“

”یہاں کے سیٹ آپ کا کیا ہوگا؟“

”اسے ہم وائسڈ آپ کر دیں گے۔ تم کل صبح بیٹو کے ساتھ نکل جاؤ ایاز بھی تمہارے ساتھ جائے گا وہ ڈرائیونگ کرے گا اور میری حویلی سے بھی واقف ہے۔“

”جیسا آپ کہیں۔“ مانی نے کہا۔

ہم نے دامن کوہ کے ایک ریسٹوران میں کھانا کھایا۔ وہیں سے میں نے عبداللہ کو کال کر کے ایاز کو بھی بھیجے کو کہا۔ بیٹو پہلے ہی فارم ہاؤس جا چکا تھا مانی یہ سن کر اداس تھا کہ ہم یہ فارم ہاؤس چھوڑ رہے تھے۔ ”میرا تو اس جگہ دل لگ گیا ہے۔ یہاں سکون اور آرام ہے۔“

”ہاں لیکن دشمن آگئے تو یہی جگہ ہمارے لیے خوفناک ہو جائے گی۔ احتیاط کا تقاضہ ہے کہ اسے چھوڑ دیا جائے۔“

واپسی پر میں نے مری روڈ کی طرف جا کر مانی کو افغان احمد کا گھر دکھانے کا سوچا۔ میرا ارادہ تھا کہ اگلی صبح مانی کو بیٹو کے ساتھ روانہ کر دوں گا۔ اس کے بعد ہم افغان احمد سے مکان کی چابی لیں گے اور ساراں یہاں منتقل کریں گے۔ مانی اور بیٹو یہیں واپس آئیں گے۔ میں نے مانی سے کہا تو وہ بھی تیار ہو گیا۔ کھانے کے بعد ہم اس طرف روانہ ہو گئے۔ بیس منٹ بعد ہم افغان احمد کی کونٹری کے سامنے تھے اس کا اوپر کی حد تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور صرف پورچ میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ مجھے آس پاس عبداللہ کا آدمی نظر نہیں آیا تھا۔ وہ یقیناً کسی ایسی جگہ تھا جہاں سے ہم اسے نہیں دیکھ سکتے تھے خود میں نے احتیاطاً گاڑی ایک درخت کے نیچے روکی تھی اور اپنے سیاہ رنگ کے باعث یہ بالکل نزدیک آنے پر دکھائی دیتی۔ کونٹری سے اس کا نظر آنا ممکن نہیں تھا۔ مانی نے کونٹری کا معائنہ کیا اور بولا۔ ”دیکھنے میں تو اچھی لگ رہی ہے اور جگہ بھی اچھی ہے یہاں بھی سکون ہے۔“

میں نے عبداللہ کو کال کی۔ ”تمہارا آدمی کہاں ہے وہ افغان احمد کی کونٹری کے پاس نظر نہیں آ رہا ہے۔“

عبداللہ نے پریشانی سے کہا۔ ”میں خود اس سے دو گھنٹے سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن اس کا

”ہوٹل والے تمہیں ہونے میں دیکھ کر بچتا رہے ہوں گے۔“

”کہاں جناب میرے جیسے تو ایک دو ہوتے ورنہ زیادہ تر ایسے آتے ہیں جو سلاہ کے پتے براؤن بریڈ میں رکھ کر بچکتے ہیں۔“ مانی نے سامنے والی میز پر بیٹھی لڑکیوں کی طرف اشارہ کیا جو جھج جھج اسی قسم کا پرہیز کیا کھانا کھا رہی تھیں۔ وہ پہلے ہی وزن بڑھنے کے اندیشوں سے دہلی ہوئی جا رہی تھیں۔ ان کے دہلا پے کا اندازہ ان کے لباس سے ہوتا تھا جس میں کفایت شعاری مقصود تھی یا دکھاوا۔ میں نے مانی سے اتفاق کیا کہ ہوٹل والے خسارے میں نہیں رہتے ہوں گے۔ اٹھتے اٹھتے بھی مانی نے پشاور کی آکس کریم کا ایک کپ خالی کیا تھا۔ وہ گاڑی میں ہی سو گیا اور کچھ دیر بعد باقاعدہ خرانے لینے لگا تھا۔ اس کے خرانوں سے بچنے کے لیے میں نے ریڈیو آن کیا اور ایک انٹیشن لگایا جہاں سے موسیقی نشر کی جا رہی تھی۔ ایک گلوکار نے فیض کی نظم کا وہ شعر کیا تھا جو مرشد اپنے دشمنوں کا کرتا تھا۔ سازوں کے شور و غل میں الفاظ مشکل سے سمجھ میں آ رہے تھے۔ بہر حال اس سے یہ ہوا کہ مانی کے خرانوں نے صبح خراشی کم کر دی تھی۔ فارم ہاؤس پر وہ بمشکل گاڑی سے اترا اور اندر جاتے ہی کاؤچ پر ڈھیر ہو کر پھر خرانے لینے لگا تھا۔ میں شدت سے بور ہو رہا تھا عبداللہ کی کونٹری کا چکر لگانے کا سوچا لیکن اسے رسک سمجھتے ہوئے مسٹر دکر دیا۔ ویم کے پاس جا سکتا تھا لیکن مانی اکیلا تھا اور بیٹو بھی جا کر بیٹھ گیا تھا یہ اس کا سیانا پن تھا وہاں اسے اپنی پسند کے کھانے مل رہے ہوں گے تو وہ یہاں ٹن بند پیک کھانے زہر مار کرنے کیوں آئے گا۔

شام کو مانی سو کر اٹھا تو میں نے اس سے پوچھا۔ ”رات کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

وہ کھل اٹھا۔ ”داسن کوہ چلیں وہاں باربی کیو بہت اچھا ملتا ہے۔“

”تو تیار ہو جاؤ۔“ میں نے کہا۔

”ابھی ہے؟“

”ہاں کچھ کام بھی ہے۔“ میں نے کہا اور سوٹ کیس سے اچھی خاصی رقم نکالی تھی۔ صابر جس کمرے میں قید تھا وہاں سے وہ از خود نہیں نکل سکتا تھا پھر بھی میں نے نکلنے سے پہلے عبداللہ کو کال کر کے کہا کہ وہ بیٹو کو بھیج دے۔ ہماری واپسی تک کوئی تو ہو۔ مانی پرتھس تھا کہ ہم کہاں جا رہے تھے۔ میں نے اسے راستے میں بتایا کہ میں اپنی آبائی حویلی کی ایسی سیکورٹی کروانا چاہتا ہوں اس کے لیے درکار آلات خریدنا تھے۔ مانی نے کہا۔

”یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔“

”دیکھو سیکورٹی ایسی کرنی ہے کہ کوئی عام آدمی بھی اس کے سسٹم کو سمجھ سکے اور استعمال کر سکے۔ یہ کام تمہیں وہاں جا کر کرنا ہے اور سمجھنا ہے اس کے بعد تم واپس آ جاؤ گے۔ دوسرے لوگ اس سسٹم کی دیکھ بھال کرتے رہیں گے۔“

مانی اچھی طرح جانتا تھا کہ کمپیوٹر اور اس کے دوسرے آلات یہاں کہاں سے اور کس قیمت پر ملتے تھے وہ مجھے ایک ایسی ہی مارکیٹ لے گیا۔ اس نے راستے میں مجھ سے حویلی کا ساڑ اور نقشہ خاصی حد تک سمجھ لیا تھا اس نے اسی لحاظ سے آلات کی خریداری کی اور ہر چیز کا بیک اپ بھی لیا۔ اس نے دو عدد لیپ ٹاپ لیے۔ اس کے علاوہ درجنوں کے حساب سے سیکورٹی کیمرے اور مانک لیے۔ کئی ایسے آلات لیے جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے اور نہ یہ معلوم تھا کہ ان سے کیا کام لیا جاتا ہے۔ مانی نے سارا سامان چیک کر کے لیا اور پھر ان کی اصلی

موبائل بند جا رہا ہے۔“

میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ ”میں کوئی کے سامنے ہوں اور یہاں سناٹا اور خاموشی ہے۔“

”میں اپنے آدمیوں کے ساتھ نکل رہا ہوں۔ میرے آنے تک آپ دیکھتے رہیے گا۔“

”تمہارا مطلب ہے میں کچھ نہ کروں؟“

”آپ مانی کے ساتھ ہیں وہ آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا ہے اور اکیلے اندر جانا خطرے سے خالی نہیں

ہوگا۔“

”ٹھیک ہے میں تمہاری آمد کا انتظار کرتا ہوں لیکن حالات میں کوئی تبدیلی آئی تو مجھے ہاتھ پاؤں ہلانے

پڑیں گے۔“

”وہ تو آپ خود سمجھدار ہیں۔“ عبداللہ بولا۔ ”اے میری درخواست سمجھیں۔“

میں ہنسا۔ ”ہاں بھائی ایسا ہی سمجھ رہا ہوں۔“

میں محسوس کر رہا تھا کہ اس بار جب میں واپس آیا تو میرے ساتھی مجھے کچھ احتیاط سے ٹریٹ کر رہے تھے۔ اگر میں کوئی قدم اٹھانا چاہتا تو وہ فوراً فکر مند ہو جاتے تھے کہ کہیں میں اکیلا ہی کچھ کرنے کے پکر میں دشمن کے ہاتھ نہ لگ جاؤں۔ کچھ عرصے سے میں نے بھی اغوا ہونے کا نیا عالمی ریکارڈ قائم کر دیا تھا اس لیے ان لوگوں کی تشویش برحق تھی۔ اس کے باوجود ان کا رویہ مجھے تھوڑا سا محسوس ہو رہا تھا وہ کچھ زیادہ ہی فکر مند تھے ان کے خیال میں ہمیں زیادہ خطرات مول لینے لگا تھا اور اپنی ذات سے لاپرواہ تھا حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ بعض اوقات حالات دیکھ کر مجھے خطرہ مول لینا پڑتا تھا اور کیونکہ وہ ان حالات کو نہیں سمجھ پاتے تھے اس لیے وہ میرے رد عمل کو بھی نہیں سمجھتے تھے۔ اس وقت بھی عبداللہ نے ڈھکے چھپے انداز میں درخواست کی تھی کہ میں خود سے پنکا لینے کی کوشش نہ کروں بلکہ ان کے آنے کا انتظار کروں۔ میرا خود بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مانی یہ گفتگو سن کر بہم گیا تھا۔ اس نے کہا۔

”کوئی خطرے والی بات ہے تو مجھے اجازت دیں میں ذرا محفوظ فاصلے پر چلا جاؤں؟“

”خطرے والی بات ہے برخوردار لیکن تم کہاں جاؤ گے؟“

”وہ سامنے والے نیلے پر چلا جاتا ہوں وہاں گولیوں سے بچ جاؤں گا۔“

”موت سے بچ کر کوئی کہاں جا سکتا ہے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”ممکن ہے وہاں پہلے سے دشمن کا کوئی آدمی موجود ہو جو تمہارا کام تمام کر دے۔“

مانی جو گاڑی سے اترنے کی تیاری کر رہا تھا فوراً واپس سیٹ پر آ گیا اور رونے والے لہجے میں بولا۔

”آپ نے مرواد یا جی، مجھے مکان دکھانے لائے تھے یہاں دوسرا چکر شروع ہو گیا ہے۔ اب میرا کیا ہوگا؟“

”ابھی سے کیوں مرے جا رہے ہو۔ ابھی تو کچھ ہوا نہیں ہے۔“

”جب ہوگا تب رونے سے فائدہ؟“ وہ بولا۔ ”پہلے کیوں نہ ردو لوں۔“

”ٹھیک ہے ردو لو۔“ میں نے اجازت دے دی۔ ”بس آواز گاڑی سے باہر نہ جائے ممکن ہے کوئی دشمن

آس پاس ہو ہمارے سروں پر کھینچا چلا آئے۔“

اس کے بعد مانی کی آواز بھی بند ہو گئی تھی۔ میں نے پستول نکال لیا تھا۔ عبداللہ کے آدمی کا غائب ہونا

نہایت تشویش ناک تھا اگر وہ کسی اور کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اتنی دیر میں وہ اس سے نہ جانے کیا کچھ معلوم کر چکے ہوں گے۔ سب سے اہم بات افغان احمد کی نگرانی کرتے ہوئے اس کا غائب ہونا ثابت کرتا تھا کہ افغان احمد درست آدمی نہیں تھا۔ عبداللہ کا آدمی کوئی عام شخص نہیں تھا وہ تربیت یافتہ اور لڑنے بھڑنے کا ماہر ہوگا اس کا مسلح ہونا بھی یقینی تھا اس پر قابو پانے والے عام لوگ نہیں ہو سکتے تھے۔ میں نے سوچا کہ مکان کے اسی پاس گاڑی کھڑی کرنا بھی مناسب نہیں تھا بے شک یہاں تاریکی تھی اور گاڑی کا رنگ بھی سیاہ تھا لیکن کوئی آجاتا تو اسے گاڑی نظر بھی آ سکتی تھی میں نے مانی سے کہا۔ ”برخوردار نیچے اترو۔“

وہ اچھل پڑا۔ ”کیوں جناب؟“

”میں گاڑی کو ذرا آگے چھوڑنے جا رہا ہوں تب تک تم یہاں کی نگرانی کرو۔“

”نہیں جی میں اکیلا کسی صورت نہیں رہوں گا۔“ اس نے فوراً انکار کر دیا۔

”دیکھو اگر میں گاڑی چھوڑنے گیا اور اس دوران میں یہاں کوئی آیا یا گیا تو ہمیں پتا بھی نہیں چلے گا تم

سامنے والی جھاڑیوں میں چھپ جاؤ وہاں سے دیکھتے رہو۔“

”نہیں جناب وہاں دشمن کا کوئی آدمی ہوا تو.....؟ آپ ہی نے تو کہا تھا۔“

میں نے سر پر ہاتھ مارا وہ میری ہی بات مجھے لونہا رہا تھا میں نے بھنا کر کہا۔ ”اچھا بیٹھو۔“

میں نے گاڑی اشارت کیا اور آگے روانہ ہو گیا میرا رخ مری کی طرف تھا۔ ایک منٹ بعد بائیں طرف

سڑک کے ساتھ تھوڑی سے جگہ نظر آئی اور میں نے گاڑی وپیں روک دی۔ گاڑی میں ایک عدد چھوٹی سی آٹو

میٹک راکفل تھی۔ میں نے رائفل اور اس کے فاضل میگزین نکال لیے۔ میں نے نیچے اترتے ہوئے مانی سے کہا۔

”اب تم یہیں ٹھہرو۔“

اس نافرمان نے پھر انکار کر دیا۔ ”نہیں جناب اکیلا میں نہیں رہوں گا۔“

”میرے ساتھ مارے جاؤ گے یا مجھے مرواؤ گے بہتر ہے تم یہیں رکو اور گاڑی کے دروازے اندر سے

بلاک کر لو۔“

مانی مجبوراً رکھا میں اتر کر روانہ ہوا۔ عبداللہ کو کال کیے پندرہ منٹ ہو چکے تھے اور وہ کسی وقت بھی یہاں

پہنچنے والا تھا۔ پیدل واپسی میں پانچ منٹ لگے۔ اگر اتنی دیر میں مکان میں کوئی آیا تھا یا نکل کر چلا گیا تھا تو میں

اس سے بے خبر تھا میں سامنے والے نیلے پر آیا یہاں بلندی سے مکان کا منظر واضح تھا۔ دور بین کے بغیر بھی سب

نظر آ رہا تھا پورچ میں تیز روشنی والا بلب روشن تھا۔ اچانک پورچ کے سامنے مکان کا داخلی دروازہ کھلا اور اس میں

سے ایک شخص نکل کر بھاگتا ہوا باہر آیا۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ عبداللہ کا آدمی تھا شبہ اس لیے کہ وہ صرف ایک انڈرویز

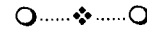
میں تھا اور سر سے پاؤں تک زخمی تھا۔ اس کا رخ مین گیٹ کی طرف تھا لیکن اسے گیٹ تک پہنچنا نصیب نہیں ہوا

تھا۔ اندر سے افغان احمد برآمد ہوا اور اس نے ایک لمبی تال والے پستول سے فرار ہونے والے آدمی پر گولی

چلائی۔ گولی کی آواز نہیں آئی پستول پر سالنسر نچا۔ بھاگنے والا اچھل کر ڈرائیو سے پرگرا اور تڑپنے لگا۔ افغان احمد

بھاگتا ہوا آیا اور اسے بازوؤں سے سمجھجھکا کر اندر لے جانے لگا۔

عبداللہ ابھی تک نہیں آیا تھا میں نے کچھ دیر سوچا اور پھر نیلے سے اتر کر ایسی جگہ سے سڑک کر اس کی کہ کوئی کوٹھی سے دیکھ رہا ہو تو میں اسے نظر نہ آؤں پھر سیدھے راستے سے کوٹھی کی طرف جانے کے بجائے میں نیلے کے ساتھ ساتھ اوپر آیا۔ کوٹھی کے چاروں طرف سات آٹھ فٹ اونچی دیوار تھی اور اسے پھلانگنا یوں بھی آسان نہیں تھا کہ دیوار پر کچھ کے نکلے گئے تھے۔ ایک جگہ دیوار کے ساتھ کچھ مٹی جمع ہوئی تھی جس سے دیوار کی اونچائی کم ہو کر میرے ہاتھوں کی ریش میں آگئی تھی۔ مسئلہ شیشوں کا تھا اگر میں ان کو توڑتا تو اس سے آواز پیدا ہوتی۔ سامنے گیٹ کے سوا اندر جانے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں گھوم کر گیٹ کی طرف آیا اور ایک جھری سے جھانکا۔ بہ ظاہر اندر کوئی نہیں تھا۔ تیز روشنی میں ڈرائیوے پر پھیلا اس شخص کا خون دکھائی دے رہا تھا جسے افغان احمد گولی مارنے کے بعد کھینچ کر اندر لے گیا تھا۔ میں نے ہمت کر کے گیٹ پھلانگ لیا اور فوراً باغ میں چلا گیا یہاں پورچ کے بلب کی روشنی بہت واضح نہیں تھی۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا مکان کے بائیں طرف آیا۔ یہاں کمروں کی کھڑکیاں تھیں اور سب بند تھیں ان کے پیچھے مکمل تاریکی تھی۔ میں مکان کے پچھلے حصے میں آیا یہاں بھی خاموشی اور تاریکی کا راج تھا۔ یہاں ایک دروازہ تھا میں نے چیک کیا تو اسے کھلا پایا۔ یہ کچن کا دروازہ تھا اندر تاریکی تھی۔ میں بغیر آہٹ کے اندر داخل ہوا اور دروازہ بند کر دیا۔ چند لمحوں میں گن لیتا رہا اندر بھی مکمل خاموشی تھی۔ میں آگے بڑھا مکان کا نقشہ میرے ذہن میں تھا ذرا آگے ڈائننگ روم تھا اور اس کے بعد ایک بیڈ روم اور پھر ڈرائنگ روم تھا۔ ڈرائنگ روم کے ساتھ ہی سیزہیاں اوپر جاری تھیں۔ ان سیزہیوں کے نیچے بھی ایک دروازہ تھا لیکن نہ تو مجھے خیال آیا اور نہ افغان احمد نے اس بارے میں بتایا تھا۔ میں سیزہیوں کے پاس آیا تو میں نے اس دروازے کو کھلا پایا اور اس کے اندر روشنی ہو رہی تھی۔ اس روشنی میں نیچے جاتی سیزہیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ میں کھلے دروازے کی طرف بڑھا تھا کہ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں وہاں اکیلا نہیں تھا۔ کوئی ڈائننگ ٹیبل کے پاس تاریکی میں ساکت کھڑا تھا۔ جیسے ہی میں نے اس طرف دیکھا تاریکی میں ایک شعلہ چمکا تھا۔



شعلہ اس لائٹر سے برآمد ہوا تھا جو افغان احمد کے ہاتھ میں تھا اور اس کے دوسرے ہاتھ میں وہی لمبی نال والا بے آواز پستول تھا۔ پستول کا رخ میری طرف تھا اس لیے میں فوراً ساکت ہو گیا تھا۔ اس نے سر کوئی نما لہجے میں کہا۔ ”اپنا پستول نیچے رکھ دو اور پیر سے میری طرف سر کا دو..... آہستہ سے..... تیزی مت دکھانا۔“ میں نے پستول نیچے پھینک دیا۔ ”اور کوئی حکم.....؟“

”اب اپنی رائفل بھی شانے سے اتار کر اسی طرح نیچے رکھ کر میری طرف سر کا دو۔“

وہ نہایت چوکس تھا اور اس نے ایک لمحے کے لیے بھی مجھ سے نگاہ نہیں ہٹائی تھی۔ بد قسمتی سے اس بند جگہ ہوا بالکل نہیں تھی اور لائٹر کا شعلہ یوں ساکت تھا جیسے بلب ہو اور اس کی روشنی بالکل ہموار تھی۔ اس لیے میں پوری طرح افغان احمد کی نظروں میں تھا۔ اس کے چہرے کے نرم اور مہذبانہ تاثرات بالکل غائب تھے اور وہ کسی بھیڑیے کی طرح چوکنا اور خونخوار دکھائی دے رہا تھا اس نے جتنے آرام سے فرار ہونے والے آدمی کو گولی ماری تھی یہی اس کی اصلیت کھول دینے کے لیے کافی تھا۔ میں نے بہت کم کسی انسان کے ظاہر سے ایسا دھوکا کھایا تھا۔ اگرچہ اسے دھوکا کہنا مناسب نہیں ہوگا کیونکہ میں نے اس پر کوئی اعتماد نہیں کیا تھا اور ہم اس کی نگرانی بھی کر رہے تھے لیکن اسے دیکھ کر مجھے ایک بار بھی خیال نہیں آیا کہ اندر وہ اتنا سفاک آدمی ہوگا۔

”وہ آدمی کہاں ہے جسے تم نے گولی ماری تھی۔“

”تمہ خانے میں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اس نے فرار کی کوشش کی تھی۔“

”تم نے اسے کیوں قید رکھا۔“

”وہ اس کوٹھی کی نگرانی کر رہا تھا وہ تمہارا آدمی تھا؟“

میں نے سر ہلایا۔ ”میں نے آنکھ بند کر کے تمہیں دس لاکھ روپے نہیں دیئے تھے اپنی رقم کی حفاظت بھی تو کرنی تھی۔“

”جھوٹ مت بولو تم پولیس یا کسی ایجنسی کے آدمی ہو۔“

میں چونکا وہ قانون سے خوفزدہ تھا اس کا مطلب تھا کہ وہ کسی غیر قانونی کام میں ملوث تھا ورنہ خوفزدہ ہونے کا کیا سوال تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اس کے جرائم پیشہ ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ بعد میں بھی ہو سکتا تھا فی الحال تو مرحلہ اپنی جان بچانے کا تھا۔ اس کے عزائم سے لگ رہا تھا کہ وہ گولی چلانے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ کا

نشانہ لیا کہ میں کھڑا ہوں گا گولیاں میرے اوپر سے گزر گئیں اور میں بال بال بچا۔
لڑھک کر نیچے آنے میں چوٹیں لگیں خاص طور سے ایک بار سر سبز صی سے ٹکرایا تو چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ کہیں اور گھٹنے بھی زخمی ہوئے۔ بہر حال یہ چوٹیں فوت ہونے کے مقابلے میں کہیں قابل قبول تھیں۔ میں نیچے پہنچا تو افغان احمد نے اوپر فائرنگ کر کے اندر کی کنڈی توڑ ڈالی اور اندر آیا۔ اس وقت میں نیچے تھا اسے دیکھتے ہی میں لپک کر دیواری آڑ میں ہوا اور اس کی چلائی دو گولیوں سے بچ نکلا اس کے بعد اس کا پستول خالی ہو گیا کیونکہ اب صرف خرچ خرچ کی آوازیں آرہی تھیں۔ یہ چند لمحے کی جھلک تھی کیونکہ افغان احمد کا انداز بتا رہا تھا وہ مجھے مرحوم کرنے کا پختہ فیصلہ کر چکا ہے اور بس اس پر عمل درآمد کرنا باقی تھا۔ وہ دوسرا میگزین لگاتے ہی نیچے آتا اور اپنے فیصلے پر عمل کر لیتا اگر اس سے پہلے میں کچھ نہ کر گزرتا۔ میں نے دیواری آڑ میں ہوتے ہی آس پاس دیکھا۔

تہہ خانہ اصل میں ایک ہی بیس بالی پندرہ کا کمرہ تھا اور عبداللہ کے آدمی کی لاش یہیں پڑی تھی وہ اوندھے منہ فرش پر لیٹا تھا اور اس کی پشت خون آلود ہو رہی تھی بہ ظاہر وہ لاش ہی لگ رہا تھا۔ تہہ خانے میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جسے میں اپنے دفاع کے لیے استعمال کر سکتا۔ میرے کانوں نے پستول سے میگزین نکلنے کی آواز سنی۔ افغان احمد اس میں دوسرا میگزین لوڈ کر رہا تھا۔ اب وقت بالکل نہیں تھا۔ وہ کسی لمحے بھی نیچے آجاتا اور مجھے دیکھتے ہی شوٹ کر دیتا۔ ایسے وقت جب بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ اچانک ہی ایک خیال الہام کی طرح نازل ہوا۔ تہہ خانے میں روشنی کا واحد ذریعہ میز یوں کے عین خاتمے والی جگہ لگا ہوا انرجی سیور تھا یہ واحد انرجی سیور بیک وقت میز یوں اور تہہ خانے میں روشنی کر رہا تھا۔ اگر میں اسے توڑ دیتا تو تہہ خانے اور میز یوں پر تاریکی چھا جاتی اور افغان احمد کے لیے مجھے نشانہ بنانا آسان نہ رہتا۔

وہاں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے میں انرجی سیور پر مار کر اسے توڑ دیتا۔ لہذا میں نے غلبت میں جوتا اتارا اور انرجی سیور پر کھینچ کر مارا۔ ایک تڑاٹے کے ساتھ انرجی سیور ٹوٹا اور تہہ خانے میں اندھیرا چھا گیا۔ افغان احمد جو نیچے آ رہا تھا اس کے منہ سے ایک گندی سی گالی نکلی۔ اس دوران میں، میں نے دوسرا جوتا بھی اتار لیا تھا اور وہ میز یوں پر پھینک کر مارا۔ جگہ بڑی مختصر سی تھی اس لیے نشانہ خطا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ افغان احمد چلایا تو مجھے بڑی مسرت ہوئی تھی۔ اس سے پہلے میں نے دشمنوں کو گولی سے لے کر گولہ تک ہر ہتھیار مارا تھا لیکن جوتے کو بے طور ہتھیار استعمال کرنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ جوتا غالباً اس کے منہ پر لگا تھا۔ کم سے کم آواز سے تو ایسا ہی لگا تھا۔ اس نے اشتعال میں آ کر دو گولیاں اور چلائیں مگر نیچے آنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ خاصی دیر بعد اس نے تکلیف زدہ لہجے میں کہا۔

”میں ابھی روشنی کا بندوبست کر کے آتا ہوں اور تمہارے سر میں سوراخ کر دوں گا۔“ وہ ناک سے بول رہا تھا اس کا مطلب تھا کہ جوتا اس کی ناک پر لگا تھا۔ یہ ایک اور اچھی بات تھی۔ میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اس کے بجائے میرے کان آہٹوں پر مرکوز تھے۔ وہ اوپر جا رہا تھا لیکن یہ دھوکا بھی ہو سکتا تھا وہ واپسی کا تاثر دے کر میز یوں پر موجود ہوتا اور جیسے ہی میں میز یوں پر نمودار ہوتا وہ آرام سے مجھے گولی مار دیتا۔ میں نے فرش پر بیٹھتے ہوئے نٹول کو اپنا پہلا جوتا تلاش کیا لیکن وہ تہہ خانے کے دوسری طرف جا چکا تھا میں پھرتی سے

مظاہرہ نہیں کرے گا۔“ فرض کر دو میں کسی انجینیئر کا آدمی ہوں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

”تم لوگ میرے پیچھے لگے ہو؟“

”ہمیں تم پر شک ہے۔“ میں نے گول مول انداز میں کہا۔

”کیا شک ہے؟“

”آج کل حالات ٹھیک نہیں ہیں اور خاص طور سے دارالحکومت کی سیکورٹی سخت کرنے کا فیصلہ کیا ہے ان تمام افراد کی نگرانی کی جارہی ہے جن پر کسی تخریب کاری میں ملوث ہونے کا شک ہے۔“
میری آمد یقیناً اس کے لیے غیر متوقع تھی لیکن وہ کسی طرح سے میری آمد سے باخبر ہو گیا تھا اور اس نے بالکل درست جگہ گھات لگا کر مجھے گرفتار کر لیا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے۔ اس نے حالات کا تجزیہ کر لیا تھا اور طے کر لیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے عبداللہ کے آدمی کو شوٹ کر دیا تھا اور اب وہ ہمیں کسی انجینیئر کا آدمی سمجھ رہا تھا۔ اسے یہاں سے فرار ہونا تھا۔ اس نے کہا۔ ”باہر تمہارے ساتھی موجود ہیں؟“

”بالکل۔“ میں نے پورے اعتماد سے کہا۔ ”باہر میرے ساتھی موجود ہیں اور ہم نے اس کوشی کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔“

”تم جھوٹ بولتے ہو اس صورت میں تم اکیلے اندر نہیں آتے بلکہ تمہیں دھاوا بول دینا چاہیے تھا خاص طور سے جب میں نے تمہاری نظروں کے سامنے تمہارے ایک ساتھی کو شوٹ کیا تھا۔ تم نے اس وقت مجھے گولی کیوں نہیں ماری دی۔“

اس نے میرا جھوٹ پکڑ لیا تھا میں نے بات بنانے کی کوشش کی۔ ”یہ سب اچانک ہوا تھا۔“

”بکواس کرتے ہو تم..... اصل میں تم اکیلے ہو اور اسی لیے اکیلے اندر آئے ہو۔“

”اگر میں اکیلا ہوں تب بھی کچھ دیر میں میرے ساتھی یہاں پہنچ جائیں گے اندر آنے سے پہلے میں ان کو گنجل دے آیا ہوں تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ تم ہتھیار ڈال کر خود کو ہمارے حوالے کر دو۔“

”اور ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاؤں۔“ اس نے استہزاءیہ انداز میں کہا۔ ”میرا تو خیال ہے میں تمہیں ہمیشہ کے لیے غائب کر دیتا ہوں، چلو تہہ خانے میں اترو۔“

یہاں اس سے چوک ہو گئی اپنی حفاظت کے خیال سے وہ مجھ سے دور تھا اور اس نے اس وقت بھی پاس آنے کی کوشش نہیں کی جب میں تہہ خانے کے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ ایک مختصر سی جگہ کے فوراً بعد میز یوں اندر اتر رہی تھیں۔ میں اندر داخل ہوا اور فوراً ہی میرے ذہن میں خیال آیا میں نے میز یوں کی طرف ہوتے ہوئے اچانک دروازے کو ہاتھ مار کر بند کیا اور پھرتی سے نیچے بیٹھتے ہوئے اندر سے اس کی کنڈی لگا دی۔ افغان احمد نے سوچا نہیں تھا اس لیے اسے ردِ عمل دکھانے میں ذرا دیر لگی اس نے لگا تار کئی فائر کیے اور گولیاں دروازے میں سوراخ کرتی اندر آئی تھیں اگر میں کھڑا ہوتا تو یہ سوراخ میرے جسم میں بھی ہو سکتے تھے میں بیٹھے ہونے کی وجہ سے بچ گیا اور فوراً ہی میز یوں سے نیچے لڑھک گیا۔ چالاک افغان احمد نے اندازہ لگایا تھا کہ اب میں میز یوں سے نیچے جاؤں گا اس نے اگلے فائر میز یوں کی طرف کیے اس بار بھی اس نے یہ سوچ کر

دوسری طرف پہنچا۔ اپنا جوتا تلاش کیا اور پھر سیڑھیوں پر پھینک کر مارا۔ اس بار جوتا اس کے منہ پر نہیں لگا تھا شاید جسم پر کہیں لگا تھا اور اس نے بے ساختہ گالی کے بعد گولی ارسال کی۔ وہ چالاک سیڑھیوں پر موجود تھا۔ میں نے قہقہہ مارا۔

”میں اسی طرح تمہیں جوتے مارا کر ہلاک کر دوں گا۔“

اس نے نہایت اشتعال کے عالم میں ناگفتہ بہ زبان میں بتایا کہ وہ جوتوں اور میرے ساتھ کیا کرے گا اور میرے کیا دوسے زیادہ پاؤں ہیں اب میں تیسرا جوتا کہاں سے لاؤں گا؟ یہ سوال کرتے ہوئے وہ بھول گیا تھا کہ تہہ خانے میں ابھی دو عدد جوتے موجود تھے۔ جب تک وہ بک بک کرتا رہا میں ریگتا ہوا عبداللہ کے آدمی کے پاس پہنچا اور ٹٹول کر اس کے جوتے اتارے۔ اس بے چارے کے جسم پر انڈر ویز کے بعد بس جوتے ہی تھے۔ میں نے دل ہی دل میں اس سے معذرت کی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ یہ سخت ترین قسم کے چڑے سے بنے موٹے سول والے ذرنے جوتے تھے۔ میں واپس آیا تو افغان احمد خاموش تھا۔ شاید وہ سیڑھیوں سے باہر نکل گیا تھا یا پھر وہیں دبکا بیٹھا تھا۔ میں نے آڑ میں رہتے ہوئے جیب سے ایک سکہ نکال کر اوپر کی طرف اچھالا۔ سکہ ٹن سے گرا اور اس نے بھڑک کر فائر کیا۔ وہ وہیں موجود تھا مگر مکاری سے کام لیتے ہوئے خاموش تھا۔ اس طرح فائر کرنے سے اس کے کشیدہ اعصاب ظاہر ہو رہے تھے۔

میرے پاس موبائل تھا۔ اب تک مجھے موقع نہیں ملا تھا کہ عبداللہ کو کال کروں جو شاید یہاں پہنچ گیا تھا۔ میں نے اس کا نمبر ملا لیا اور اسکرین کی روشنی چھپانے کے لیے اسے سامنے جیب میں رکھ لیا۔ جیسے ہی عبداللہ نے کال ریسیو کی میں بلند آواز سے افغان احمد سے کہا۔ ”افغان احمد مجھے جانے دو تم بھی نکل جاؤ مجھے مارنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ میرے ساتھی تمہارے بارے میں سب جانتے ہیں وہ تمہیں پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔“

”کبواس مت کرو۔“ وہ غرایا۔ ”میں اسی جگہ کو تمہارا مقبرہ بنا کر جاؤں گا۔“

”تم کیا سمجھتے ہو اس تہہ خانے میں مجھے محصور کر لو گے۔ ٹھیک ہے میں نے اکیلے آکر غلطی کی لیکن جلد میرے ساتھی یہاں پہنچنے والے ہیں۔“

افغان احمد نے تکلیف زدہ قہقہہ لگایا۔ ”جب تک وہ یہاں آئیں گے میں جا چکا ہوں گا۔“

عبداللہ نے شروع میں ایک بار ہیلو کہا تھا لیکن میری آواز سنتے ہی وہ خاموش ہو گیا اور پھر موقع کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے اپنے موبائل کے مائک کا دیویم بہت ہلکا کر لیا تھا شاید وہ ٹریفک میں تھا اس لیے شور ہو رہا تھا۔ میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ افغان احمد دیر کیوں کر رہا ہے وہ اوپر سے کوئی نارنج یا ایمر جنسی لائٹ لاکر اس کی روشنی میں بھی میری زندگی کا چراغ گل کر سکتا تھا۔ شاید اسے خوف تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں ہمیں نکل بھاگوں گا۔ نارنج یا روشنی والی کوئی چیز کچن یا آس پاس میں تیس تھی اور اسے دور جانا پڑتا۔ یہی بات درست تھی اور اسی مجبوری کی وجہ سے تہہ خانے کا دروازہ چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔ مگر اس دوران میں وہ خالی نہیں بیٹھا تھا ایک تو وہ اوپر سے میری رائفل لے آیا تھا۔ یہ کام اس نے اتنی خاموشی سے کیا کہ میں اس کے جانے اور آنے کی آہٹ نہیں سن سکا۔

پھر اس نے دوسرا کام یہ کیا کہ اس نے اپنی قمیص اتار کر اس کا گولہ بنایا اور پھر اسے لائٹر سے آگ دکھادی جب گولہ اچھی طرح جلنے لگا تو اس نے اسے تہہ خانے کے فرش کی طرف اچھال دیا وہ آخری سیڑھی پر گرا اور لڑھک کر بالکل میرے سامنے آ گیا۔ میں نے غلٹ میں ایک جوتے سے جلنے پڑے کو اپنی طرف کھینچ لیا اور پھر بال بال بچ گیا افغان احمد نے اوپر سے برسٹ مارا تھا۔ گولیاں میرے ہاتھ کے آس پاس سے گزر گئی تھیں میں نے بے ساختہ ہاتھ پیچھے کھینچا اور فوراً ہی جوتا گھما کر اوپر مارا۔ وہ اذیت بھری آواز میں چلایا تو مجھے ایک بار پھر گہری مسرت ہوئی تھی یہ جوتا بھی نشانے پر لگا تھا اور میرے جوتے کی نسبت زیادہ سخت تھا اس لیے چوٹ بھی زیادہ آئی ہوگی۔ افغان احمد نے دوسرا برسٹ مارا لیکن میں آڑ میں تھا۔ کپڑا جل رہا تھا اور اس کی محدود روشنی میں بھی تہہ خانہ نمایاں ہو رہا تھا اگر میں سامنے آنے کی کوشش کرتا تو وہ آرام سے مجھے نشانہ بنالیت۔

آڑ سے لکھنا ممکن نہیں تھا میں نے آس پال دیکھا پھر اوپر کا معائنہ کیا تو مجھے تقریباً سات فٹ کی بلندی پر کنکریٹ کا فلیٹ دکھائی دیا۔ اس قسم کے فلیٹ سامان رکھنے کے لیے بنائے جاتے ہیں ان پر کٹڑی سے پٹ لگا کر خوب صورت شکل دے دی جاتی ہے اور سینٹ والے حصوں پر پلائی چڑھادی جاتی ہے۔ مگر فی الحال یہ صرف چھپا تھا۔ میں نے اچھل کر دونوں ہاتھوں سے اسے تھاما اور پھر پاؤں دیوار پر لگاتے ہوئے بے آواز اوپر چڑھ گیا۔ افغان احمد کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جانا چاہیے تھا اور وہ نیچے آنے والا تھا کیونکہ اس کے بغیر وہ میرا خاتمہ نہیں کر سکتا تھا۔ اب اس کے پاس خود کار رائفل تھی اور وہ زیادہ پُر اعتماد تھا۔ ظاہر ہے میں کہیں زیادہ خطرے میں تھا۔ چھپا مشکل سے دو فٹ نکلا ہوا تھا اور اس سے اوپر چھت تک صرف تین فٹ جگہ تھی اور میں اس جگہ میں پیک تھا۔ اگر ایک طرف غلا نہ ہوتا تو میرے لیے حرکت کرنا بھی مشکل ہو جاتا۔ میں آہستگی سے بے آواز حرکت کرتا ہوا عین سیڑھیوں کے اوپر والی جگہ آیا۔

افغان احمد کی قمیص پوری طرح جل کر بجھنے والی تھی اور وہ بجھ جاتی تو اسے شاید اپنی پتلون جلانی پڑتی اور پھر وہ صرف انڈر ویز میں رہ جاتا۔ مگر اس کے لیے مسئلہ نہیں تھا یہاں اس کے پاس کپڑوں کی کمی نہیں تھی۔ اس نے بلا تکلف اپنی پتلون بھی جلا کر نیچے پھینک دی اور اب تہہ خانہ زیادہ روشن ہو رہا تھا۔ میں ساکت بیٹھا اور کان لگائے ہوئے تھا۔ اگر افغان احمد سیڑھیاں اتر رہا تھا تو وہ بالکل دے قدموں تھا۔ ذرا سے غور کے بعد میں نے ایک لائن آف ایکشن تیار کیا اور خود کو اس پوزیشن میں لے آیا جو عمل کے لیے بہترین تھی اب مجھے انتظار تھا کہ افغان احمد نیچے آئے۔ میں آسانی سے ہتھیار ڈالنے والوں میں سے نہیں تھا۔ مرشد اور فتح خان جیسے دشمنوں سے نمٹ رہا تھا۔ میں نے دل میں سوچا۔ ”بیٹا نیچے آؤ تمہیں پتا چلے کہ کس سے مقابلہ ہے۔ اتنی آسانی سے تم مجھ پر قابو نہیں پاسکتے ہو۔“

پتلون اب دھڑا دھڑل رہی تھی اور تہہ خانے میں روشنی تیز ہو گئی تھی۔ بالکل آخری لمعے میں مجھے پتا چلا کہ وہ نیچے تک آ گیا ہے۔ وہ اچانک آکر دائیں طرف گھوما اور ہلکا برسٹ مارا۔ اس کے خیال میں ہمیں یہاں چھپا ہوا تھا وہ یقیناً سر پر اتر رہا تھا جب اس نے آڑ کو خالی پایا اور پھر وہ دوسری طرف گھوم رہا تھا کہ میں غیر متوقع طور پر اوپر سے نازل ہوا۔ وہ سمجھے کہ عین نیچے تھا اس لیے میں اس پر کوئی نہیں سکتا تھا اس لیے میں نے دونوں پاؤں ہوا میں اچھالے میرے دونوں ہاتھ سمجھے کے کناروں پر تھے اور میں یوں نیچے آیا جیسے جتنا سڑر رہی پر

اس وقت رحم کی اپیل کرنے والے کی درنگی اس وقت صحیح سے سامنے آئی جب تہہ خانے میں دوسرا از جی سیور لگایا اور ہمیں وہاں کا معائنہ کرنے کا موقع ملا۔ اس نے اشفاق کے کپڑے اتار دیئے تھے اور اسے رسیوں سے باندھ کر تشدد کا نشانہ بنا رہا تھا۔ اشفاق نے موقع پا کر کسی طرح سے رسیاں کھول لیں اور فرار کی کوشش کی لیکن افغان احمد نے اس کی یہ کوشش ناکام بنادی۔ وہ اسے کھینچتا ہوا تہہ خانے تک لایا تھا اور فرش پر اس کے خون کے نشانات تھے۔ عبداللہ نے اسے کسی نجی اسپتال میں بھجوا یا جس کا مالک جان پہچان والا تھا وہ پولیس کو اطلاع کرنے سے گریز کرتا۔ ہم نے افغان احمد کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھے اور پھر ان ہاتھوں سے رسی باندھ کر اسے چھت پکھالکانے والے فولادی کڑے سے گزرا۔ افغان احمد بدستور انڈرویز میں تھا۔ وہ اتنا تو سمجھ گیا تھا کہ ہمارا تعلق کسی ایجنسی سے نہیں تھا ورنہ ہم اسے ساتھ لے جاتے یہیں تفتیش نہ شروع کر دیتے۔

اس نے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔ ”سنو مجھے تمہارا آدمی مشکوک لگا تو میں اسے پکڑ لیا۔“

”کیسے..... وہ اتنی آسانی سے قابو میں آنے والا نہیں تھا۔“ میں نے رسی کھینچی تو افغان احمد کے بازو اوپر

ہوئے تھے۔ اس نے جلدی سے کہا۔

”میں نے عقب سے جا کر اسے قابو کیا تھا۔“

باقی سب میرے علم میں تھا وہ یقیناً اس سے ہمارے بارے میں پوچھ رہا ہوگا۔ اشفاق کے جسم پر تشدد کے نشانات تھے۔ اس نے اشفاق کو قتل کرنے کی کوشش کر کے اپنی سزا خود منتخب کر لی تھی اور اسے چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن پہلے میں جاننا چاہتا تھا کہ یہ کیا چکر تھا وہ اچھے خاصے شریف اور مہذب آدمی کے لہو اسے میں اتنا ہی بڑا بدعاش نکلا تھا اس کا مطلب تھا اس نے پہلے جو بتایا تھا وہ سب جھوٹ تھا۔ عبداللہ کے آدمی اوپر چلے گئے تھے انہیں کوٹھی کے چاروں طرف نظر رکھنے کو کہا مانی کو چکن میں چائے کافی تیار کرنے پر مامور کر کے میں ایک کرسی سمیت نیچے آیا۔ اس دوران میں عبداللہ اس سے تفتیش کر رہا تھا اور وہ شرافت سے اس کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا ان سوالوں کا تعلق اشفاق سے تھا۔ اس نے کہا کہ اس نے بے ساختہ گولی چلائی تھی اس کا ارادہ قتل کرنے کا نہیں تھا یہ کہتے ہوئے وہ بھول گیا کہ اس نے کتنی گولیاں مجھے قتل کرنے کے ارادے کے ساتھ چلائی تھیں۔ اب رسی میں نے سنبھال لی اور اسے ذرا کھینچتے ہوئے پوچھا۔ ”افغان احمد اب بتاؤ یہ کیا چکر ہے؟“

”کیسا چکر؟“ وہ انجان بنا۔

”یہ کہ تم تو ایک شریف آدمی تھے اور اپنے بیٹے کے پاس امریکہ جا رہے تھے یہ اچانک تم اتنے بڑے بدعاش کیسے نکل آئے کہ ایک تربیت یافتہ گارڈ پر قابو پالیا اور اسے اپنی قید میں رکھ کر پوچھ گچھ کرنے لگے۔ پھر تم نے اسے گولی ماری اور مزید یہ کہ نہایت چالاکی سے مجھے پکڑ کر قتل کرنے کی پوری کوشش کی۔ ظاہر ہے یہ سارے کام کوئی عام آدمی نہیں کر سکتا ہے اس لیے تم اپنی اصلیت آسانی سے اگل دو۔“

”ورنہ ہم مشکل سے اگلوں گے۔“ عبداللہ نے کہا۔

”پہلے تو اس کوٹھی کو کرائے پر دینے کی وجہ بتاؤ۔“

”یہ میری کوٹھی ہے اور میں کرائے پر دینا چاہتا ہوں۔“ وہ بولا تو اس کے لہجے کی کمزوری نے مجھے چونکا

سے گھومتے ہوئے نیچے آتا ہے ایک قوس کی صورت میں۔ میرے پاؤں اور پھر پورا جسم افغان احمد سے ٹکرایا اور وہ میرے اور دیوار کے درمیان میں پس گیا تھا۔ اس تصادم نے اس کے ہوش اڑا دیئے تھے۔ رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ میں نیچے گرا تو میرا سر ایک بار پھر فرش سے لگا اور مجھے چکر آ گیا تھا۔

جس وقت میں اپنے حواس بحال رکھنے کی کوشش کر رہا تھا افغان احمد بھی خود کو سنبھال رہا تھا اور اس کے ہاتھ رائفل تلاش کر رہے تھے۔ وہ جیج انڈرویز میں تھا۔ اسی وجہ سے وہ پستول چھوڑ کر آنے پر مجبور ہوا تھا۔ ورنہ وہ پستول لباس میں رکھ لیتا۔ جیسے ہی اس نے رائفل اٹھائی میں نے لات چلائی اور رائفل اس کے ہاتھ سے نکل کر دیوار سے ٹکرائی۔ اس کے ہاتھ پر بھی چوٹ آئی تھی۔ اس نے چلا کر گالی دی۔ اپنی گالیوں سے وہ نہایت تھرڈ کلاس آدمی لگ رہا تھا کوئی مہذب اور تعلیم یافتہ شخص ہنگامی حالات میں بھی ایسی گالیاں نہیں دیتا ہے۔ اس نے مجھے جوابی لات مارنے کی کوشش کی لیکن اس معاملے میں وہ اناڑی تھا۔ اس کا پاؤں بے گنے پن سے مجھے لگا اور میرے حواس بحال ہو گئے تھے اس لیے میں نے اسے بتایا کہ جوتے کے بعد لات کیسے مارتے ہیں۔ چند ٹھوکریں کھانے کے بعد اس نے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور چلانے لگا۔ ”مجھے مت مارو۔“

پتلون کی آگ بھی بجھ رہی تھی میں نے ایک ہاتھ سے رائفل اور دوسرے سے افغان احمد کے سفید بال پکڑے اور اسے کھینچ کر تہہ خانے سے باہر لانے لگا۔ وہ تکلیف سے چلا رہا تھا لیکن میں نے ذرا رحم نہیں کھایا تھا۔ اس نے ہمارے ایک ساتھی کو سفاکی سے قتل کیا تھا اور مجھے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی وہ کسی صورت رحم کا مستحق نہیں تھا۔ اوپر لاکر میں نے اسے بکن کے فرش پر پٹخ دیا اور وہاں کی لاشیں جلائیں۔ جب سے مو بائل نکال کر عبداللہ سے کہا۔ ”کہاں ہو تم..... حالات میرے قابو میں ہیں؟“

”میں بس پہنچ گیا ہوں۔“

”گیٹ سے اندر آ جاؤ..... یہاں ایک بری خبر بھی ہے۔“

”اشفاق کے بارے میں۔“ اس نے اپنے آدمی کا نام لیا۔

”ہاں اگر وہی ہے تو شاید وہ زندہ نہیں ہے، اس خبیث نے اسے میری نظروں کے سامنے گولی ماری تھی۔“

خود کار رائفل کے سامنے افغان احمد اپنی ساری چالاکی بھول گیا تھا اور بالکل کتے کی دم کی طرح سیدھا پڑا تھا۔ اسے سیدھا کرنے والی ٹنگی میرے ہاتھ میں تھی۔ ابھی اس سے پوچھ گچھ کا وقت نہیں آیا تھا۔ دو منٹ بعد عبداللہ وہاں پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ اس کے دو آدمی اور تھے دو باہر تھے۔ میں نے انہیں تہہ خانے بھیجا کہ وہ اپنے ساتھی کو دیکھیں اور انہوں نے فوری اطلاع دی کہ وہ زندہ تھا اگرچہ اس کی حالت نہایت تشویش ناک تھی۔ عبداللہ نے اسے فوری طور پر دو آدمیوں کے ساتھ ہمراہ اسپتال بھجوا دیا۔ اس دوران میں عبداللہ کے آدمیوں نے کوٹھی کی تلاشی لے لی تھی وہاں سوائے افغان احمد کے اور کوئی نہیں تھا۔ مانی کو بھی اندر بلا لیا تھا۔ افغان احمد خاموش اور متشکر تھا اسے معلوم تھا جلد یا بدیر اسے ہماری تفتیش یا انتقامی کارروائی کا نشانہ بننا پڑے گا۔ ان تمام کاموں سے نمٹ کر جب ہم اسے تہہ خانے میں لے جانے لگے تو وہ گڑ گڑانے لگا۔

”خدا کے لیے مجھ پر تشدد مت کرنا تم جو پوچھو گے میں بتا دوں گا۔“

دیا۔ میں نے عبداللہ سے کہا۔

”ذرا اس سے تفتیش جاری رکھو اور اگر اس دوران میں اس کے ہاتھ اکھڑ جائیں تو کوئی مسئلہ نہیں ہے پھر ہم اسے التالک نکالیں گے۔“

رہی عبداللہ کو تھما کر میں اوپر آیا اور اس بار ڈربار یک بنی سے کوشی کے بیڈروم کا جائزہ لیا۔ الماریاں اور درازیں مقفل تھیں لیکن میں نے بلا حلف ان کے لاک توڑ دیئے۔ الماریوں میں کپڑے تھے ایک اندر کی دراز سے مجھے کچھ فائلیں ملیں۔ میں نے فائلوں کا معائنہ کیا تو یہ اس مکان کے کاغذات ثابت ہوئے تھے۔ کوشی بیج بیج افغان احمد کے نام تھی لیکن جس افغان احمد کے آئی ڈی کارڈ کی کاپی لگی تھی اس پر لگی تصویر اس شخص سے بالکل مختلف تھی جسے میں تہہ خانے میں بندھا چھوڑ کر آیا تھا۔ البتہ نام الودیت وہی تھی۔ ایک لمحے کو میں چکرایا کہ ایک ہی نام کے دو آدمی کیسے ہو سکتے ہیں پھر میں نے عقل کو آواز دی اور عقل نے سمجھایا کہ یہ پاکستان ہے یہاں سب ممکن ہے۔ اس کوشی کا اصل مالک یہ افغان احمد تھا جس کی آئی ڈی کارڈ کی کاپی لگی تھی اور دوسرے افغان احمد نے یقیناً جعلی شناختی کارڈ بنوایا تھا۔ اب ایک سوال یہ بھی تھا کہ اس کوشی کا اصل مالک کہاں گیا اور جعلی افغان احمد نے دھڑلے سے جو ڈرافٹ وصول کیا تھا اس کا اس نے کیا کیا۔ یقیناً اس نے جعلی شناختی کارڈ کی بنیاد پر بینک اکاؤنٹ کھلوایا ہوگا۔ میں فائل لے کر تہہ خانے میں آیا۔ فائل دیکھتے ہی وہ سمجھ گیا تھا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

”یہ نقلی افغان احمد ہے یہ کوشی اس کی نہیں ہے اور اس نے ہم سے دس لاکھ روپے وصول کر لیے۔“ میں نے عبداللہ کو مطلع کیا اور اس سے پوچھا۔ ”اصل مالک کہاں ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم اور تم مجھ سے دس لاکھ روپے حاصل نہیں کر سکتے۔“ اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے ہم تم سے ساری عمر کا کھایا پیابھی نکلوا سکتے ہیں لیکن ہمیں دس لاکھ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہمارے مجرم تم ہو اور تم ہمارے ہاتھ میں ہو۔“

صورت حال یک دم بدل گئی تھی اور افغان احمد ایک نقلی آدمی نکلا تھا۔ اصل آدمی کہاں تھا اور عین ممکن تھا وہ پولیس لے کر نازل ہو جاتا۔ اس سے پہلے ہمارا یہاں سے نکل جانا ضروری تھا۔ ابھی میں عبداللہ سے کہنے جا رہا تھا کہ اوپر سے مانی کی چیخ سنائی دی۔ میں اوپر کی طرف لپکا مانی ڈیپ فریزر کے پاس دم بخود کھڑا تھا اور اس کی وجہ فریزر میں ٹھونکی ہوئی لاش تھی وہ بالکل سفید اور برف سے ڈھک گئی تھی اس کے باوجود مجھے شناخت کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ اصل افغان احمد تھا۔ میں نے قریب سے لاش کا معائنہ کیا تو اس کے سینے پر عین دل کے مقام پر سوراخ تھا اسے گولی ماری گئی تھی۔ میں نے ڈیپ فریزر بند کر دیا تو مانی چونکا۔ ”جناں لاش۔“

”ہاں یار ہمارے ساتھ رہو گے تو لاشوں سے ہی واسطہ پڑے گا حسیناؤں سے نہیں۔“

مانی نے خود پر قابو پا لیا تھا۔ ”میں چائے کے لیے دودھ تلاش کر رہا تھا۔“

”لعنت بھیجو چائے پر یہاں سے اپنی اگلیوں کے نشانات صاف کرو اور نکلنے کی کرو۔“ میں نے کہا اور تہہ خانے کی طرف آیا عبداللہ کو تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا۔ ”اس سے پہلے کہ پولیس یا اور کوئی آئے ہمیں یہاں سے نکل جانا ہوگا۔“

”اس کا کیا کریں۔“

افغان احمد نے ہمیں دیکھ لیا تھا اور وہ پولیس کے ہاتھ جاتا تو ہمارے بارے میں بتا دیتا اگرچہ ہم نے کوئی جرم نہیں کیا تھا لیکن پولیس مرشد کے اشارے پر پہلے ہی میری دشمن ہو رہی تھی وہ اس کیس میں مجھے ملوث کر سکتی تھی اس لیے بہتر یہی تھا کہ ہم یہاں سے اپنے تمام نشانات مٹا کر نکل جاتے اور آئندہ بھی اس معاملے سے کوئی تعلق ظاہر نہ کرتے۔ گاڑی ایک ہی تھی ہم نے اسی میں بندل بنا کر افغان احمد کو ڈالا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ عبداللہ اور اس کے آدمی ایک جگہ اتر گئے تھے عبداللہ کو زخمی اشفاق کو بھی دیکھنا تھا اسے راتے میں اطلاع ملی تھی کہ اسے آپریشن روم میں لے جایا گیا تھا اور ڈاکٹر اس کی جان بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے دل میں اللہ سے دعا کی کہ اشفاق بیچ جائے ورنہ میرے دل پر ایک بوجھ اور آجاتا ایک اور انسان میری خاطر جان سے جاتا۔ عبداللہ نے کہا تھا کہ وہ گنام کال کر کے پولیس کو اس قتل کی اطلاع کر دے گا۔ میں مانی اور افغان احمد کے ہمراہ حویلی کی طرف روانہ ہو گیا۔

رات کے ساڑھے گیارہ بجے ہم حویلی تک پہنچے۔ مین روڈ سے لائٹ بند کر کے گاڑی حویلی کے عقبی حصے تک لایا تاکہ آس پاس روشنی نمایاں نہ ہو۔ ویم کے آدمی مستعد تھے انہوں نے گاڑی پہچاننے کے باوجود گاڑی کے اندر روشنی ڈال کر دیکھا اور جب میری صورت دیکھی تو مطمئن ہو گئے۔ میں نے گاڑی رہکی اور افغان احمد کے بارے میں ہدایت کی کہ اسے تہہ خانے میں پہنچا دیا جائے لیکن دوسروں سے الگ رکھا جائے۔ مانی حویلی کے ماحول اور تاریکی سے کسی قدر ڈرا ہوا تھا لیکن جب ہم اندر آئے اور اسے ویم کی صورت دکھائی دی تو اس نے سکون کا سانس لیا اس نے جاتے ہی ویم سے شکایت کی۔ ”آج تو بس اللہ نے بچا لیا ورنہ شوبی بھائی نے مردانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔“

”بیٹے یہ تمہاری غلط فہمی ہے جب میں نے مردانا چاہا تو بچو گے نہیں۔“ میں جوتے اتار کر قالین پر دراز ہو گیا۔ ویم اچانک مجھے ایک قیدی سمیت دیکھ کر حیران ہوا تھا لیکن سوال جواب سے پہلے اس نے ہمارے لیے چائے منگوائی، ساتھ میں کچے بھی تھے۔ مانی نے بھوک نہ ہونے کے باوجود ان سے پورا انصاف کیا۔ میں ویم کو زوداد سنانے لگا۔ جو اگرچہ خاصی السناک تھی لیکن ویم اور مانی دل کھول کر ہنسے تھے خاص طور سے جوتوں کو بہ طور ہتھیار استعمال کرنے کا آئیڈیا انہیں بہت پسند آیا تھا۔ ویم نے کہا۔

”یہ شخص اسی قابل ہے اسے جوتے سے مارا جائے۔“

”یہ مزائے موت کے قابل ہے۔ اس نے کم سے کم ایک شخص کو قتل کیا، ایک پر اقدام قتل کیا اور ایک کو قتل کرنے کی پوری کوشش کی۔“

”اس کے علاوہ اس نے دھوکا کیا کسی مکان کسی دوسرے کو کرائے پر دے دیا اور اس سے سال بھر کی رقم وصول کر لی۔“ مانی نے کہا پھر میری طرف دیکھا۔ ”فارم ہاؤس نہیں چلنا ہے آج مجھے بہت کام کرنا ہے۔“

”چلتے ہیں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”ذرا فاصلی سے تو ملاقات کر لیں دیکھیں وہ کس حال میں ہے۔“

ویم مسکرایا اور آغا حشر کے انداز میں کہا۔ ”شیر لوہے کے جال میں ہے۔“

مانی نے ناک سکیڑ کر کہا۔ ”آپ اسے شیر کھڑے ہیں جسے شوبی چوہے کی طرح پکڑ کر لے آئے۔“
 ”اس وقت تو تقریباً چوہا بن گیا ہے۔“ وسیم ہنسا۔ ”آئیں اس کے ڈوز کا وقت ہو گیا ہے ذرا اس کی حالت دیکھیں۔“

”ابھی تک اس سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی ہے؟“

”نہیں میں نے سوچا کہ آپ کی بات درست ہے ہر آدمی کی قوت ارادی مختلف ہوتی ہے۔ آج اسے چار دن ہو چکے ہیں۔ کل تک اسے ہر آٹھ گھنٹے بعد دے رہے تھے لیکن آج صبح دیا تھا اور اس کے بعد سے اب تک نہیں دیا ہے۔“

میں وسیم اور اس کے ایک آدمی کے ساتھ نیچے تہہ خانے میں آیا جہاں فاضلی ایک ستون کے ساتھ زنجیر سے بندھا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ بھڑکا اور میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا صرف چار دن میں اس کی قابلِ رحمکت صحت افسوسناک ہو گئی تھی۔ اس کا چہرہ ست گیا تھا اور شانے ڈھلک گئے تھے میں نے وسیم کی طرف دیکھا۔ ”کیا اسے کھانا نہیں دیتے؟“

”دیتے ہیں لیکن یہ کھانا نہیں ہے اسے تو بس ایک ہی چیز کی طلب ہے۔ اس نے صبح مشکل سے آدمی روٹی چائے کے ساتھ کھائی تھی لیکن اب بھی یہ کھانا نہیں مانگے گا۔“ وسیم نے اپنے آدمی کی طرف دیکھا تو اس نے ایک سرخ نکالی۔ فاضلی جواب تک متوقع نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا سرخ پر نظر پڑے ہی بے تاب ہو گیا۔ اس نے تقریباً گڑگڑا کر کہا۔

”یہ مجھے لگا دو۔۔۔۔۔۔ خدا کے لیے۔“

اگرچہ یہ تجویز میں نے ہی دی تھی لیکن فاضلی کی حالت دیکھ کر بھی مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ میں نے وسیم کی طرف دیکھا۔ ”کیا یہ واقعی عادی ہو گیا ہے؟“

”شہباز صاحب ہیر وٹن بڑی ظالم چیز ہے۔ یہ مضبوط سے مضبوط آدمی کی قوت ارادی یوں فنا کرتی ہے کہ وہ اس نام کی چیز بھول جاتا ہے۔ میں نے اس تباہ کن چیز کو قریب سے دیکھا ہے اللہ کا شکر ہے میں اس کے دھندے میں نہیں پڑا جب میں نے اس کے اثرات دیکھے تو مجھے اسی وقت اس چیز سے نفرت ہو گئی تھی۔ اس نے نئی پاکستانی نسل کو ایک زمانے میں تباہ کر دیا تھا اب بھی اس کے اثرات موجود ہیں۔“

فاضلی کو خالص ہیر وٹن کے انجکشن دیئے جا رہے تھے اور چار دن میں وہ اس کا عادی ہو گیا تھا۔ ہیر وٹن نے اس کے سسٹم پر اس طرح قبضہ جمایا تھا کہ اب وہ اس کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ انجکشن دیکھ کر وہ جس طرح بھڑکا تھا اس سے اس کی طلب واضح تھی۔ میں نے کہا۔ ”فاضلی تمہیں یہ انجکشن چاہیے؟“

”ہاں پلیز یہ مجھے دو میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

”یہ تمہیں مل جائے گا لیکن پہلے تمہیں ہمارے سوالوں کے جوابات دینا ہوں گے۔“

”میں دوں گا تم جو پوچھو گے وہ بتاؤں گا۔۔۔۔۔۔ مرشد کے بارے میں۔۔۔۔۔۔ میرے بارے میں۔۔۔۔۔۔ میرے باپ کے بارے میں۔۔۔۔۔۔ میری ماں سمجھتی ہے میں اپنے اصل باپ کے بارے میں نہیں جانتا۔۔۔۔۔۔ لیکن وہ بے وقوف ہے۔۔۔۔۔۔ مجھے تب ہی پتا چل گیا تھا جب مجھے پتا چلا تھا کہ انسان باپ کیسے بنتا ہے۔“

ہم نے حیرت سے اس کی بات سنی وسیم نے کہا۔ ”تمہارا اصل باپ کون ہے؟“
 ”مرشد۔“ اس نے عجیب سے انداز میں ہنس کر کہا۔ ”میری ماں اس کی خادمہ تھی اور معمولی شکل صورت کی تھی اس لیے میرے باپ کو کبھی خدشہ نہیں ہوا تھا۔ مگر اسے نہیں معلوم تھا میری ماں اسے دھوکا دے کر مرشد کی خواب گاہ میں جاتی تھی۔“

ہم سب ہی دم بخود رہ گئے تھے۔ بعض اوقات آدمی اپنے بارے میں کیسے سچ اگلتا ہے اس نے خود بھی اس بارے میں نہیں سوچا ہوتا ہے۔ فاضلی نے بھی نہیں سوچا ہو گا کہ کبھی اسے اس طرح سچ بولنا پڑے گا یا اس کے منہ اس کی ذات کا نازک ترین سچ نکل جائے گا۔ فاضلی گڑگڑایا تو ہم چوٹے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”اب تو دے دو۔۔۔۔۔۔ میں اس کے لیے مر رہا ہوں۔“

میں نے وسیم کے آدمی کی طرف دیکھ کر سر کو جنبش دی تو اس نے آگے بڑھ کر پہلے فاضلی کے بازو پر رسی لپیٹی اور پھر اس کی نس اٹھا کر اس میں سرخ اتار دی۔ جیسے ہی ہیر وٹن فاضلی کے خون میں شامل ہوئی اس کے چہرے پر سکون کے تاثرات نظر آنے لگے۔ انجکشن لگتے ہی وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا اور ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا پھر اس نے میری طرف دیکھا اور بو جھل لہجے میں بولا۔ ”شہباز ملک۔۔۔۔۔۔ سچ سن لیا۔۔۔۔۔۔ جب مجھ سے کچھ پوچھنا ہو تو انجکشن لے کر آ جانا میں اس وقت کے سوا کچھ نہیں۔۔۔۔۔۔ کہوں گا۔“

مجھے اپنے روٹنے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔ جب میرے ذہن میں یہ خیال آیا اور میں نے فاضلی کے حوالے سے وسیم کو اس پر عمل کرنے کا کہا تو اس وقت میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ چیز اتنی مؤثر ثابت ہوگی۔ ہیر وٹن کا نشہ آدمی کو کس طرح اپنے قابو میں کرتا ہے اس کا اندازہ مجھے فاضلی کی حالت دیکھ کر ہو رہا تھا ایک انجکشن کے لیے اس نے وہ راز کھول دیا جو شاید وہ اپنے سائے سے بھی چھپاتا ہو گا۔ وسیم نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا تو میں چونکا۔ میں جذباتی ہو رہا تھا۔ فاضلی میرا بدترین دشمن تھا اور دشمن کے خلاف ہر حربہ جائز تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”فاضلی اس سے پہلے تم بے کار ہو جاؤ میرے ایک سوال کا جواب اور دو۔“
 ”پوچھو۔“ اس بار اس نے ذرا مشکل سے کہا ہیر وٹن کا نشہ اس کے دماغ پر غالب آ رہا تھا۔

”مرشد یہ بات جانتا ہے؟“

فاضلی مسکرایا۔ ”اگر وہ یہ بات جانتا تو کیا میں اب تک زندہ ہوتا۔ وہ بوجھ پالنے والوں میں سے نہیں ہے۔“

”تم نے اپنے گھر والوں کا حوالہ دیا تھا کہ مرشد انہیں نہیں بخشے گا۔ کیا تمہارے بہن بھائی ہیں۔“

”ماں باپ اور بہن بھائی کو میں بہت پہلے چھوڑ چکا ہوں ان سے میرا کوئی رشتہ ناٹ نہیں ہے۔“

”تب تمہارے بیوی بچے ہوں گے۔“

اس نے بمشکل سر ہلایا اور پھر ستون سے نکال دیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ گہری نیند میں جا چکا ہو درحقیقت نشے نے اس کا ذہن ماؤف کر کے اسے سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔ میں اور وسیم اس سے ذرا دور گئے تو وسیم نے کہا۔ ”یہ بہت عیار شخص ہے نشے نے اس کی قوت ارادی کو شکست دی ہے اس کی عیاری ختم نہیں ہوئی ہے۔“

وسیم سمجھ گیا اس نے دونوں ہاتھ ملے ہوئے کہا۔ ”آپ فکر نہ کریں یہ بتائیں پہلے کیا کرتا ہے۔“
”پہلے اس سے اس کے ساتھی کے بارے میں معلوم کرو اور دس لاکھ روپے نکلواؤ اس کے بعد دیکھیں گے۔“

جعلی افغان احمد کا چہرہ پھر سفید پڑ گیا تھا وہ سمجھ گیا کہ ہم فی الحال اسے چھوڑنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ وہ پھر رونے لگا گزرائے لگا مگر ہم اس پر توجہ دینے بغیر باہر آ گئے۔ وسیم نے پھر پوچھا۔ ”اس کا بعد میں کیا کرتا ہے؟“
”ویسے یہ شخص اس قابل نہیں ہے کہ اسے چھوڑا جائے لیکن پولیس میں دینے سے الٹا ہمارے لیے مسائل کھڑے ہوں گے اس لیے معاملے کو خاموشی سے نمٹنا ہی بہتر رہے گا۔ پہلے تو اس سے اس کے کثرت انگواؤ۔“
”فاضلی والا سنو نہ استعمال کریں اس میں نہ ہینک لگے گی اور نہ پینکری اور رنگ بھی چوکھا آئے گا۔“
میں ہنسا۔ ”تم آج کل با محاورہ اردو بولنے لگے ہو۔“

”یہ سب مطالعے کا نتیجہ ہے۔“ وسیم نے دانت نکالے۔ ”آج کل فرصت زیادہ ہے اس لیے پڑھنے میں وقت گزرتا ہے۔“

”برادر خورد کا کیا حال ہے۔“

”دہشت سے برا حال ہے وہ سمجھ رہا ہے کہ کسی ایجنسی نے اسے اٹھایا ہے۔ جب اس حیثیت کا آدمی اتنا ڈرتا ہے تو سوچا جاسکتا ہے کہ عام آدمی کا کیا حال ہوگا۔“

”مرشد کے بارے میں کیا اگا ہے؟“

”کچھ خاص نہیں وہی پرانی باتیں ہیں۔“

”وسیم پرانی اور نئی باتیں ہماری لیے بے کار ہیں اصل میں ہمیں مرشد کے تمام ٹھکانوں کا پتا چلنا ہے اور اس کے تمام دھندوں کے بارے میں جانتا ہے اس کے بعد اس کے خلاف کارروائی کرنی ہے۔ تم فاضلی اور نادر سے پوچھ گچھ میں زیادہ فوکس اسی بات پر رکھو۔“

وسیم نے سر ہلایا اور پھر بولا۔ ”میرا تو مشورہ ہے آپ اور مانی بھی یہیں آجائیں فارم ہاؤس صابر کی وجہ سے بے کار ہو جائے گا اور کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ ویسے بھی اس معاملے کی وجہ سے خطرہ پیدا ہو گیا ہے اس کے ساتھی کے پاس آپ کے آئی ڈی کارڈ کی کاپی سمیت کرائے داری کا معاہدہ موجود ہے اگر وہ اس نے سامنے آئے بغیر پولیس کے حوالے کر دیا تو آپ کے لیے مزید مشکلات کھڑی ہو جائیں گی۔ پولیس نئے کیس بنادے گی۔“

میں نے اس کی بات پر غور کیا اور اتفاق کیا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں کل یہاں آجاتا ہوں مانی اور بیوہ باز کے ساتھ حویلی جائیں گے۔ ہم فارم ہاؤس خالی کر دیتے ہیں۔“

”سفیر اس اسٹیٹ ایجنٹ کو اطلاع کر دے گا جس سے یہ فارم ہاؤس لیا تھا وہ خود آکر قبضہ لے لے گا۔“
وسیم کے دو ساتھیوں اور ایک گاڑی سمیت ہم فارم ہاؤس پہنچے۔ رات کے دو بج رہے تھے اور سب کا عکس سے برا حال تھا لیکن یہاں سے اپنا سامان سمیٹنا تھا۔ مانی نے نگرانی کے تمام آلات، کمپیوٹرز اور انٹرنیٹ سے متعلق چیزیں پیک کر کے دیم کے آدمیوں کے حوالے کیں وہ انہیں لے کر رخصت ہو گئے۔ کچھ اور چیزیں

”تم نے ٹھیک کہا اس سے پوری طرح ہوشیار رہنا اور اب ہیروئن کی مقدار کم کر دو جب یہ بالکل پاگل ہونے لگے تب ہی اسے ہیروئن دینا۔“

افغان احمد اسی تہ خانے کے ایک حصے میں بندھا ہوا تھا اور اس کے جسم پر وہی انڈر ویئر تھا۔ اب اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہم کیا تھے اور وہ کن لوگوں سے ٹکرانے کی کوشش کر بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تمام ہو گئی تھی اور ہمیں دیکھتے ہی اس نے گڑ گڑانا شروع کر دیا۔ ”دیکھو تم جو پوچھو گے میں سچ سچ بتاؤں گا بالکل جھوٹ نہیں بولوں گا۔۔۔۔۔۔ بس تم مجھے مارنا مت۔“

میں نے اس عیار شخص کی چالاکی کا جواب چالاکی سے دینے کا فیصلہ کیا اور اس سے کہا۔ ”ٹھیک ہے اگر تم رہائی چاہتے ہو تو ہر سوال کا درست جواب دینا اور یہ سوچ کر دینا کہ ہم تصدیق کریں گے سو میں سے ایک غلط جواب تمہیں معافی سے محروم کر دے۔“

”خدا کی قسم، میں ذرا بھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔“

میں نے اس کے چہرے پر نظر جما کر کہا۔ ”سب سے پہلے تو اس چکر کی وضاحت کرو۔ تم نے اصل افغان احمد کو کیوں قتل کیا اور اس کے نام اور دلہیت پر مبنی جعلی شناختی کارڈ کیوں بنوایا۔ ویسے یہ بتا دو کہ میں سمجھ گیا ہوں صرف تمہارے منہ سے سننا چاہ رہا ہوں۔“

اس نے بادل ناخواستہ کہنا شروع کیا۔ ”یہ میرا اور منور کا کھیل ہے۔ ہم بڑی کوششوں کے مالکوں کے نام سے جعلی شناختی کارڈ بنواتے ہیں اور پھر ان سے بینک اکاؤنٹ کھلاتے ہیں۔ اس کے بعد ہم کوشی کو کرائے پر دینے یا فروخت کرنے کا اشتہار دیتے ہیں جیسے ہی پارٹی لگتی ہے اصل مالک کو اپنے قبضے میں کر لیتے ہیں۔“
”قبضے میں کر لیتے ہو یا اسے دوسری دنیا روانہ کر دیتے ہو۔“ میں نے طنز یہ لہجہ میں کہا۔ ”تم نے جلیل خانزادہ کا اصل کا نام بتا دیا تمہارا اصل نام کیا ہے۔“

”میرا نام ریاض شاہ ہے۔“ اس نے یوں تیزی سے کہا جیسے نام پہلے سے سوچ کر رکھا ہوا تھا سوال کرتے ہی بتا دے۔

”تو تم نے اصل مالک افغان احمد کو قتل کر دیا اور اس کی لاش اس کے اپنے گھر کے ڈیپ فریزر میں ڈال دی اس سے تمہارا کیا مقصد تھا؟“

”ہم اسے قتل کرنا نہیں چاہتے تھے لیکن اس نے مزاحمت کی تو ہمیں گولی چلانی پڑی اور وہ مر گیا۔ ہم اس کی لاش کہیں لے جائیں سکتے تھے اس لیے وہیں ڈیپ فریزر میں ڈال دی۔“

”تاکہ جب کرائے دار آئے اور وہ بے چارہ دیکھے تو مصیبت میں پڑ جائے۔ اگر پولیس کو اطلاع دیتا ہے تب بھی مشکل میں پڑے گا اور اگر لاش چھپانے کی کوشش کرے گا تب بھی پکڑا جائے گا۔ یہ بتاؤ کہ دس لاکھ کہاں ہیں مسٹر۔۔۔۔۔ کیا نام بتایا تھا؟“

”ایاز۔۔۔۔۔ وہ روٹی میں کہتے کہتے رکا۔“ ریاض شاہ۔“

میں نے وسیم کی طرف دیکھا۔ ”یہ جھوٹ بول رہا ہے اور ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسے سمجھاؤ کہ ہمیں بے وقوف بنانے کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔“

نہ بتاتا اور ہمیں بھی ذہنی کوفت سے گزرنا پڑتا۔ ظاہر ہے ہم درندے نہیں تھے جو کسی کو اذیت دے کر لطف اندوز ہوتے۔ ہیر و ن والا طریقہ نہایت مؤثر رہا تھا اور فاضلی جیسا آدمی بھی ہمارے آگے جھک گیا تھا۔ ”اب ایسے طریقے آگئے ہیں کہ پوچھنے والے تمہیں انگلی بھی نہیں لگائیں گے اور تم فر فر سب اگلنے جاؤ گے۔“

”سنو تم لوگ شاذیہ کا خیال رکھو گے نا؟“ اس نے لجاجت سے کہا۔ ”اگر میں ناکام رہا تو سزا صرف مجھے دینا۔“

”صابر ہم لوگ انسان ہیں اور عورت کا احترام کرنا جانتے ہیں۔ ہمارے پاس تو شہلا جیسی عورت بھی بالکل محفوظ رہی تھی۔ تم شاذیہ کے بارے میں بے فکر رہو۔ اسے ہم نے صرف ضمانت کے طور پر رکھا ہے اگر تم نے کوئی غلط حرکت نہ کی تو وہ قطعی محفوظ رہے گی اور اگر تم نے ہمیں مجبور کیا تب بھی ہم خود کچھ نہیں کریں گے اسے مرشد کے حوالے کر دیں گے اور تم اس کے ہاتھ سے اپنی سزا کو پہنچو گے۔“

”اس سے بہتر ہو گا تم اسے اپنے ہاتھ سے مار دو۔“ صابر تنگی سے بولا۔ ”کیا تم نہیں جانتے کہ مرشد اور اس کے آدمیوں کے لیے عورت کیا ہے۔“

میں نے ڈرائیو کرتے ہوئے اچانک ہی الٹا ہاتھ اس کے منہ پر مارا۔ ”کیا یہ خیال تمہیں اس وقت نہیں آیا تھا جب تم شہلا کو اس کے حوالے کر رہے تھے۔“

اس نے اپنا منہ سہلایا۔ ”شہلا کی بات اور تھی وہ پہلے ہی کون سی.....“

”بکو اس مت کرو وہ بہر حال عورت تھی اس کے ساتھ جو ہوا اس کے اصل مجرم تم ہو اور میں نے تمہیں صرف اس لیے رعایت دی کہ تم پہلے ہی اپنے کیے کی ٹھیک ٹھاک سزا بھگت چکے ہو۔“ میں نے کہا میرا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ صابر نے خاموش ہونے میں عافیت سمجھی تھی۔ میں نے اسے ایک ایسی جگہ اتارا جہاں سے وہ مسٹر آباد جانے والی بس یا کوئی دوسری گاڑی حاصل کر سکتا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”یاد رکھنا آج کے دن سے تمہارے پاس ایک مینیئر کی مہلت ہے۔ اگر تم اس دوران میں واپس نہ آئے یا تم نے رابطہ نہ کیا تو.....“

”میں تم سے کیسے رابطہ کروں گا؟“

میں نے سوچا اور ایک مشہور اخبار کا نام لیا۔ ”تم اس کے کلاسیفائیڈ میں صرف اپنے نام اور رابطے کے نمبر کے ساتھ اشتہار دو ہم خود تم سے رابطہ کر لیں گے اشتہار تم کسی بھی دن دے سکتے ہو۔“

”ٹھیک ہے۔“

میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ یہ سفیر کی سفاری تھی لیکن اس کی نمبر پلیٹ بدلی ہوئی تھی اس لیے اگر صابر نے نمبر نوٹ کر لیا تھا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس ماڈل اور رنگ کی ہزاروں گاڑیاں راولپنڈی اسلام آباد میں گھوم رہی تھیں۔ گزشتہ روز سے واقعات میں بہت تیزی آئی تھی۔ میں بنے سوچا بھی نہیں تھا کہ افغان احمد کچھ اور نکلے گا۔ وہ اپنی شخصیت سے فائدہ اٹھاتا تھا اور لوگ آسانی سے دھوکا کھا جاتے تھے۔ وہ اور اس کا ساتھی منور مل کر نہ جانے لوگوں کے ساتھ اس طرح کے دھوکے کر چکے تھے۔ وہ ایسے دولت مندوں کو تاڑتے ہوں گے جو اکیلے ہیں اور جن کے رشتے دار ملک سے باہر ہیں پھر ان کو ٹریپ کر کے ان کی جائیداد کو فروخت یا کرائے پر دینے کا چکر چلاتے تھے رقم وصول کرتے تھے اور نو دود گیارہ ہو جاتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ جائیداد کے اصل

تمہیں جیسے ذاتی سامان اور رقم والا سوٹ کیس وہ میں نے اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا۔ میری حویلی جانے والا سامان ایاز کی جیب میں منتقل کر دیا گیا تھا اور طے ہوا تھا کہ وہ صبح ہوتے ہی روانہ ہو جاتے۔ ایاز کام مکمل ہونے کے بعد انہیں واپس لے کر آتا۔ صبح چار بجے ہم فارغ ہوئے تو سب نے تھوڑی دیر کے لیے آنکھ جھپک لی۔ سات بجے سب اٹھ گئے تھے۔ ایاز، بیٹو اور مانی فوری روانہ ہو گئے انہوں نے ناشتہ بھی راستے میں کرنا تھا۔

میں صابر کے کمرے میں آیا اس کی حالت خاصی بہتر ہو رہی تھی اور اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ”تم کیوں دیر کر رہے ہو مجھے جانے دو ورنہ تاخیر سے معاملہ خراب ہوا تو تم مجھے الزام نہیں دے سکو گے۔“

”فکر مت کرو اور تیار ہو جاؤ ہم یہاں سے نکل رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”یہ بتاؤ کہ تمہیں کہاں چھوڑیں؟“

اس نے سوچ کر کہا۔ ”مجھے کسی ایسی جگہ چھوڑ دو جہاں سے میں مظفر آباد جانے والی گاڑی پکڑ سکوں۔“

اس کے پاس رقم تھی اور سامان بھی تھا میں نے اسے ایک چھوٹا بیگ دیا جس میں اس نے اپنی ساری چیزیں منتقل کیں۔ اس نے اسلحے کا مطالبہ بھی کیا لیکن میں نے اسے نال دیا۔ اس کا ایک عدد پستول اور چھوٹی شاٹ گن میرے پاس تھی۔ سارا اسلحہ وٹیم کے آدمی لے جا چکے تھے ان میں صابر کا اسلحہ بھی تھا۔ وہ اس میدان کا کھلاڑی تھا اور اسلحہ حاصل کرنا اس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں اسے لے کر نکلا تو دھوپ نکھر چکی تھی۔

میں نے فارم ہاؤس بند کر کے اس کی چابیاں پورچ میں رکھے ایک گیلے تلے رکھ دیں اور پھر سفیر کو کال کر کے اس کے بارے میں بتا دیا۔ اس نے پوچھا۔ ”تو کہاں جا رہا ہے؟“

”اپنے صابر بھائی کو ڈراپ کر کے بڑے گھر جاؤں گا اب اور کہاں ٹھکانہ رہا ہے۔“ میں نے صابر کی موجودگی میں حویلی کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

”تو خوش رہو میں اسٹیٹ ایجنٹ کو مطلع کرتا ہوں وہ خوش ہو جائے گا پورے سال کا کرایہ وصول کر چکا تھا اور اب نام ہاؤس دوبارہ مل جائے گا وہ مالکوں کو بتائے بغیر کسی کو دے کر باقی کرایہ اپنی جیب میں ڈالے گا۔“

”ہماری بلا سے یار..... ہمارا کام تو نکل گیا نا۔“

”یہاں اچھا وقت گزرا تھا۔“

”اچھا برا وقت انسانوں کے ساتھ گزرتا ہے جگہوں کے ساتھ نہیں اور اپنے سارے ہمارے پاس ہیں۔“

میں نے کہا اور ”تو بائبل بند کر دیا۔ صابر خاموشی سے سن رہا تھا اس نے میری طرف دیکھا۔

”تم میری وجہ سے یہ ٹھکانہ چھوڑ رہے ہو کہ میں نے اس جگہ کو دیکھ لیا ہے۔“

”یہ احتیاط کا تقاضہ ہے آزاد ہونے کے بعد ہو سکتا ہے کہ تمہاری نیت بدل جائے لیکن زیادہ امکان اس کا ہے کہ تم مرشد کے ہتھے چڑھ جاؤ اور ہمارے بارے میں سب بک دو لیکن اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا تم شوق سے کسی کو بتاتے پھر وہ ہم یہ جگہ خالی کر چکے ہیں اب یہاں کوئی نہیں ملے گا۔“

”میں کسی کو نہیں بتاؤں گا اور اب مرشد کے کتے بھی مجھ سے کچھ اگلا نہیں سکتے ہیں۔“

”ایسا مت کہو۔ آج کل تشدد کا فن سائنس کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ مضبوط سے مضبوط آدمی بھی نوٹ جاتا ہے۔“ میں نے کہا تو مجھے فاضلی کا خیال آیا۔ اگر ہم اس پر تشدد کرتے تو شاید وہ مر جاتا لیکن ہمیں کچھ

مالکان کو قتل نہیں کرتے ہوں گے کیونکہ اس طرح بات پولیس تک جاتی۔ وہ انہیں آزاد کر دیتے ہوں گے ان کا کوئی نقصان نہیں ہوتا ہوگا اس لیے وہ پولیس کے پاس جانے کی حماقت نہیں کرتے ہوں گے اور جو لٹتے ہوں گے وہ بھی زیادہ تر رد پیت کر رہے ہوں گے۔ جو چند ایک پولیس کے پاس جا کر شکایت کراتے ان کی کوئی سنتا نہیں ہوگا۔ اصل افغان احمد نے یقیناً کوئی ایسی حرکت کی ہوگی جس کی وجہ سے وہ اسے قتل کرنے پر مجبور ہوئے۔

میں نے ناشتے کی نیت سے راہ لینڈی کے ایک مشہور ہوٹل کے سامنے گاڑی روکی اور ایک کونے کی میز سنبھال کر عبداللہ سے رابطہ کیا۔ ”اشفاق کیسا ہے؟“

”آپریشن کامیاب رہا ہے لیکن ڈاکٹروں نے چوبیس گھنٹے اہم قرار دیے ہیں اگر رات بارہ بجے تک زندہ رہا تو پھر چانس زیادہ ہو جائے گا۔“

”اللہ خیر کرے اس کے گھر والوں کو اطلاع کر دی؟“

”ہاں وہ میر پور کارہنے والا ہے اس کے بھائی آگئے ہیں۔ شادی شدہ ہے اور دو سال کا بیٹا بھی ہے۔“

میں نے ایک بار پھر دکھ محسوس کیا۔ بہر حال یہ اس کی تقدیر میں تھا۔ میں نے کہا۔ ”مائی، بیٹو اور ایاز میری حویلی کی طرف گئے ہیں۔“

”یہ آپ نے اچھا کیا کہ وہاں ای سیکورٹی میں اضافہ کر رہے ہیں اب وہ جگہ زیادہ محفوظ ہو جائے گی تو ہم خواتین کو منتقل کرنے کے پروگرام پر دوبارہ عمل کریں گے۔“

”ہیلی کاپٹر کریش کا معاملہ منٹ گیا؟“

”ہاں ایئر کلب کے مالکان اثر والے ہیں انہوں نے اصل بات دہادی اور کریش کی وجہ فی خرابی بیان کی تھی۔“

”اور وہاں جو دو بے گناہ سیکورٹی گارڈ مارے گئے۔“

”اس واقعے کو الگ سے ظاہر کیا گیا ہے اور ملکہ نامعلوم افراد کے سر ڈال دیا گیا ہے۔ سمجھ لیں کہ معاملہ ختم کر دیا گیا ہے۔ مگر میں اٹھواچکا تھا اس لیے کوئی ثبوت بھی باقی نہیں رہا ہے۔“

”فاضلی کے بارے میں پتا چل گیا ہوگا اس کی ساری آنکھوں ختم ہو چکی ہے اور وہ سب بتانے کے لیے تیار ہے۔“

”ہاں لیکن اب آپ کے لیے خطرات بڑھ گئے ہیں پولیس میں موجود میرے ایک واقف کار نے بتایا کہ پولیس پر دباؤ آ رہا ہے وہ بہر صورت آپ کو گرفتار کرے اور اس کے لیے ڈی آئی جی کے حکم سے ایک خصوصی ٹیم بھی تشکیل دی جا رہی ہے جس میں اکرم چشتی جیسے کرپٹ لوگ بھی شامل ہیں آپ کو پتا ہے اسے ڈی ایس پی بنا دیا گیا ہے۔“

میں حیران ہوا۔ ”وہ تو شاید اے ایس آئی تھا.....؟“

”جی ہاں یہ ترقی اسے مرشد کی وجہ سے ملی ہے۔ اس نے جعلی تعلیمی سرٹیفکیٹس جمع کرائے جن کی بنیاد پر اسے یہ ترقی ملی ہے اور وہ اب پہلے سے زیادہ خطرناک ہو جائے گا۔“

”اسے بھی دیکھ لیں گے یار جب مرشد اور فتح خان جیسے بڑے خطروں سے نمٹتے آئے ہیں۔“ میں نے لا پرواہی سے کہا اور پھر عبداللہ کو صابر کے بارے میں بتایا۔ ”اس کے پاس ایک مبینہ کی مہلت ہے تم اپنے کسی آدمی کی ڈیوٹی لگا دو اس اخبار کا کلاسیفائیڈ روز چیک کرے۔“

”یہ اخبار آتا ہے میں خود چیک کر لوں گا۔ آپ کہاں ہیں؟“

”فی الحال تو میں ناشتہ کر رہا ہوں۔ مجھے حویلی جانا ہے لیکن میں سوچ رہا ہوں ایک چکر کھٹی کا بھی لگا لوں۔“

عبداللہ خوش ہو گیا۔ ”میں بھی آپ سے یہی کہنے والا تھا آپ بہت عرصے سے یہاں نہیں آئے ہیں۔ اگر آپ تیار ہیں تو میں گاڑی بھیجتا ہوں اس کے شیشے سیاہ ہیں آپ اس میں آئیں گے تو کسی کو پتا نہیں چلے گا۔“

”ٹھیک ہے تم اسی ہوٹل سے کچھ دور ایک مشہور حلوہ پوری والا ہے اس کے پاس گاڑی بھیج دو ڈرائیور سے کہو کہ دروازہ ان لاک چھوڑ دے اور خود حلوہ پوری لینے چلا جائے میں موقع دیکھ کر گاڑی میں بیٹھ جاؤں گا۔“

”میں ابھی روانہ کرتا ہوں۔“

اس دوران میں ناشتہ آگیا اور میں ناشتہ کرنے میں لگ گیا۔ جب تک میں ناشتے سے فارغ ہوا عبداللہ کی کال آگئی۔ ”ڈرائیور پہنچنے والا ہے سیاہ رنگ کی ہیلکس ہے نمبر.....“

”ٹھیک ہے میں پہنچ رہا ہوں۔“

اپنی سفاری ہوٹل کے باہر ہی چھوڑ دی تھی یہاں اسے کوئی نہیں جھپٹتا اور خود پیدل حلوہ پوری کی دکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ راہ لینڈی کے اس علاقے میں بے پناہ رش تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک کا اژدھام تھا اور فٹ پاتھوں پر لوگ چڑھے ہوئے تھے حلوہ پوری کی دکان پر باقاعدہ جنگ کا سماں تھا۔ ہیلکس دکان سے ڈرائیور کھڑی تھی اور اس کے آس پاس بھی متعدد گاڑیاں تھیں اگر کوئی ان لوگوں کا تعاقب کرتا ہوا آیا تھا تو اس رش میں اس کا پتا چلانا ناممکن تھا۔ بہر حال میں اللہ کا نام لے کر دیوار والی طرف سے ہیلکس کے پچھلے حصے میں گھس گیا وہاں عبداللہ کا ایک آدمی پہلے سے موجود تھا۔ اگلی اور پچھلی سیٹوں کے درمیان نیم شفاف پلاسٹک نما رہیسی چادر موجود تھی اس کے ہوتے ہوئے کوئی ونڈ اسکرین سے اندر نہیں دیکھ سکتا تھا جب کہ آگے پیچھے کے شیشے ایسے تھے کہ باہر سے اندر کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ عبداللہ کے آدمی نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولا۔

”بس ہم ایک منٹ میں روانہ ہوتے ہیں۔“

”ڈرائیور کہاں ہے؟“

”حلوہ پوری کی دکان پر گیا ہے لیکن وہ حلوہ پوری لے گا نہیں ابھی واپس آ جائے گا۔“

دکان کے سامنے کوئی سو افراد موجود تھے اور اگر ڈرائیور حلوہ پوری کے چکر میں پڑتا تو اس کا نمبر ایک ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے نہیں آتا۔ وہ چند منٹ بعد ہی مایوسانہ انداز میں واپس آ گیا تھا۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی نکالنے لگا لیکن وہاں خاصا ہجوم تھا۔ اسے دشواری پیش آرہی تھی لیکن کسی نہ کسی طرح اس نے ہیلکس نکال لی۔ رش سے نکلتے ہی اس نے ہیلکس کو دیران سڑکوں پر گھمانا شروع کر دیا وہ تعاقب کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن جب کوئی گاڑی پیچھے آتی دکھائی نہیں دی تو اس نے کھٹی کارخ کیا۔ آدھے گھنٹے بعد ہم عبداللہ والی

”اسی وقت تو سویا تھا۔ کل رات دیر تک گپ شپ کرتے رہے۔ مونا ڈھیلے ڈھالے لباس میں بخڑا باندھتی ہوئی نمودار ہوئی۔ پہلے جھجکی جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہو کہ میرے ساتھ اپنا دکھ کس طرح شیئر کرے۔ اسے شرم بھی آ رہی تھی پھر وہ میرے شانے سے چٹ کر رونے لگی۔ میں نے اس کا سر تھپتھپایا۔“

”بس اب رونے کی ضرورت نہیں ہے، یہ سب اللہ کے کام ہیں۔ اپنی حکمت وہی جانتا ہے۔ سوچو اگر تم میں سے کسی کو کچھ ہو جاتا تو.....؟“

مونا نے خود پر قابو پا لیا کچھ دیر بعد ہم اس کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ عبد اللہ نے کچن کے لیے کل وقتی باورچی رکھ لیا تھا۔ وہ تینوں وقت کا کھانا بنا تا تھا اور یہاں موجود تمام افراد کے لیے بناتا تھا اس طرح انہیں باہر سے کچھ منگوانا نہیں پڑتا تھا۔ سفیر نے کک کو ناشتے کا کھانا اور میرے لیے کافی منگوائی۔ مونا کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ اس کی حالت خاصی حد تک بہتر ہو گئی تھی۔ سفیر نے سادگی میں بتایا کہ آج لیڈی ڈاکٹر چیک آپ کے لیے آئے گی تو مونا جھپٹ گئی اور پھر گھور کر سفیر کو دیکھا۔ سادی کا کمرہ برابر والا تھا اور شاید اس نے ہماری آوازیں سن لی تھیں وہ اٹھ کر آ گئی۔ مجھے دیکھ کر وہ خوش ہو گئی اس نے جوش و خروش سے کہا۔ ”آف کتنے دن بعد دیکھ رہی ہوں آپ کو..... میں تو آپ کی صورت ہی بھول گئی تھی۔“

”ہاں طوطا چشم لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔“ سفیر نے تائیدی کی۔ ”ادھر بندہ دو تین دن کے لیے غائب ہوا یہ اس کی شکل ہی بھول جاتے ہیں۔“

”آپ مت بولیں۔“ سادی نے فحاشی سے کہا۔ ”تین دن سے آپ نے میرا دماغ خراب کر رکھا ہے۔“

”ٹھیک کہتا م نے اصل میں یہ فارغ ہے نا اس لیے دوسروں کا دماغ خراب کرتا ہے۔“ میں نے سادی کی تائیدی کی۔

”یہ الزام ہے۔“ سفیر نے احتجاج کیا۔ ”جو چیز سرے سے موجود ہی نہ ہو اسے میں کیسے خراب کر سکتا ہوں۔“

”دیکھا آپ نے شولی۔“ سادی نے فریادی کی۔

”یار تجھے کیا ہو گیا ہے وہاں اُن بچوں کا ناطقہ بند کر کے رکھتا تھا اور یہاں ان معصوم بچیوں کے پیچھے پڑ گیا ہے۔“

”اتنی معصوم نہیں ہیں یہ بچیاں۔“

”کیوں کیا ہم مکار ہیں۔“ مونا نے آنکھیں نکالیں۔

”اب دیکھ لو اپنی زبان سے خود اقرار کر رہی ہیں۔“ سفیر بولا۔

یہ جھگڑا کافی کی آمد پر ختم ہوا باورچی دیکھنے میں تازہ تازہ کسی پنڈ دادن خان سے نو وارد لگتا تھا لیکن اس کے جانے کے بعد مونا نے تصدیق کی کہ اپنے کام کا ماہر تھا۔ قدیم مغلیہ و منگول کھانوں سے لے کر جدید ترین چینی اور انڈین کھانے تک مہارت سے بناتا تھا۔ پھر مقدار میں بناتا تب بھی ذائقے میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ کافی بھی بہت اچھی بناتی تھی۔ جھگڑا ختم ہوا تو میں نے انہیں اپنی تین چار دن کی زوداد سنائی انٹان احمد کے بارے میں جان کر سادی نے کہا۔ ”شولی سمجھ میں نہیں آتا یہ سارے خاص قسم کے لوگ ہمارے مقدر میں لکھ دیئے گئے

کونھی پر تھے۔ میں نے خاصے عرصے بعد کونھی دیکھی تھی اور اس کی صورت خاصی بدل گئی تھی۔ سب سے پہلے تو اس کی چار دیواری بارہ فٹ اونچی ہو گئی تھی اور اس پر مزید تین فٹ تک خاردار تاروں کی ایسی بانڈ تھی جس سے نینس کی گیند بھی گزر کر نہیں آ سکتی تھی۔ مین گیٹ بھی بدل گیا تھا اور اب پہلے سے کہیں زیادہ موٹی چادر کا بھاری بھر کم گیٹ تھا جو در پر پھسل کر کھتا تھا۔ ورنہ صرف قبضے اس کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ ایک چپک پوسٹ جیسی جگہ کونھی کے اوپری حصے میں بھی بنادی گئی تھی جہاں سے نگران چاروں طرف نظر رکھ سکتے تھے اور یہیں کیمرے بھی لگے تھے جن سے دور تک کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ مجھے مین گیٹ کے ساتھ ایک عجیب سی مشین دکھائی دی۔ میرے ساتھ بیٹھے آدمی نے کہا۔

”یہ بارود کی نشاندہی کرتی ہے اگر کونھی کے سامنے سے کوئی ایسی گاڑی گزرے جس میں بارود ہو تو یہ الارم بجاتی ہے۔“

عبد اللہ کا نام کر رہا تھا وہ کونھی کو زیادہ سے زیادہ محفوظ بنا رہا تھا۔ ہیکلس پورج میں رکی جو اوپر سے فابری کی چھت کی وجہ سے کوڑھا تھا اور ظاہر ہے آس پاس کی بلند عمارتوں سے بھی اس کے نیچے دیکھا جھکن نہیں تھا۔ یہ انتظام یقیناً اسی لیے کیا گیا تھا۔ میں گاڑی سے نکلا کہ عبد اللہ موجود تھا وہ مجھے اندر لے گیا۔ ”آپ کو اتنے عرصے بعد یہاں دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے۔“

”اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ تم نے کونھی کے حفاظتی انتظامات مزید بہتر کر لیے ہیں۔“

”جی میں ان دنوں اسی کام میں لگا رہا ہوں۔ یہ ہمارا مرکز ہے اور ہم اسے چھوڑ نہیں سکتے ہیں اس لیے اسے زیادہ سے زیادہ محفوظ بنا رہے ہیں بلکہ کچھ دن بعد ہم گلی کے دونوں سروں پر بیریز لگا کر اسے بند کر دیں گے میری محلے والوں سے بات ہوئی ہے ہم سیکورٹی گارڈز رکھیں گے اور اس کے اخراجات سب شیئر کر لیں گے۔ اس کے بعد گلی میں کوئی غیر متعلق فرد نہیں ٹھس سکے گا اور نہ ہی گاڑیاں آسکیں گی۔“

”لیکن عقیلی گلی تو موجود ہے۔“

”یہی کام وہاں بھی کیا جائے گا۔ گلی کو عام لوگوں کی آمد و رفت کے لیے بند کر دیا جائے گا۔“

عبد اللہ کا آئیڈیا اچھا تھا لیکن مجھے اچھا نہیں لگا اس میں راستے بند ہو رہے تھے اور راستے بند کرنا کسی صورت درست نہیں ہوتا ہے۔ بہر حال یہ گلی بند ہونے سے راستے بالکل ہی بند نہیں ہوتے گزرنے والے اگلی یا پچھلی گلی سے گزر سکتے تھے لیکن ہلکی پچھلی گلی والوں کو بھی یہ خیال آ جاتا تو ظاہر ہے لوگوں کے لیے راستے بالکل بند ہو جاتے اور انہیں بہت لمبا متبادل راستہ اختیار کرنا پڑتا۔ میں نے خیال آرائی سے گریز کرتے ہوئے سفیر مونا اور سعدیہ کے بارے میں پوچھا۔ عبد اللہ نے کہا۔ ”میرا خیال ہے وہ سور ہے ہیں کل دیر تک جا گئے رہے تھے۔“

میں نے سفیر کے کمرے کے دروازے پر دستک دی کئی بار دستک کے جواب میں وہ بھنپا ہوا دروازے تک آیا۔ ”کون ہے صبح صبح۔“

”باہر نکل جو روکے غلام۔“

”ابے ٹو۔“ سفیر باہر نکل کر مجھ سے لپٹ گیا۔ ”ٹو کیسے نازل ہو گیا۔“

”میں نے صبح کال کی تو ٹو جاگ رہا تھا۔“

ہیں کبھی غلطی سے بھی کوئی عام آدمی نہیں ملتا ہے۔“

”یہ تو میری سمجھ میں بھی نہیں آتا۔ اب ضروری تھا کہ درجنوں اشتہارات میں سے میں جس کو بھی کا انتخاب کرتا وہاں پہلے سے ڈرامہ تیار ہوتا۔ اس کا اصل مالک قتل کیا جا چکا تھا اور اس کی لاش اس کے اپنے ڈیپ فریزر میں پڑی تھی۔ بہر حال وہ فرادیا ہمارے قبضے میں ہے اسے ہمارے دس لاکھ کے ساتھ پہلے کا کھایا پیا بھی اگنا پڑے گا۔“

”ویسے یہ دھندہ اچھا ہے۔“ سفیر نے کہا۔ ”جس غلط آدمی کو پکڑو اس سے اس کی ساری جمع پونجی ہتھیالو سزا کی سزا اور ہمارا خرچ بھی نکلتا رہے گا۔“

”جیسے مرشد کے ساتھ کیا ہے۔“ سادی نے کہا۔

”نہیں ہم نے جان بوجھ کر یہ حرکت کبھی نہیں کی ہم چور نہیں ہیں اور نہ ڈاکو ہیں جو دوسروں کے مال پر نظر رکھیں یہ تو اتفاق تھا کہ کالی کوٹھی میں رقم سے بھرا سوٹ کیس مل گیا اگر وسم اسے نہ لاتا تو وہیں جل کر خاک ہو جاتا اور کسی کے کام نہ آتا۔“ میں نے وضاحت کی۔

”میں کون سا بچ مشورہ دے رہا تھا۔“ سفیر نے کھسیا کر کہا۔

ناشتہ آیا تو وہ سب ناشتہ کرنے لگے مونا اور سادی کے اصرار پر مجھے ان کا ساتھ دینا پڑا تھا۔ ناشتہ جاری تھا کہ سادی کو وسم کی کال آئی۔ اس نے بتایا کہ میں یہاں آیا ہوں۔ دوسری طرف کی سن کر اس نے موبائل میری طرف بڑھا دیا۔ ”وسم آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“

”شہباز صاحب۔۔۔۔۔۔ یہ غیاث الدین تو نہایت بودا نکلا میری مراد جعلی افغان احمد سے ہے۔ رات ہی میں اس نے منور کے بارے میں بتا دیا ہم اسے پکڑ لائے ہیں اور دس لاکھ روپے معصود کے وصول کر لیے ہیں۔“

”اس میں سود کتنا ہے؟“

”بہی کوئی چالیس لاکھ۔“ اس نے کہا۔ ”اب ان کا کیا کرنا ہے۔۔۔۔۔ کیا چھوڑ دیں؟“

”اتنی جلدی نہیں ہے کچھ دن اور ان کی میزبانی کرو۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن ایک کام تو کرنا ہے یہ اپنے چہرے سے دوسروں کو دھوکا دیتے ہیں ان کے چہرے ان کے اعمال کے مطابق کردوتا کہ آئندہ کسی کو یہ دھوکا نہ دے سکیں۔“

”ہاں کم سے کم اتنی سزا تو ملنی چاہیے۔ عبد اللہ کے آدمی کی حالت بہتر ہو رہی ہے۔“

”اللہ کرے وہ بچ جائے بیوی بچے والا ہے۔“

”میری کچھ دیر پہلے اس کے بھائی سے بات ہوئی ہے اس کی حالت میں بہتری آئی ہے اور اب ڈاکٹر

زیادہ ہر امید ہیں اسے میں نے ہی عبد اللہ کے پاس بھیجا تھا۔“

”میں یہاں سے نٹ کر تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ بے بعد آگے کا لائحہ عمل طے کریں گے۔“

میں نے موبائل واپس سادی کو دیا تو سفیر بولا۔ ”میں بھی ساتھ چلوں گا۔“

”نہیں تم فی الحال یہیں روکو مونا کو تمہاری ضرورت ہے اور وہاں تمہاری خاص ضرورت نہیں ہے۔“

”شوٹی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ سادی بولی۔ ”ابھی آپ یہیں رکھیں۔“

”کیا ہو گیا ہے بی بی کچھ دیر پہلے تو تم مجھ سے بیزار تھیں۔“

”وہ تو اب بھی ہوں لیکن مونا کی خاطر برداشت کر لوں گی۔“

مونا مسکرا رہی تھی اسے معلوم تھا یہ سب چھیڑ چھاڑ ہے اس میں تلخی اور نفرت کے بجائے محبت اور خلوص کا رنگ ہے۔ سفیر کی ایسی باتوں کا کوئی برائیں منانا تھا حالانکہ وہ مانی اور بیٹو کو اس سے زیادہ چھیڑتا تھا۔ وہ بھی وقتی دواؤں سے تھے اور پھر نارمل ہو جاتے۔ طے ہوا کہ میں دوپہر کے بعد جاؤں گا اور سفیر میرے ساتھ نہیں جائے گا۔ جیسے ہی ہم ٹش۔۔۔ گاہ میں آئے تو سفیر نے دوبارہ کوشش کی۔ ”یار میں یہاں خواتین میں رہ کر کیا کروں گا۔“

”وہی جو خواتین کرتی ہیں لگائی بھائی اور دوسروں میں کیڑے نکالنا باقی کاموں کے لیے عبد اللہ کے ساتھ شامل ہو سکتا ہے۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تو نہیں جاسکتا ابھی مونا کے پاس تیرا ہونا ضروری ہے۔“

”وہ ٹھیک ہو گئی ہے۔“

”صرف جسمانی حد تک۔۔۔۔۔ ابھی روح کا زخم نہیں بھرا ہے۔ اسے تیری دل جوئی کی ضرورت ہے۔“

سفیر خاموش ہو گیا۔ مجھے لگا جیسے وہ یہاں سے فرار چاہتا ہو۔ اس بچے کے لیے وہ بھی مونا کی طرح بے تاب تھا۔ میں سفیر کی دلی کیفیت کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ مگر فرار اس مسئلے کا حل نہیں تھا وہ مرد تھا اور اسے زیادہ ہمت کا ثبوت دینا تھا۔ مونا عورت تھی اسے سنبھالنے کی ضرورت تھی۔ عبد اللہ آیا تو مجھے راجا عمر دراز کا خیال آیا بہت عرصے سے اس کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی میں نے عبد اللہ سے اس کی خیریت پوچھی۔ اس نے کہا۔ ”بچھلے دنوں ان کی طبیعت کچھ خراب رہی تھی لیکن اب بہتر ہے۔ ہر دوسرے تیسرے دن ان کی کال آتی ہے وہ آپ کی خیر خیریت پوچھتے ہیں۔“

”اچھا تم نے بتایا نہیں۔۔۔۔۔ انہیں میری طرف سے پوچھ لیا کرو۔“

عبد اللہ مسکرایا۔ ”میں پوچھ لیتا ہوں۔“

میں نے بچ خور کو عبد اللہ کا شکر گزار محسوس کیا۔ اس کا اور میرا ساتھ زیادہ پرانا نہیں تھا۔ وہ راجا عمر دراز کا ملازم تھا مگر اس نے بہت جلد میرے ساتھیوں میں جگہ بنا لی تھی۔ اس نے میرے لیے وہ سب کچھ کیا تھا جو سفیر اور وسم کر سکتے تھے یا بیٹو کر سکتا تھا۔ ایاز بھی اس صف میں شامل تھا۔ یہ میرے وہ دست و بازو تھے جن پر میں اپنے جسم کی طرح بھروسہ کر سکتا تھا۔ عبد اللہ اور سفیر سے بات کرتے ہوئے اچانک مجھے خیال آیا۔

”میں تو بھول ہی گیا تھا کہ ہماری ساری پونجی سفاری میں ہے اور وہ ہوٹل کی پارکنگ میں کھڑی ہے۔“

”کوئی بات نہیں اسے وہاں کون چھیڑے گا یہ بتا کہ سوٹ کیس نمایاں تو نہیں ہے؟“ سفیر نے کہا۔

”نہیں وہ پچھلے حصے میں رکھا ہوا ہے اور شیشے اندھے ہیں باہر سے جھانک کر کوئی نہیں دیکھ سکتا۔“

عبد اللہ نے دوپہر کے کھانے میں خاصا اہتمام کرایا تھا اور وہ ڈشیں بنوائی تھیں جو مجھے پسند تھیں۔ خاصے عرصے بعد گھر کے ماحول میں گھر کا بنا کھانا کھا رہا تھا۔ کھانے کے بعد مونا اور سادی نے اصرار کیا کہ میں کچھ دیر اور رک جاؤں لیکن میں اب جلد از جلد وسم کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ کھانے کے دوران ہی ایاز کی کال آئی تھی وہ سب میری حویلی پہنچ گئے تھے۔ سفیر اور عبد اللہ متفق تھے کہ پہلے ہمیں فاضلی اور نادر سے مرشد کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنی چاہیے اور اس کے بعد کوئی لائحہ عمل طے کرنا چاہیے۔ سب سے مل کر میں دو بجے میں

اسی ہیکلس میں پچھلے حصے میں زد پوش ہو کر عبداللہ کی کونھی سے نکلا پہلے کی طرح گاڑی میں ایک ڈرائیور اور میرے ساتھ ایک مسلح گارڈ تھا۔ ہمارا رخ راولپنڈی کی طرف تھا۔

ڈرائیور حسب سابق تعاقب کے سلسلے میں پوری طرح محتاط تھا اس نے پہلے گاڑی کو سنان سڑکوں پر گھمایا۔ اس کے بعد منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ عبداللہ کی پولیس والی بات نے مجھے فکر مند کر دیا تھا۔ بہت عرصے سے میں نے ندیم بھٹی سے بات نہیں کی تھی میرے کیس وہی دیکھ رہا تھا۔ اس کے گھر کا نمبر مجھے یاد تھا وہاں کال کر کے میں نے اس کی بیوی سے موبائل نمبر لیا۔ ندیم کی بیوی شازیہ نے مجھے پہچان لیا تھا اور داغ کھانے پر آمادہ تھی لیکن میں نے غلت کا بہانہ کر کے اس سے جان چھڑائی اور ندیم کا نمبر ڈائل کیا۔ وہ عدالت سے فارغ ہو کر اپنے دفتر آ گیا تھا میری آواز سن کر بولا۔ ”ابے ٹو میری جان کے دشمن..... ٹو ابھی تک زندہ ہے..... اس شخص مرشد نے تیرا کام تمام نہیں کیا؟“

”فی الحال میرے تمام دشمنوں کا منہ کالا ہے۔ یہ بتا میرے مقدمات کا کیا بنا..... کیا وکیلوں کی روایت کے مطابق یہ میری وفات کے بعد جا کر ختم ہوں گے؟“

”گلتا تو ایسا ہی ہے۔ مگر تیری اور تیرے دشمنوں کی طرف سے خاموشی ہے۔“

”یہ خاموشی اوپر ہی ہے اندرون خانہ بہت کچھ ہو رہا ہے۔ ٹو نے بتایا نہیں کیا ہوا ہے اب تک۔“

”راجا صاحب کے تعاون سے فقیر کے مرڈر والا کیس تو نمٹ گیا ہے بس تیرا انتظار ہے کہ ٹو آئے تو جج بری کرنے کا آرڈر جاری کرے۔“

”یہ کام میرے آئے بغیر نہیں ہو سکتا ہے؟“

”مشکل ہے لیکن اس کے بعد پولیس تجھے دوسرے مقدمات میں گرفتار کر لے گی۔ بہر حال اصل کیس یہی تھا جس سے ٹو فلک گیا ہے باقی کے معاملات طے کیے جاسکتے ہیں۔“

”پولیس اور انتظامیہ کا رویہ کیا ہے؟“

”ویسا ہی ہے جیسا کہ تیرے جیسے شخص کے ساتھ ہونا چاہیے۔ سنا ہے ڈی آئی جی کی طرف سے تیری گرفتاری کے لیے خصوصی ٹیم تشکیل دی گئی ہے اس لیے بہت ضروری ہو گیا ہے ٹو اپنی منحوس صورت لے کر کہیں غائب ہو جا۔“

”یہ مشکل ہے۔“ میں نے سرد آہ بھری۔

”تب گرفتار ہو جا..... بھگتے کے لیے ہم بیٹھے ہیں۔“ ندیم نے فنگی سے کہا اور کال بند کر دی۔ اس وقت ہم اسلام آباد سے گزر رہے تھے۔ جیسے ہی گاڑی اسلام آباد سے راولپنڈی کی حد میں داخل ہوئی۔ اچانک گاڑی کے آگے پیچھے دو گاڑیاں نمودار ہوئیں اور یہ پولیس کی گاڑیاں تھیں۔ ڈرائیور نے پیچھے منہ کر کے اطلاع دی۔

”پولیس کی دو گاڑیاں ہیں جی آگے پیچھے..... انداز محسوس گنگ رہا ہے۔“

میں اور گارڈ مستعد ہو گئے۔ میں نے پوچھا۔ ”اسلام آباد پولیس کی گاڑیاں ہیں؟“

”نہیں جناب پنڈی پولیس ہے۔“

مجھے تشویش ہونے لگی۔ پنڈی پولیس نے ہی میرے خلاف تمام مقدمات درج کیے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا

کہ پولیس کے بھیس میں مرشد کے گرگے ہوں۔ ہم دھوکا کھا گئے تھے وہ عبداللہ کی کونھی کی نگرانی کر رہے تھے اور انہوں نے کسی طریقے سے وہاں میری موجودگی کا پتا چلا لیا تھا وہ یہ بھی جان گئے تھے کہ مجھے کہاں جانا تھا اس لیے وہ متوقع راستے میں پہلے سے موجود تھے ہیکلس دیکھتے ہی وہ حرکت میں آ گئے تھے۔ میں تیزی سے سوچ رہا تھا اور میں نے ان دونوں سے کہا۔ ”اگر یہ پولیس ہوئی تو تم کوئی حرکت نہیں کرو گے یہ بتاؤ تمہارا اسلحہ لائسنس یافتہ ہے؟“

”جی میری رائفل کالائسنس ہے۔“ گارڈ نے کہا جب کہ ڈرائیور غیر مسلح تھا۔ میں نے کوشش کر کے دیکھا عقبی گاڑی کچھ فاصلے پر تھی جب کہ آگے والی گاڑی کوئی تیس گز آگے تھی۔ سڑک پر زیادہ ٹریفک نہیں تھا۔ اچانک آگے جانے والی گاڑی ایک تنگ سے جگہ محوم کر رک گئی اور اس نے آگے نکلنے کا راستہ بلاک کر دیا تھا۔ ڈرائیور ہیکلس روکنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس دھندان میں اگلی گاڑی سے پولیس والے کود کر پوزیشن لے رہے تھے۔ میں نے ان کے پاس ایس ایم جی کی جھلک دیکھی۔ پیچھے والی پولیس موبائل اس طرح رکی تھی کہ پیچھے کا راستہ بھی بند ہو گیا تھا۔ آج ہی عبداللہ نے مجھے خبردار کیا تھا کہ پولیس میرے خلاف سرگرم ہو گئی ہے لیکن یہ میں نے نہیں سوچا تھا کہ پولیس اتنی سرگرم ہو جائے گی اور اتنی مستعدی سے مجھے چھاپ لے گی۔ چند منٹ پہلے ندیم نے غائب ہونے کا مشورہ دیا تھا اور ابھی میں نے اس پر عمل کا سوچا بھی نہیں تھا کہ پولیس نازل ہو گئی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ پولیس میرے لیے آئی تھی۔ اگلی موبائل سے کوئی چار پولیس والے اترے تھے اور وہ سب ایس ایم جی سے مسلح تھے۔ پیچھے والی موبائل سے بھی اتنے ہی پولیس والے اترے تھے۔

”تم کوئی حرکت نہیں کرو گے۔“ میں نے گارڈ کی طرف دیکھا پھر ڈرائیور سے کہا۔ ”تم ہاتھ اوپر کر کے نیچے اترو اور پولیس والوں سے پوچھو کہ گاڑی کو کیوں روکا گیا ہے؟“

لیکن اس سے پہلے کہ ڈرائیور اترتا میں نے ایک جانی پہچانی آواز سنی جو کہہ رہی تھی۔ ”شہباز ملک میں جانتا ہوں تم اس گاڑی میں ہو۔ شرافت سے ہاتھ اوپر کر کے نیچے اتر آؤ۔ تمہیں دس سیکنڈ کا وقت دیا جاتا ہے اس کے بعد پولیس فائر کھول دے گی۔“

آواز اکرم چشتی کی تھی اور میں اسے کیسے فراموش کر سکتا تھا۔ اس سفاک شخص سے کئی بار میرا واسطہ پڑ چکا تھا۔ جب اس نے دھمکی دی تو مجھے ذرا بھی شک نہیں رہا تھا کہ پولیس واقعی دس سیکنڈ بعد فائر کھول دے گی۔ مقابلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اکرم چشتی کتنی گن رہا تھا۔ میں نے سوچا اور فوری فیصلہ کیا۔ میں نے اپنا موبائل اور پستول نکال کر گارڈ کے حوالے کیا۔ ”تم دونوں اندر رہی رہو اور جب تک پولیس والے نہ کہیں نیچے اترنے کی ضرورت نہیں ہے۔ شاید یہ صرف مجھے ہی یلے آئے ہیں۔“

اکرم کے دس کہنے سے پہلے میں نیچے اتر آیا تھا اور میرے دونوں ہاتھ سر پر تھے۔ فوراً ہی آگے پیچھے سے چار پولیس والوں نے مجھے گھیر لیا۔ ان میں سے ایک نے میرے ہاتھ پشت کی طرف کیے اور ان میں ہتھکڑی ڈال دی۔ مجھے باقاعدہ گرفتار کیا جا چکا تھا۔ اکرم چشتی اتنا بہادر تھا کہ جب تک اس کے آدمیوں نے مجھے مکمل بے بس نہیں کر دیا وہ گاڑی سے اتر کر آگے نہیں آیا تھا وہ پچھلی گاڑی میں تھا۔ میں نے اس کی منحوس صورت خاصے عرصے بعد دیکھی تھی آخری بار میں نے اسے جناح مارکیٹ میں دیکھا تھا جب میں زرین کو شاہنگ کرانے وہاں

لے گیا تھا اور اچانک ہی اکرم چشتی بھی وہاں آ گیا تھا۔ اگر زرین ڈرامہ نہ کرتی تو وہ مجھے دیکھ لیتا اور پھر مجھے مار دھاڑ کر کے نکلتا پڑتا۔ مگر اب تو مار دھاڑ کا موقع بھی نہیں تھا۔ اکرم چشتی مزید پھول گیا تھا اس کا چہرہ سوز سے مشابہ ہو رہا تھا اور آنکھوں میں پرانا کینہ چمک رہا تھا۔ اس نے سامنے آتے ہی اچانک مجھے تھپڑ مارا۔ اس کا ہاتھ ہماری تھامی اس پر ہلکا سا گھوما لیکن میں اپنی جگہ سے ہلانی نہیں تھا۔

”شہباز ملک..... یہ ایڈوانس ہے۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”افسوس کہ تم صبح سے ایڈوانس دینے کے قابل بھی نہیں رہے ہو۔ حرا خوری نے تمہیں کسی قابل نہیں چھوڑا ہے۔“ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ اکرم چشتی کا سیاہی مال چہرہ مزید سیاہ پڑ گیا تھا۔ مگر اس نے مزید کچھ کہنے سے گریز کیا اور اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا کہ مجھے موبائل میں بٹھائیں۔ اس نے گاڑی اور اس میں موجود افراد سے کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔ اس نے ایسے ہیملکس اور اس میں بیٹھے عبداللہ کے آدمیوں کو نظر انداز کر دیا تھا جیسے وہ وہاں تھے ہی نہیں۔ جیسے ہی میں اگلی موبائل بٹھایا گیا اور سپاہی اس میں چڑھے وہ حرکت میں آ گئی۔ پیچھے والی موبائل سیدی ہوئی اور اس موبائل کے پیچھے آنے لگی اس سے زیادہ میں نہیں دیکھ سکا تھا کیونکہ ایک سپاہی نے میلا سا کپڑے کا غلاف میرے منہ پر چڑھا دیا تھا۔ اب میں کچھ دیکھنے سے قاصر تھا۔ بلکہ اس غلاف سے ایسی بو اٹھ رہی تھی کہ میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ میرے ساتھ کسی مستند دہشت گرد کا ماسلوک کیا جا رہا تھا۔ کیونکہ میں مرشد جیسے شخص کا دشمن تھا۔

جب اکرم چشتی نے مجھے تھپڑ مارا تو مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا تھا۔ اس سے اسی رویے کی توقع تھی۔ تعجب مجھے اس وقت ہوا جب موبائل میں پولیس نے حسب روایت مجھ پر تشدد شروع نہیں کیا جب عام طور سے کسی مستند مجرم کو گرفتار کیا جاتا ہے تو جائے وقوع سے اس کی چھتر کاری کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے بجائے پولیس والے سکون سے بیٹھے تھے حد یہ کہ انہوں نے گالی گلوچ سے بھی کام نہیں لیا۔ وہ آپس میں بھی بات نہیں کر رہے تھے۔ یہ جدید قسم کی طاقتور انجمن والی پولیس موبائل تھی جو حال ہی میں پولیس کو دی گئی تھی۔ جب پولیس موبائلز نے ہیملکس کو روکا تو مجھے شبہ نہیں ہوا کہ یہ پولیس کے بجائے کوئی اور ہیں۔ مگر جب وہ مجھے اس طرح خاموشی سے گرفتار کر کے لے جانے لگے انہوں نے نہ تو عبداللہ کی گاڑی اور نہ اس کے آدمیوں سے تعرض کیا حتیٰ کہ ان سے پوچھ گچھ بھی نہیں کی کہ وہ پولیس کے مطلوب شخص کو اپنی گاڑی میں لیے کیوں پھر رہے ہیں اصولاً تو میرے ساتھ انہیں بھی گرفتار کر لینا چاہیے تھا اور گاڑی بھی پولیس کی تحویل میں چلی جاتی۔ پھر انہوں نے میرے ساتھ نہایت شریفانہ سلوک رکھا تھا۔ اس سے مجھے شبہ ہونے لگا تھا کہ وہ پولیس والے نہیں تھے یا اگر جج پوچھ گچھ پولیس تھی تب بھی وہ کسی کی ہدایت پر کام کر رہی تھی۔ شاید مجھے تھانے کے بجائے کہیں اور لے جایا جا رہا تھا۔

اگر مجھے کہیں اور لے جایا جا رہا تھا تو وہ یقیناً مرشد کا کوئی ٹھکانہ ہو سکتا تھا۔ مرشد کے آدمی عبداللہ کی کوشی کی نگرانی کر رہے تھے اور انہوں نے کسی طرح مجھے دیکھ لیا تھا۔ فوری طور پر مجھے اٹھانے کا پلان بنایا گیا۔ مرشد نے چالاکی سے کام لیا اپنے آدمیوں کو بھیجنے کے بجائے اس نے اکرم چشتی سے کام لیا جو اس کا زریعہ تھا اور میرا دشمن بھی تھا اس نے خوشی سے یہ ناسک لیا اور اسے پورا بھی کر دیا اگر پولیس کی جگہ مرشد کے گرگے ہمیں روکتے تو اتنی آسانی سے مجھے نہیں لے جاسکتے تھے۔ ہم مقابلہ اور مزاحمت کرتے اور ممکن ہے حملہ آوروں کو ان کے مقصد

میں ناکام بنا دیتے مگر پولیس کے خلاف مزاحمت مشکل تھی ان سے تو مقابلہ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ پولیس کے پاس گولی چلانے کا پورا اختیار ہوتا ہے لیکن یہ میرا اندازہ تھا جو غلط بھی ہو سکتا تھا۔ اس کا بھی امکان تھا کہ پولیس نے جج جج مجھے گرفتار کر لیا تھا اور آغاز میں تعرض نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اب میں پولیس کے پاس تھا وہ آرام سے مجھ سے پوچھ گچھ کر سکتی تھی اور اکرم چشتی پرانے حساب برابر کر سکتا تھا۔ جلد مجھے معلوم ہو جاتا کہ میرا کون سا مفروضہ درست تھا مگر ایک بات یقینی تھی میں مشکل میں پڑ گیا تھا۔

اگر میرا پہلا خدشہ درست تھا تو میں زیادہ مشکل میں پڑنے والا تھا کیونکہ پولیس کا اختیار محدود تھا لیکن مرشد کا اختیار لامحدود تھا وہ میرے ساتھ کچھ بھی کرنے کے لیے آزاد تھا۔ وہ مجھے مار سکتا تھا اور مار کر غائب بھی کر سکتا تھا جب کہ پولیس مجھے عدالت کے سامنے پیش کرنے کی پابند تھی۔ اگرچہ اکرم چشتی کی موجودگی میں یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ میں تھا تو پولیس کی تحویل میں لیکن وہ مجھے غیر قانونی تفتیش کے لیے لے جا رہی تھی۔ اکثر پولیس والے جس ملزم کے لیے خدشہ محسوس کرتے ہیں کہ اسے چھڑانے والے فوراً آ جائیں گے اسے متعلقہ تھانے کے بجائے کہیں اور رکھتے ہیں اور وہیں اس سے ”تفتیش“ کرتے ہیں حتیٰ کہ مطلوبہ مقصد حاصل نہیں کر لیتے۔ اس تفتیش کے لیے انہیں کہیں جواب دہ نہیں ہونا پڑتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تفتیش میں بندہ جان سے گزر جاتا تو اسے خاموشی سے کہیں پھینک دیا جاتا ہے۔ یوں پولیس بری الذمہ ہو جاتی ہے۔ اگر اکرم چشتی مجھے ایسی کسی جگہ لے جا رہا تھا تو میری خیر نہیں تھی۔



اب مجھے افسوس ہونے لگا تھا کہ میں نے اتنے بڑے خطرے کو مسلسل کیوں نظر انداز کیا۔ پولیس کو میری تلاش تھی اگرچہ یہ تلاش ٹھنڈی پڑی ہوئی تھی لیکن ختم نہیں ہوئی تھی۔ بس اتفاق کی بات تھی کہ آج تک گرفتاری کی نوبت یوں نہیں آئی تھی کہ پولیس نے مجھے باقاعدہ گرفتار کر لیا ہو مگر اس کا خدشہ تو ہمیشہ موجود تھا۔ آج ہی عبداللہ اور پھر ندیم بھٹی نے اس خطرے سے خبردار کیا۔ میں اپنے دوسرے دشمنوں سے تو محتاط رہا لیکن پولیس کو نظر انداز کر دیا اور بالآخر اپنی لا پرواہی کا خمیازہ بھگتتے جا رہا تھا۔ میں نے برابر میں موجود پولیس والے سے کہا۔ ”یہ تو بتا دو کہ کہاں لے جا رہے ہو؟“

”جلدی کیا ہے میاں جی۔“ پولیس والے نے طنز یہ انداز میں کہا۔ ”جلد پتا چل جائے گا۔“

”اسے چھتر ول کی جلدی ہے۔“ کوئی دوسرا انس کر بولا۔

میرا شبہ یقین میں بدلنے لگا وہ پولیس والے نہیں تھے یا میرے معاملے میں ان کا کردار روایتی پولیس کا نہیں تھا کیونکہ ان کے لہجے میں میرے لیے بغض نہیں تھا۔ سمجھ میں آنے والی بات ہے آدمی جس کے خلاف کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہو پہلے اس کے خلاف اپنے دل و زبان میں نفرت اور کینہ پیدا کرتا ہے۔ ان لوگوں کے انداز میں میرے لیے استہزاء تو لیکن نفرت اور کینہ نہیں تھا۔ موبائل تیزی سے جاری تھی اور دس بارہ منٹ بعد باہر ٹریفک کا شور کم ہو گیا یعنی ہم کسی کم ٹریفک والی سڑک سے گزر رہے جب کہ پنڈی میں ایسے علاقے بہت کم ہیں جہاں سڑک پر ٹریفک کم ہو۔ کیا یہ مجھے شہر سے باہر کہیں لے جا رہے تھے۔ شروع میں ہمیں نے اپنے ذہن میں سستوں کا اندازہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن جلد موبائل نے اتنے موڈ کالے کے سارے اندازے آپس میں گڈ

دیکھا۔ وہ کب خاموشی سے چلا آیا تھا ہمیں پتا ہی نہیں چلا اکرم چشتی اسے دیکھ کر بوکھلا گیا تھا۔

”جناب..... آپ۔“

مرشد نے سرد لہجے میں کہا۔ ”تم گدھے ہو تمہیں گاڑی اور اس میں موجود افراد کی تلاشی لینی چاہیے تھی۔“
”دیکھا میں بھی یہی کہہ رہا تھا لیکن جعلی ڈگری سے ڈی ایس پی بن جانے سے عقل ڈی ایس پی والی نہیں ہو جاتی۔“

اکرم چشتی نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ”یہ بکواس کر رہا ہے جناب ان لوگوں کے پاس کوئی کسرے والا موبائل نہیں تھا ورنہ میرے آدمی دیکھ لیتے۔“

”تمہارے آدمی.....“ میں ہنسا تو اکرم چشتی کا غصے سے برا حال ہو گیا اگر مرشد نہ موجود ہوتا تو شاید وہ مجھ پر ٹوٹ پڑتا اور میرا حشر نشر کر دیتا۔ مرشد نے ناگواری سے میری طرف دیکھا۔

”شہباز اپنا جوکر پن ختم کرو اور سنجیدگی سے بات کرو۔“

”میں بالکل سنجیدہ ہوں لیکن یہ اکرم چشتی مجھے مسلسل ہنسا رہا ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ میں اپنی ہنسی کا گلا گھونٹ لوں تو چلو یہ بھی کر لیتا ہوں۔“

مرشد اپنے مخصوص حلیے کے بجائے اس وقت سیاہ چٹلون اور ماؤ کوٹ میں تھا۔ اس کے پیروں میں بہترین قسم کے چمکتے پمپی شوز تھے۔ یہ فرض تو مشکل تھا کہ وہ یہاں اکیلا آیا تھا اس کا حافظہ ٹولہ یقیناً کہیں آس پاس موجود تھا ویسے اسے یہاں صرف مجھ سے خطرہ تھا اور میں بے بس ہو کر بندھا ہوا تھا مرشد نے خاص نظروں سے اکرم چشتی کی طرف دیکھا۔ اس نے کہا۔ ”جناب عالی یہ خطرناک آدمی ہے۔“

”میں اسے تم سے زیادہ جانتا ہوں۔“ مرشد نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اب تم اپنے پلے سمیت یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“

اکرم چشتی ڈم دبا کر اپنے آدمی سمیت باہر چلا گیا۔ وہ عزت بے عزتی سے بے نیاز تھا اس کے نزدیک مفاد اصل چیز تھی۔ جو وہ بہر صورت حاصل کر لیتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد مرشد نے کہا۔ ”شہباز میں نے تمہیں یہاں صرف بات کرنے کے لیے بلایا ہے۔“

”اکرم چشتی تو کہہ رہا تھا کہ مجھ سے پرانے حساب بے باق کرنے ہیں یہ تم میرے منہ پر نشان دیکھ رہے ہو یہ اس کی طرف سے ایڈوانس تھا۔ ایسے میں تمہاری بات پر کیسے یقین کیا جاسکتا ہے؟“

”تم نے اسے اشتعال دلایا ہوگا میں دیکھ رہا تھا تم مستقل اسے مشتعل کر رہے تھے۔ دشمنوں کے ساتھ تمہارا یہی رویہ ہے جو مسائل کو حل ہونے نہیں دیتا ہے۔ میں نے ہمیشہ کوشش کی کہ مسائل.....“

”مرشد یہ سب باتیں تم اس کے سامنے کیا کرو جو تمہیں جانتا نہیں ہو۔“ میں نے تلخی سے کہا۔ ”پچھلے دنوں بھی تم نے مسائل حل کرنے کی کوشش کی تھی میرے ساتھیوں کی زندگی تھی جو وہ بچ گئے ورنہ تم نے انہیں مار دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔“

”میں کہہ چکا ہوں وہ فاضلی کہ اپنی کوشش کی تھی میں نے اسے ایسا کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔“

”خوب تم نے شکاری کتے کا پناؤھیلا چھوڑ دیا اور اب کہتے ہو اسے شکار کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔“

”تم نے کوٹھی پر چھاپہ کیوں نہیں مارا؟“

وہ عیاری سے مسکرایا۔ ”کیونکہ تمہاری گرفتاری ظاہر نہیں کرنی تھی۔ کوٹھی پر چھاپہ مارتے تو کئی لوگ گواہ بن جاتے اس لیے تمہیں راستے سے اٹھایا گیا اب کوئی گواہ نہیں ہے کہ پولیس نے تمہیں گرفتار کیا ہے۔“

”تم راجا صاحب کے ملازموں کو بھول رہے ہو تم نے ان کے سامنے مجھے گرفتار کیا ہے۔“

”وہ کچھ بھی کہتے رہیں ان کی بات کون سنے گا۔“

اس کی یہ بات مجھے ہضم نہیں ہوئی تھی کہ پولیس کے جنرل عبداللہ والی کوٹھی کی نگرانی کر رہے تھے اور انہوں نے مجھے کوٹھی میں دیکھ لیا تھا۔ عبداللہ نے اس قسم کے انتظامات کر رکھے تھے کہ میری آمد خفیہ رہے اور کوٹھی کے باہر سے اندر دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے اکرم چشتی کی یہ بات جھوٹ تھی۔ ابھی ہماری پولیس کے جنرل اتنے تیز نہیں ہوئے تھے کہ وہ اندر کی بات جان جاتے اس کے پیچھے کوئی اور چکر تھا۔ مجھے خیال آیا کہ پولیس کے لیے کوٹھی کے کسی ملازم کو توڑ لینا مشکل نہیں تھا۔ اسے ڈرا دھمکا کر اور لالچ دے کر اپنا آلہ کار بنایا جاسکتا تھا پولیس سے کون ہیر لے سکتا ہے اس سے آسان تو دریا میں مگر مجھ سے ہیر لینا ہے۔ یہ زیادہ آسان کام تھا مجھے دیکھتے ہی پولیس کے اس جنرل نے کال یا ایس ایم ایس سے اطلاع کر دی ہوگی۔ تیس چالیس افراد میں سے کسی ایک کا بک جانا بعید نہیں تھا۔

”ٹھیک ہے پولیس کے مقابلے میں کسی عام فرد کی بات کون مانے گا لیکن جب راجا صاحب اس پولیس گردی کی رپورٹ کریں گے تب تو اعلیٰ حکام توجہ دیں گے۔“

”لیکن راجا صاحب یہ نہیں فرمائیں گے کہ ان کی گاڑی میں پولیس کو مطلوب مجرم موجود تھا ورنہ وہ اس کی کیا وضاحت کریں گے۔ وہ زیادہ سے زیادہ پولیس پر اپنے ملازموں کو ہراساں کرنے کا الزام لگا سکتے ہیں۔ مگر اسے کون تسلیم کرے گا جب کہ گاڑی اور ملازموں پر ایک نشان بھی نہیں پڑا ہے۔“

”ممکن ہے اس کے کچھ ثبوت جمع ہو گئے ہوں۔“ میں نے کہا۔

”کیا مطلب کیسے ثبوت؟“ اس نے مشکوک نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

”اکرم چشتی تم ڈی ایس پی بن کر بھی احمق ہی رہے کیا تمہیں نہیں معلوم کہ آج کل کبیرے والے موبائل بچوں کے پاس بھی ہوتے ہیں۔ گاڑی کے ڈرائیور کے پاس بھی تھا اور اس نے میری گرفتاری کی تصاویر بنائی ہوں گی ان کے ہوتے ہوئے بھلا کون میری گرفتاری سے انکار کر سکے گا۔“ اگرچہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میرے موبائل میں کبیرہ نہیں تھا اور مجھے گاڑی ڈرائیور کا خیال نہیں آیا تھا۔ درحقیقت مجھے اس چیز کا بھی خیال نہیں آیا تھا۔ مگر یہ بات اکرم چشتی کیسے جان سکتا تھا۔ اب اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا تھا اور اس کے چہرے پر بارہ بج گئے اس نے کمزور لہجے میں کہا۔

”بکواس کرتے ہو۔“

”چلو جی بکواس ہی سہی۔“

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ اچانک دروازے کی طرف سے آواز آئی اور میں نے وہاں مرشد علی کو کھڑے

بھاشن دے رہے تھے۔“

مرشد نے گہری سانس لے کر خود پر قابو پایا دیے فاضلی کے لیے اس کی تشویش دیکھ کر مجھے فاضلی کی بات درست لگی تھی کہ وہ اس کا فطری بیٹا تھا (اگر بڑھری اولاد کو فطری اولاد کہتے ہیں)۔ مرشد خود ڈیوڈ کا بیروکار تھا اس لیے فاضلی کو اس کی فطری اولاد کہا جاسکتا تھا۔ مگر فاضلی کا یہ اندازہ غلط تھا کہ مرشد کو اس بارے میں علم نہیں ہے۔ اسے فاضلی سے انیت ہو سکتی تھی لیکن یہ اتنی بھی نہیں تھی کہ وہ اس کی فکر میں گھلا جاتا اور میری ہر بات مان لیتا۔ میں نے کہا۔ ”اپنا دوسرا مطالبہ بتاؤ۔“

”میں نادر کی واپسی بھی چاہتا ہوں۔“

”نادر میرے پاس نہیں ہے۔“

”شہباز جھوٹ مت بولو..... میں جانتا ہوں اور تم بھی جانتے ہو نادر کہاں ہے۔ اس کے حوالے سے مجھ پر خاندان والوں کا بہت دباؤ آرہا ہے میں نے اب تک اس بات کو گھر سے باہر نکلنے سے روکا ہے۔ کیونکہ مجھے یقین ہے نادر کو کسی الجھنی سے نہیں بلکہ تم نے اٹھایا ہے۔“

”نہ ناو۔“ میں لا پرواہی سے کہا۔ ”جو حقیقت ہے وہ میں بتا دی ہے۔“

مرشد مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ”شہباز حقیقت میں دوسرے طریقے سے بھی معلوم کر سکتا ہوں۔“

”تو معلوم کر لو تمہیں کس نے روکا ہے میں تو ویسے ہی بے بس اور تمہارے قبضے میں ہوں۔“

”میں تمہیں اپنے جلاوطنوں کے حوالے نہیں کرنا چاہتا اور نہ تمہاری ساری خوش فہمی دور دراز میں گئے۔“

”مجھے کوئی خوش فہمی نہیں ہے مجھے وہ منظر آج بھی یاد ہے جب تمہارے جلاوطنوں نے مجھے ڈرانے کے لیے ایک مظلوم لڑکے کو ڈنڈے مار مار کر ہلاک کر دیا تھا جس نے اپنی ماں کے غائب ہونے پر احتجاج کیا تھا۔ صرف مجھے ذہنی اذیت دینے کے لیے وہ اس لڑکے کی لاش پر بھی ڈنڈے برساتے رہے تھے حتیٰ کہ اس کی ساری ہڈیاں توڑا اسے گوشت کے ایک ٹکڑے میں بدل دیا تھا۔“

مرشد اب کمرے میں ٹپٹنے لگا تھا۔ ”تمہارے ساتھ اس سے بھی زیادہ ہو سکتا ہے۔“

”میں نے کہا نا تم آزاد ہو اپنی مرضی کرنے کے لیے..... ظاہر ہے تم نے صرف مذاکرات کے لیے تو اتنی زحمت نہیں کی ہوگی۔“

”میں چاہتا ہوں معاملہ خراب ہوئے بغیر منٹ جائے۔“

”اگر تمہارا مطالبہ نادر ہے تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں وہ میرے پاس نہیں ہے ہاں فاضلی کو حوالے کرنے پر بات ہو سکتی ہے وہ دیسے بھی ہمارے لیے بیکار ہو گیا ہے۔“

”اسے کیا ہوا ہے؟“

”چکنے کی کوشش میں اس کے سر پر چوٹ آئی اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا ہوش میں آنے کے بعد وہ ہسکی ہسکی باتیں کرتا رہا اور تمہیں اپنا والد ماجد قرار دیتا رہا۔“ میں نے روانی سے جھوٹ میں جج ملایا اور مرشد کے چہرے پر اس کا اثر دیکھ کر مجھے دلی مسرت ہوئی تھی۔ ”ہم نے ایک ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا۔ اس نے اسے چوٹ کا صدمہ قرار دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ کیفیت عارضی بھی ہو سکتی ہے اور مستقل بھی، ابھی اس بارے میں کچھ کہنا مشکل

”دیکھو میں یہ مانتا ہوں میں نے اسے تمہارے خلاف کھلا چھوڑ دیا تھا لیکن یہ سب کرنے کا حکم نہیں دیا تھا یہ سب اس کی اپنی پلاننگ تھی۔“

میں نے محسوس کیا کہ اس بحث کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ مرشد نہیں مانے گا اور مجبور میں تھا۔ اس لیے میں نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے بات کو آگے بڑھانے کے لیے میں تمہاری بات مان لیتا ہوں۔“

اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”شہباز میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہتا ہوں۔ میں اس بلا وجہ کی جنگ سے باہر نکلنا چاہتا ہوں میرے سامنے اور مقاصد ہیں اور میں اب اس چکر میں اپنی توانائی ضائع کرنا نہیں چاہتا۔“

”چلو تمہاری یہ بات بھی مان لی جائے کہ تم اس جنگ کو ختم کرنا چاہتے ہو لیکن تمہارا طریقہ کار بتا رہا ہے تم اصل میں دشمن کو ختم کرنا چاہتے ہو جب دشمن باقی نہیں رہے گا تو دشمنی خود یہ خود ختم ہو جائے گی۔“

خلاف توقع مرشد مشتعل ہونے کے بجائے مسکرایا۔ ”اگر ایسا ہوتا تو تم اس وقت زندہ نہ ہوتے جو پولیس والے تمہیں میرے حکم پر گرفتار کر کے یہاں لا سکتے ہیں وہ تمہیں موقع پر چھلنی کر سکتے تھے اور کوئی ان پر انگلی نہ اٹھاتا۔ تم پولیس کو مطلوب مجرم ہو اور مسلح حالت میں ایک گاڑی میں اپنے مسلح ساتھیوں کے ہمراہ گھوم رہے تھے پولیس کے روکنے پر تم نے فائرنگ کی اور پولیس کی جوابی فائرنگ سے تم مارے گئے۔ اسے کون غلط کہتا؟“

”میرے ساتھی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”انہیں کوئی قائل نہیں کر سکتا اور وہ تمہیں نہیں چھوڑتے۔ مرشد مہربانی کر کے اصل موضوع پر آؤ، تمہاری مجبوری کی وجہ تمہاری شرافت یا اعلیٰ ظرفی نہیں ہے۔ بلکہ ہماری طرف سے طاقت کا وہ اظہار ہے جس نے تمہیں یقین دلایا ہے کہ مقابلہ اب برابری کا ہے۔ کالی گولی کی تباہی نے تمہیں یہ بات سمجھا دی تھی لیکن انفس تم نے ہٹ دھرمی نہیں چھوڑی۔“

مرشد کے سرخ چہرے پر غیض کی سیاسی ایک لمحے کے لیے غالب آئی تھی مگر فوراً ہی اس نے خود پر قابو پایا۔ ”میرا خیال ہے ہمیں ان باتوں کو ماضی کا حصہ بنا دینا چاہیے۔“

”ٹھیک ہے اگر تم چاہتے ہو تو میں مستقبل کی بات کرتا ہوں۔“

”پہلے تم اپنے مطالبات سامنے رکھو، تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

”میں تم سے صرف یہ چاہتا ہوں کہ میری اور میرے ساتھیوں کی جان چھوڑ دو۔ اپنے شکاری کتوں کو پیچھے ہٹا لو اور مجھے ہمیشہ کے لیے بھول جاؤ۔ اپنے باقی مسائل سے میں خود منٹ لوں گا۔“

”مجھے منظور ہے۔“ اس نے کہا۔ ”جواب میں میرا ایک..... بلکہ دو مطالبے ہیں۔ پہلا تم فاضلی کو چھوڑ دو۔“

”ٹھیک ہے چھوڑ دیں گے دیسے بھی وہ اب کسی کام کا نہیں رہا ہے۔“

مرشد کے چہرے پر تشویش نظر آئی تھی۔ ”کیا مطلب؟“

”جب وہ تمہارے پاس پہنچے گا تو اسے دیکھ لینا۔“

”دیکھو شہباز اسے کچھ ہوا تو.....“

”تو تم مجھے توپ دم کر دو گے۔“ میں نے ہنس کر طنز کیا۔ ”ابھی تو تم تنازعات کو ماضی کا حصہ بنانے کا

نام ہے اور کچھ جمع پونجی ویسے اس کے پاس ہوگی لیکن مجموعی طور پر وہ خالی ہاتھ تھا۔ مجھے امید تھی کہ چند دنوں میں اس کا دماغ ٹھکانے پر آجائے گا لیکن وہ اس سے پہلے ہی غائب ہو گیا اسے اٹھایا گیا۔

”تم ایک بار پھر سارا الزام نادر پر لگا رہے ہو کیا یہ غلط ہے کہ اسے اصل میں تمہاری شہ حاصل رہی ہے۔“
 ”کبھی تھی۔“ اس نے اعتراف کیا۔ ”لیکن جب میں نے محسوس کیا کہ یہ دشمنی میرے لیے نقصان دہ ہے تو میں نے اس سے ہاتھ کھینچ لیا اور اسے بھی سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہو سکا میری عمر بھر کی معذوری نے اس کا دماغ الٹ دیا تھا۔“

”تم شاید جانتے نہیں ہو ایک بار نادر نے مجھ سے ملاقات کی تھی اس وقت بھی میں اسی طرح بے بس تھا اور اس نے بھی دشمنی ختم کرنے کی بات کی تھی اور الزام تم پر لگایا تھا۔“
 ”مرشد غالباً دم بخود رہ گیا تھا۔“ مجھ پر..... کیا مجھ سے تمہاری براہ راست دشمنی ہے۔ یہ سارا کھیل تو اس کا تھا۔“

”وہ بھی یہی بات کہہ رہا تھا وہ اب دشمنی ختم کرنا چاہتا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”تم دونوں بھائی ایک ہی زبان بول رہے ہو لیکن تم ایک چیز فراموش کر رہے ہو۔ وہ ہے میرے بے گناہ بھائی کا خون۔“
 ”مجھے اس کا احساس ہے اور میں براہ راست اس میں ملوث نہیں ہوں لیکن تم چاہو تو میں اس کا خون بہا ادا کرنے کو تیار ہوں۔ ہمارا دین اس کی اجازت.....“

”مرشد دین کی باتیں تم جیسے شخص کے منہ سے اچھی نہیں لگتی ہیں تم اچھی طرح جانتے ہو جتنا میں جانتا ہوں دین سے تمہارا اتنا ہی واسطہ ہو سکتا ہے جتنا کٹر میں رہنے والے چوہے کا صفائی ستھرائی سے ہو سکتا ہے اس لیے تم دنیا کے لحاظ سے بات کرو۔“

مرشد نے اس مثال پر برا نہیں منایا۔ ”جیسی مرضی تمہاری، لیکن اب میں کیا کر سکتا ہوں اگر نادر تمہارے قبضے میں ہے تو تم اس سے معلوم کر سکتے ہو کہ تمہارے بھائی کا قتل اس کے اشارے پر ہوا تھا یا نہیں۔ میں یہ کر سکتا ہوں تمہارے مقدمات ختم کر دوں اور تمہارا جو مالی نقصان ہوا ہے اس کی تلافی کر دوں۔“

”اس کے بدلے تم چاہتے ہو کہ میں فاضلی کو تمہارے حوالے کر دوں۔“
 ”ہاں۔“

”ٹھیک ہے تب مجھے آزاد کر دو اور اپنا وعدہ پورا کرو جیسے ہی میرے خلاف مقدمات ختم ہوں گے میں فاضلی کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔“

”مقدمات اتنی جلدی ختم نہیں ہوں گے۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کر دوں گا۔ انتظامیہ، پولیس اور سماعت کرنے والی عدالت پر دباؤ ڈالنا ہو گا جب کہیں جا کر یہ کام کی مہینوں میں ہو گا تم جانتے ہو اب میں اس حکومت میں شامل نہیں رہا ہوں اس لیے میرا اثر بھی پہلے جیسا نہیں ہے۔“

”اس پر بھی تم دن دھاڑے پولیس کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کر سکتے ہو۔“ میں نے طنز کیا۔
 ”اکرم چشتی میرا خاص آدمی ہے لیکن باقی پولیس میری زر خرید نہیں ہے جب تک میرا سرکاری اختیار تھا وہ میری بات ماننے پر مجبور تھے اب ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے۔“

”یہ ویسے اس کی جان کو خطرہ نہیں ہے۔“

”اسے میرے حوالے کر دوں میں اسے بہترین ڈاکٹروں کو دکھاؤں گا۔“

میں نے تعجب سے مرشد کی طرف دیکھا۔ ”اتنا تو تم اپنے بھائی کے لیے بھی پریشان نہیں ہو جتنا فاضلی کے لیے ہو رہے ہو کہیں اس نے سچ تو نہیں کہا تھا۔“

”کیا کہا تھا؟“ مرشد نے بے خیالی میں پوچھا۔

”یہ کہ تم ہی اس کے والد ماجد ہو۔“

”احقانہ باتیں مت کرو۔“ مرشد نے اپنی کیفیت چھپاتے ہوئے کہا۔ ”تم خود بتا رہے ہو کہ وہ بہنکی بہنکی باتیں کر رہا ہے۔“

”ہاں لیکن بعض اوقات انسان اس کیفیت میں سچ بھی تو بول دیتا ہے جیسے نشتے میں انسان بہکتا ہے اور سچ بھی بول دیتا ہے۔ بہر حال حقیقت جو بھی ہو اگر تم فاضلی کو واپس چاہتے ہو تو تمہیں مجھے چھوڑنا ہو گا۔“

”ایسے نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”پہلے فاضلی کو چھوڑا جائے گا اس کے بعد ہی تمہاری رہائی عمل میں آئے گی۔“

”اس کے لیے تمہیں میرے ساتھیوں سے بات کرنی ہوگی مجھ سے کچھ کہنا بیکار ہے۔ وہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ فاضلی کو چھوڑنا ہے یا نہیں۔“

مرشد کی آنکھوں میں خطرناک چمک نمودار ہوئی۔ ”انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”اس کا پتا تو اس وقت چلے گا جب تم ان سے بات کرو گے۔ ویسے کیا نادر سچ غائب ہے؟“

وہ چونکا۔ ”کیا مطلب؟“

”مرشد تم بہت بڑے ڈرامے باز ہو۔ کیا اس بات کا امکان نہیں ہے کہ نادر کو تم نے خود غائب کر دیا ہو اور دکھاوے کے لیے واویلا کر رہے ہو؟“

”میں اسے کیوں غائب کرنے لگا؟“

”کیونکہ نادر اور تمہارے درمیان اختلافات پیدا ہو چکے تھے۔ میرا خیال ہے وہ گدی نشینی کے اس کاروبار میں اپنا برابر کا حصہ مانگ رہا ہو گا لیکن تم یہ حصہ دینے کے لیے تیار نہیں ہو گے۔“

”یہ بکواس ہے اس کے اور میرے درمیان اختلاف کی اصل وجہ تم ہو۔ وہ تم سے انتقام کے لیے پاگل ہوا جا رہا تھا اور میں اس سے متفق نہیں تھا جب اس نے میرے علم میں لائے بغیر تمہارے بھائی کا قتل کروایا تب سے میرے اور اس کے درمیان اختلاف آ گیا تھا۔ میں نے اسے محدود کر دیا اور اس کے گرد اپنے آدمی لگا دیے تاکہ وہ میرے علم میں لائے بغیر کوئی حرکت نہ کر سکے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ اب یہ چکر ختم کرے لیکن وہ میری ایک سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مجبوراً مجھے اس کی کفالت سے بھی ہاتھ اٹھانا پڑا مجھے معلوم ہے دولت کے بغیر وہ اتنا ہی بے کار جتنا سانپ زہر کے بغیر ہو سکتا ہے۔“

”تمہارے خاندان کے دوسرے لوگ اس کی مدد نہیں کرتے تھے؟“

”نہیں وہ تو خود میرے ٹکڑوں پر چلتے ہیں وہ نادر کی کیا مدد کرتے۔ نادر جس کوٹھی میں رہ رہا تھا وہ اس کے

وہ اپنی مجبوری بڑھا چڑھا کر بیان کر رہا تھا۔ اصل میں یہی مقدمات میرے لیے مسئلہ تھے۔ اگر میں اس پھندے سے نکل جاتا تو مرشد مجھ پر باؤ نہیں رکھ سکتا تھا کیونکہ طاقت کا توازن اب برابر تھا لیکن قانون کے سامنے وہ معزز تھا اور میں ایک مجرم۔ میں نے سوچ کر کہا۔ ”تمہارا مطلب ہے پہلے فاضلی کو تمہارے حوالے کر دیا جائے اس کے بعد تم کچھ کرو گے اگر تمہیں اس چیز کا احساس تھا تو تم نے پہلے ہی میرے خلاف مقدمات کیوں نہیں ختم کر دیے۔“

وہ چونکا۔ ”میں..... ایسا کیسے کر سکتا تھا۔ اپنے دشمن کو جان بوجھ کر کون رعایت دیتا ہے یہ تو لو اور دو کا معاملہ ہے۔ اگر تمہارے پاس جواب میں دینے کے لیے کچھ نہیں ہے تو میں تمہیں کیوں دوں؟“

میں نے محسوس کیا کہ میں لاجواب ہو رہا تھا۔ مرشد میں حیرت انگیز تبدیلی آئی تھی پہلے وہ مجھ سے بد معاشوں والے انداز میں پیش آتا تھا مجھے اپنی طاقت اور فرعونیت سے مرعوب کرنے کی کوشش کرتا تھا لیکن اب وہ مجھ سے برابری کی سطح پر دلائل سے بات کر رہا تھا اور میرے لیے پہلے سے زیادہ مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ ”پھر تم کیا چاہتے ہو؟“

”میں چاہتا ہوں تم اپنے ساتھیوں سے رابطہ کرو اور ان سے کہو فاضلی کو رہا کر دیں اس کے بعد میں اور تم مل کر ملے کریں گے کہ اس جنگ کو ختم کرنے کے لیے ہمیں کیا کرنا ہے۔“

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا تم مجھے احمق سمجھتے ہو کہ میں ایسا کروں گا۔ تم پر بھروسہ کسی صورت ممکن نہیں ہے۔ اگر فاضلی کی رہائی کے بعد بھی تم نے مجھے چھوڑنے سے انکار کیا یا اس جہان سے کوچ کر دیا تو میں کیا کروں گا۔ ابھی تم ہی نے تو کہا تھا کہ یہ اس ہاتھ لو اور اس ہاتھ دو والا کھیل ہے۔“

”بالکل ممکن ہے تم اپنی پوزیشن پر غور کرو تو تمہیں یہ ممکن نظر آئے گا۔“ اس نے اصرار کیا۔ ”مجھے بہر صورت فاضلی واپس چاہیے اور اگر مجھے اس کے لیے کسی حد سے گزرتا پڑے تو میں گزر جاؤں گا۔“

اس کے الفاظ میں واضح دھمکی تھی۔ میں اپنی پوزیشن پر پہلے ہی غور فرما چکا تھا اور میں نے تسلیم کر لیا تھا کہ میں بہت بڑی مشکل میں پڑ گیا ہوں۔ مرشد مجبور تھا لیکن اتنا بھی نہیں تھا کہ اسے میری کھال اتروانی پڑی یا دو چار ہڈیاں تڑوانی پڑیں تو وہ زیادہ تامل کرے۔ مگر ضروری نہیں تھا کہ میں مرشد کے سامنے اپنی کمزوری کا اقرار کرتا۔ اس لیے میں نے اوپری لا پرواہی سے کہا۔ ”ٹھیک ہے تم چاہو تو میرے ساتھ پرانا والا سلوک کر سکتے ہو یقیناً تمہارے دل کی بہت ساری حسرتیں لگی ہوں گی تو بہت ساری رہ گئی ہوں گی تم چاہو تو باقی حسرتیں بھی نکال سکتے ہو۔“

مرشد کسی قدر مایوس ہوا تھا۔ ”شہباز تم کیوں خود کو مشکل میں ڈال رہے ہو فاضلی کو میں بہر صورت واپس حاصل کر لوں گا۔ اگر تم بات نہیں کرو گے تو میں براہ راست تمہارے ساتھیوں سے بات کروں گا اور وہ تمہیں بچانے کے لیے میری بات ماننے پر مجبور ہوا جائیں گے۔“

”اگر تمہارا یہ خیال ہے تو ایسا بھی کر کے دیکھ لو لیکن یاد رکھنا حالات خراب کرنے کی ذمہ داری بھی تم پر آئے گی۔ ابھی تو تمہیں ہیلی کا پڑوالی حرکت کا حساب دینا ہے۔“

وہ چونکا ہو گیا۔ ”کیا کر دے تم؟“

”جب کروں گا تب تمہیں خود پتا چل جائے گا ابھی سے کیا کہہ سکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”مگر ایک بات اپنے ذہن میں اچھی طرح بٹھالو مرشد کہ ہماری طرف سے ہر حرکت کا بھرپور جواب دیا جائے گا۔“

اچانک اکرم چشتی اندر آیا اس نے مرشد سے کہا۔ ”جناب عالی میں نے کہا تھا یہ کتے کی دم ہے ایسے نہیں مانے گا اسے میرے حوالے کریں اور دیکھیں اس کا باپ بھی بتائے گا۔“

وہ چھپ کر ہماری گفتگو سن رہا تھا۔ مرشد نے اسے ناپسندیدہ انداز میں دیکھا لیکن اسے پہلے کی طرح جھڑکا نہیں تھا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا اور غالباً یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے اکرم چشتی کے حوالے کرے یا نہ کرے۔ اس کا کچھ دیر پہلے والا مفادمانہ رویہ ایک دھوکا تھا اور شاید وہ جانچ رہا تھا کہ میں کتنے پانی میں ہوں۔ دوسری طرف وہ ڈر رہا تھا کہ میرے اغوا کا نہ جانے کیا رد عمل سامنے آئے۔ کالی کوٹھی کی تباہی نے اسے سمجھا دیا تھا کہ جوابی کارروائی میں ہم اس سے کسی طرح کم نہیں تھے۔ میں نے ہیلی کا پڑوالے واقعے کا حساب لینے کا بھی کہا تھا۔ وہ بجا طور پر مشکل میں تھا کہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے اگر وہ مجھے اکرم چشتی کے حوالے کرتا تو اس کا خلیا زہ بھی اسے بھگتنا پڑتا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ فاضلی کو واپس حاصل کرنے کے لیے بے تاب تھا۔ سوال یہ تھا کہ وہ فاضلی کے لیے اتنا بے تاب کیوں ہو رہا تھا؟ فاضلی ایسی کوئی بات جانتا تھا جو ہم اس سے اگلو لیتے تو یہ مرشد کے لیے اچھا نہیں ہوتا؟ یقیناً ایسی ہی کوئی بات تھی ورنہ مرشد کی اس طرح اپنے کسی آدمی کے لیے بے چینی میرے لیے نئی چیز تھی۔ آدمی اس کے لیے استعمال کی چیز تھے وہ ان کو ٹشو پیپر سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ جہاں تک فاضلی کا اس کے نطفے سے ہونے کا تعلق تھا تو مرشد جیسے عیاش آدمی کی ایسی نہ جانے کتنی اولادیں کہاں کہاں موجود تھیں۔ ظاہر ہے وہ ان کی پروا کرنے والا بھی نہیں تھا۔ مجھے اپنا یہ خیال درست لگا تھا کہ فاضلی کسی ایسی بات سے واقف تھا جو مرشد ہر صورت ہم سے چھپانا چاہتا تھا۔ اس کی واپسی کے لیے وہ اس حد تک چلا گیا کہ اس نے مجھے پکڑا لیا۔ جب کہ وہ جانتا تھا اس کا رد عمل آئے گا۔ مرشد کی آوازیں سن کر میں سوچ کی دنیا سے باہر آیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”شہباز تمہارے لیے یہ آخری موقع ہے اپنے آدمیوں سے بات کرو اور ان سے فاضلی کو چھوڑنے کو کہو۔“

میں وعدہ کرتا ہوں جیسے ہی فاضلی میرے پاس آیا میں تمہیں رہا کر دوں گا۔“

”خوشی سے مرنا جاتے جو اگر اعتبار ہوتا۔“ میں نے تلخی سے کہا۔ ”مرشد مجھے بے وقوف سمجھنا چھوڑ دو میں سویا زکھا کر سوجو تے کھانے کا قائل نہیں ہوں۔“

اس نے گہری سانس لی۔ ”تو تم یوں نہیں مانو گے۔ ٹھیک ہے اکرم یہ اب تمہارے حوالے ہے۔“

اس دوران میں اکرم چشتی ٹھٹھا ہوا میری پشت کی طرف آگیا تھا اور پوری طرح تیار تھا۔ مرشد کی بات سننے ہی میں نے کرسی اٹھنے کی کوشش کی تھی کہ میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اکرم چشتی نے کسی سخت چیز سے بڑا سخت وار کیا تھا۔ میں نیچے گر گیا اور ذہن پر کسی آکٹوپس کی طرح چھاتی تاریکی سے لڑنے لگا۔ اسی تاریکی میں مجھے مرشد کی آواز سنائی دی۔ ”یاد رہے اسے بظاہر کچھ نہیں ہونا چاہیے۔“

”فکر نہ کریں جناب عالی۔“ اکرم چشتی نے کہا۔ ”اسے خراش بھی نہیں آئے گی اور آپ کا مقصد بھی پورا

ہو جائے گا۔“

یہ آخری الفاظ تھے جو میں نے سنے اور اس کے بعد میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا تھا۔ بہت عرصے بعد میں اپنے بدترین دشمنوں کے قبضے میں آیا تھا اور آنے والا وقت میرے لیے نہ جانے کون سی مصیبتیں لانے والا تھا۔



مجھے ہوش آیا تو میں ایک غلیظ قسم کی کوٹھری کے کندے فرش پر یوں پڑا تھا کہ میرے جسم پر سوائے ایک انڈر ویئر کے اور کچھ نہیں تھا۔ رات ہو چکی تھی کیونکہ میں سردی محسوس کر رہا تھا۔ دن میں موسم خوشگوار ہوتا تھا لیکن رات کو کسی قدر خشکی ہو جاتی تھی۔ میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا اور جب میں نے سر اٹھانے کی کوشش کی تو اندریوں جھکڑ سے چلنے لگے کہ کوٹھری میری نظروں کے سامنے گھوم کر رہ گئی۔ اس کے ایک طرف لوہے کی سلاخوں والا دروازہ لگا تھا اور باہر سے کسی مدقوق سے بلب کی پہلی پیار روشنی اندر آرہی تھی۔ پہلی کوشش کے بعد میں نے سر کوٹھری کے سرد اور نرم فرش پر رکھ دیا اس سردی سے مجھے بہت سکون ملا تھا۔ چند منٹ بعد میں نے دوبارہ کوشش کی اور اٹھ بیٹھا۔ کوٹھری مشکل سے آٹھ بائی آٹھ فٹ کی تھی اور اس کی دیواریں سرخ اینٹوں سے بنی تھیں اوپر پکی چھت تھی۔ یعنی میں اس جگہ نہیں تھا جہاں مرشد نے مجھ سے ملاقات کی تھی۔

یہ شاید مرشد کا کوئی عقوبت خانہ تھا کم سے کم اس کوٹھری سے تو ایسا ہی لگ رہا تھا۔ میں ایک طرف دیوار سے ٹک لگا کر بیٹھ گیا اور دل میں سوچا کہ برے بھٹنے۔ مرشد نے اکرم چشتی کے حوالے کر دیا تھا۔ پولیس والے ویسے ہی ایسے تشدد کے ماہر ہوتے ہیں جس میں بندہ مرنے کے قریب ہو جاتا ہے لیکن اس کے جسم پر کوئی نشان نہیں آتا ہے۔ مرشد فاضلی کے لیے بے چین تھا اور میں اپنے ساتھیوں سے رابطہ کر کے اسے کمزوری کا تاثر دینا نہیں چاہتا تھا کم سے کم میں اتنی آسانی سے مرشد کی فرمائش پوری نہیں کر سکتا تھا۔ اس کوٹھری میں وقت کا اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا۔ بہ ظاہر یہ جگہ ہمہ وقت تاریک رہنے والی لگ رہی تھی کوٹھری میں کوئی روشن دان نہیں تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ رات ہو چکی تھی اور مجھے تقریباً پانچ گھنٹے بعد ہوش آیا تھا۔ میری حالت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اکرم چشتی نے تیاری کر لی تھی اور بس میرے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے سر کا درد کم ہو رہا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد مٹکی کی سی کیفیت بھی ہو رہی تھی مگر کچھ دیر بعد یہ کیفیت ختم ہو گئی۔ اب میں بہتر محسوس کر رہا تھا۔ پولیس کے ہاتھوں اغوا کی خبر فوراً ہی میرے ساتھیوں تک پہنچ گئی ہوگی اور اندم کے توسط سے انہوں نے معلوم کر لیا ہوگا کہ میں پولیس کی تحویل میں نہیں ہوں۔ اس کے بعد صرف مرشد رہ جاتا ہوگا اگر عبداللہ کے ساتھیوں کو اکرم چشتی کا پتا چل جاتا تو پھر وہ جان جاتے کہ یہ کارروائی مرشد کی ہے۔ ویسے پولیس کی موجودگی ہی یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہوتی۔ میں نے مرشد سے جھوٹ کہا تھا کہ فاضلی ذہنی لحاظ سے معطل ہو گیا ہے۔ اگرچہ اس کا امکان کم تھا کہ وہ اس بات کی تصدیق کر سکتا۔ براہ راست وہ میرے ساتھیوں سے نہیں لو جھ سکتا تھا اور اگر پوچھ لیتا تو وہ کون سا ٹھیک جواب دیتے۔ پھر مرشد نے اس اطلاع پر کسی خاص رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اسے فاضلی کی دماغی حالت سے زیادہ اس کی ہماری تحویل میں موجودگی کی فکر تھی۔ اسے نکالنے کے لیے وہ اس حد تک چلا گیا تھا کہ مجھے اٹھوایا تھا۔

جب میں نے مرشد سے پہلے فاضلی کے حوالے سے بات کی تو اس نے لاپرواہی ظاہر کی تھی۔ اس کا

اندازہ ایسا تھا جیسے فاضلی اس کا ایک عام گرگاہو جس کے ہونے یا نہ ہونے سے اسے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا ہے۔ اس کے بعد شاید حالات میں کوئی تبدیلی آئی اور مرشد فاضلی کو واپس حاصل کرنے کے لیے بے تاب ہو گیا۔ میں سوچ میں گم تھا کہ کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ سامنے ایک تنومند شخص موجود تھا اس نے پرانے زمانے کے جشی غلاموں کی طرح صرف شلوار پہن رکھی تھی اور اس کا اوپری جسم نگاہ تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ جشی نہیں تھا۔ ”باہر آ.....“ اس نے ”دے کر کہا۔

”تمہاری والدہ نے بلایا ہوگا مگر ابھی موڈ نہیں ہے۔“ میں نے اپنی جگہ سے ہلے بغیر کہا۔ ”کسی اور کو لے جاؤ۔“

ظاہر ہے اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور وہ خود غرا تا ہوا اندر آیا۔ جیسے ہی وہ نزدیک آیا میں نے دونوں ہاتھ زمین پر ٹپکتے ہوئے دونوں پاؤں بیک وقت اٹھا کر اس کی رانوں کے درمیان مارے۔ وار سخت اور نازک جگہ تھا اس کی غراہٹ دھاڑ میں بدل گئی اور پیٹ پکڑ کر واپس کوٹھری کے دروازے سے باہر جا کر لیکن اس سے پہلے میں اٹھا اکرم چشتی نمودار ہوا اور اس نے اپنے ہاتھ میں موجود عجب سے پستول کا رخ میری طرف کر دیا۔ ”مجھے پتا تھا تم ضرور حرامی پن کرو گے اس لیے میں تمہارا علاج بھی ساتھ لایا ہوں۔“

اس نے پستول کا ٹریگر دبایا تو میں بدک کر پیچھے ہوا فطری طور پر مجھے خیال آیا کہ اکرم چشتی مجھے گولی مار رہا ہے لیکن اس پستول سے پن نکل کر میرے سینے میں اتر گئی اس سے ایک باریک تار منسلک تھی۔ اگلے ہی لمحے میرا جسم جیسے زلزلے کی زد میں آ گیا اور میں اپنی جگہ گر کر بے بسی سے لرزنے لگا۔ خبیث اکرم چشتی نے مجھ پر کرنٹ مارنے والا آلہ آزمایا تھا۔ باہر ملکوں میں پولیس کے پاس اس قسم کے کرنٹ مارنے والے آلے موجود ہوتے ہیں لیکن پاکستان میں ابھی یہ پولیس کو مہیا نہیں کیا گیا ہے۔ وہ ویسے ہی ملزم کو کرنٹ لگانے کے ماہر ہوتے ہیں۔ اکرم چشتی نے اپنے طور پر حاصل کیا تھا یا مرشد نے اسے مہیا کیا تھا۔ فاضلی کے آنے کے بعد سے مرشد کے آدمیوں کے پاس بھی جدید قسم کے غیر روایتی ہتھیار نظر آنے لگے تھے۔ مشتعل جلاد نے کوٹھری میں ہی میری گوشالی کی کوشش کی لیکن اکرم چشتی نے اسے روک دیا۔ ”اسے ہاتھ لگانے کی کوشش مت کرنا ورنہ کرنٹ کا اثر ختم ہو جائے گا اور یہ اپنی جگہ تمہیں لٹا دے گا۔“

”اس کی تو.....“ جلاد نے کہا لیکن اس نے اکرم چشتی کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے مجھ پر تشدد سے گریز کیا اور جبکہ کر مجھے اٹھا کر آنے کی بوری کی طرح شانے پر لا دیا اس سے پہلے اکرم چشتی نے تار کھینچ لیا تھا میرے سینے سے پن نکل گئی۔ ان دونوں کے علاوہ ایک شخص اور تھا اور وہ شاید اس جیل کا نگران تھا کیونکہ اس نے کوٹھری کے دروازے کو بند کر کے تالا لگا دیا تھا۔ ویسے وہ صرف نگران تھا۔ مجھول سا اور شاید چرہ تھا۔ اپنا کام کر کے وہ کسی ردیوٹ کی طرح چل ہوا مخالف سمت چلا گیا۔ جلاد مجھے ایک ہال نما کمرے میں لایا جس کا فرش کچا تھا۔ اس نے مجھے جھٹکے کے انداز میں زمین پر ڈال دیا۔ پھر لوہے کا ایک کڑا میرے دائیں ہاتھ میں اور دوسرا کڑا بائیں ہاتھ میں ڈال دیا ان سے درمیانے درجے کی زنجیر منسلک تھی لیکن یہ بھی اتنی مضبوط تھی کہ میں کسی صورت اسے نہیں توڑ سکتا تھا۔ پھر اس نے ایک کونے میں جا کر کچھ کیا تو کسی مشین کی گڑگڑاہٹ کی آواز آئی اور زنجیریں کھینچنے لگیں۔ ساتھ ہی میں بھی کھینچنے لگا اور اوپر اٹھتا چلا گیا۔ میرا جسم شاک کے اثر سے نکل کر کسی حد تک میرے

قابو میں آگیا تھا لیکن میں مزاحمت کے قابل نہیں تھا اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ آنے والے لمحات میں مجھے بہت کچھ برداشت کرنا تھا اور میں ابھی سے خود کو اس کے لیے تیار کر رہا تھا۔ ذرا دیر میں مشین نے زنجیروں کو اتارنا کھینچ لیا کہ میں عملاً ہوا میں معلق ہو گیا اور میرے دونوں پاؤں بمشکل ہی زمین کو چھو رہے تھے۔ جلاد نے مشین بند کر دی اور واپس آیا۔

اکرم چشتی اس دوران میں بڑے مسائل سے سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کا رویہ اس مافیاباس کا سا تھا جس نے سب کچھ اپنے گروگوں پر چھوڑ دیا ہوا اور اب اس کے پاس فراغت ہی فراغت ہو۔ میں زنجیروں سے لٹکا ڈھیلے ڈھالے انداز میں جھول رہا تھا اس لیے اکرم چشتی بے خطر میرے پاس چلا آیا اس نے دھواں میرے منہ پر چھوڑا اور استہزائیہ انداز میں بولا۔ ”اور ملک صاحب کیسا لگ رہا ہے۔“

اس کا جواب میں نے عملاً دیا اور اچانک ہی دونوں پاؤں اوپر کرتے ہوئے انہیں اکرم چشتی کی گردن میں ڈال دیا۔ وہ اس حملے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا ورنہ میرے پیروں کا بھی کوئی بندوبست کر کے میرے پاس آتا۔ گردن میں قہقہے لگاتے ہی میں نے اسے جھٹکا دینے کی کوشش کی لیکن اتنی دیر میں وہ ہوشیار ہو گیا تھا اس نے دونوں ہاتھ سے میرے پاؤں پکڑ لیے اور گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔ ”مجھے..... چھڑاؤ۔“

جلاد لپک کر آیا اور اس نے عقب سے میری کمر پر گردے والی جگہ پوری قوت سے کئے مارے۔ اس کے ہاتھوں میں واقعی بہت جان تھی دوسرے کئے پر میرا سانس رکنے لگا اور چوتھے کئے پر میں نے مجبوراً اکرم چشتی کو چھوڑ دیا۔ اسے بس ایک دو لمبے کی مہلت مل گئی تھی ورنہ میں اس کی گردن توڑنے یا اسے ایسا جھٹکا دینے میں کامیاب ہو جاتا کہ اسے قبر میں نہیں تو پھر اسپتال میں ہی ہوش آتا۔ مگر اس کی قسمت اچھی تھی۔ آزاد ہوتے ہی وہ جلاد پر برس پڑا تھا حالانکہ اس نے عقل سے کام لے کر اکرم چشتی کی جان بچائی تھی اگر وہ اسے احمقانہ انداز میں آزاد کرانے کی کوشش کرتا تو اس کا پورا امکان تھا کہ اکرم چشتی کی لاش ہی میرے پیروں سے آزاد ہو پاتی لیکن اس نے بالکل صحیح جگہ وار کر کے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اسے چھوڑ دوں۔ مگر اکرم چشتی نے اپنی فطرت کے مطابق اچھائی کا صلہ برائی سے دیا۔ وہ اس کے خاندان کی عورتوں کو بگھارتے ہوئے چلا رہا تھا۔ ”ماں کے..... کتے کی اولاد..... اتنی دیر کی..... ابھی یہ تیرا باپ میری گردن توڑ دیتا۔“

جلاد اب پچھتا رہا تھا کہ اس نے مجھے اکرم چشتی کی گردن کیوں توڑنے نہیں دی۔ وہ ایک معمولی ملازم تھا اس لیے سر جھکائے اکرم چشتی کی گالیاں سنتا رہا۔ جب اس کی ہمزاس نگلی تو اس نے زوے خن میری طرف کیا اور ناقابل اشاعت الفاظ میں بتانے لگا کہ وہ اب میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ وہ سخت مشتعل تھا۔ اس نے جلاد کو حکم دیا۔ ”اس..... کے پیچھے باندھ دو۔“

وہ دو عدد زنجیروں سے منسلک کڑے اور لایا اور انہیں میرے پیروں میں ڈال دیا۔ یہ لاک نہیں ہوتے تھے بلکہ ہک تھے جنہیں دبا کر کھولا اور بند کیا جاسکتا تھا البتہ جسے پہنانے جاتے تھے وہ کسی صورت ہک نہیں دبا سکتا تھا۔ پھر اس نے کوئی دوسری مشین چلائی اور پاؤں والی زنجیریں پیچھے کی طرف کھینچ لگیں اور میرا جسم مکان کی طرح مزے لگا۔ جب اس نے موٹر روکی تو میرے دونوں پاؤں تقریباً میری کمر تک آچکے تھے۔ ریزہ کی ہڈی مکان بن چکی تھی اور پیٹ کے عضلات بری طرح کھینچ رہے تھے۔ اکرم چشتی میرے پاس آیا اور اس نے انتقامی

طاقت سے بھرپور کئی گھونٹے مسلسل میرے تنے پیٹ پر مارے اور یہ قیامت کے گھونٹے تھے۔ عام حالات میں مجھ پر ان کا خاص اثر نہیں ہوتا لیکن اس حالت میں یہ بہت زیادہ لگ رہے تھے میرے لیے سانس لینا بھی محال ہو گیا تھا۔ تکلیف سے میری آنکھوں میں پانی آگیا تھا۔

”کیسا لگ رہا ہے؟“ اکرم چشتی نے شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔ ”مزہ آ رہا ہے نا۔“ اس نے کہا اور پھر تین چار گھونٹے مارے۔

”بہت۔“ میں نے بمشکل کہا۔ ”میری جگہ آ کر دیکھو۔“

”تمہاری زبان اب بھی چل رہی ہے۔“ وہ بولا اور پھر مجھ پر ٹوٹ پڑا تھا۔ اس بار وہ اس وقت رکا جب خود اس کی حالت بری ہو گئی تھی۔ وہ کتے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ خود میری حالت یہ تھی کہ ہانپنا تو ایک طرف رہا مجھ سے سانس ہی نہیں لیا جا رہا تھا۔ اس بار جیج مجھ پر قیامت گزر گئی تھی۔ درد کے گولے تھے جو پیٹ سے اٹھ کر پورے جسم میں دوڑ رہے تھے۔ جب اکرم چشتی کا سانس قابو میں آیا تو اس نے جیج کر کہا۔ ”زنجیر اوراد پر کرو۔“ حکم کے غلام نے فوراً موٹر چلا دی اور میرے پاؤں والی زنجیر مزید اوپر کی طرف کھینچ لگی۔ میرا جسم مزید کمان ہونے لگا۔ اب جسم کا سارا زور ریزہ کی ہڈی پر تھا اور باؤ ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ اس دباؤ کو کم کر کے لیے میں نے ہاتھوں کے بل اوپر ہونا چاہا تو یہ بھی ناممکن ثابت ہوا کیونکہ دونوں ہاتھوں میں کوئی چارٹ کا فاصلہ تھا جسے کسی صورت کم نہیں کیا جاسکتا کڑے اس طرح سے کلائی میں فٹ تھے کہ میں ہاتھ گھما کر زنجیر بھی نہیں پکڑ سکتا تھا۔ ورنہ زنجیر پکڑ کر خود کو تھوڑا اوپر کر کے کمر کو آرام دے سکتا تھا۔ اکرم چشتی آگے آیا اور مجھے تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ ”کیسا لگ رہا ہے مزہ آ رہا ہے نا؟“

مرشد کی ہدایت کے برعکس وہ مجھے فاضلی کی رہائی پر آمادہ کرنے کے بجائے تشدد کا نشانہ بنا رہا تھا۔ اس نے اب تک ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس سے پتا چلے کہ اسے فاضلی کی رہائی سے کوئی دلچسپی ہے۔ اگر میرے ہاتھ پاؤں کھلے ہوتے تو اس وقت میرا اکرم چشتی کی گردن مروڑنے کو دل چاہ رہا تھا میں اس آدمی پر اپنے الفاظ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے میں نے وہ کیا جو میرے بس میں تھا میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ اس نے مشتعل ہو کر مجھے اتنی قوت سے تھپتھپا کر کہ ہر تھپتھپ پر میرا منہ گھوم جاتا تھا۔ پھر اس نے اچانک میرے جسم کے زیر ناف حصے کو جکڑ لیا اور میں تڑپ کر رہ گیا۔ وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ ”اب بول..... کیسا لگ رہا ہے..... مزہ آیا..... بول..... بول..... بولنا کیوں نہیں ہے۔“

میں کیا بولتا میں تو تڑپ بھی نہیں سکتا تھا۔ مجرد کا مرکز بدل گیا تھا۔ مجھے ذہنی اذیت دینے کے لیے وہ موتا اور سویرا کے بارے میں بکواس کرنے لگا۔ وہ بتا رہا کہ میرے بعد وہ بھی یہاں آئیں گی اور وہ ان کے ساتھ میرے سامنے کیا سلوک کرے گا۔ میں درد برداشت کرتے ہوئے اس کی بکواس بھی نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ خود کو صبر کی تلقین کر رہا تھا اور سمجھا رہا تھا کہ کتنا بھوک رہا ہے کیونکہ اس کا کام ہی بھونکنا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ کا دباؤ کبھی کم کر دیتا تھا اور کبھی اچانک بڑھا دیتا۔ خدا خدا کر کے اس کی یہ اذیت رسائی ختم ہوئی۔ اس کا گندہ منہ بھی بند ہو گیا۔ میرے جسم پر پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا اور اذیت سے بار بار میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ چند منٹ میں میرا گلا اور زبان خشک چڑے جیسے ہو گئے تھے۔ مگر یہاں پانی ملنے کا کوئی امکان نہیں

تھا۔ یہ تو اذیتوں کا آغاز تھا آگے مجھے اس سے کہیں زیادہ برداشت کرنا پڑا تھا۔

اکرم چشتی ایک کرسی پر ڈھیر سستار ہاتھ اور ساتھ ہی سگریٹ کے گہرے کش لے رہا تھا۔ پیٹ پر لگنے والی ضربوں کی وجہ سے مجھے متلی کی کیفیت ہونے لگی اور جب دھواں مجھ تک آیا تو یہ کیفیت مزید بڑھ گئی اور میں نے الٹی کر دی۔ مجھے کھانا کھائے ہوئے اٹھ نو گھنٹے ہو چکے تھے اس لیے معدہ تقریباً خالی تھا۔ میں ابکائیاں لیتا رہا اور کچھ نکلا نہیں۔ جب میری حالت کسی قدر سنبھل گئی تو وہ اٹھ کر پاس آیا لیکن اتنا قریب نہیں آیا کہ میں اس پر قہقہہ سکتا حالانکہ اب اس پر قہقہے کے لیے میرے منہ میں لعاب تو تھا نہیں بالکل خشک ہو رہا تھا میرا منہ۔ اس نے وہی بات کی جو میرے ذہن میں تھی۔ ”یہ آغاز ہے..... بہتر۔ مرشد بادشاہ کی بات مان لو۔“

”کون سی بات مان لوں۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے میرے ساتھی صرف میرے کہنے سے فاضلی کو نہیں چھوڑیں گے وہ خود مرشد سے سودا کریں گے اور اپنی شرائط پر فاضلی کو اس کے حوالے کر دیں گے۔“

”بکواس مت کرو تم ان کے سرغندہ وہ تہیاری بات کیسے ٹال سکتے ہیں؟“

”ہم میں کوئی کسی کا سرغندہ نہیں ہے ہم سب ساتھی ہیں اور سارے فیصلے مل کر کرتے ہیں۔“

اس نے میرے بال متلی میں جکڑے۔ ”اگر تمہاری جان خطرے میں ہو تو وہ تب بھی نہیں مائیں گے؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں وہ کیا فیصلہ کریں گے۔ مرشد سے کہو ان سے براہ راست بات کر لے۔ مجھ پر تشدد کرنے کا اسے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“

جلاد ایک کونے میں کھڑا تھا اکرم چشتی نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور میرے کان کے پاس منہ لا کر بولا۔ ”اسے ہو یا نا ہو مجھے تو ہوگا کب سے میری خواہش تھی تم میرے ہاتھ آؤ اور میں تمہیں تڑپا تڑپا کر مار دوں۔“

”تو تم اپنی خواہش پوری کر رہے ہو اور مرشد کے حکم کی تمہارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔“ میں نے جان بوجھ کر بلند آواز سے کہا اکرم چشتی کے رویے نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ جلاد اصل میں مرشد کا آدمی ہے اور یقیناً یہ جگہ بھی مرشد کی تھی۔ مجھے یاد ہے ایک بار میں مرشد ہاؤس یا اس کے کسی اور ٹھکانے کے نیچے موجود مرشد کی ٹی جیل میں رہ چکا تھا لیکن وہ جگہ دوسری تھی اس بار مجھے کہیں اور لایا گیا تھا۔ میری بات سن کر جلاد چونکا تھا۔ مگر اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی تھی۔ اکرم چشتی نے دانت پیسے۔

”تم اس حالت میں بھی اپنی حرازدگی سے باز نہیں آ رہے ہو۔“

”تم مرشد کو دھوکا دے رہے ہو اس نے تمہیں یہ سب کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ اگر مجھے نقصان ہو تو مرشد کو بھی نقصان ہوگا اور یہ تمہاری وجہ سے ہوگا۔“

”اس کتے کا منہ بند کرو۔“ اکرم چشتی نے غضبناک ہو کر جلاد کو حکم دیا اور اس نے قہقہہ کرتے ہوئے ٹاٹ کا ایک ٹکڑا زبردستی میرے منہ میں ٹھونس دیا اس سے نہایت ناگوار ہوا تھا وہی تھی۔ پھر اکرم چشتی نے اس سے کہا۔ ”اسے تار لگاؤ۔“

تار لگانے کا مطلب میں اس وقت سمجھا جب جلاد نے میرے پیروں پر بجلی کی ٹنگی تار پیٹ دی۔ میرے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی تھی وہ مجھے کرنٹ سے اذیت دینے جا رہے تھے۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتا تھا اور اگر کہہ سکتا تب بھی کوئی فائدہ نہیں تھا اکرم چشتی وہی کرتا جو اس کے دل میں تھا۔ میں خود کو اس اذیت کے لیے تیار کرنے

لگا۔ اس نے جلاد کی طرف دیکھ کر سر ہلایا اور اس نے بجلی کا سوئچ آن کر دیا میرے جسم کو شدید جھٹکا لگا اور بجلی میرے جسم میں چبھے آگ اور تیزاب بن کر دوڑنے لگی۔ میں مستقل جھٹکے کھا رہا تھا اور ہر جھٹکے پر جیسے جان نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ دنیا کی کوئی اذیت ایسی جان لیوا نہیں ہوتی ہے جو بجلی کی اذیت سے بڑھ کر ہو۔ آدمی کے جسم کا ایک ایک ریشہ جیسے جل جاتا ہے اور ہر رگ اور پٹھانچ کر تڑخ جاتا ہے۔ نہ جانے یہ دور کتنا طویل تھا ایک منٹ یا ایک گھنٹا لیکن جب اکرم چشتی کے اشارے پر جلاد نے سوئچ آف کیا تو مجھے لگنا نہ جانے کتنے عرصے بعد مجھے اس اذیت سے نجات ملی تھی۔ اس بار پسینہ یوں بہہ رہا تھا کہ باقاعدہ نیچے مٹی پر گر رہا تھا اور میرے جسم سے جیسے آگ نکل رہی تھی۔ گلا اور منہ پہلے بہت بہتر حالت میں تھا لیکن اب لگ رہا تھا اس میں جلتی ہوئی خشک ریت بھردی گئی ہو۔ میں مردہ حالت میں زنجیروں سے بندھا جھول رہا تھا۔ اکرم چشتی میری حالت سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور غالباً سوچ رہا تھا کہ اب میری اذیت کا عیاں سامان کرے۔ مجھ میں بولنے تو کیا سوچنے کی ہمت بھی نہیں رہی تھی۔

”کیا خیال ہے شہباز مرشد بادشاہ کی بات مانو گے یا.....“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اس نے پھر جلاد کو اشارہ کیا اور اس بار بے ہوشی نے مجھے اذیت سے بچا لیا تھا۔ جھٹکوں کا آغاز ہوتے ہی میں ہوش دھواں سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ مجھے ہوش آیا تو میں کچے فرش پر پڑا تھا۔ زنجیریں اس حد تک ڈھیلی کر دی گئی تھیں کہ میں زمین پر آ گیا تھا۔ اکرم چشتی ایک طرف کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور جلاد بجانب تھا۔ میرا چہرہ گہلا تھا شاید ہوش میں لانے کے لیے میرے منہ پر پانی پھینکا گیا تھا۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر مٹی کے چند قطرے جذب کر لیے یہ چند قطرے ہی اس وقت نعمت عظیم سے کم نہیں تھے۔ جو میرے منہ کے پیاسے صحرا میں یوں غائب ہو گئے جیسے بارش کے چند چھینے صحرائے اعظم میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے ہیں۔ اکرم چشتی مجھے ہوش میں آتے دیکھ رہا تھا لیکن وہ سکون سے اپنی جگہ بیٹھا رہا تھا اسے معلوم تھا اول تو مجھ میں کچھ کرنے کی ہمت نہیں تھی دوسرے زنجیریں بس اس حد تک ڈھیلی کی گئی تھیں کہ میں زمین پر آ گیا تھا اگر میں کھڑا ہو جاتا تب بھی چند قدم سے زیادہ حرکت نہیں کر سکتا تھا۔

جلاد کہیں گیا ہوا تھا وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ربر پائپ چڑھے منبوط فولادی پائپ تھے۔ اس نے پائپ ایک طرف رکھے اور مجھے کڑوں سے آزاد کر کے گھسیٹ کر ایک لکڑی کے تخت پر لٹا دیا۔ اس میں ہاتھ اور پیروں کو پھنسانے والے فکس کڑے تھے اس نے میرے ہاتھ پاؤں ان میں پھنسا کر مجھے بالکل بے دست و پا کر دیا تھا۔ اب شاید مجھے ربر چڑھے فولادی پائپوں سے پٹنا جاتا۔ اپنا کام کر کے اس نے پائپ اٹھائے اور اکرم چشتی کی طرف دیکھا جو سگریٹ کے کش لیتا ہوا میری طرف آیا اور اس نے اچانک ہی سگریٹ کا جلتا سرا میرے سینے سے لگا دیا اور اس وقت تک لگائے رکھا جب تک وہ بجھ نہیں گیا۔ جسم دیسے ہی درد کا سمندر بنا ہوا تھا اس لیے اس سمندر میں ایک چھوٹا دریا اور گرتا تو اس سے کیا فرق پڑتا اسی طرح مجھے سگریٹ سے جلنے کی اذیت کا پتا بھی نہیں چلا تھا۔

”پانی ڈالو اس پر۔“ اکرم نے حکم دیا۔ ”لیکن منہ پر مت ڈالنا..... اس کے منہ کے لیے میں نے خاص پانی رکھا ہے۔“

معروف مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی نے خون کے اس قطرہ فساد کے لیے جو انسان کو قتل کی طرف لے جاتا ہے فرمایا ہے کہ وہ ان کی زبان میں تھا تو کچھ ایسا ہی معاملہ میرے ساتھ بھی تھا۔ تکلیف کے باوجود میں بولنے سے باز نہیں آیا تھا۔ ”تم خود بھی شاید اسی خاص پانی کے عادی ہو۔“

اکرم چشمی سفاکی سے مسکرایا۔ ”مجھے معلوم ہے تم میں بہت دم غم ہے اور مجھے اس کی خوشی ہے اگر تم اتنی جلدی ہار مان جاتے تو مجھے ہاپوی ہوتی اب میں اپنے دل کی حسرتیں نکال سکوں گا۔“

نہ جانے کتنی دیر کمر کے بل لٹکے رہنے اور بجلی کے جھٹکے کھانے کے بعد اب مجھے ذرا سکون تھا لیکن میں جانتا تھا یہ سکون عارضی تھا۔ عذاب کا نیا دور شروع ہونے والا تھا۔ اس سختی پر باندھ کر کسی نئی مشق ستم کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ جب جلاد اور اکرم چشمی نے ربر چڑھے لوہے کے پائپ سنبھالے تو میں تیار ہو گیا۔ اکرم چشمی نے گھٹنے پر ہلکی سی ضرب لگائی۔ ”اب مزہ آئے گا جب میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے تکلیف دوں گا۔“

اس کے اشارے پر جلاد نے پہلے ضرب لگائی اور اس کا نشانہ میرے بائیں پاؤں کا تھا۔ میں تڑپنا چاہتا تھا لیکن تڑپ نہیں سکا تھا۔ کڑوں نے پوری طرح جکڑ رکھا تھا فوراً ہی اکرم چشمی نے دوسری ضرب لگائی۔ اس نے زیادہ قوت استعمال کی تھی۔ پھر ان دونوں کے ہاتھ مشینی انداز میں چلنے لگے۔ پاؤں کے ٹکڑے پر کٹنے والی ضرب کا اثر میرے دماغ تک آتا تھا۔ میرے اعصاب ترخنے لگے۔ کچھ دیر تو میں برداشت کرتا رہا پھر تکلیف مہری برداشت سے باہر ہوئی تو میں چلانے لگا۔ اکرم چشمی ہنسا۔

”تمہاری جینیں سن کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔“

اس کی بات سن کر میرا دماغ الٹ گیا تھا۔ میں اسے ماں بہن کی گالیاں دینے لگا اور ایسی دھمکیاں دینے لگا جن پر عمل کرنا فی الحال میرے بس کی بات نہیں تھی۔ اسی طرح چلاتے اور بولتے ہوئے نہ جانے کب مہربان بے ہوشی نے اپنے قبضے میں کر لیا۔ یہ لمبی بے ہوشی نہیں تھی جلاد نے پانی کا گلاس میرے منہ پر ڈالا تو میں جھرجھری لے کر ہوش میں آ گیا اور بے اختیار کر اپنے لگا۔ بیروں میں قیامت کا درد ہو رہا تھا لیکن جلاد اور اکرم چشمی نے اس کی پروا کیے بغیر مجھے زبردستی اٹھایا اور چلانے لگے۔ میں انہیں برا بھلا کہہ رہا تھا۔ میں جانتا تھا یہ ضروری تھا اس طرح چلنے سے میرے بیروں میں جم جانے والا خون پھر سے رواں ہو جاتا ورنہ یہ خون مستقل جم جاتا تو میں چلنے سے معذور بھی ہو سکتا تھا۔ وہ دس پندرہ منٹ مجھے اسی طرح چلاتے رہے حتیٰ کہ ٹکڑوں کی تکلیف کم ہونے لگی۔ پھر جلاد ایک بالٹی میں گرم پانی لے آیا اور مجھے اس میں پھر رکھنے کو کہا تو میں نے لات مار کر بالٹی الٹ دی۔ ”اپنی مہربانیاں اپنے پاس رکھو۔“

پانی کے چھینٹے اڑ کر اکرم چشمی تک گئے تھے اس نے پولیس نصاب کی چند منتخب گالیاں دیں اور جلاد کو حکم دیا۔ ”اسے زنجیروں سے باندھ دو۔“

میں نے مزاحمت کی واجبی سے کوشش کی مگر جلاد نے نہایت آسانی سے میرے ہاتھ کڑوں سے باندھ دیے اور پھر موٹر چلا کر زنجیر کو سمجھایا اب میں کھڑا ہوا تھا اور اگلے مرحلے کا سوچ کر میری روح فنا ہو رہی تھی جب وہ میرے پیر بھی باندھے اور مجھے پھر سے کڑی کمان بنا دیے۔ مگر جلاد نے صرف ہاتھوں میں کڑے ڈالے تھے۔ اکرم چشمی نے اسے تار لگانے کو کہا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے اب تک میں جو تکلیفیں برداشت کی

تھیں ان میں کرنٹ سب سے زیادہ اذیت ناک تھا۔ جیسے ہی جلاد نے سوچج آن کیا میں جاڑے کے بخار کے مریض کی طرح لرزنے لگا تھا۔



مجھے ہوش آیا تو میں کوٹھری میں پڑا ہوا تھا۔ میرا جسم ایسا ہو رہا تھا جیسے اس میں ہڈیاں باقی نہ ہوں اور میں صرف نرم گوشت کی کوئی جیلی فش قسم کی مخلوق بن کر رہ گیا ہوں۔ اس نرم گوشت میں تکلیف لہروں کی طرح دوڑ رہی تھی۔ درد جیسے ریٹے ریٹے میں سرایت کر گیا تھا۔ میں نے سنا ہے کہ موت کی تکلیف کچھ ایسی ہوتی ہے جیسے کانٹے دار جھاڑی میں الجھ جانے والے نازک کپڑے کو یک دم کھینچ لیا جائے اور وہ لیر لیر ہو جائے۔ اگرچہ یہ موت کی تکلیف نہیں تھی لیکن میں کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا تھا۔ اس عقوبت خانے میں آج مجھے دودن ہو گئے تھے لیکن یہ دو دن دو صدیاں بن کر گزر رہے تھے جب میں نے اکرم چشمی اور مرشد کے جلاد کے سوا کسی کو نہیں دیکھا تھا اور انہوں نے مجھ پر ہر وہ ستم توڑا تھا جس کا نشانہ میرے جسم پر نہ آئے لیکن وہ آزار بن کر میری رگ و پے میں اتر جائے۔

ان دودنوں میں اکرم چشمی نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا اسے صرف اذیت دینے سے غرض تھی۔ بعض اوقات وہ اتنی کال بے حس سے مجھ پر تشدد کرتا تھا جیسے میں انسان نہیں کوئی پتھر یا کسی درخت کا بے جان تناہوں جس میں درد محسوس کرنے کی حس نہیں ہوتی ہے۔ میرا چمٹنا اور کرنا اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا لیکن نہیں، معنی رکھتا تھا میری جینیں اور کراہیں اس کے لیے اضافی انعام ہوتی تھیں۔ مجھ پر مشق ستم کر کے اسے جو خوشی ملتی تھی وہ دو گنی ہو جاتی تھی۔ ان دودنوں میں تکلیف برداشت کرنے کے علاوہ میں نے جو واحد کام کیا تھا وہ دل میں کیا جانے والا عہد تھا جسے میں نے بار بار دہرایا کہ اگر مجھے موقع ملا تو میں اکرم چشمی کو اتنی ہی اذیت دوں گا۔ یہ بات میں نے اسے بتا بھی دی تھی لیکن اس کے لیے اس دھمکی کی بھی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

پہلے دن کئی گھنٹے بعد جب مجھے کوٹھری میں واپس لایا گیا تو میں اپنے بیروں پر جل بھی نہیں پار تھا اور جلاد مجھے صیغتا ہوا لایا تھا۔ میں کپے فرش پر پڑتے ہی ایسا غافل ہوا کہ مجھے سول گھنٹے بعد ہوش آیا۔ یہ بات مجھے جلاد نے بتائی ورنہ یہاں وقت کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ اس نے مجھے اٹھا کر وال چاول کا ایسا آمیزہ کھانے کو دیا جسے شاید جانور بھی کھانے سے انکار کر دیں لیکن میں نے بے تابی سے کھایا کیونکہ جسم کے تکلیفوں کے ساتھ اب بھوک بھی اذیت دینے لگی تھی۔ چوبیس گھنٹے بعد مجھے صرف ایک گلاس پانی دیا گیا تھا۔ مسلسل پسینہ بننے سے میں ڈی ہائیڈریشن کا شکار ہو گیا تھا۔ میری جلد سڑ گئی تھی اور یہ خشک کاغذ جیسی ہو رہی تھی۔ کھانے کے چند گھنٹے بعد جلاد مجھے دوبارہ اسی جگہ لایا۔ اس بار اکرم چشمی نے ایک کیمرے کا بندوبست بھی کیا تھا جو مجھ پر کیے جانے والے تشدد کو ریکارڈ کرتا اور یہ ریکارڈنگ یقیناً میرے ساتھیوں کے لیے تھی۔ دوسرے دن بھی وہی سب دہرایا گیا۔ پانچ گھنٹے میں نے طویل ترین عذاب میں گزارے۔ جب میں آخری بار بے ہوش ہوا تو پھر مجھے کوٹھری میں ہوش آیا تھا نہ جانے کس وقت مجھے لاکر یہاں پھینک دیا گیا تھا۔

کوٹھری کے باہر وہی پیلا ننھوس روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ میں نے سر گھما کر دیکھا تو ایک کونے میں دو پیالے رکھے نظر آئے۔ ان میں سے ایک میں پانی تھا۔ میں بے تابی سے اٹھا اور اس وقت اپنی تکلیف بھول کر پیالے کی طرف بڑھا لیکن پانی پینے سے پہلے مجھے خیال آیا اور میں نے پورا پیالہ خالی کرنے کی خواہش پر پیش قدمی

چاہے اس کوشش میں وہ مجھے کرنٹ ہی کیوں نہ لگا دے۔ مگر اس نے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔ آج اکرم چشتی نہیں تھا۔ شاید اسے فرصت نہیں ملی تھی یا وہ کسی اور ضروری کام میں مصروف تھا۔ اس لیے صرف جلا دیا تھا۔ مگر خلاف توقع اس نے مجھے عقوبت خانے کی طرف لے جانے کے بجائے راہداری میں مخالف سنت چلنے کو کہا۔ میرے جسم پر بدستور وہی انڈر ویئر تھا اور یہ بھی اب نہایت میلا ہو گیا تھا۔ جلا دمجھے ایک کمرے میں لایا۔ یہ پکی اینٹوں والے فرش کا غسل خانہ تھا کیونکہ وہاں نہانے دھونے کا مکمل انتظام تھا۔ وہاں گرم اور ٹھنڈے پانی کی لائینیں تھیں۔ ایک طرف کھوئی پر تولیہ اور صاف سترا شلوار قمیص لٹکا ہوا تھا۔

”لے بھی اپنا آخری غسل خود کر کے یہ کفن پہن کر تیار ہو جا، ہم نے بس مٹی ڈالنی ہے اپنے لیے دعا بھی خود کہہ جانا۔“ جلا نے اپنی طرف سے مذاق کیا تھا۔

”تم جس طرح میرے ساتھ ساتھ پھر رہے ہو لگتا ہے مرشد قبر میں بھی میرے ساتھ ہی ڈالے گا۔ میں بہت گناہ گار ہوں لیکن اتنے بڑے عذاب کا مستحق نہیں ہوں کہ تم وہاں بھی میرے ساتھ ہی رہو۔“ میرا مذاق اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا اس نے غرا کر کہا۔ ”بکواس نہ کر جلدی نہادھو لے ورنہ ایسے ہی لے جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے لیکن اب تم تو دفع ہو۔ کیا مجھے غسل بھی دو گے۔“

وہ مجھے گھورتا ہوا بارہا چل گیا۔ دروازے میں معمولی سی چٹنی تھی جسے ایک ایک دھکے میں توڑا جاسکتا تھا اس کا صرف یہ فائدہ تھا کہ کوئی اچانک اندر نہیں آسکتا تھا۔ میں اپنا واحد لباس اتار کر حالتِ فطرت میں آیا اور گرم پانی والا وال کھول کر شاور کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ گرم پانی نے میرے جسم کے درد پر جیسے جادو اثر کیا تھا۔ جسم سے میل کے ساتھ ساتھ درد بھی خُجڑ کر نکلنے لگا۔ پندرہ منٹ بعد میں نہادھو کر تازہ دم ہو گیا تھا۔ شلوار قمیص پرانا لیکن صاف ستھرا تھا۔ اسے پہن کر میں نے خود کو دوبارہ سے انسان محسوس کیا تھا جب تک انسان کے جسم پر لباس ہوتا ہے اس کی عزت نفس اس کی اپنی نظروں میں برقرار رہتی ہے لیکن جب لباس اتار لیا جاتا ہے تو انسان سب سے پہلے اپنی نظروں میں ذلیل ہو جاتا ہے۔ میں باہر آیا تو جلا غائب تھا اور اس کی جگہ ایک اساتر اور خوش شکل نوجوان کھڑا تھا لیکن اس کے ہاتھ میں وہی کرنٹ مارنے والا پستول تھا۔ میں اسے دیکھ کر ٹھنکا۔

”غائب تم نے جلا دھو؟“

وہ مسکرایا۔ ”نہیں جناب میں مرشد صاحب کا سیکرٹری ہوں۔“

اس کے شائستہ لہجے نے مجھے چونکا دیا کیونکہ یہ لہجہ اور آواز میرے لیے نا آشنا نہیں تھیں میں نے کہا۔ ”تم وہ ٹیلی فون آپریٹر ہو جو مرشد ہاؤس میں کال ریسیو کرتے تھے۔“

”آپ نے خوب پہچانا..... اس طرف آئیے۔“ اس نے راہداری میں مزید آگے کی طرف اشارہ کیا اور خود میرے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ صاف ظاہر تھا وہ کوئی رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ ایک جگہ بیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں اور یہاں ایک بھیاں تکسم کا گوریلانا آدمی موجود تھا اس نے بہت بڑی سی رائفل اٹھا رکھی تھی۔ نوجوان کو وہ پہچانتا تھا لیکن میں اس کے لیے الجھی تھا اس نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟“

”مرشد کا قیدی ہے اس نے طلب کیا ہے۔“ مجھ سے آپ جناب کرنے والے نوجوان نے خلاف توقع

قابو پاتے ہوئے پانی گھونٹ گھونٹ کر کے پینا شروع کیا۔ یہ خاصا بڑا پیالہ تھا نصف پیالہ ہی کر میں نے دوسرے پیالے کی طرف توجہ دی اس میں دلیہ تھا۔ اپنی تمام تر شکستہ حالی کے باوجود میں اس پر ٹوٹ پڑا تھا۔ دلیہ کھا کر میں نے باقی نصف پیالہ بھی پی لیا اور پھر یک لخت نقاہت کا شدید حملہ ہوا تھا۔ یہ بہت دیر بعد پیٹ میں کچھ جانے کا فطری ردِ عمل تھا۔ میں نڈھال ہو کر لیٹ گیا۔ کچھ دیر جاگنے کی کوشش کرتا رہا لیکن پھر نیند نے مجھے شکست دے دی۔ نہ جانے میں کتنی دیر سوتا رہا پھر اچانک کسی نے میرے پیروں پر ٹھوکر ماری۔ ”ٹھٹھ نواب صاحب کی اولاد کیسے مرے سے پڑا سو رہا ہے۔“

میں نے آنکھ کھول کر ٹھوکر مارنے والے کو دیکھا۔ وہ جلا تھا۔ میں نے کہا۔ ”اگر تمہیں اعتراض ہے تو آکر میری جگہ سو جاؤ تمہیں پتا چل جائے گا کہ کتنے مرے سے سو رہا ہوں۔“

پانی اور خوراک کے ساتھ آرام نے میری جسمانی حالت کو پہلے سے بہتر کر دیا تھا تکلیف اب بھی تھی لیکن یہ قابلِ برداشت تھی میرے جواب پر اس کے تاثرات بگڑ گئے تھے۔ ”ٹھٹھ جا..... آج تیرے ساتھ تیسرا ڈنڈ ہو گا۔“

”تیسرا ڈنڈ۔“ میں نے سوچا۔ ”یعنی آج تیسرا دن ہو گیا تھا۔“

میں نے اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر کہا۔ ”تم لوگ سطوں میں مارنے کے بجائے ایک ہی بار میرا خاتمہ کیوں نہیں کر دیتے ہو؟“

”وہ بھی کریں گے جب مرشد بادشاہ کا حکم ہوگا۔ ابھی تو اتنا ہی کرتا ہے جتنا اس نے حکم دیا ہے۔“

بہ ظاہر یہ تشدد میری سمجھ سے باہر تھا۔ اگر انہوں نے یہ کام اس لیے کیا تھا کہ مجھے فاضلی کی رہائی کے لیے اپنے ساتھیوں سے بات پر آمادہ کر سکیں تو اس کی انہوں نے خاص کوشش نہیں کی تھی اکرم چشتی اور اس جلا کا سارا زور مجھے زیادہ سے زیادہ تکلیف دینے پر تھا۔ اگرچہ اکرم چشتی نے کہا تھا کہ وہ اپنی تسکین کے لیے مجھے تکلیف دے رہا ہے لیکن اس کی یہ وضاحت میرے دل کو زیادہ نہیں لگی تھی وہ اس کھیل کو اتار لیا نہیں کرتا اور جلد از جلد مجھے زیادہ سے زیادہ عذاب کے ساتھ مار دیتا۔ تو کیا یہ مرشد کا کھیل تھا اس کی خواہش تھی کہ مجھ پر اس طرح سے تشدد کیا جائے جس کا بہ ظاہر تو کوئی فائدہ نہیں تھا لیکن مکار مرشد اس سے کوئی فائدہ اٹھا رہا تھا۔ فی الحال میرا ذہن اس معاملے کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ گزشتہ روز میری ویڈیو بنی تھی۔ اگر مرشد نے وہ ویڈیو میرے ساتھیوں کو بھیجی تھی تو وہ ان سے کچھ بھی منوا سکتا تھا۔ وہ فاضلی کو رہا کر اسکا تھا اور چالاکی سے کام لیتا تو نادر کو بھی حاصل کر لیتا۔ یقیناً اس نے کوشش کی ہوگی۔ مگر اب تو اس کھیل کو ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ یہ منوں صورت جلا دکہ رہا تھا آج تیسرا ڈنڈ تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے اٹھائے گا لیکن اس نے چالاکی سے کام لیا اور پیچھے ہٹ کر وہی کرنٹ مارنے والا پستول نما آلہ نکال لیا۔ ”اٹھ جاؤ ورنہ پہلے ہمیں کرنٹ کھانا پڑے گا۔“

میں کرنٹ کھانے کے لیے بالکل بھی تیار نہیں تھا اس لیے بادل ناخواستہ کراہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ پہلے تو جی مجھے پکڑا گیا تھا اور میں دیوار سے ٹک گیا ورنہ شاید گر جاتا۔ جب نظر کے آگے سے دھند بھٹی تو میں لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھا۔ جلا نے مجھ سے فاصلہ رکھا تھا وہ پیچھے ہٹا اور کٹھری سے نکل گیا۔ میری خواہش تھی کہ اس کے اور میرے درمیان فاصلہ کم ہو تو میں اپنی ناتوانی کے باوجود اسے دبوچنے کی کوشش کروں

مرشد کا ذکر یوں کیا جیسے وہ آپس میں لنگوٹے یاد رہے ہوں۔ مگر گوریلے نے اس کا برا نہیں منایا اور مرشد کا نام سن کر اس نے راستہ چھوڑ دیا تھا۔ ہم اوپر آئے۔ ایک ایسی راہداری میں نکلے جس کے دونوں طرف کمرے تھے اور ان کمروں کے بند دروازوں کے پیچھے جو کھیل کھیلا جا رہا تھا اسے سوائے گندگی کے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ نشے میں ڈوبی حیوانیت سے بھرپور آوازیں باہر تک آرہی تھیں۔ سچ یہ ہے کہ مجھے اس جگہ سے گزرتے ہوئے یوں پسینہ آگیا جیسے میں خود کسی غلط ارادے سے یہاں آیا ہوں اور مجھے خوف ہے کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ نو جوان نے ان آوازوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ وہ ان کا عادی تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ خود بھی یہاں آتا ہو۔ ظاہر ہے یہ مرشد کے غلام تھے جو فارغ اوقات میں عیش کرتے تھے۔

میرا اندازہ تھا کہ ہم مرشد ہاؤس میں تھے اس کا مطلب تھا تہہ خانے کے بارے میں میرا اندازہ غلط تھا کہ وہ کہیں اور تھا۔ شاید پہلے مجھے تہہ خانے کے کسی اور حصے میں رکھا گیا تھا مرشد کی یہ جیل بھی بہت بڑی تھی۔ اگرچہ میں نے اپنے سوا ہاں کسی کو نہیں دیکھا تھا لیکن یہ بات یقینی تھی کہ وہاں مرشد کے اور مقرب بھی موجود تھے۔ مرشد اپنی مخصوص شاہانہ نشست گاہ میں میرا منتظر تھا۔ خلاف توقع وہ بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا اس نے مجھے اپنے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب میں بیٹھ گیا تو اس کے نو جوان سیکرٹری نے عقب میں پوزیشن سنبھال لی۔ وہ پوری طرح چوکنا تھا کہ میں کوئی حرکت کروں اور وہ پستول استعمال کر سکے۔ مرشد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”شہباز مجھے افسوس ہے.....“

میں نے اس کی بات کاٹی۔ ”اس میں افسوس کی کوئی بات نہیں ہے افسوس تو تم کرو گے جب میرا وقت ہو گا اور اگر تم چشتی اپنے پیدا ہونے پر پچھتائے گا۔“

”اسے میں سزا دوں گا اس نے میرے حکم کے خلاف.....“

”تمہارا حکم۔“ میں نے تنگی سے کہا۔ ”مرشد تم صاف کیوں نہیں کہتے کہ یہ سب تمہارے حکم پر ہوا ہے۔ میں نے تمہیں اتنا بزدل کبھی نہیں دیکھا۔“

اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ ”اس نے میرے حکم سے تمہادز کیا۔ میں نے اسے یہ سب کرنے کو نہیں کہا تھا۔“ میں نے گہری سانس لی۔ ”ٹھیک ہے جو مجھ پر گزرتا تھی وہ میں نے بھگت لی۔ اب تم کیا چاہتے ہو میں اپنے ساتھیوں سے اب بھی بات نہیں کروں گا۔“

”تمہاری بچت کی ایک ہی صورت ہے مجھے فاضلی واپس مل جائے زندہ سلامت اور ٹھیک ٹھاک۔“

”فرض کرو ایسا نہ ہوا تو.....؟“

”ایسا مت کہو۔“ وہ مضطرب ہو گیا۔ ”شہباز ملک تم بہت مشکل میں پڑ جاؤ گے۔“

”فاضلی کے لیے تمہارا یہ اضطراب سمجھ میں نہیں آتا ہے ٹھیک ہے وہ تمہارے لیے اہم ہے لیکن ہے تو ایک ملازم اور میں نے کبھی تمہیں رشتوں کی پروا کرتے نہیں دیکھا۔“

”تم اس بات کو نہیں سمجھو گے۔“ مرشد نے بہم انداز میں کہا۔ ”اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے تم فاضلی کو واپس کرو۔ میں ہر قسم کھانے کو تیار ہوں تمہیں چھوڑ دوں گا اور کوئی مطالبہ نہیں کروں گا۔ مجھے یقین ہے تاہم تمہارے

پاس ہے لیکن میں اس کا مطالبہ بھی نہیں کروں گا۔“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں جس مصیبت میں پھنس چکا تھا اس سے نکلنا اہم تھا۔ فاضلی سمیت باقی سب باتیں ثانوی تھیں۔ اگر میں اسے ایک بار پکڑ سکتا تھا تو دوبارہ پکڑ سکتا تھا لیکن میرا مرشد کے چنگل سے نکلنا ضروری تھا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ میں مرشد پر اعتماد نہیں کر سکتا تھا وہ وعدہ کر رہا تھا کہ فاضلی کو حاصل کرتے ہی وہ مجھے چھوڑ دے گا لیکن میرے اس وعدے کی اتنی اہمیت بھی نہیں تھی جتنی بھیڑ کے نزدیک بھیڑیے کے وعدے کی ہو سکتی ہے۔ اگر میں اس پر بھروسہ کرتے ہوئے فاضلی کو رہا کرنے کا کہہ دیتا اور میرے ساتھی اسے چھوڑ بھی دیتے تب بھی مجھے ایک فیصد بھی یقین نہیں تھا کہ مرشد اپنے وعدے پر عمل کرے گا اور مجھے جانے دے گا۔ وہ غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ”غالبا تمہارے دل میں میری طرف سے شک ہے؟“

”لازمی بات ہے۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ”کیا شک ہونا نہیں چاہیے۔ میں نے کبھی تمہیں اپنے قول و فعل کا پاس کرتے نہیں دیکھا۔ اس لیے تم مجھ سے توقع بھی مت رکھو کہ میں تم پر اعتماد کروں گا۔“

”تب یہ مسئلہ کس طرح حل ہوگا؟“

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ”آخر تم اتنا کیوں مصر ہو کہ فاضلی کو پہلے رہا کیا جائے اور پھر تم مجھے چھوڑ دو گے۔ تم یہ تبادلہ ہاتھ کے ہاتھ کیوں نہیں کر لیتے۔“

”یہ ممکن نہیں ہے۔“ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

مرشد جس طرح اصرار کر رہا تھا اس کا مطلب تھا کہ فاضلی کی واپسی کے بعد وہ اس سے کوئی خاص بات کرتا اور اس خاص بات پر ہی میری رہائی کا انحصار تھا۔ یہ خیال تو پہلے بھی آیا تھا کہ فاضلی کچھ خاص جانتا ہے جو مرشد نہیں چاہتا کہ کسی صورت ہمارے علم میں آئے۔ اس لیے وہ فاضلی کی پہلے واپسی چاہتا تھا اگر فاضلی وہ خاص بات ہمارے سامنے اگل چکا ہوتا تو مرشد میری رہائی ملتوی کر دیتا اور میرے ذریعے میرے ساتھیوں پر دباؤ بڑھاتا۔ اس نے مجھ پر تشدد کی ویڈیو بھی اسی لیے تیار کرائی تھی۔ میں نے اچانک پوچھا۔ ”میری ویڈیو کچھ کر میرے ساتھیوں کا کیا رد عمل تھا؟“

مرشد سکرایا۔ ”ان کا کیا رد عمل ہونا چاہیے۔“

”وہ دھکی ہوں گے ہوں گے تمہیں گالیاں اور دھمکیاں بھی دی ہوں گی لیکن جہاں تک تمہارے مطالبے کا تعلق ہے اس پر انہوں نے کوئی خاص رد عمل ظاہر نہیں کیا ہوگا۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”اس کا ثبوت اس وقت یہاں میری موجودگی ہے اگر میرے ساتھی تمہاری بات مان چکے ہوتے تو تم میرے ساتھ مغرباری نہ کر رہے ہوتے۔“

وہ کھسیا گیا تھا۔ ”ٹھیک ہے انہوں نے انکار کیا ہے ان کا کہنا ہے جب تک وہ تم سے بات نہیں کر لیں گے مجھ سے مزید کوئی بات نہیں ہوگی۔“

میں نے دل ہی دل میں دسم کی ذہانت کی داد دی۔ ویڈیو کچھ کر یقیناً باقی جذباتی ہو گئے ہوں گے لیکن اس نے خود پر قابو رکھا اور وہی فیصلہ کیا جو ان حالات میں ہمیں کر سکتا تھا۔ یہ طے تھا میری عدم موجودگی میں فیصلے

کا اصرار وہیم لو ہوتا ہے اور اس نے بالکل مناسب فیصلہ کیا تھا۔ میں نے سر ہلایا۔ ”اس نے ٹھیک کیا۔“

”اس نے حماقت کی ہے۔“ مرشد مشتعل ہونے لگا۔ ”جب میں دوسری ویڈیو بھیجوں گا تب ان کے ہوش ٹھکانے آئیں گے۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں تمہیں کوئی ناقابل تلافی نقصان پہنچا دوں۔“

”تم ایسی کوئی حماقت نہیں کرو گے۔“ میں نے سر گھما کر عقب میں کھڑے سیکرٹری کو دیکھا۔ وہ پوری طرح مستعد تھا اور کرنٹ والا پتول اس کے ہاتھ میں تھا وہ ایک لمبے میں مجھ پر فائر کر سکتا تھا۔ ”مرشد تمہارا سیکرٹری اتنا مہذب اور شعلیق ہے کہ یقین نہیں آتا کہ یہ تمہارا سیکرٹری ہے۔“

سیکرٹری نے کہا۔ ”میں نے اردو ادب میں ایم اے کیا اور گولڈ میڈلسٹ ہوں۔“

”اس کے بعد تم نوکری کی تلاش میں در بدر پھرتے رہے ہو گے لیکن اپنے مقدر کا رزق ہاتھوں سے کمانے کی کوشش نہیں کی ہوگی اور بزم خود ساری دنیا سے مایوس ہو کر بالآخر مرشد کے دامن میں پناہ لی ہوگی۔۔۔۔۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”میں نے اعلیٰ تعلیم مرشد صاحب کی مدد سے حاصل کی ہے اور یہ طے تھا کہ میں ان کا سیکرٹری بنوں گا۔ اب میں ان کا سیاسی مشیر بھی ہوں۔“

”تب تمہیں پولیٹیکل سائنس کی ڈگری لینے چاہیے تھی۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے میرا باپ پنڈی کا ایک درمیانے درجے کا سیاست دان تھا۔ وہ کونسلر تو ہمیشہ بننا تھا ایک بار ایم پی اے بھی بن گیا تھا لیکن اسے تھا ایمان داری کا مرض، میں نے سیاسی تربیت اسی سے حاصل کی ہے۔“

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”کاش کہ تم نے اپنے باپ کے نظریات سے بھی کچھ حاصل کیا ہوتا۔“

”وہ بہت برے حال میں سرکاری اسپتال میں کیفر سے لڑتا ہوا مرا تھا اس کے حال سے مجھ سمیت بہت سارے لوگوں نے عبرت حاصل کی تھی۔“

”میرا خیال ہے تم مرشد کے باڈی گارڈ بھی ہو؟“

”ہاں تمہیں اس سلسلے میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ میں خالی ہاتھوں سے بھی تمہیں زیر کر سکتا ہوں میں نے جوڈو میں بلیک بیلٹ لی ہے۔“

کہاں تو وہ نہایت شرافت سے کھڑا تھا اور کہاں اس نے بولنا شروع کیا تو مجھے اپنے بارے میں سب بتانے پر تل گیا تھا میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”بس۔۔۔۔۔ اتنا کافی ہے میں کافی ڈر گیا ہوں ویسے ہی بہت برے حالوں سے گزر کر رہا ہوں۔ ہائی دی وے تمہارے پاس اتنی زیادہ صلاحیتیں ہیں تو مرشد کو چاہیے باقی لوگوں کی چھٹی کر دے اور صرف تمہیں رکھے۔“

سیکرٹری کھپکھپایا۔ سیکرٹری کی طرح اپنے باس کے معاملات کو اپنے ذاتی معاملات سمجھتا تھا۔ مرشد نے مجھے ٹوکا۔ ”تم موضوع سے ہٹ رہے ہو۔“

”سوری مجھے مینٹنگ کے ایجنڈے کا خیال نہیں رہا۔“ میں نے معذرت کی۔ ”ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟“

”تم کہہ نہیں رہے ہو بلکہ مان نہیں رہے ہو نہ صرف اپنے لیے بلکہ میرے لیے بھی مشکلات کھڑی کر

رہے ہو۔“ مرشد پہلو بدل کر بولا۔ ”یہ مت سمجھنا کہ مرشد ڈر گیا ہے یا اس میں ہمت نہیں رہی ہے میں ڈرتا تو خدا سے بھی نہیں ہوں۔“

”تمہارا یہ پہلا بچ ہے جس پر میں صدق دل سے یقین کر سکتا ہوں۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”اور مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ تم سمیت تمہارے سارے چچوں کا نام دشنام دلا دوں۔“ مرشد اب مشتعل ہو گیا تھا۔ ”اس کو بھی کو تم کیا سمجھتے ہو میرے آدی دور سے چند ہم پھینکیں گے اور کوٹھی خود اپنے کینوں کا مقبرہ بن جائے گی۔“

”افسوس کہ ہمارے ہاں گدی نشینی کے برنس کا روان نہیں ہے ورنہ اس مقبرے کو ہمارے بدل دیتا۔ کبھی کبھی تو مجھے تم پر رشک آتا ہے۔“ میں بدستور سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

”شہباز۔“ مرشد کی قوت برداشت جواب دینے لگی تھی۔ ”یہ مت سمجھو کہ میرے پاس دوسرے طریقے نہیں ہیں۔ میں چاہوں تو یوں چنگی بجاتے ہی معاملہ ختم کر سکتا ہوں کوئی مانی کا حل مجھ پر انگلی نہیں اٹھا سکتا ہے۔“

”تم چنگی بجا سکتے ہو میں نے نہیں روکا ہے۔“

وہ میری بات اُن سنی کر کے بولتا رہا۔ ”لیکن میں سمجھتا ہوں تم سے الجھ کر میں اپنے دوسرے معاملات میں نقصان اٹھا رہا ہوں۔“

”یعنی گدی اور ملک کی سیاست پر پوری توجہ نہیں دے پارہے ہو۔“

”شہباز یہ دیکھو۔“ اس نے اپنی نشست کے برابر میں رکھا ہوا ایک چھوٹا اور لمبا سلینڈر اٹھایا۔ اس نے اس کا اوپری حصہ دھکن گھما کر کھولا اندر سے ہلکی سی بھاپ نکل رہی تھی جیسے سرد کنڈینز کھولنے پر نکلتی ہے اس نے اس میں سے ایک جدید ہائڈروک سرنگ نکالی جس میں نیلے رنگ کا سیال بھرا ہوا تھا۔ مرشد نے اس سامنے کیا۔ ”دیکھو یہ ایک انجکشن تم سے وابستہ میرے اکثر مسائل حل کر سکتا ہے۔“

”اس میں کیا ہے کوئی مہلک زہر جیسے سائائڈ؟“

”نہیں زہر دینے سے زیادہ آسان تو ایک گولی مارنا ہے بلاوجہ اتنی زحمت کون کرے۔“

”پھر کیا ہے اس میں؟“

”یہ ایک جدید ایجاد ہے۔ اسے کسی شخص کو لگا دیا جائے تو مشکل سے دس منٹ کے بعد وہ شخص ہمیشہ کے لیے اپنی شخصیت سے محروم ہو جائے گا۔“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔ یہ پاگل بنانے والا انجکشن ہے؟“

”نہیں آدمی اپنی تمام حیات اور سوچوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ اس کی شخصیت روز اول والی بن جاتی ہے۔ وہ کسی نو مولود کی طرح معصوم ہو جاتا ہے۔“

میرے جسم میں سردی لہر دوڑ گئی تھی۔ کیا واقعی یہ انجکشن اتنا خطرناک تھا یا مرشد اس کی خصوصیات بڑھا چڑھا کر بیان کر رہا تھا صرف مجھے دہشت زدہ کرنے کے لیے، ظاہر ہے یہ انجکشن میرے لیے تھا۔ اپنی شخصیت سے محروم ہو کر ایک ریبوٹ بن جانا۔ نہیں ریبوٹ کا بھی ایک پروگرام ہوتا ہے وہ اس کے تحت فنکشن کرتا ہے۔ میں تو پودا بن جاتا۔ جو سانس لیتا ہے زمین سے پانی اور خوراک حاصل کرتا ہے وہ بڑھتا ہے اور اپنی نسل بھی

بڑھاتا ہے لیکن وہ شعور اور احساس سے عاری ہوتا ہے۔ شاید میں کسی پودے سے بھی گیا گزرا ہو جاتا۔ مرشد میرے رومل کا فتنہ تھا میں نے اچانک اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ”ذرا دکھانا..... تم پر آ زما کر دیکھوں اگر کامیاب رہا تو اس ملک کے تمام شیطان صفت لوگوں کو اس انجکشن کی اشد ضرورت ہے میں ان سب کو لگاؤں گا چاہے اس کے لیے مجھے چندہ جمع کرنا پڑے یا کسی بنگ میں ڈاکا مارنا پڑے۔“

مرشد مجھ سے دور محفوظ فاصلے پر تھا۔ اس نے رومل ظاہر نہیں کیا اور سرخ دوبارہ سلیڈز میں رکھ کر اس کا ڈھکن بند کر دیا۔ ”ذرا سوچو تم اپنے ساتھیوں کو اس حالت میں ملو کہ تم ایک پالتو بلی سے زیادہ مختلف نہیں ہو گے۔ تم بھوک لگنے پر دو گے اور ضرورت پڑنے پر بلا تکلف اسی جگہ رفع حاجت کر لو گے جہاں موجود ہو گے۔ تم کپڑے پہنو یا نہ پہنو تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ انسان اور انسانوں سے وابستہ رشتے تمہارے لیے بے معنی ہو جائیں گے۔“

”اوکے۔“ میں نے ہاتھ اوپر کیا۔ ”میں دہشت زدہ ہو گیا۔ مگر ایک سوال ہے۔“

”بہی کہ میں نے اسے استعمال کیوں نہیں کیا؟“

”ہاں تم دو دن تک اکرم چشتی اور اپنے جلاؤ کو زحمت دینے کے بجائے پہلے ہی دن یہ انجکشن استعمال کر

لیتے۔“

”لیکن اس صورت میں فاضلی کو کیسے واپس حاصل کرتا؟“ اس نے روانی سے کہا تو مجھے لگا جیسے اس کے منہ سے سچ نکل گیا ہے۔ اسے اصل فکر فاضلی کی تھی اور جب اس نے یہ کہا تو مجھے لگا کہ اسے مجھے انجکشن لگانے پر کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ شاید اس نے انجکشن حاصل اسی مقصد کے لیے کیا تھا تو وہ پہلے فاضلی کو حاصل کرتا اور اس کے بعد مجھے انجکشن لگا کر میرے ساتھیوں کے حوالے کر دیتا۔ میں جیسے جیسے اس بات پر غور کر رہا تھا مجھے لگ رہا تھا یہی درست ہے۔ مرشد کا منصوبہ یہی تھا جواب میری مٹ دھری کی وجہ سے ناکام رہا تھا۔ اس نے مجھ پر تشدد کر لیا تھا۔ میں نے سوچا تو اچانک ہی ایک اور خیال ذہن میں جگنو کی طرح چکا تھا۔ مجھ پر تشدد کا مقصد ویڈیو بنا کر میرے ساتھیوں کو یقین دلانا تھا کہ اس تشدد کی وجہ سے میں اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا اور اس میں مرشد کی کوئی سازش شامل نہیں تھی۔ میں نے سرسری سے انداز میں مرشد سے سوال کیا۔ ”میرا خیال ہے اس دوکاندوس سسٹم پر کوئی سراغ بھی باقی نہیں رہتا ہوگا؟“

”ہاں ایک بار جسم میں جانے کے چند گھنٹوں بعد اس کا نشان مٹ جاتا ہے اور پھر دنیا کا کوئی ٹیسٹ یہ نہیں بتا سکتا ہے کہ آدی کے ساتھ اصل میں ہوا کیا ہے۔“

”اس لیے کوئی نہیں جان سکے گا کہ میں کیسے پاگل ہوا۔“ میں نے کہا۔ ”یہ منصوبہ ہے نا تمہارا..... اسی لیے تم پہلے فاضلی کو حاصل کرنے کے لیے بے چین تھے۔“

مرشد کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی تھی۔ ”تم بہت چالاک آدی ہو بالآخر صحیح بات تک پہنچ گئے۔“

”اسی لیے تم نے مجھ پر تشدد کی ویڈیو بنائی اور میرے ساتھیوں تک پہنچائی تاکہ وہ یہ سمجھیں کہ تشدد نے

میرا دماغ ماؤف کر دیا ہے۔“

مرشد نے اس بار کچھ نہیں کہا لیکن اس کے چہرے پر اقرار تھا کہ اس کا یہی ارادہ تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ

بدلاتو کچھ بھی نہیں تھا میں اس کے قبضے میں تھا۔ وہ اب بھی اپنے منصوبے پر عمل کر سکتا تھا۔ اگر میں جان بھی گیا تھا تو اس سے کیا فرق پڑتا تھا؟ اس نے سیکرٹری کی طرف دیکھا۔ ”اے لے جاؤ اور بند کر دو۔“

”ضرور۔“ میں نے آنکھوں سے اٹھتے ہوئے کہا اور اچانک ہی مرشد کی طرف جھپٹا۔ میرے عقب میں سیکرٹری پوری طرح چوٹا تھا جیسے ہی میں نے حرکت کی اس نے پستول سیدھا کر لیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں اسے نہیں دیکھ رہا ہوں لیکن میں اسے دیکھ رہا تھا۔ مرشد کے عقب میں ایک بڑی دیوار گیر الماری تھی جس کے خشے چمکیلی سطح والے تھے اور ان پر عکس واضح دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے سیکرٹری واضح نظر آ رہا تھا۔ جیسے ہی اس نے پستول سیدھا کیا میں یک دم فرش پر گر کر اس پر دبیز قالین تھا۔ میں گرتے ہی چاروں ہاتھوں بیروں پر آگے بڑھا اور میری نظر مرشد پر مرکوز تھی۔ وہ گھبرا کر نشست سے اٹھ رہا تھا۔ جب سیکرٹری کا فار کیا ہوا اس کے جسم میں اتر گیا اسے جھٹکا لگا اور وہ دوبارہ نشست پر گر کر لرزے لگا۔ پن کے ساتھ بہت باریک تار منسلک تھا جس سے کرنٹ گزر کر مرشد کو لگ رہا تھا۔ میں نے تار پر ہاتھ مار کر اس کے جسم سے پن نکال دی اور اس سے پہلے سیکرٹری حرکت میں آتا میں نے مرشد کو ٹانگ سے پکڑ کر نیچے کھینچ لیا۔ اسے اپنے جسم پر قابو نہیں رہا تھا۔ میرے ہاتھ بے تابی سے مرشد کا لباس ٹٹول رہے تھے۔ اس کے لباس میں کسی ہتھیار کی موجودگی لازمی تھی۔

پھر میں نے اس کی شیردانی کی جب میں پستول محسوس کر لیا لیکن اس سے پہلے میں اسے نکالتا۔ سیکرٹری عقب سے مجھ پر آ پڑا تھا۔ دیکھنے میں عام جسامت کے سیکرٹری کا وزن اچھا خاصا تھا۔ مجھے لگا جیسے مجھ پر کوئی وزنی جسم گرا ہو۔ میں نے اسے جھٹکا چا لیا لیکن ایک تو وہ مجھ سے چٹ گیا تھا دوسرے مجھ میں اتنی توانائی نہیں تھی کہ اسے جھٹک سکوں۔ میں نے مرشد کو چھوڑ کر اسے خود سے گرانے کی کوشش کی لیکن وہ بری طرح مجھ سے چٹا ہوا تھا۔ کسی صورت مجھے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے غلط بیانی کی تھی کہ اسے جوڈو آتا تھا اگر ایسا تھا تو وہ عقب سے ایک ہی دھار کے مجھے بے ہوش کر سکتا تھا لیکن اس کے بجائے وہ مجھے قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ بھی خاصے انارڈی انداز میں۔ اگر میں فٹ ہوتا تو اب تک اس سے نمٹ چکا ہوتا۔ اس کی کوشش تھی کہ مرشد کے دوسرے محافظوں کے آنے تک مجھے کسی حرکت سے روکے۔

جب میں نے محسوس کیا کہ میں خود کو اس سے چھڑا نہیں سکوں گا تو میں نے دوبارہ مرشد کی جیب ٹٹولی مگر سیکرٹری نے بھانپ لیا اور اس نے مجھے کسی قدر پیچھے کھینچ لیا۔ اب مرشد کی شیردانی کی جیب میری پہنچ سے دور ہو گئی تھی۔ مجھے قابو کرنے کی کوشش کے ساتھ سیکرٹری چیخ چیخ کر مرشد کے دوسرے محافظوں کو بلا رہا تھا اور اس وقت اپنا تسلیق لہجہ اور زبان بھول کر نہایت روانی سے ناقابل بیان القابات کے ساتھ مرشد کے آدیوں کو پکار رہا تھا۔ میں مرشد کی طرف بڑھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ قسمت بھی آدی کو کہاں لاکر بے بس کرتی ہے۔ ایک عام سانو جوان اس وقت میرے لیے بلائے جان بن گیا تھا اور کسی صورت جان نہیں چھوڑ رہا تھا۔ اس نے میرے گلے میں ہاتھوں سے چندہ ڈال دیا تھا اور پورے جوش سے گلا دبا رہا تھا۔ ہاتھ مارتے ہوئے اچانک کوئی چیز میرے ہاتھ میں آئی اور میں نے اسے اٹھایا تو یہ وہی دھاتی سلیڈز لٹکا جس میں انجکشن تھا۔ میں نے سلیڈز سیکرٹری کے سر پر مارا اور دوسری ضرب میں اس نے کراہ کر والدہ محترمہ کو یاد کیا اور میرا گلا چھوڑ دیا۔ اسے پرے جھٹک کر میں اٹھ بیٹھا۔ وقت بالکل نہیں تھا۔ مرشد کے آدیوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ

اندرا تے میں نے تیزی سے سلیپر سے اسن نکال کر اس کی سرنگ ہے۔ اس پر سے سرنگی سون میں دس ر
دی۔ اسی لمحے کئی مسلح افراد نشست گاہ میں گھس آئے۔

”خبردار۔“ میں نے لکار کر کہا۔ ”کسی نے حرکت کی تو میں تمہارے آقا کو یہ انجکشن لگا دوں گا۔“

”کوئی حرکت نہ کرے۔“ سیکرٹری نے بولکھلا کر کہا۔ ”پیچھے ہو جاؤ۔“

ایک جاہل گارڈ نے اپنی خوفناک شاٹ گن کا رخ میری طرف کیا اور گالی دے کر بولا۔ ”چھوڑ دے

مرشد بادشاہ کو۔“

”سیکرٹری اسے بتاؤ کہ یہ کیسا انجکشن ہے۔“ میں نے خود پر قابو پا لیا تھا ورنہ پہلے میرا ہاتھ لرز رہا تھا۔
سیکرٹری گارڈز پر برس پڑا اور ان کے خاندان سے اپنے نہایت غلط قسم کے تعلقات جوڑتے ہوئے اس نے انہیں
یہاں سے دفع ہو جانے کا حکم دیا۔ صورت حال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے وہ دفع ہو گئے۔ سیکرٹری نے
میری طرف دیکھا اور لرزتی آواز میں بولا۔

”سرنج بنا لو ایسا نہ ہو کہ دوا انجکٹ ہو جائے۔“

”دل تو میرا چاہ رہا ہے کہ انجکٹ کر دوں لیکن مجھے زندہ رہنا ہے اس لیے مجبوراً اس وقت تک انجکٹ نہیں

کروں گا جب تک مجھے اس کے لیے مجبور نہ کیا جائے۔“

”لیکن تم کب تک اس طرح سرنج رکھو گے؟“

”زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”جیسے ہی مرشد چلنے پھرنے کے قابل ہوں اسے لے کر

یہاں سے نکل جاؤں گا۔“

مرشد کی شیردانی کی جیب سے چھوٹا لیکن جدید قسم کا پستول نکال لیا اب میں نہتا نہیں تھا۔ میں نے خود کو
کسی قدر پُر اعتماد محسوس کیا اور یہ بھول گیا کہ جال وہیں ہوتے ہیں جہاں پر سنبھتے ہیں۔ بالکل آخری لمحے میں
سیکرٹری کے تاثرات نے مجھے خبردار کیا اور میں نے پلٹ کر دیکھنا چاہا لیکن اس سے پہلے کوئی چیز میرے سر سے لگی
اور میں چکر اکر گر پڑا۔ ضرب ایسی تھی کہ نشست گاہ میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگی اور جب ذرا قابو میں آئی
تو مجھے لگا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ میرے سامنے فاضلی تھا لیکن یہ کیسے ممکن تھا فاضلی تو حویلی میں قید تھا۔ وہ
یہاں کیسے آ گیا؟ فاضلی نے مرشد کی گردن میں گھسی سرنج نکالی اور میرے بازو میں گھونپ دی۔ اس نے میری
آنکھوں میں جھانکا اور بولا۔ ”مڈبائی شہباز ملک۔“
اس نے سرنج کا میٹن دبا دیا تھا۔



میرا سر گھوم رہا تھا نہ جانے یہ سرنج میں موجود دوا کا اثر تھا جو میرے جسم میں داخل ہو چکی تھی، سر پر لگنے
والی ضرب کا نتیجہ یا پھر حیرت کا جھٹکا تھا جو فاضلی کو یہاں لگا تھا۔ وہ دیم کی قید میں اتنا ہی بے بس تھا جیسے
روح جسم کی قید میں ہوتی ہے اور اس کا چھوٹ جانا میرے نزدیک اتنا ہی ناممکن تھا جتنا خود اپنی روح کو جسم کی قید
سے آزاد کرنا لیکن یہ ناممکن، ممکن ہو گیا تھا۔ وہ فاضلی ہی تھا۔ مجھے انجکشن لگا کر وہ پیچھے صوفے پر گر گیا تھا اور
یوں ہانپ رہا تھا جیسے میلوں دوڑ کر آیا ہے۔ ظاہر ہے اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ اس کے باوجود اس نے وہ کام

کر دکھایا تھا جو مرشد کا سیکرٹری اور اس کے سارے محافظ نہیں کر سکتے تھے۔ میں ضرب کھا کر گرا تو سیکرٹری نے
جھپٹ کر میرے ہاتھ سے پستول نکال لیا اور اگر اسے موقع ملتا تو وہ فاضلی کو روک دیتا لیکن فاضلی نے سیکنڈ سے
بھی پہلے انجکشن مرشد کی گردن سے نکال کر مجھے لگا دیا تھا۔

”یہ تم نے کیا کیا؟“ سیکرٹری بولا۔

”وہی جو بہ مرشد صاحب کے ساتھ کرنے والا تھا۔“ فاضلی نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ”اس میں زہر

ہے؟“

سیکرٹری نے انہوس سے سر ہلایا اور پھر محافظوں کو بلانے لگا۔ پھر اس نے واک ٹاک پر کسی ڈاکٹر کو طلب
کیا۔ ڈاکٹر شاید مرشد ہاؤس میں موجود تھا کیونکہ وہ دو منٹ بعد ہی آ گیا تھا اس دوران میں سیکرٹری نے ایک محافظ
کی مدد سے مرشد کو اٹھا کر صوفے پر لٹایا تھا۔ میں خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر یہ سوچ کر ہی میرا دل
ڈوب رہا تھا کہ کچھ دیر میں اپنی سوچوں اور اپنی شخصیت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاؤں گا۔ ممکن ہے مرشد نے
اس انجکشن کے بارے میں مبالغے سے کام لیا ہو لیکن اس کی بات کو جھوٹ بھی نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔ ڈاکٹر کے
آتے ہی سیکرٹری نے اسے مرشد کو ٹریٹ منٹ دینے کو کہا اور فاضلی کی طرف متوجہ ہوا۔ ”تم کیسے چھوٹے۔۔۔۔۔ تم
اس کے ساتھیوں کی قید میں تھے؟“

فاضلی شاید مجھے گھور رہا تھا کیونکہ چکراتے سر کے ساتھ میں نظروں کو فکس نہیں کر پا رہا تھا البتہ ان لوگوں
کی آوازیں صاف سن رہا تھا۔ ”میں نے وہاں ایک آدمی کو توڑ لیا۔۔۔۔۔ وہ مجھے ہیر وڈن کا انجکشن دیتا تھا۔۔۔۔۔ میں نے
نقد سودا کیا اور وہاں سے نکل آیا۔“

”نقد سودا کیسے کیا؟“

”میں نے اس سے سودا کیا کہ وہ مجھے آزاد کر دے تو میں اسے دس لاکھ روپے دوں گا۔ یہ رقم میں نے
ایک جگہ چھپا رکھی ہے۔ وہ لالچ میں آ گیا اور اس نے مجھے باہر نکال دیا۔“

”کہاں سے؟“

”میں نہیں جانتا کیونکہ وہ مجھے رات کی تاریکی میں آنکھوں پر پٹی باندھ کر باہر لایا اور پھر ایک گاڑی میں
بٹھا کر وہاں سے نکال لایا۔ میں نہیں جانتا وہ جگہ کہاں ہے۔“

”وہ آدمی کہاں ہے؟“

”اسے میں نے مار دیا۔۔۔۔۔ دس لاکھ کہاں تھے اسے دھوکا دیا تھا میں اسے نہیں مارتا تو وہ مجھے مار دیتا۔“
فاضلی بولا، اس کے لہجے میں بے چینی آگئی تھی۔ ”اس ڈاکٹر سے کہو مجھے دیکھے۔۔۔۔۔ مجھے ہیر وڈن کی طلب ہو رہی
ہے۔“

”فکرمات کر تمہارا علاج ہو جائے گا۔“ سیکرٹری نے اسے تسلی دی۔ اس کے انداز سے لگتا تھا کہ فاضلی
اس سے کم تر درجے کا آدمی تھا۔ ظاہر ہے وہ مرشد کا سیکرٹری تھا اور آنے والے دنوں میں اس کی اہمیت اور بھی
زیادہ ہو جاتی۔ ڈاکٹر نے مرشد کو کوئی دوا دی یا انجکشن لگایا تھا جس سے اس کی توانائی بحال ہو گئی اور وہ فاضلی پر
برس پڑا۔ ”یہ تم نے کیا کیا۔۔۔۔۔؟“

”جو میری سمجھ میں آیا جناب۔“ فاضلی سبے انداز میں بولا۔ ”کیا میں نے غلطی کی ہے؟“

”تم اسے قابو کر چکے تھے انجکشن دینے کی کیا ضرورت تھی۔“ مرشد نے غرا کر کہا۔

”میں خود پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔“ فاضلی کا لہجہ مزید کمزور ہو گیا تھا۔ ”ان لوگوں نے میرے ساتھ اچھا

سلوک نہیں کیا۔“

”انہوں نے تم جیسے گدھے کے ساتھ بالکل ٹھیک سلوک کیا ہے۔“ مرشد نے کہا اور ڈاکٹر کو حکم دیا کہ میرا

معائنہ کرے۔ ڈاکٹر نے پٹن نارنج سے میری آنکھوں میں روشنی ڈال کر دیکھی۔ پھر نبض اور دل کی دھڑکن اور

آخر میں بلڈ پریشر چیک کیا۔

”وائٹل سائن تقریباً نارمل ہیں، یہ بے ہوش نہیں ہے لیکن پوری طرح ہوش میں بھی نہیں ہے۔“

”کیا یہ ہماری باتیں سن رہا ہے؟“

”ہو سکتا ہے سن رہا ہو جناب۔“

”کیا مطلب ہو سکتا ہے۔“ مرشد نے غلطی سے کہا۔ ”یقین سے بتاؤ۔“

”یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں جناب۔“ پریشان ہو گیا۔ ”ویسے اس کے ساتھ ہوا کیا ہے؟“

مرشد نے ڈاکٹر کو بتایا کہ مجھے کس قسم کا انجکشن دیا گیا ہے اور اس کے کیا نتائج نکل سکتے ہیں۔ ڈاکٹر نے

کہا۔ ”تب آپ کسی نر کے ماہر کو دکھائیں یہ دماغ کا معاملہ ہے اور میرے بس سے باہر ہے۔“

مرشد نے چراغ پا ہو کر ڈاکٹر اور فاضلی کو دفع ہو جانے کا حکم دیا۔ وہ سن چکا تھا کہ فاضلی کس طرح

میرے ساتھیوں کی قید سے رہا ہوا تھا، مجھے اس شخص پر افسوس تھا جس نے دس لاکھ روپے کے لالچ میں اپنی زندگی

فروخت کر دی تھی اب وہ زندہ بھی نہیں تھا کہ اسے برا بھلا ہی کہا جاتا۔ اپنے کیے کی سزا وہ بھگت چکا تھا۔ البتہ یہ

اچھی بات تھی کہ اس نے فاضلی کو جو بلی یا اس کا جائے وقوع دیکھنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ مجھے قائلین سے اٹھا کر

صوفے پر لٹا دیا گیا تھا۔ اگرچہ مرشد اور سکرٹری جانتے تھے کہ مجھے انجکشن لگایا ہے اور سر پر چوٹ بھی آئی تھی اس

کے باوجود وہ دونوں محتاط تھے اور انہوں نے دوسرے لوگوں سے مجھے اٹھوایا تھا اس وقت بھی میرے سر پر ایک مسلح

ف شخص موجود تھا۔

”اس کا کیا کرنا ہے جناب۔“ سکرٹری نے مرشد سے میرے بارے میں پوچھا۔ ”میرا خیال ہے یہ کام

سے گیا۔“

”یہ سب تمہاری انٹیلی کی وجہ سے ہوا ہے۔“ مرشد نے اپنی توپوں کا رخ سکرٹری کی طرف موڑ دیا۔ ”وہ

تو میری قسمت اچھی تھی کہ یہ کامیاب نہیں ہوا اور فاضلی بروقت آ گیا۔“

”میرا قصور نہیں ہے جناب جیسے ہی میں نے فائر کیا یہ گر گیا۔“ سکرٹری پریشان ہو گیا اسے یاد ہی نہیں رہا

تھا کہ اس نے اپنے آقائے ولی نعمت کو کزنٹ لگا دیا تھا۔ خود مرشد پریشانی میں یہ بات بھولا ہوا تھا اب اسے یاد

آ گیا اس نے سکرٹری کو سنانی شروع کیں۔ وہ ملازم تھا خاموشی سے سنتا رہا۔ خود مرشد کا دماغ ٹھکانے پر نہیں

تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ حالانکہ اسے سب سے پہلے فاضلی سے معلوم کرنا چاہیے تھا کہ

اس نے اپنے محسن کی لاش کہاں چھوڑی تھی اور وہ کس گاڑی میں یہاں تک آئے تھے۔ فاضلی کو بھی ہیروئن کے

ڈوز کی گھر لگ گئی تھی ورنہ وہ مرشد کو بتاتا۔ سب ہی بوکھلائے ہوئے تھے سوائے میرے کیونکہ میرے پاس کرنے کو

کچھ تھا ہی نہیں۔ سر پر لگنے والی ضرب کا اثر کم ہو رہا تھا کیونکہ مجھے چکر آنا کم ہو گئے تھے۔ البتہ آنکھوں کے سامنے

دھندلا پن موجود تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ انجکشن کی دوا جلد مجھ پر اثر کرنے والی تھی کیونکہ دس منٹ ہو گئے تھے یا

ہونے والے تھے۔ یہ خیال مرشد کو بھی آیا اس نے سکرٹری سے پوچھا۔

”دس منٹ ہو گئے ہیں؟“

”میرا خیال تو ہو گئے ہیں جناب۔“ وہ بے دلی سے بولا۔

”اب تک اس پر اثر ہو جانا چاہیے۔“

”بالکل ہو گا جناب۔“ سکرٹری نے کہا۔ ”شاید کچھ دیر لگے کیونکہ فاضلی نے انجکشن گوشت میں اتار دیا تھا

اگر نس میں لگتا تو جلدی اثر کرتا۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ مرشد نے کہا۔

”آپ بلاوجہ پریشان ہو رہے ہیں۔“ سکرٹری نے مرشد کو دھیما پایا تو اس کا حوصلہ لوٹ آیا تھا۔ اسے یاد

آ گیا کہ وہ مرشد کا مشیر تھا۔ ”آپ کا اصل پلان بالآخر یہی تھا۔ دیکھیں فاضلی خود چھوٹ کر آ گیا اور آپ کو انجکشن

لگانے کا حکم بھی نہیں دینا پڑا۔ سب فاضلی کے ہاتھ سے ہو گیا۔“

”ہاں یہ سب سے اچھی بات ہوئی کہ فاضلی ہاتھ آ گیا۔“ مرشد نے بادل ناخواستہ سکرٹری کی تائید کی۔

”لیکن ابھی مجھے اس سے بہت کچھ پوچھنا تھا۔“

”جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا اب آگے کا سوچیں اس کا کیا کرنا ہے۔“ سکرٹری نے درست مشورہ دیا۔

”میرا تو دماغ کام نہیں کر رہا ہے۔“ مرشد نے کہا۔ ”ابھی تو اسے اٹھواؤں یہاں سے.....“

مرشد وہاں سے چلا گیا اور سکرٹری ملازموں کو میرے بارے میں ہدایت دے رہا تھا۔ ”اسے گیٹ

ہاؤس شفٹ کر دو اور ہاں اس پر نظر رکھنا یہ کہیں ادھر ادھر ہوا تو تم لوگوں کو حساب دینا ہو گا۔“

”چل اٹھا اپنے اس بیٹوں۔“ سکرٹری کے جانے کے بعد کسی نے کہا اور پھر مجھے دو افراد نے پہلے

بازوؤں اور ناگوں سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی لیکن یہ طریقہ خاصا مشکل تھا۔ میرا وزن تقریباً پچاسی کلو گرام تو

تھا اس لیے ان میں سے ایک نے قربانی دی اور مجھے اپنے شانے پر ڈال لیا۔ مگر وہ راستے بھر مجھے سناٹا ہی رہا تھا

اور دوسرا ہنستا رہا۔ اس نے مجھے نرم بستر پر لاکر بیٹھ دیا اور دوسرے پر بگڑنے لگا اس بار اس نے مجھے دوسرے کا والد

پا جد قرار دیتے ہوئے کہا۔ ”اٹھاتا ناں اپنی بے بے دے خصمنوں۔“

میرا اندازہ تھا کہ مجھے انجکشن لگے چندہ منٹ سے اوپر ہو گئے تھے لیکن اب تک میرا ذہن میرے قابو میں

تھا اور میں بہ قول مرشد کے نہ تو نوزائیدہ ہوا تھا اور نہ بلی کا بچہ بنا تھا۔ شاید اس کی وجہ وہی تھی جو سکرٹری نے بیان

کی تھی۔ فاضلی نے انجکشن میرے بازو کے گوشت میں گھونپ دیا تھا۔ گوشت میں لگایا جانے والا انجکشن دیر سے

اثر کرتا ہے۔ مگر اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ اثر ضرور کرتا ہے۔ اس لیے مجھے کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ مرشد کی قید

میں آنے کے بعد میں اپنے ساتھ ہر سلوک کے لیے تیار تھا اور ذہنی طور پر میں نے تسلیم کر لیا تھا کہ صرف قسمت

ہی مجھے مرشد کی قید سے زندہ سلامت نکال سکتی ہے۔ اس سے پہلے بھی کئی بار مرشد یا دوسروں کی قید میں آنے کے

بعد میں نکلنے میں کامیاب رہا تھا اور اب بھی مجھے اللہ پر بھروسہ تھا کہ میرے مقدر کی سانسیں باقی ہیں تو میں بچ نکلوں گا۔

مرشد کے آدمی مجھے یہاں لٹا کر آپس میں لڑتے جھگڑتے چلے گئے تھے۔ سیکرٹری نے مجھے گیسٹ ہاؤس میں بھجوا دیا تھا۔ اس جگہ پہرہ تھا اور میرے بارے خاص طور سے خبردار کیا تھا اس لیے اس کمرے کے باہر یقیناً مرشد کے محافظ موجود تھے۔ اگر مجھے انجکشن نہ دیا گیا ہوتا تب بھی اس کا امکان بہت کم تھا کہ میں یہاں سے فرار ہو سکوں۔ اب میرے پاس سوائے انتظار کے اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ آگے پردہ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ میرا ذہن صاف ہو گیا تھا یعنی چکر آنا بند ہو گئے تھے لیکن آنکھوں کے سامنے ہلکی سی دھند برقرار تھی۔ میں نے آہستہ سے سرگھبرا کر اس دھند کے پاس کمرے کا معائنہ کیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس لیے میں نے اٹھ بیٹھنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ اس میں بھی کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی البتہ دھند ختم نہیں ہوئی تھی میں نے سر جھٹکا آنکھیں ملیں۔ دھند اپنی جگہ موجود رہی تھی اور یہ شاید دوا کا اثر تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں میرے قابو میں تھے۔ مگر اس دھند کے ہوتے ہوئے میں فرار کی کوشش میں صرف ٹھوکریں کھا سکتا تھا یا مرشد ہاؤس کے باہر جانے کے بجائے مرشد کی بیڈروم میں کھسک سکتا تھا۔

میں نے بہتر سمجھا کہ اٹھنے اور گھومنے بھرنے کے بجائے لیٹ جاؤں اور دھند چھٹنے کا انتظار کروں میں نے لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ ابھی تک انجکشن کے اثرات ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت سے کوئی تفریق آدھا گھنٹہ ہونے کو آیا تھا اور انجکشن لگنے کے بعد پہلی بار میرے دل میں امید کی کرن جاگی کہ شاید انجکشن کا اثر نہیں ہوا تھا۔ مگر اس امید کے باوجود خدشات باقی رہے تھے۔ وقت گزرتا رہا پھر دروازے کے باہر آہٹ ہوئی تو میں سنبھل گیا۔ کئی افراد اندر آئے اور میں نے فاضلی کی آواز سنی۔ ”آپ کو یقین ہے جناب کہ یہ انجکشن اسی طرح اثر کرتا ہے؟“

”یقین ہے۔“ مرشد بولا۔ ”میں نے اس کا تجربہ کر لیا ہے۔“

”مجھے یقین نہیں آ رہا جناب عالی۔“ فاضلی نے ضدی لہجہ میں کہا۔

”جلد تمہیں یقین آ جائے گا۔“ سیکرٹری بولا اس کا لہجہ معنی خیز تھا لیکن فاضلی نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی تھی۔ اس نے مرشد سے کہا۔

”آپ اس شخص کو اتنی اچھی طرح نہیں جانتے جتنی اچھی طرح میں جان گیا ہوں۔ یہ شخص قسمت کا دشمن ہے اس وقت بھی بچ کر نکل جاتا ہے جب اسے خود اپنے بچنے کا علم نہیں ہوتا ہے۔“

”احقانہ باتیں مت کرو۔“ مرشد نے ناگواری سے کہا۔ ”کوئی شخص ہمیشہ نہیں بچ سکتا ہے۔۔۔۔۔۔ وہ کیا کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اونٹ ہاتھی کے نیچے آتا ہے۔“ مرشد نے اپنی جہالت کا ثبوت دیتے کہا اور سیکرٹری نے فٹھ کی۔

”پھاڑتے جناب۔“

”ایک ہی بات ہے کہنے کا مطلب ہے کہ اپنے سے بڑی چیز کے نیچے آتا ہے تو یہ بھی میرے قابو میں آ گیا۔ اب یہ ساری عمر اسی طرح رہے گا۔“

”میں تو کہتا ہوں اسے اس کے ساتھیوں کے پاس تحفے میں بھیج دیں۔“ سیکرٹری نے مشورہ دیا۔ ”وہ بھی

کیا یاد کریں گے۔“

میں نے دل ہی دل میں سیکرٹری کو اتنا اچھا مشورہ دینے پر شاباشی دی۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہوتا ہے۔ نادان دوست کا کردار و سیم کے آدمی نے کیا اور فاضلی کو آزار دیا نتیجے میں خود اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا اور اب نادان دشمن کا کردار مرشد کا سیکرٹری ادا کر رہا تھا۔ فاضلی کی یقیناً اس سے لگتی تھی اس لیے اس نے فوراً درمیان میں ٹانگ اڑائی۔ ”لیکن پہلے اس کی تصدیق تو ہو جائے کہ یہ بچ ہمیشہ کے لیے اپنا ذہن کھو چکا ہے۔“

”کسی ڈاکٹر کو دکھانا ہوگا۔“

”لیکن جناب صرف دماغ کا ڈاکٹر ہی تصدیق کر سکتا ہے۔“ سیکرٹری دبے لہجے میں بولا۔ ”اور اسے دکھانا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔“

”وہ کیا کر لے گا۔“ فاضلی بدتمیزی سے بولا۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اس کا کوئی علاج کیا گیا تھا اور ہیر وڈن کی طلب دب گئی تھی کیونکہ اس کے لہجے میں نہ تو نشہ تھا اور نہ ہی طلب والی بے چینی تھی۔ ”اسے اپنی فیس سے غرض ہوگی۔“

”تم اپنا منہ بند رکھو۔“ سیکرٹری نے اسے جھڑپا دیا۔ ”وہ اسے دیکھ لے گا اور پھر یاد رکھے گا۔ کسی وقت وہ گواہی دے سکتا ہے کہ اس نے شہباز کو کہاں اور کس حال میں دیکھا تھا۔“

”وہ اس کی جرأت نہیں کرے گا اور کرے گا تو اسے دیکھ لیں گے۔“ فاضلی نے کہا۔ ”ویسے معلوم کرنے کے دوسرے طریقے بھی ہیں۔“

”دوسرے طریقے۔۔۔۔۔۔؟“ مرشد نے پوچھا۔

”آپ نے اسے اگر چہ جتنی کے حوالے کیا تھا اب میرے حوالے کریں میں اپنی تسلی کروں گا۔“

میں نے اس بار بھی دل ہی دل میں فاضلی کو بے نقطہ سنائیں۔ وہ یقیناً اس بہانے اپنے دل کی بھڑاس نکالنا چاہتا تھا۔ ہماری قید میں اسے تشدد کا نشانہ نہیں بنایا گیا تھا لیکن ہیر وڈن کا عادی ضرور بنا دیا تھا اور وہ ہمیں بہت کچھ بتانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اب وہ بدلہ لینے کے لیے بے چین تھا۔ یہ بات مرشد بھی سمجھتا تھا اس لیے اس نے انکار کر دیا۔ ”ابھی تمہاری اپنی حالت ٹھیک نہیں ہے اور میں نے بھی کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے دو چار دن اسے دیکھتے ہیں۔“

”یہ ٹھیک ہے اسے یہیں رکھتے ہیں۔“ سیکرٹری نے کہا۔ ”پتا چل جائے گا کہ انجکشن نے اس پر کیا اثر کیا ہے۔“

”میں تو سمجھا تھا وہ زہر کا انجکشن ہے۔“ فاضلی نے کہا۔ ”ویسے میں ٹھیک ہوں جناب عالی۔“

”خاک ٹھیک ہو۔“ مرشد نے اسے جھڑپا دیا۔ ”اگر ٹھیک ہوتے تو اس آدمی کو مارنے کے بجائے یہاں لے

آتے اور پھر ہم اس سے شہباز کے ساتھیوں کے بارے میں پوچھ لیتے ابھی تو ہم بالکل اندھیرے میں ہیں۔ وہ

سب بہت بڑا خطرہ ہیں۔ اب اکیلا شہباز ہی در و در نہیں رہا ہے۔“

”لیکن ان کا سرغنہ یہی ہے۔“ فاضلی نے اصرار کیا۔ ”میں کہتا ہوں واپس کرنے کا خطرہ مول نہ لیں

اسے ٹھکانے لگا دیں۔“

”یہ ممکن نہیں ہے اس کے ساتھیوں کو ہٹا چل گیا ہے کہ یہ میرے پاس ہے کسی گم نام کا خر مرشد ہاؤس آچکی ہیں کہ اگر شہباز کو کچھ ہوا تو مرشد ہاؤس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔“

”اتنی جرأت نہیں ہے ان میں.....“

”بات جرأت کی نہیں تھی تیاروں کی ہے جب تم وہ خوفناک گمن حاصل کر سکتے ہو اور اسے استعمال کر سکتے ہو تو شہباز کے ساتھی تم سے زیادہ ان چیزوں کے بارے میں جانتے ہیں۔ وہ بھی خطرناک اسلحہ حاصل کر سکتے ہیں۔ مرشد ہاؤس پر اس پاس کی کسی پہاڑی سے راکٹ فائر کیے جاسکتے ہیں اس کے بعد یہ بے لطف کا ڈھیر نہیں بن جائے گا۔ میں ان لوگوں کی طرح چھپ کر تو نہیں بیٹھ سکتا ہوں۔“ مرشد کے لہجے میں لرزے خدشات سن کر مجھے حقیقی خوشی ہوئی تھی۔ یہ فرعون مفت شخص اب خوف کھانے لگا تھا جب سے ہم اینٹ کا جواب پتھر سے دینا شروع کیا تھا اس کا دماغ ٹھکانے پر آگیا تھا وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کے کسی بھی عمل کا فوری رد عمل ہوگا۔

”بلکہ ہو سکتا ہے وہ اس وقت بھی کسی کارروائی کا منصوبہ بنا رہے ہوں۔“ سیکرٹری نے لقمہ دیا۔ ”بد قسمی سے ہمارے تمام ٹھکانے ان کے علم میں ہیں۔“

”اور یہ سب تیری وجہ سے ہوا۔“ مرشد کا لہجہ غضبناک ہو گیا۔ ”تو کیا سمجھتا تھا جبر بونڈ بن جائے گا۔ تیرا سارا منصوبہ جوتا بن کر تیرے منہ پر پڑ گیا اور الٹا ہی بھی مصیبت میں پھنس گیا۔“

”کیا فرق پڑتا ہے جناب عالی۔“ فاضلی سب سے انداز میں بولا۔ ”یہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“

”پہلے نہیں بگاڑ سکتے تھے لیکن اب یہ بھی طاقتور ہو گئے ہیں اور ہماری نظروں سے چھپے ہوئے ہیں۔ وہ دشمن زیادہ خطرناک ہوتا ہے جو نظروں سے اوجھل ہو۔“

یہ ساری گفتگو بحث اور مباحثہ میرے پاس ہی جاری تھا۔ مرشد اتنا مکمل کر اس وجہ سے بھی بات کر رہا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ دوا مجھ پر اثر کر چکی ہے۔ مرشد نے مجھے بتایا کہ میں دس منٹ میں اپنی شخصیت سے محروم ہو جاؤں گا یعنی میں بھول جاؤں گا کہ میں کون ہوں لیکن اس نے یہ وضاحت نہیں کی تھی کہ میں انسانی خصوصیات سے بھی محروم ہو سکتا ہوں یا نہیں جس میں سب سے اہم بولنا ہے۔ اب تک میں نہ تو اپنے ذہن و سوچ سے محروم ہوا تھا اور نہ ہی میری یادداشت میں کوئی غلط آیا تھا اس کا مطلب تھا دوا مجھ پر اثر نہیں کر سکی تھی۔ مگر میں ان لوگوں کو ایسا ہی تاثر دینا چاہتا تھا کہ دوا مجھ پر اثر کر چکی ہے۔ اگر فاضلی وہاں نہ ہوتا اور مجھ پر شک کا اظہار نہ کرتا تو مجھے اداکاری کرنے میں دشواری پیش نہ آتی۔ مرشد اور سیکرٹری کتنے ہی ہوشیار سی لیکن وہ عملی میدان کے کھلاڑی نہیں تھے۔ ان کے مقابلے میں فاضلی عملی آدمی تھا اور مجھے اسی سے خطرہ تھا کہ وہ میری اداکاری بھانپ لے گا لیکن مجھے یہ رسک تو لینا تھا۔

میں نے آنکھیں کھولیں اور اٹھ بیٹھا۔ مرشد، سیکرٹری اور فاضلی بے ساختہ پیچھے ہوئے تھے۔ ان کے اس رد عمل پر میں نے رد عمل ظاہر کیا اور یوں بیڈ پر سکر گیا جیسے ڈر گیا ہوں۔ میں سبھی نظروں سے ان تینوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میرے رد عمل پر مرشد اور سیکرٹری نے سکون کا سانس لیا سیکرٹری بولا۔ ”دیکھا جناب دوا نے اثر کیا ہے۔“

”یہ اداکاری بھی ہو سکتی ہے۔“ فاضلی نے الٹی رائے دی پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”شہباز..... ذلیل آدمی بولو.....“ وہ گالیاں دینے لگا اور پھر ایسی باتوں پر اتر آیا کہ عام حالات میں، میں اس کی گردن مروڑنے کو ترجیح دیتا لیکن اس وقت میں مجبور تھا۔ میں یوں اس کی بکواس سن رہا تھا جیسے سب کچھ میرے سر سے گزر رہا ہو اور میں اس کے غضبناک انداز سے سہم رہا ہوں۔ میں نے تکیہ سینے سے لگا لیا اور گویا اس کے عقب میں چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے اس رد عمل سے فاضلی کو حوصلہ ہوا اور اس نے آگے آ کر مجھے تھمڑا کرنا چاہا تو میں نے تکیہ آگے کر دیا اور حلق سے کبھی کبھی آوازیں نکالیں۔

”تم بے کاری مشق کر رہے ہو۔“ سیکرٹری نے حقارت سے اسے آگاہ کیا۔ ”ایک ایسے شخص سے دشمنی نکال رہے ہو جو اب دوستی اور دشمنی کا مفہوم ہی نہیں سمجھتا۔“

”میں نہیں مانتا۔“ فاضلی نے مشتعل ہو کر کہا۔ ”یہ اداکاری کر رہا ہے میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”ہو سکتا ہے۔“ مرشد نے کہا۔ ”لیکن ابھی اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔“

”یہ مجھے مار رہا ہے۔“ میں نے مرشد سے شکایت کی۔ ”یہ گندہ ہے۔“

”وہ تینوں جو کئے تھے۔ مرشد نے مجھے غور سے دیکھا۔ ”تم کون ہو؟“

”میں۔“ میں نے کہا اور سوچ میں گم ہو گیا جیسے یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ میں کون ہوں۔ پھر میں نے مرشد کی طرف دیکھا اور الٹا اسی سے سوال کیا۔ ”میں کون ہوں۔“

فاضلی نے ایک بار پھر بکواس کی اور مجھے ناقابل بیان الفاظ میں بتایا کہ میں کون ہوں میں نے پھر مرشد سے شکایت کی۔ ”یہ گالی دے رہا ہے۔“

”فاضلی اپنا منہ بند رکھو۔“ مرشد نے اسے گھر کا پھر زنی سے مجھ سے کہا۔ ”تمہیں کچھ یاد نہیں ہے؟“

”کیا یاد نہیں ہے؟“

”تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟“

”میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں؟“ میں نے اس بار بھی اس کا سوال دہرایا تو مرشد کسی قدر جھنجھلا گیا۔

”جناب اس کے سوالوں سے بھی ظاہر ہے کہ یہ اپنی شخصیت اور ذہن کو چوکا ہے یہ سوچ کر سوال بھی نہیں کر سکتا ہے صرف اپنی حاجت بیان کر سکتا ہے اسے فاضلی سے خوف ہوا تو اس نے شکایت کر دی۔ اسے بھوک لگے گی تب یہ بولے گا ورنہ اسے باقی چیزوں سے کوئی غرض نہیں ہے۔“

”یہ اداکاری ہے۔“ فاضلی تیز لہجے میں بولا۔ ”میں کہتا ہوں اسے میرے حوالے کر۔ میں ایک گھنٹے میں اسے سیدھا کر دوں گا۔“

”ایک گھنٹے میں تم اسے اوجھڑ کر صرف اپنا بدلہ لے سکو گے۔“ سیکرٹری نے تیز لہجے میں کہا۔ ”میں ویڈیو دکھاتے ہیں کہ اکرم چشتی نے اس کے ساتھ کیا کیا اور پورے دن تک اسے اذیت دیتا رہا لیکن وہ اس سے ایک چھوٹا سا مطالبہ نہیں منوا۔ تم کیا تیر مار لو گے۔“

”تیری وجہ سے میں پہلے ہی مشکل میں پڑ گیا ہوں۔“ مرشد نے سیکرٹری کی تائید کی۔ ”اب تو جا کر آرام

کر..... اس کی فکر نہ کر۔“

مرشد نے نرم لہجے میں حکم دیا تھا اور فاضلی اچھی طرح سمجھتا تھا اب اسے یہاں سے چلے جانا تھا۔ اس کے جانے کے بعد مرشد نے سیکرٹری سے کہا۔ ”بھئی اس کا اچھی طرح خیال رکھو۔“

”آپ فکر نہ کریں جناب۔“ سیکرٹری بولا اور وہ دونوں بھی کمرے سے نکل گئے۔ مجھے ان کے لہجے معنی خیز لگے تھے۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ انہوں نے مجھ پر سو فیصد اعتبار کر لیا تھا۔ مشکوک وہ بھی تھے لیکن فاضلی کی طرح شک نہیں کر رہے تھے۔ وہ جانا چاہتے تھے کہ انکشن نے سچ اثر کیا تھا یا نہیں۔ اس کے بعد ہی وہ میرے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرتے۔ میں بستر پر بیٹھ لانا تھا۔ انداز میں کمرے اور اس کی سجاوٹ کو دیکھ رہا تھا یہ مرشد ہاؤس کا کمرہ تھا اور اسی کے معیار سے سجا ہوا تھا۔ کمرے کے ساتھ ہی انچ باتفہ تھا۔ دودن سے مجھے ہاتھ روم جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس لیے میں نے موقع غنیمت سمجھتے ہوئے ہاتھ روم کا رخ کیا۔ جب باہر نکلا تو کمرے میں ایک خادمہ موجود تھی۔ اگرچہ وہ خاصی خوب صورت تھی اور عمر بھی بیس بائیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس نے کپڑے بھی قیمتی پہن رکھے تھے لیکن چہرے کا بھونڈا میک اپ اور اس سے زیادہ بھونڈے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہاں خادمہ تھی اور تمام اقسام کی خدمات مہیا کرتی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے بے تکلفی سے کہا۔ ”میں صدقے کیسی ہے میری سرکار؟“

میں اسے سپاٹ نظروں سے دیکھتا رہا پھر جا کر بستر پر بیٹھ گیا۔ خادمہ اس عدم توجہی پر کھسیا گئی۔ حالانکہ زبان کے ساتھ اس نے جسم کی زبان بھی استعمال کی تھی۔ اس بار وہ روکے لہجے میں بولی۔ ”بھوک لگی ہے؟“

میں نے اپنا پیٹ ٹولا اور سر ہلایا۔ ”ہاں بھوک لگی ہے۔“

میں بولنے کے معاملے بہت محتاط تھا۔ کوشش کرتا تھا وہی لفظ و ہراؤں جو سامنے والے نے کہے ہوں تاکہ میرا غائب دماغی کا تاثر قائم رہے کوئی ایسا جملہ یا لفظ نہ کہوں جس سے ذہانت نظر آئے۔ غلامہ چلی گئی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ ٹرے میں کھانا سجا کر لے آئی اور میں کھانے پر ٹوٹ پڑا میں نے بدتمیزی سے کھانا شروع کر دیا جیسے بچے کھاتے ہیں میں ایک پردہ سزا نوالہ منہ میں ڈال رہا تھا اور لا پرواہی سے کام لیتے ہوئے گرا بھی رہا تھا۔ یہ کڑا ہی نما گوشت اور موٹی تندوری روٹی تھی۔ بہ ظاہر یہ ملازمین کا کھانا تھا بوٹیاں بھی ادھ گلی تھیں۔ میں جان بوجھ کر مسالے میں انگلیاں ڈورہا تھا۔ ڈٹ کر کھانے کے بعد میں نے ملازمہ کی طرف دیکھے بغیر بستر پر دراز ہو کر سر تکیے سے لگا لیا تھا۔ اگرچہ مجھے خود پر بہت جبر کرنا پڑا تھا لیکن میں نے ایسا ظاہر کیا کہ مجھے اپنے گندے ہاتھوں اور ان سے گندے ہو جانے والے کپڑوں کی کوئی پروا نہیں تھی۔ ملازمہ ٹرے اٹھا کر لے گئی۔

ملازمہ کے جانے کے کچھ دیر بعد فاضلی کمرے میں داخل ہوا تو میں چونکا ہوا ہو کر بستر کے کونے میں سمٹ گیا جیسے فاضلی سے خوفزدہ ہوں۔ وہ دانت پیس کر بولا۔

”میرے ساتھ چال بازی نہیں چلے گی۔“

”چال بازی۔“ میں نے سوچ کر کہا۔ ”وہ جو ابھی کھانا لائی تھی۔ وہ چلی گئی۔“

فاضلی کی حالت خاصی بہتر لگ رہی تھی۔ حویلی کے تہہ خانے میں وہ تباہ حال پڑا تھا۔ کپڑے گندے ہو

رہے تھے اور برائے نام خوراک پھر مسلسل ہیروئن کی ڈوز نے اسے کمزور کر دیا تھا لیکن اس وقت وہ نہادھو کر صاف ستھرا لگ رہا تھا۔ یقیناً اس کا فوری علاج شروع ہو گیا تھا اور اس نے ہیروئن استعمال نہیں کی تھی۔ ورنہ وہ غسل نہ کرتا تمام نشہ کرنے والے نہانے سے بھاگتے ہیں کیونکہ اس طرح نشہ اتر جاتا ہے اور انہیں دوبارہ نشہ کے لیے تنگ و دو کرنا پڑتی ہے۔ شاید اسے ہیروئن کے نشہ کے خلاف کوئی زود اثر دوا استعمال کرائی گئی تھی۔ اب اس قسم کی دوائیں آچکی ہیں جو ایک دو ہفتے میں نشہ چھڑوا دیتی ہیں لیکن اس میں اہم کردار نشہ کرنے والا کا ہوتا ہے اگر وہ نشہ چھوڑنا چاہتا ہے تو علاج کا رگر ہوتا ہے دوسری صورت میں دنیا کا کوئی علاج کارگر ثابت نہیں ہوتا ہے۔ فاضلی مضبوط قوت ارادی کا مالک تھا اور ہیروئن نے اتنی جلدی اس کے اعصاب کو تباہ نہیں کیا تھا اس لیے وہ سنبھل جاتا اور جلد اس نشہ سے چھٹکارا حاصل کر لیتا۔

میرا خیال تھا کہ میرے جواب پر فاضلی سب پا ہو جائے گا لیکن وہ سنجیدہ رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ”شہباز میں جانتا ہوں تم ہوش میں ہو، لیکن فکر مت کرو میں مرشد سے یہ بات نہیں کروں گا۔ بشرطیکہ تم بھی بھول جاؤ کہ ہیروئن کی طلب میں، میں نے تم لوگوں کو کیا کیا بتایا ہے۔“

میں نے دل ہی دل میں اسے برا بھلا کہا وہ مرشد کے دل میں شک پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اب کہہ رہا تھا کہ وہ مرشد کو کچھ نہیں بتائے گا۔ ساتھ ہی وہ نہایت چالاکی سے مجھے دھکا رہا تھا کہ میں مرشد کو اس کے بارے میں نہ بتاؤں۔ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ اس صورت خود میرا راز فاش ہو جاتا۔ میرے لیے زبان بند رکھنے اور انجان بنے رہنے میں عافیت تھی۔ فاضلی کی بات کے جواب میں، میں کوئی رد عمل ظاہر کیے بغیر اسے گھورتا رہا۔ فاضلی نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”مرشد تمہارا دشمن ہے وہ تمہیں مردادے گا۔“

میں نے آنکھیں پھیلانیں اور ڈرے ڈرے انداز میں بولا۔ ”مار دے گا۔“

”ہاں اسے یقین ہے تم بنے ہوئے پاگل ہو اور حقیقت میں پوری طرح ہوش میں ہو۔“

”میں پاگل ہوں؟“ میں نے سوچ کر سوال کیا۔

فاضلی نے ایک بار پھر دانت پیسے۔ ”شہباز میں کہتا ہوں ہوش میں آؤ ورنہ تمہارے ساتھ بہت برا ہونے والا ہے۔“

”بچاؤ..... بچاؤ۔“ میں نے لاؤڈ اسپیکر جیسی آواز نکالی اگرچہ اس کے لیے مجھے اپنے ہیمپھروں اور گلے کی قوت کو آخری حد تک استعمال کرنا پڑا تھا لیکن میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ فوراً ہی سیکرٹری اندر رکھس آیا شاید وہ کہیں آس پاس ہی موجود تھا۔ میں بستر سے کودا اور اس سے چٹ گیا۔ وہ بوکھلا گیا اس کا خیال تھا کہ میں نے اس پر حملہ کیا ہے۔ اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن میں اس طرح چٹنا تھا کہ وہ آسانی سے نہیں چھڑا سکتا تھا۔ وہ جتنا خود کو چھڑانے کی کوشش کرتا میں اتنا ہی اس سے چٹ رہا تھا اور ساتھ ہی چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔

”بچاؤ..... بچاؤ۔“

”کس سے بچاؤں..... چھوڑ مجھے..... تیری تو.....“

فاضلی اس کی مدد کرنے کے بجائے بے تحاشہ ہنس رہا تھا۔ اس نے طنز یہ انداز میں کہا۔ ”اب خود کو چھڑا کر دکھاؤ سیکرٹری صاحب..... تمہیں بھی پتا چلے ان معاملات میں آدمی کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔“

اب سیکرٹری بھی شور کر رہا تھا اور شاید شور سن کر ہی مرشد خود وہاں چلا آیا۔ اس نے گرج کر کہا۔ ”کیا ہو رہا ہے یہ؟“

میں نے سیکرٹری کو چھوڑا اور مرشد سے چٹ گیا۔ ”مجھے بچاؤ یہ مجھے مار دے گا۔“
میں نے کسی کی طرف اشارہ نہیں کیا تھا اور میری ساری توجہ مرشد کو پکڑے رکھنے پر تھی۔ وہ بھی بوکھلا گیا اس نے پہلے خود چھڑانے کی کوشش کی پھر فاضلی سے کہا۔ ”اسے دور کرو۔“
فاضلی نے مجھے گردن سے پکڑ کر کھینچا تو میں نے سعادت مندی سے مرشد کو چھوڑ دیا اور پھر شکایتی لہجے میں کہا۔ ”یہ گندہ آدمی مجھے مارے گا۔“

مرشد نے خون خوار نظروں سے فاضلی کی طرف دیکھا۔ ”تو یہاں کیا کر رہا ہے۔“

”میں اسے دیکھنے آیا تھا۔“ فاضلی جلدی سے بولا۔

”اور میں شور سن کر آیا تو یہ مجھ سے چٹ گیا۔“ سیکرٹری نے مرشد کے پوچھنے سے پہلے وضاحت کی۔ ”یہ بہت خوفزدہ تھا۔ جناب یہ ہوش کھو چکا ہے۔“

جب میں نے مرشد کو پکڑا تو وہ خوف زدہ ہو گیا لیکن اب وہ بھی سوچ میں پڑ گیا تھا میں نے صرف اسے پکڑا تھا اور اس کے خلاف کوئی جارحانہ کارروائی نہیں کی تھی۔ میرا انداز فطری تھا حالانکہ اس بہانے میں نے مرشد اور سیکرٹری کے کپڑوں سے اپنے گندے ہاتھ اچھی طرح صاف کر لیے تھے۔ میں اچھی طرح سمجھتا تھا کسی جارحانہ کارروائی کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میں مرشد یا کسی کو نقصان پہنچا کر یہاں سے نہیں نکل سکتا تھا۔ فی الحال میری عافیت اسی میں تھی کہ اپنا ڈرامہ جاری رکھوں۔ اگر مرشد کو یقین آ جاتا کہ دوانے مجھے بے کار کر دیا تب وہ شاید مجھے رہا کرنے کا فیصلہ کر لیتا مگر فاضلی منوس نے پہلے اس کے ذہن میں شک کے بیج بو دیے تھے اور اب میرے سامنے ہمدرد بن رہا تھا۔ سیکرٹری نے مجھ سے جان چھوٹنے پر سکون کا سانس لیا تھا اور وہ باہر جاتے ہوئے بولا۔

”اس سے جان چھڑائیں جناب..... یہ پورا پاگل ہو گیا ہے۔“

”اچھا۔“ مرشد نے دلچسپی سے مجھے دیکھا۔

”بہتر ہو گا کسی دماغ کے ڈاکٹر کو دکھالیں۔“ فاضلی نے ایک بار پھر یوں ٹرن لیا۔ مرشد نے سر دونظروں سے اسے دیکھا اور وہاں سے دفع ہو جانے کا حکم دیا۔ خود مرشد مجھے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتا رہا تھا۔ اس وقت وہ کمرے میں اکیلا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے خاصی حد تک یقین ہو گیا تھا کہ میں اپنا شعور کھو چکا ہوں۔ اس نے نرمی سے کہا۔ ”تم شبہ باز ہو۔“

”میں شبہ باز ہوں۔“ میں نے بے یقینی سے کہا۔

”نہیں تم بلی ہو۔“

”مین بلی ہوں۔“ میں نے فوراً تسلیم کر لیا۔

”بلی کی طرح بول کر دکھاؤ۔“

اگر میں بلی کی طرح بولتا تو یہ حماقت ہوتی اس سے ظاہر ہوتا کہ کچھ چیزیں میری یادداشت میں ہیں۔ اس

لیے میں اس کی طرف دیکھا۔ ”بلی کی طرح کیسے بولتے ہیں؟“

”جہیں نہیں معلوم کہ بلی کی طرح کیسے بولتے ہیں؟“

میں بے تاثر رہا اور سوال کا جواب بھی نہیں دیا۔ مرشد نے میرا معائنہ جاری رکھا تھا اور اب اس نے بھی اپنا چہرہ سپاٹ کر لیا تھا۔ اچانک اس کے لباس سے ٹون کی آواز آئی اور اس نے ایک چھوٹا سا ٹاکی سیٹ نکالا۔ شاید مرشد ہاؤس کی حد میں رابطے کے لیے ڈاکی ٹاکی استعمال کیے جاتے تھے۔ اس نے ایک مٹن دیا اور بولا۔ ”ہاں بولو.....“

”اکرم چشتی آیا ہے جناب آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“ میں نے سیکرٹری کی مدغم آواز سنی۔

”اسے یہاں بھیج دو میں گیسٹ ہاؤس میں ہوں۔“

چند منٹ بعد اکرم چشتی اندر آیا وہ سادہ لباس میں تھا۔ یہ بہت اعلیٰ درجے کا قہری بیس سوٹ تھا لیکن اس پر یوں چڑھا ہوا تھا جیسے کسی لکڑی جھگے کو سوٹ پہنا دیا جائے۔ اس نے آتے ہی مشکوک نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر مرشد سے بولا۔ ”جناب عالی یہ میں کیساں رہا ہوں..... یہ پاگل ہو گیا ہے؟“

”ظاہر ہے۔“ مرشد نے سر ہلایا۔ ”تم نے اس کے ساتھ جو کیا تھا اس کے بعد آدمی پاگل ہی ہوتا ہے۔“

”ڈرامہ کر رہا ہے یہ۔“ وہ مدح کی سے بولا۔ ”مزید تفتیش سے بچنے کے لیے سارے طرم اس قسم کی ڈرامے کرتے ہیں لیکن ڈرامہ گروم میں جاتے ہی دو منٹ میں سارے ڈرامے بھول جاتے ہیں۔“

”خوب تم آدمی کو مار مار کر انسان سے دنپہ بنا دو، اس کی کھال کھینچو اور اس میں بھس بھر کر کہو کہ وہ ڈرامہ کر رہا ہے۔“ مرشد نے طنز کیا۔

”جناب عالی آپ کے لیے ہی سب کرتے ہیں ہمیں کسی کو مفت میں مارنے کا شوق تو نہیں ہے۔“ اکرم چشتی نے جوابی طنز کیا۔

”میں سوچ رہا ہوں اسے چھوڑ دوں۔“ مرشد نے اس کا طنز نظر انداز کر کے کہا تو اکرم چشتی چوکتا ہو گیا۔

”اسے کیوں چھوڑ رہے ہیں اگر آپ کے کام کا نہیں رہا ہے تو میرے حوالے کر دیں۔ ویسے بھی اس کی گرفتاری کے لیے خصوصی ٹیم بنی ہے میری واہ واہ ہو جائے گی۔“

یہ سن کر میرا خون خشک ہو گیا۔ اکرم چشتی کے ہاتھ آنے کا مطلب تھا وہ مجھ پر مشق ستم کرنے کے لیے بالکل آزاد ہو جاتا یہاں تو وہ جو کر رہا تھا۔ وہ مرشد کی ہدایات کے مطابق کر رہا تھا۔ اس پر بھی اس نے میرا حشر نشر کر دیا تھا۔ مگر مرشد کے انکار سے میری جان میں جان آئی۔ اس نے کہا۔ ”یہ ممکن نہیں ہے..... اس کے ساتھیوں کی طرف سے دھمکیاں مل رہی ہیں اور وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔“

اکرم چشتی نے خطرناک لوگوں کو ایک غلیظ گالی دی اور بولا۔ ”آپ ان کی نگر نہ کریں..... ایک بار اس سانپ کا سر جکڑ دیں باقی سنو لیے خود فرار ہو جائیں گے کوئی آپ کے سامنے نہیں آئے گا پھر ہم ہیں آپ کی حفاظت کے لیے۔“

”تم پولیس والے۔“ مرشد نے پھر طنز کیا۔ ”آج کل تم بے چاروں سے اپنی حفاظت نہیں ہو پا رہی۔“
میری حفاظت کہاں سے کرو گے ویسے بھی میں اپنی حفاظت خود کرنے کا قائل ہوں لیکن میں اب ان لوگوں سے

ہوئے گراتا تو وہ ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ برا بھلا کہنے سے بھی گریز نہیں کرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ مجھے سنا کر اور برتن لے کر رخصت ہوئی تو میں مسکرا رہا تھا۔ اس کے بعد میں انتظار کرنے لگا کہ ابھی مرشد یا اس کے گرگوں میں سے کوئی آئے گا لیکن دن گزرتا گیا اور کوئی سند یہ نہیں آیا۔ میرا اضطراب بڑھ رہا تھا کیونکہ مرشد کو سوچ و بچار کا جتنا موقع ملتا میرے بارے میں اس کے ذہن میں زیادہ منفی خیالات آتے اور ان خیالات کے نتیجے میں اس کے شکوک بڑھتے تو میری رہائی کا امکان اتنا ہی کم ہوتا جاتا۔

مگر میں اس معاملے میں بے بس تھا۔ اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا تھا جو اس وقت کر رہا تھا۔ ہاں دعا ضرور کر سکتا تھا کہ اللہ میرے دشمنوں سے عقل سلیم چھین لے اور ان کو غلطی کرنے کی توفیق عطا فرمائے لیکن ان کو اس غلطی پر پہچتانے کی مہلت نہ دے۔ یہ پورا دن بھی اداکاری کرتے گزر گیا اور شام تک میں اتنا عادی ہو گیا تھا کہ اب مجھے فائر العقلی کی اداکاری کرنے کی کوشش نہیں کرنا پڑ رہی تھی بلکہ خود بہ خود اداکاری جاری تھی۔ مجھے لگنے لگا کہ اسی طرح میں اداکاری کرتا رہا تو چند دن بعد سچ بچ ہوش و حواس سے ہاتھ دھو بیٹھوں گا۔ اس سارے دن میں کمرے کی چیزوں اور آرائشی اشیاء کا معائنہ کر کے مجھے خاصی حد تک یقین ہو گیا تھا کہ یہاں کوئی خفیہ کیمرا نہیں ہے لیکن مائیک کی موجودگی عین ممکن تھی۔ اس کے باوجود میں نے ہوش کے مظاہرے سے گریز کیا۔ رات کا کھانا حسب معمول خادمہ کو پیش دلا کر کھایا اور وہ صفائی کے بعد مجھے برا بھلا کہتی ہوئی رخصت ہوئی۔

میں سونے کے لیے لیٹا تھا کہ فاضلی ایک مسلح آدمی کے ساتھ اندر آیا۔ اس نے کہا۔ ”اٹھ جا شہزادے تیری طبی ہوئی ہے۔“

میں نے اٹھ کر اسے سوالیہ انداز میں دیکھا تو اس نے مجھے ہاتھ پکڑ کر بستر سے کھینچ لیا۔ میں چاہتا تو اسے جوباب کھینچ کر بستر پر لٹا دیتا اور ہمیشہ کی نیند سلا دیتا۔ جیسے ہی میں اپنے پیروں پر کھڑا ہوا اس نے مجھے دروازے کی طرف دھکا دیا۔ اس کے ساتھ آنے والا مسلح شخص پوری طرح مستعد تھا اور اس کے ہاتھ میں چھوٹی نال والی لیکن نہایت مہلک شاٹ گن تھی۔ اس کا فائرزدیک سے کسی کے چیتھڑے اڑانے کے لیے کافی تھا۔ گارڈ تربیت یافتہ تھا کیونکہ اس نے مجھ سے مخصوص فاصلہ برقرار رکھا تھا۔ وہ مجھے لے کر باہر آئے۔ مرشد ہاؤس کا یہ حصہ عام ملازموں کے لیے ممنوع تھا کیونکہ وہاں گنے چنے افراد ہی نظر آئے۔ فاضلی مجھے ایک بڑے کمرے میں لایا اور بہ ظاہر یہ طبی امداد کے لیے مخصوص لگ رہا تھا کیونکہ وہاں دواؤں کی بوتلیں اور فرسٹ ایڈ میں کام آنے والا سامان رکھا تھا۔ ایک لبا بیڈ تھا جس پر لٹا کر زخمی یا مریض کا معائنہ کیا جاتا تھا۔

”یہاں لیٹ جاؤ۔“ فاضلی نے مجھے حکم دیا اور میں نے اس کی تعمیل کی میں اس سے خوف ظاہر کر رہا تھا اور میں دیکھ رہا تھا اسے اس کی بہت خوش ہو رہی تھی اس لیے وہ کوشش کر رہا تھا کہ مجھ سے زیادہ درشت انداز میں پیش آئے تاکہ میں اور سہم جاؤں۔ فاضلی کمرے سے نکل گیا تھا۔ ایک منٹ بعد ایک ادھیڑ عمر گول منول سا شخص اندر آیا۔ اس نے گول فریم والی عینک لگا رکھی تھی۔ فاضلی اس کے پیچھے تھا اس نے گول منول آدمی سے کہا۔

”اس کو دیکھو..... یہ پاگل بنا ہوا ہے یا بچ پاگل ہو چکا ہے۔“

گول منول آدمی ڈاکٹر تھا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے اسے زبردستی اس کام کے لیے لایا گیا تھا

گرمی سے بچانا ہوتا ہے لیکن میں نے انجکشن کنٹینر سے نکال کر خاصی دیر اپنے ہاتھ میں رکھا تھا اور پھر فاضلی نے اسے میرے بازو میں انجکٹ کر دیا تھا۔ وہ تقریباً دس منٹ کنٹینر سے باہر رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اتنی دیر میں باہر کی گرمی نے دوا کی کمپوزیشن کو متاثر کیا ہو اور وہ اپنی افادیت کھو بیٹھی ہو۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ یہ زردی دوا تھی اور فاضلی نے میرے بازو کے پٹھے میں سوئی گھسا دی تھی۔ ظاہر ہے دوا بھی پٹھے میں گئی اور اسے خون میں شامل ہونے میں خاصا وقت لگا جس سے دوا بے اثر ہو گئی۔ ان میں سے کوئی وجہ ہو سکتی تھی۔ بہر حال اصل وجہ اللہ کی طرف سے مدد تھی۔ جب تک اس کا حکم نہ ہو کوئی آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکتا اور جب اس کا حکم آجائے تو کوئی آپ کو بچا نہیں سکتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ جب وقت نہیں آتا تو لوگ بدترین حادثوں اور بیماریوں سے بھی بچ جاتے ہیں اور جب وقت آتا ہے تو بیٹھے بیٹھے مر جاتے ہیں۔

خادمہ دوپہر کا کھانا لائی تھی۔ اس کے خاصی دیر بعد مجھے رات کا کھانا ملا تھا۔ حالانکہ دوپہر میں، میں نے ڈنٹ کر کھایا تھا۔ مگر اس وقت مجھے دوبارہ بھوک لگ گئی تھی۔ اس بار چادل کے ساتھ دال تھی اور آلو کی بھیجا تھی۔ ظاہر ہے اس بار بھی کھانا ملازموں کے کچن سے آیا تھا اور یہ بھی غنیمت تھا ورنہ اب تک تو ماری کھاتا آیا تھا۔ شکر ہے اس بار وہ سچ لائی تھی اس لیے میرے ہاتھ گندے ہونے سے بچ گئے اور کھانا اس نے میز پر لگایا تھا اس لیے بستر بھی صاف رہا۔ میں نے ندیدے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے میز پر گر گیا جو خادمہ نے خاصا برامان کر صاف کیا اور جاتے جاتے مجھے بہت کچھ سنا گئی۔ میں نے اس کی بک بک ایسے سنی جیسے بھینس مین کی آواز سنتی ہے۔ کھانے کے بعد میں بچوں کی طرح سکڑ سٹ کر بیڈ پر لیٹ گیا حالانکہ یہ خاصا برا بیڈ تھا۔ میں نے چہرہ نیکیے میں چھپا لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہاں کوئی کیمرا لگا تھا تو اس میں میرے چہرے پر فکر انگیز تاثرات نظر آئیں۔

کچھ دیر میں کرٹوش لیٹا رہا پھر اٹھ کر لائٹ کے سوچ آف کر دیئے۔ کمرے میں تاریکی چھا گئی اور میں سکون سے لیٹ کر سو گیا۔ اگرچہ رات کی تاریکی میں بھی دکھانے والے کیمرے اب عام ہیں لیکن وہ چہرے کے تاثرات نہیں دکھاتے ہیں۔ رات کسی نے مداخلت نہیں کی اور میں آرام سے سو تا رہا۔ صبح ہوئی تو میری آنکھ خود ہی کھل گئی۔ رات مجھے غور و فکر کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ مگر اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ اصل کام یہ تھا کہ میں اپنی اداکاری برقرار رکھوں اور مرشد کے یقین کو پکا کرتا رہوں کہ میں اپنی یادداشت اور عقل کھو چکا ہوں۔ اس اداکاری پر ہی میری رہائی کا انحصار تھا لیکن دوسری طرف مرشد کو بہکانے والوں کی کمی بھی نہیں تھی۔ ان میں سرفہرست فاضلی تھا جو تنہائی میں میرا ہمدرد بن رہا تھا لیکن اصل میں وہ بہر صورت مجھے اس دنیا سے رخصت کرنا چاہتا تھا۔ اسے شدید خطرہ تھا کہ میری یادداشت درست ہو گئی اور میں نے مرشد کے سامنے اس کا بھانڈا پھوڑ دیا تو میرے بجائے اسے دنیا سے رخصت ہونا پڑے گا۔

مجھے بھوک اتنی نہیں لگ رہی تھی لیکن میں نے بے قراری زیادہ دکھائی تھی۔ کچھ دیر کمرے میں ٹھٹھٹا رہا پھر دروازے پر ہاتھ مارے۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا یعنی آدھے گھنٹے بعد وہی طرح دار خادمہ ناشتہ لے آئی۔ پہلی بار وہ آئی تو خاصی پُر جوش تھی۔ اس کے خیال میں اس کے حلقہ عشاق میں ایک احق کا مزید اضافہ ہو گا لیکن جب اس نے دیکھا کہ متوقع احق تو کسی نو لوموڈ کی طرح اس سے بے نیاز تھا تو اس کا سارا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا تھا اور اب وہ میری شکم سیری کی خدمت مارے باندھے کر رہی تھی اور جب میں کھاتے

ہے۔

فاضلی نے شک سے پوچھا۔ ”تمہارا مطلب ہے یہ اداکاری نہیں کر رہا ہے؟“

”امکان ہے۔“ ڈاکٹر اب کسی قدر سنجیدہ لگا تھا۔ ”ویسے اسے ہوا کیا ہے؟“

”ممکنہ طور پر اسے کوئی ایسی دوا دی گئی ہے جو دماغ پر اثر کرتی ہے اور یادداشت ختم کر دیتی۔“

”اس صورت میں تو یہ معاملہ اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ اس کے ٹیسٹ ہوں گے اور پتا چلایا جائے گا کہ اسے کون سی دوا دی گئی ہے۔ تب جا کر فیصلہ ہوگا کہ اس کا دماغ متاثر ہوا ہے اور کس حد تک متاثر ہوا ہے۔“

”ٹیسٹ کی ضرورت نہیں ہے ویسے بھی وہ دوا اپنا نشان نہیں چھوڑتی ہے ہمیں صرف یہ پتا چلانا ہے کہ اس کے دماغ پر کس حد تک اثر ہوا ہے۔“

”اس کے لیے اسے کلینک لے جانا ہوگا۔“

فاضلی بگڑ گیا۔ ”گلتا ہے تم ڈاکٹر نہیں گھسیارے ہو۔“

”میری دوسری بیوی بھی یہی کہتی ہے۔“ ڈاکٹر جلدی سے بولا۔

”ٹھیک کہتی ہے۔“ فاضلی نے اسے دروازے کی طرف دھکیلا اور پھر گاڑ سے بولا۔ ”ہوشیار رہنا میں اسے ٹھکانے لگا کرتا ہوں۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہیں جناب؟“ ڈاکٹر چلایا۔ ”آپ نے تو کہا تھا مجھے بحفاظت واپس چھوڑ دیں گے۔“

”تجھے بحفاظت تیرے ٹھکانے تک ہی چھوڑنے جا رہا ہوں۔“ فاضلی نے اسے کمرے سے باہر دھکیلا۔

کچھ دیر ڈاکٹر کا دوا دیکھنا سنا دیتا رہا پھر خاموشی چھا گئی۔ گاڑی کمرے میں آتے ہی ایک کونے میں چلا گیا تھا جہاں سے وہ مجھے پوری طرح نشانے پر رکھے ہوئے تھا اور اس دوران میں اس نے ایک لمحے کے لیے بھی توجہ مجھ پر سے نہیں ہٹائی تھی۔ وہ مرشد کے عام نگاروں سے مختلف نظر آ رہا تھا۔ اس کے انداز میں ایک پیشہ ورانہ جھلک تھی۔ جیسے دسم کے ساتھیوں میں تھی۔ مجھے اس غدار کا خیال آیا جسے غداری کا صلہ موت کی صورت میں ملا تھا۔ اس نے دس لاکھ کے لالچ میں اپنی زندگی فروخت کر دی تھی اور اللہ ہی بہتر جانتا تھا کہ سستی بچی تھی یا مہنگی۔ فاضلی کی پہلی کوشش ناکام رہی تھی۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ آرام سے بیٹھ جاتا۔ دودن میں اس کی حالت میں نمایاں فرق آیا تھا اور کم سے کم ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے ہیرن کی ذہنی طلب سے نجات حاصل کر لی تھی۔ جسمانی طلب کے لیے یقیناً اس کا علاج جاری تھا۔ دواؤں اور خوراک سے اس کا سابقہ دم خٹا لوٹ آیا تھا۔

فاضلی کے جانے کے آدھے گھنٹے بعد مرشد اور سیکرٹری کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک اضافی محافظ اور بھی تھا۔ وہ دروازے پر رک گیا تھا۔ مرشد نے کمرے میں موجود محافظ سے رپورٹ طلب کی اور اس نے لفظ بہ لفظ رپورٹ دی۔ مرشد کے چہرے پر ناگواری نظر آنے لگی۔ ”یہ کیا احمقانہ حرکتیں کر رہا ہے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں اسے خود ڈاکٹر کو دکھانے کی ضرورت ہے۔“ سیکرٹری نے مرشد کی تائید کی۔

اس نے بادل ناخواستہ میری طرف پیش قدمی کی اور پاس آ کر پہلے میری آنکھوں کا معائنہ کیا۔ نبض دیکھی اور پھر فاضلی کی طرف دیکھا۔ ”تم اسے پاگل کیوں کہہ رہے ہو؟“

”کیا یہ اپنی یادداشت اور شخصیت کھو چکا ہے؟“

گول منول آدی نے بے بسی سے کہا۔ ”یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں۔“

”تم نیوروفزیشن ہو۔“ فاضلی غرایا۔ ”اتنی سی بات نہیں بتا سکتے؟“

”ایسے کیسے بتا سکتا ہوں۔“ گول منول ڈاکٹر نے رد دینے والے لہجے میں کہا۔ ”تم مجھے میرے کلینک سے مگن پوائنٹ پر اٹھالائے ہو اور مجھ سے اس شخص کی ذہنی حالت کے بارے میں پوچھ رہے ہو، میری خود اپنی

حالت خراب ہو رہی ہے۔ پتا نہیں صبح کس کا منہ دیکھا تھا..... ہاں یاد آیا اپنا ہی دیکھا تھا شیو کرتے ہوئے..... پہلی بیوی اللہ اسے کبھی نہ بخشے مجھے ہمیشہ منحوس کہا کرتی تھی۔ آج خیال آتا ہے ٹھیک کہتی تھی۔“

مجھے ہنسی آنے لگی لیکن میں بالکل سنجیدہ رہا کیونکہ ڈاکٹر رو رہا تھا اور اس کی ذہنی حالت واقعی خراب نظر آ رہی تھی۔ وہ جلدی جلدی بول کر اپنی فرسٹریشن نکال رہا تھا درحقیقت خود اسے طبی امداد کی ضرورت تھی۔ میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔ ”یہ رد رہا ہے؟“

”نہیں گارہا ہوں۔“ ڈاکٹر نے جل کر کہا۔ ”جب میں روتا ہوں تو میری دوسری بیوی یہی کہتی ہو۔ اللہ اسے جلد جہنم رسید کرے۔“

یہ ظاہر ڈاکٹر بیویوں کا ستم رسیدہ لگ رہا تھا۔ وہ دوسروں کے اعصاب اور دماغ کا علاج کرتا تھا لیکن خود اس کے ذاتی اعصاب تباہ لگ رہے تھے۔ فاضلی کو اٹھالانے کے لیے یہی ایک نمونہ ملا تھا۔ اس نے زنج لہجے میں کہا۔ ”ٹھیک ہے تم ایسے نہیں بتا سکتے لیکن پھر کس طرح بتا سکتے ہو اس شخص کے بارے میں۔“

”اسے میرے کلینک لے آؤ میں اسے وہاں داخل کر لیتا ہوں پھر مختلف ٹیسٹوں کی مدد سے پتا چلے گا۔“ فاضلی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اگر اسے کسی کلینک یا اسپتال لے جا سکتے تو تمہیں اٹھالانے کا مشکل کام کیوں کرتے؟“

”پھر میں کیسے پتا کر سکتا ہوں۔ یہ دماغ کا معاملہ ہے اوپر سے کچھ پتا نہیں چلتا ہے۔“

”تم اس سے سوال کر کے تو کچھ اندازہ کر سکتے ہو؟“

گول منول ڈاکٹر نے میری طرف دیکھا اور اپنے ماتھے پر آئے پسینے کو صاف کر کے مجھ سے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

میں نے غور کیا اور الٹا سوال کیا۔ ”میرا نام کیا ہے؟“

”اسے تو اپنا نام بھی نہیں معلوم۔“ ڈاکٹر نے فاضلی سے کہا۔

”اداکاری کر رہا ہے یہ۔“ فاضلی بگڑ کر بولا۔

اپنی جان چھڑانے کے لیے ڈاکٹر نے مجھ سے کئی سوالات کیے اور میں نے تقریباً ہر سوال سے ایک سوال پیدا کر لیا۔ اس نے مایوس ہو کر نفی میں سر ہلایا۔ ”ایسے پتا نہیں چلے گا..... کہ یہ اداکاری کر رہا ہے یا جیج اپنی شخصیت کھو چکا ہے۔ ویسے اس نے جو جواب دیئے ہیں وہ ایک یادداشت اور عقل سے محروم شخص ہی دے سکتا

”بہر وئیں کے اثرات آدمی کا دماغ بھی الٹ دیتے ہیں۔“

میں اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور ہیڈ سے پاؤں لٹکا کر جھلا رہا تھا۔ مرشد نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ”میرا خیال ہے اب اسے چھوڑ دینا چاہیے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ سیکرٹری نے پھرتا سید کی تو میں نے دل ہی دل میں اسے شاباشی دی۔

”لیکن، فاضلی.....“ مرشد بولتے بولتے رک گیا۔

”آپ اس کی بات پر اتنی توجہ کیوں دیتے ہیں۔“ سیکرٹری نے ماسے قائل کرنے کی کوشش جاری رکھی۔

”مالک آپ ہیں وہ صرف ایک معمولی نوکر ہے۔“

سیکرٹری غالباً فاضلی کی اصل حقیقت سے واقف نہیں تھا لیکن مرشد کے انداز سے لگتا تھا وہ جانتا ہے کہ فاضلی اس کا بیٹا ہے اور شاید کسی وجہ سے مرشد اس کے بارے میں نرم گوشہ بھی رکھتا تھا۔ اس سے وہ فاضلی کو عام ملازم سے زیادہ اہمیت دینے پر مجبور تھا۔ بلکہ عام ملازم کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ مرشد انہیں شطرنج کے پیادوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ وہ بے دریغ انہیں استعمال کرتا اور جب ضرورت پڑتی تو پتوڑ کر ایک طرف ڈال دیتا تھا۔ فاضلی کی اس کے نزدیک اہمیت تھی اور وہ اسے واپس حاصل کرنے کے لیے بے چین تھا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ مرشد اس لیے اسے واپس حاصل کرنا چاہتا ہے کہ فاضلی اس کے اہم ترین رازوں سے واقف ہے لیکن اب مجھے لگ رہا تھا کہ فاضلی کی واپسی میں مرشد اور اس کے درمیان اس تعلق کا عمل دخل تھا جو ان دونوں نے سب سے اور شاید ایک دوسرے سے بھی چھپا رکھا تھا۔ یعنی مرشد جانتا تھا کہ فاضلی اس کا نطفہ ہے لیکن وہ سمجھتا تھا فاضلی یہ بات نہیں جانتا ہے۔ اسی طرح فاضلی سمجھتا تھا کہ اس حقیقت سے مرشد ناواقف ہے کہ وہ اس کا باپ ہے۔

لیکن مرشد واقف تھا ورنہ وہ فاضلی کو اتنی اہمیت نہ دیتا اور نہ اسے اپنے آدمیوں میں سب سے اوپر لاتا۔ سیکرٹری اس کے خلاف تھا لیکن وہ مرشد کو فاضلی کی مرضی کے خلاف قدم اٹھانے پر آمادہ کرنے میں ناکام نظر آ رہا تھا۔ کم سے کم اس وقت مجھے مرشد کے تاثرات سے ایسا ہی لگ رہا تھا کہ وہ فاضلی کی مرضی کے بغیر مجھے رہا کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اور دوسرے فاضلی میرے دماغی محاسبے پر بہ ضد تھا۔ اس نے خود مجھے وہ مہلک انجکشن لگایا تھا اور مرشد نے یقیناً اسے دوا کے بارے میں بتا دیا ہوگا اور اس شخص کو بھی دکھا دیا ہوگا جس پر اس نے انجکشن کا تجربہ کیا ہوگا۔ اس کے باوجود فاضلی کو یقین نہیں آ رہا تھا غالباً اسے یہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اتنی آسانی سے کیسے شکار ہو گیا اور اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا تھا۔ وہ اپنا شک رفع کرنا چاہتا تھا۔ سیکرٹری اس دوران میں مرشد کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھ سے نجات حاصل کر لی اور میرے ساتھیوں کے حوالے کر دیا جائے۔ انہیں یہی بتایا جائے کہ تشدد نے میرا دماغ الٹ دیا اور وہ بے چارے اس امید پر میرا علاج کراتے رہیں گے۔

”وہ اس میں لگ جائیں گے اور آپ کی جان چھوٹ جائے گی۔“

”وہ اتنی آسانی سے جان چھوڑنے والے لوگ نہیں ہیں۔“ مرشد نے نفی میں سر ہلایا۔ ”لیکن یہ خیال بھی اچھا ہے اس طرح ان کی توجہ عارضی طور پر ہٹ جائے گی۔“

سیکرٹری اس جواب سے خوش ہوا اور اس نے کوشش مزید تیز کر دی۔ ”اس کا ایک پہلو اور بھی ہے جناب، جب تک اسے رہا نہیں کیا جائے گا اس کے ساتھی چین سے نہیں بیٹھیں گے اور وہ اسے رہا کرانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ وہ ہمارے کسی ٹھکانے پر حملہ بھی کر سکتے ہیں۔“

مرشد کے ماتھے پر شکنیں آگئیں۔ اس کا امکان تھا کہ دسم اور میرے دوسرے ساتھی میرے لیے مرشد کے کسی ٹھکانے پر کارروائی کریں۔ اسے نقصان برداشت کرنا پڑتا۔ اس نے پھرتا سید کی۔ ”ہاں اس کا امکان تو ہے، ویڈیو دیکھنے کے بعد ان کے مشتعل فون آرہے تھے۔“

”بس تو مناسب یہی ہے کہ اس سے جلد از جلد جان چھڑالی جائے۔“

ایسا لگ رہا تھا کہ مرشد سیکرٹری سے تو متفق تھا لیکن وہ فاضلی کو قائل نہیں کر پاتا تھا اور اصل مسئلہ یہی تھا۔ فاضلی کمرے میں داخل ہوا تو سیکرٹری برا سامنے بنا کر خاموش ہو گیا۔ فاضلی نے اسے گھورا اور مرشد سے کہا۔ ”اسے کسی اسپتال یا کلینک میں لے جا کر دکھانا ضروری ہے۔“

”یہ بالکل مناسب نہیں ہوگا، بات جتنے زیادہ لوگوں تک جائے گی ہمارے لیے اتنی ہی مشکلات پیدا ہوں گی۔“

”کوئی مشکل نہیں ہوگی۔“ فاضلی نے تیز لہجے میں کہا۔ ”اگر ہوئی بھی تو ہم کس لیے ہیں، کیا ہم نے چوڑیاں پہن رکھی ہیں۔“

سیکرٹری نے پھر برا سامنے بنایا اور مرشد سے بولا۔ ”میرا خیال ہے جناب عالی آپ اسے ہی اپنا مشیر بنا لیں، آنے والے انتخابات میں آپ کے راستے کی تمام رکاوٹیں یہ اکیلا دور کر لے گا۔“

”تم نے ٹھیک کہا یہ کام بالآخر ہم جیسے لڑنے مرنے والوں کو کرنا پڑے گا الیکشن اب مشوروں کا کھیل نہیں ہے۔“ فاضلی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”تم دونوں اپنی بکواس بند کرو۔“ مرشد نے گرج کر کہا۔ ”مجھے کنفیوژ کر دیا ہے۔“

”دیکھیں جناب میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں اسے جتنی دیر روکا گیا آپ کے لیے اتنی ہی مشکل ہوگی۔ اس کے ساتھیوں نے کوئی جوابی کارروائی کی تو ہمیں وہ نقصان بھی برداشت کرنا پڑے گا۔“

”تمہیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے تم مرشد ہاؤس میں بالکل محفوظ ہو۔“ فاضلی نے حقارت سے کہا اور مرشد سے بولا۔ ”آپ سن لیں جناب، جب تک پوری تسلی نہیں کر لیتے ہیں اسے چھوڑنا بالکل ٹھیک نہیں ہوگا، ویسے آپ جو حکم کریں۔“

فاضلی نے اپنی بات سامنے رکھ کر چالاکی سے فیصلہ مرشد پر چھوڑ دیا اور اب وہ سیکرٹری کی طرح دم سادھے مرشد کے جواب کا منتظر تھا۔ مرشد سوچ میں پڑ گیا تھا اور اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ خاصی مشکل میں ہے۔ ظاہر ہے اس کے لیے فیصلہ آسان نہیں تھا اگر وہ مجھے رہا کر دیتا اور بعد میں اسے پتا چلتا کہ میں بھائی ہوش و حواس اسے احمق بناتا ہوا رخصت ہوا تو صدمے کے لیے علاوہ اسے آنے والے حالات سے بھی نمٹنا پڑتا۔ دوسری طرف اگر مجھے رہا نہیں کرتا اور اس دوران میں میرے ساتھی کوئی کارروائی کرتے مرشد کو جانی یا مالی نقصان ہوتا تو یہ بھی اس کے لیے اچھی بات نہیں تھی۔ زیادہ خطرہ اس بات کا تھا کہ اسے کوئی ناقابل تلافی نقصان

نہ ہو جائے اور وہ مجھے گرفتار رکھے پر مجبور ہو اور یوں اس جنگ کا دائرہ وسیع ہوتا جائے جسے مرشد اب سینٹا چاہتا تھا۔ خاصی دیر بعد اس نے گہری سانس لی اور فاضلی سے کہا۔ ”تمہیں کتنی مہلت چاہیے؟“

سیکرٹری کا چہرہ مرجھا گیا اور فاضلی کھل اٹھا تھا اس نے کہا۔ ”میں نے ڈاکٹر سے بات کی ہے اسے تین دن کا وقت چاہیے۔“

”ٹھیک ہے تمہارے پاس تین دن کا وقت ہے۔“ مرشد نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”اگر یہ ثابت ہو گیا کہ یہ مکاری کر رہا ہے؟“ فاضلی نے پوچھا۔

”تو میرے پاس ایسے ایک درجن انجکشن موجود ہیں۔“ مرشد نے مسکرا کر کہا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

سیکرٹری مایوس تھا لیکن فاضلی خوش تھا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ ن میں بہ ظاہر میں جمایاں لے رہا تھا۔ مرشد کے جانے کے بعد فاضلی نے مرشد ہاؤس کے ڈاکٹر کو طلب کیا شاید اسے میرے حوالے سے پہلے ہی کوئی ہدایت دی جا چکی تھی اس لیے اس نے آتے ہی انجکشن تیار کیا میری شرٹ کی آستین الٹ کر بازو پر ڈوری باندھی، نس ابھار کر اس نے انجکشن نس میں داخل کیا اور دوا انجکٹ کر دی۔ میں دیکھ چکا تھا کہ انجکشن ڈائزیاپام کا تھا یعنی نیند کی دوا تھی اس لیے میں نے مزاحمت نہیں کی ورنہ میں ضرور مزاحمت کرتا۔ انجکشن لگتے ہی میرا سر پھرانے لگا اور گرنے سے پہلے میں دوبارہ اسٹرپچر نما بیڈ پر لیٹ گیا تھا اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔



جب میں بیدار ہوا تو ایک کمرے میں ایک بیڈ پر اس حالت میں لیٹا ہوا تھا کہ میرے دونوں ہاتھ فولادی ہتھکڑیوں سے بیڈ کے سرہانے والے حصے سے بندھے تھے اور میرے پاؤں بیڈ کے سامنے والے اینگل آئرن سے اسی طرح ہتھکڑی سے بندھے تھے۔ بستر بھی کسی اسپتال یا کلینک کا لگ رہا تھا اور وہاں وہ مخصوص بوتلی جو اسپتالوں میں آتی ہے۔ یہ دواؤں اور جراثیم کش دواؤں کی بوتلی۔ کمرے میں صرف ایک یہی بیڈ اور ایک اس کی سائڈ دراز کے ساتھ ڈرپ اسٹینڈ تھا جو کونے میں رکھا تھا۔ وہاں خاموشی تھی اور سناٹا تھا جس میں صرف اے سی چلنے کی ہلکی سی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ کمرے میں صرف ایک دروازہ تھا اور اس کے سوا کوئی کھڑکی یا روزن نہیں تھا نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ یہ کمرہ ساؤنڈ پروف تھا۔ میں کتنا ہی چلاؤں یہاں سے آواز باہر نہیں جائے گی۔ میں نے تجربے کے لیے کسی کو آواز دینے کا سوچا تھا کہ مجھے خیال آ گیا کہ میں فائر اٹھل تھا اور مجھے کسی ہوش مند آدمی کا شور شرابا نہیں کرنا چاہیے تھا اس لیے میں کسی چھوٹے بچے کی طرح شور شرابا اور مدد کے لیے چیخ و پکار کرنے لگا میں انجانے لوگوں سے درخواست کر رہا تھا۔

”کوئی کھولو..... مجھے کھولو..... مجھے باندھا ہوا ہے..... مجھے کھولو۔“ میری کوشش تھی کہ میری آواز میں درد کے ساتھ بچکاہٹ بن رہے۔ مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ کسی نے رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میری آواز کسی کے سمجھانوں تک نہیں جا رہی تھی یا جاری تھی تو اس نے توجہ نہیں دی۔ کمرے کی دیواریں اور چھت بالکل سادہ تھی۔ ایک طرف ٹیوب لائٹ لگی تھی۔ کوئی ایسی چیز یا جگہ نظر نہیں آئی جس میں کمرے کا لگا یا جاسکتا۔ یعنی یہاں کمرہ نہیں تھا البتہ مانک کی موجودگی کا امکان تھا۔ اس کا میں نے شور شرابے میں بھی خیال رکھا تھا۔ میں نے ہتھکڑیوں کو آزمایا مگر شاید ان میں کوئی کمزوری ہو لیکن وہ بہت مضبوط تھیں۔ البتہ اس کو جھٹکے دینے سے بیڈ ہلاتو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کے نیچے پیسے لگے تھے۔ یعنی اسے ہلا کر کہیں لے جایا جاسکتا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ مجھے کسی اسپتال یا کلینک منتقل کر دیا گیا تھا اور شاید یہ اسی گول مٹول ڈاکٹر کا کلینک تھا جسے پہلے فاضلی نے گمن پوائنٹ پر اٹھایا تھا لیکن شاید بعد میں اس نے اس سے مک مکار لیا تھا اور اب وہ پیسے کی خاطر یہی کام ہنسی خوشی کرنے کو تیار ہو گیا تھا۔ فاضلی نے مجھے نیند کا انجکشن لگوا کر یہاں منتقل کر دیا تھا۔ اب ڈاکٹر مشینوں یا ٹیسٹوں کی مدد سے میری دماغی حالت کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا۔ کیونکہ اس سے پہلے میں نے بھی اپنے دماغ کا معائنہ نہیں کرایا تھا اور نہ ہی کسی اور نے یہ زحمت کی تھی اس لیے میں نہیں جانتا تھا کہ آج کی میڈیکل سائنس اور

دروازہ دوبارہ کھلا اور اسی آدمی کے ساتھ ایک نومند اور نوجوان وارڈ بوائے اندر آیا اس نے میرے بیڈ کو عقب سے پکڑ کر دھکیلتا شروع کیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ فاضلی کا آدمی بھی ساتھ تھا۔ راہداری کے جس سرے پر یہ کمرہ تھا اس کے آخری سرے پر ایک بڑا ہال نما کمرہ تھا جس میں کئی طرح کی جدید مشینیں لگی تھیں۔ وہاں وہی گول منول ڈاکٹر اور فاضلی موجود تھے۔ ان کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ ان کے درمیان انڈر اسٹینڈنگ ہو چکی ہے اور وہ میرے معاملے میں ایک ہیں۔ ”اسے کھول دو۔“ ڈاکٹر نے وارڈ بوائے سے کہا۔

”اسے کھولنا ضروری ہے؟“ فاضلی نے مداخلت کی۔

”ظاہر ہے اسے بیڈ سمیت تو کینسر میں نہیں ڈال سکتے۔“ ڈاکٹر نے ایک بڑی مشین کی طرف اشارہ کیا جس کے درمیان میں گول خلا تھا اور اس خلا سے فولادی تختہ باہر نکلا ہوا تھا۔ فاضلی نے سر ہلاتے ہوئے پستول نکال لیا۔ ڈاکٹر کا رنگ اڑ گیا تھا اس نے بولکھا کر کہا۔

”اس کی کیا ضرورت ہے؟“

”ضرورت ہے تم اس شخص کو نہیں جانتے، اسے موقع مل گیا تو یہ مجھ سمیت سب کو لہا لٹا کر نکل جائے گا۔“ نوجوان وارڈ بوائے نے یوں ڈرتے ڈرتے میری جھٹکریاں کھولیں جیسے میں کوئی زہریلا سانپ ہوں اور آزاد ہوتے ہی اسے ڈس لوں گا۔ میں بیڈ سے نیچے اترتا تو وہ فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ ڈاکٹر نے دور سے مجھ سے کہا۔

”اس پر لیٹ جاؤ۔“ اس کا اشارہ مشین سے نکلے تختے کی طرف تھا یہ شاید سی ایس ایم کی قسم کی کوئی مشین تھی۔ میں نے غور سے مشین کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔

”نہیں تم مجھے اس میں بند کر دو گے۔“

”نہیں ہم تمہارا علاج کر رہے ہیں۔“ ڈاکٹر نے چکار کر کہا۔ ”شاباش اس میں لیٹ جاؤ۔“

میں نے ظاہر کیا کہ ڈاکٹر کی پیار بھرے لہجے نے مجھے متاثر کیا ہے اور میں خاموشی سے تختے پر لیٹ گیا۔ ڈاکٹر کے اشارے پر وارڈ بوائے نے آگے آ کر میرے دونوں ہاتھ سیدھے کر کے سینے پر پیلٹ باندھ دی۔ ایسی ہی دو پیلٹیں اس نے میرے پیٹ اور نیچے گھٹنوں سے ذرا اوپر کی تھیں اب میں تختے میں بالکل فکس ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے میرے سر اور سینے پر کوئی چار عدد الیکٹروڈ لگائے اور پھر ایک طرف لگے کپیسٹور کے کی بورڈ پر چند ٹرن دباے۔ اس کے ساتھ ہی مشین آن ہو گئی اور تختہ خود بہ خود کھٹک کر اندر جانے لگا۔ ایک منٹ کے اندر میں مشین کے اندر تھا اور اس میں دائرے میں تیز روشنیاں جل بھر رہی تھیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ کس قسم کی مشین تھی اور میرے ساتھ کیا فنکشن کرتی۔ روشنیوں کے ساتھ ساتھ پانی کے کھولے جیسی سنسنائی ہوئی آواز بھی آ رہی تھی۔ شاید اس وجہ سے مجھے باہر کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ شروع میں گھومتی روشنیوں کی تیزی سے میرا سر چکرایا تھا لیکن جلد میں نے خود پر قابو پا لیا تھا۔ میں شاید آدھے گھنٹے مشین میں رہا اور اس دوران صبر سے کام لیتا رہا۔ ورنہ مجھے تو ہسپتال کے ماحول سے وحشت ہوتی ہے۔ چہ جائیکہ اس جھوٹی سی مشین میں بند ہو جانا۔

جب مجھے باہر نکالا گیا تو شاید میرے چہرے پر بھی اس وحشت کے آثار نظر آرہے تھے۔ ڈاکٹر اور فاضلی دونوں خاموش تھے اور مجھے نہیں معلوم کہ ان کے درمیان کیا بات ہوئی تھی۔ وارڈ بوائے نے پیلٹ کھولیں اور میں کود کر نیچے اتر آیا۔ ”مجھے اس میں کیوں بند کیا؟“ میں نے ڈاکٹر سے پوچھا اصل میں ہمیں اندازہ لگا تھا کہ

ماہرین کس حد تک ترقی کر چکے تھے۔ وہ کسی شخص کی دماغی حالت کا درست پتا لگا سکتے تھے کہ وہ اپنے پورے ہوش میں ہے یا نہیں۔

البتہ میں نے سنا تھا کہ بہت سارے طرم جیل میں پاگل بن جاتے ہیں تاکہ ان پر مقدمہ نہ چلایا جاسکے۔ ظاہر ہے ایسے شخص پر کیسے مقدمہ چلایا جاسکتا تھا جو اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے اپنے ہوش میں نہ ہو۔ ایسے لوگوں کا دماغی معائنہ کرایا جاتا ہے لیکن وہ ماہرین اور جدید ترین مشینوں کو بھی دھوکا دے جاتے ہیں۔ یعنی آج تک کوئی ایسی مشین یا طریقہ ایجاد نہیں ہوا جو انسان کے اندر کی خبر من و عن دے۔ ہر چیز کو انسان اپنی قوت ارادی اور ذہنی مضبوطی سے شکست دے سکتا ہے۔ اس خیال سے مجھے حوصلہ ہوا تھا اگر میں ثابت قدم رہوں تو کوئی ڈاکٹر اور کوئی مشین مجھے ہوش مند ثابت نہیں کر سکتی تھی۔ میں اندر ہی اندر خود کو مضبوط کرنے لگا کہ مجھے کسی صورت فاضلی کے حربوں سے شکست نہیں کھانی ہے۔

مرشد نے میرے خدشوں کی تصدیق کر دی تھی کہ اگر میں باہوش ثابت ہوا تو وہ ٹرائی ٹرائی آگین کے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے مجھے پھر اسی دوا کا انجکشن دے گا اور اگر پھر بھی نتیجہ حسب پسند نہیں نکلا تو اس نے بتایا تھا کہ اس کے پاس درجن سے زیادہ انجکشن موجود تھے۔ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے یہ سارے انجکشن مجھ پر خرچ کر سکتا تھا۔ میری عافیت اسی میں تھی کہ میں کسی طرح مرشد اور اس سے پہلے عبیث فاضلی کو یقین دلا سکوں کہ میں اپنے حواس اور شخصیت کھو چکا ہوں۔ میرے ہاتھ پیروں پر پڑی فولادی بیڑیاں اور کڑے بہت مضبوط اور ناقابل شکست تھے اس لیے تھک ہار کر میں نے کوشش ترک کر دی۔ فاضلی مجھے اچھی طرح جانتا تھا اسے معلوم تھا کہ میں ذرا سی کوتاہی اور کمی سے فائدہ اٹھا سکتا ہوں اس لیے اس نے کوئی کی نہیں چھوڑی تھی۔ اس نے ہسپتال منتقل کرنے کے بعد مجھے پوری طرح بے بس کر دیا تھا۔ مجھے یقین تھا اس کمرے کے باہر فاضلی کے مسلح ماتحت ہوں گے جو میرے فرار کو کسی کوشش کو ناکام بنانے کے لیے مستعد ہوتے۔ فاضلی نے انہیں اچھی طرح سمجھا دیا ہوگا کہ میرے فرار کی صورت میں انہیں کیا سزا ملے گی۔

میرے لیے صبر سے آنے والے حالات کا انتظار کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا اس لیے میں انتظار کرنے لگا۔ میرا اندازہ ہے کہ کوئی ایک گھنٹے بعد دروازہ کھلا اور ایک نرس ایک آدمی کے ساتھ اندر آئی۔ نرس نے ناشتے کی ٹرے اٹھا رکھی تھی اور آدمی خالی ہاتھ تھا لیکن اس کے لباس میں یقیناً کوئی ہتھیار تھا۔ وہ فاضلی کا گرگا تھا۔ نرس نے ناشتے کی ٹرے سائیڈ درواز پر رکھی اور نیپکن میرے سینے پر پھیلا کر جج سے مجھے دودھ ملا پورج کھلانے لگی۔ میں نے بلا تکلف پورج کھایا، اس کے بعد اس نے مجھے دودھ دے جانے کے لیے تھک کر کے اور نمک کالی مرچ چھڑک کر کھلائے۔ آخر میں اس نے گھونٹ گھونٹ کر کے مجھے چائے پلائی تھی۔ یہ خاصا تسلی بخش قسم کا ناشتہ تھا اور اب میں فاضلی اور ڈاکٹر سمیت ہر آفت کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا۔ نرس قبول صورت اور تجربے کا تھی اس لیے اس کا انداز مشینی تھا۔ اپنی ڈیوٹی بھگتا کر وہ آدمی سمیت چلی گئی۔ اس دوران میں ان دونوں نے کوئی بات نہیں کی تھی میں نے نرس سے شکایت کرنے کے انداز میں کئی بار کہا کہ مجھے باندھ کر رکھا ہے مجھے درد ہو رہا ہے لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں دی اور اپنا کام کرتی رہی۔

میرا خیال تھا کہ جلد مجھے کسی آزمائش سے گزرنا پڑے گا اور خیر خیال درست نکلا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد

کہ وہ کس نتیجے پر پہنچے تھے۔

”کچھ نہیں، ہم تمہارا علاج کر رہے ہیں۔“ وہ پہلے کی طرح نرمی سے بولا۔ ”تمہیں کچھ یاد نہیں ہے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ تمہیں تمہارا ماضی یاد آ جائے۔“

”میرا ماضی؟“

”ہاں تم سب بھول چکے ہو۔“ ڈاکٹر بولا۔

میں نے محسوس کیا کہ فاضلی ڈاکٹر کی باتوں سے متفق نہیں تھا لیکن اس نے ڈاکٹر کی رائے کو مسترد بھی نہیں کیا تھا۔ وہ خاموش تھا۔ یقیناً اس ٹیسٹ میں ڈاکٹر کو ایسا کوئی سراغ نہیں ملا تھا جس سے وہ میری سمجھ بوجھ کے بارے میں حتمی فیصلہ کر سکتا تھا بلکہ وہ میری اداکاری سے متاثر نظر آ رہا تھا میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ وہ اس اداکاری سے متاثر ہی رہے۔ مجھے ایک بار پھر بیڈ پر لٹا کر ہتھکڑیوں سے باندھ دیا گیا۔ حالانکہ ڈاکٹر نے دبی زبان میں کہا۔ ”اس سے مجھے مشکل پیش آئے گی یوں باندھنے سے آدمی کی ذہنی حالت دیسے ہی ڈسٹرب ہو سکتی ہے۔“

”تم اس معاملے میں دخل مت دو۔“ فاضلی نے رکھائی سے جواب دیا۔ ”تم اس کام کی طرف توجہ دو جس کے لیے تمہیں پچاس ہزار معاوضہ دیا گیا ہے۔“

”میں اسی کام کے لیے کہہ رہا ہوں۔“ گول مٹول ڈاکٹر نے نگلی سے کہا۔ ”خیر تمہاری مرضی..... اب اس کے کچھ بلڈ اور پورین ٹیسٹ ہوں گے۔“

بلڈ سہل تو دارو بوائے نے وہیں لے لیا تھا اور پورین سہل اس نے مجھے کمرے میں لا کر لیا۔ اس دوران میں فاضلی کا آدمی بھی وہاں موجود تھا لیکن میں شرمیلی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس طرح باندھنے کے بعد ظاہر ہے مجھے بیڈ پان ہی کرنا تھا۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے یہ مرحلہ بھی طے کر لیا۔ اگرچہ مجھے گھن آ رہی تھی لیکن مجبوری تھی۔ فاضلی مجھے آزادی کا ایک لمحہ دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مرشد کے آدمیوں میں وہی مجھ سے سب سے زیادہ واقف تھا بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ وہ مرشد سے زیادہ مجھے جانتا تھا۔ ہمارا کئی بار آپس میں براہ راست ٹکراؤ ہو چکا تھا۔ اس کا خدشہ درست تھا کہ اگر میں اداکاری کر رہا تھا تو مجھے آزادی کا موقع نہیں دیا جاسکتا تھا۔ وہ اسی مفروضے کے تحت مجھ سے پیش آ رہا تھا۔

فاضلی نے ڈاکٹر کو بتا دیا تھا کہ مجھے دی جانے والی دوا کا میرے جسم میں اب کوئی نشان نہیں ملے گا اس کے باوجود وہ میرا بلڈ اور پورین ٹیسٹ لے رہا تھا۔ ممکن ہے وہ دوا کے بجائے کچھ اور معلوم کرنا چاہ رہا ہو۔ وارڈ بوائے کے جانے کے کچھ دیر بعد وہی نرس آئی جس نے مجھے ناشتہ کرایا تھا اس نے مجھے ایک کھانا دیا اور ایک منٹ سے بھی پہلے میں سوچا تھا۔ جیسا کہ جانے کے بعد مجھے علم ہوا کہ یہ فاضلی کے حکم پر ہوا تھا۔ مجھے جاگ آئی تو میں کمرے میں اکیلا نہیں تھا۔ فاضلی اور گول مٹول ڈاکٹر بھی موجود تھے۔ وہ آپس میں بات کر رہے تھے۔ ڈاکٹر برہم تھا اس نے فاضلی سے کہا۔ ”تم اچھا نہیں کر رہے ہو اس طرح مداخلت کر کے۔“

”یہ مداخلت نہیں ہے میں بہتر سمجھتا ہوں اس شخص کو کس طرح رکھنا چاہیے۔“

”یہ مداخلت ہی ہے جب میں نے کہا تھا اسے نیند کی یا کسی قسم کی کوئی دوسری دوائی نہیں دینی ہے تو پھر تم

نے اسے کیوں انجکشن لگوا دیا؟“

”میں نے کہا تھا یہ ضروری ہے۔“

”اس طرح میں نہیں بتا سکتا کہ یہ شخص ہوش میں ہے یا نہیں ہے۔“ ڈاکٹر نے واضح کہا۔ ”ناکامی کی تمام ذمے داری تم پر ہوگی اور تم مجھے الزام نہیں دے سکتے۔“

”تم اپنا کام کرو۔“ فاضلی نے سرد لہجے میں کہا۔ ”میں تمہیں الزام نہیں دوں گا۔ یہ بتاؤ کہ ٹیسٹ کے کیا نتائج نکلے؟“

”نیکو۔“ ڈاکٹر نے مایوسی سے کہا۔ ”اگر یہ لاشعوری طور خوف زدہ ہوتا تو اس کے خون میں کچھ ہارمون شامل ہو جاتے لیکن ٹیسٹ میں ہارمون نہیں آئے۔“

”لاشعوری، سے کیا مراد ہے؟“

”بالشعور آدمی خود پر قابو رکھ سکتا ہے اس لیے ایسی سچویشن میں جب آدمی خوف محسوس کرتا ہے تو یہ ہارمون خون میں شامل نہیں ہوتے لیکن لاشعوری طور پر خوف بہت مضبوط ہوتا ہے اس لیے ہارمون لازمی خون میں شامل ہوتے ہیں اور ان کا اثر پورین میں بھی آتا ہے۔ اس لیے میں نے اسکیں کے فوراً بعد اس کے ٹیسٹ لیے تھے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ اس نے خود پر قابو رکھا اور یہ ہوش میں ہے۔“ فاضلی نے فوراً نتیجہ اخذ کیا۔

”یہ تمہارا خیال ہے۔“ ڈاکٹر نے نخئی سے کہا۔ ”تم نے اسے بندھو کر اچانک خوف زدہ ہونے والی کیفیت سے دوچار ہونے نہیں دیا۔ یہ پہلے سے اس سلوک کے لیے تیار تھا۔ اس لیے ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ یہ ہوش میں ہے یا نہیں ہے۔“

اس جواب سے فاضلی مایوس ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ”تم دونوں باتیں کر رہے ہو۔“

”میں اور کیا کروں یا تو تم مداخلت بند کر دو اور مجھے میرا کام کرنے دو یا پھر نتائج کی ذمے داری قبول کرو۔“

”مداخلت تو میں کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا۔“ فاضلی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”ہاں ذمے داری قبول کر سکتا ہوں۔“

”آخر تم یہ سب کیوں کر رہے ہو کیا یہ شخص تمہارا دشمن ہے؟“

”ہاں اور یہ پولیس کو بھی مطلوب ہے۔“

”تو اسے پولیس کے حوالے کرو۔“

”یہی کرنا ہے۔“ فاضلی نے چالاکی سے کہا۔ ”مجھے شبہ ہے یہ بچے کے لیے ڈھونگ رچا رہا ہے اس کا پتا

چلنا چاہیے کہ یہ ہوش میں ہے یا نہیں۔“

”دیکھو میں تمہیں بتا رہا ہوں اس قسم کے دھوکے کا پتا چلانا بہت دشوار ہے آج تک کوئی ایسی مشین یا طریقہ ایجاد نہیں ہوا جو انسان کی درست دماغی کیفیت کی نشاندہی کر سکے۔ میرے علم میں چار افراد کا قاتل شخص ہے جو دس برس تک کامیابی سے ڈاکٹروں کو پاگل بننے کا دھوکا دیتا رہا۔ وہ دس سال پاگل خانے میں رہا اور موقع ملنے پر فرار ہو گیا لیکن بد قسمتی دودن بعد ہی پکڑا گیا اور اس پر عدالت میں مقدمہ چلا اسے پھانسی کی سزا ہو گئی اس

”تب اس ٹیٹ سے کیا معلوم کیا جاسکتا ہے؟“ فاضلی نے بد مزگی سے کہا۔

”اس سے ٹیٹور یا کسی فزیکل ڈس آرڈر کا پتا چلتا ہے اور اگر دماغ مکمل ڈس آرڈر کا شکار ہو چکا ہو یعنی آدمی ایک سینڈ کے لیے بھی درست انداز میں نہ سوچ سکے اور اس کا ذہن اندر سے پھٹلی بازار بن جائے تو الیکٹرونک لہریں اس کا پتا دیتی ہیں۔“

”یہ مکمل پاگل نہیں ہے صرف یادداشت کھو بیٹھا ہے اور عقل استعمال نہیں کر پا رہا ہے یوں سمجھ لو یہ پانچ چھ سال کے بچے جیسا ہو گیا ہے۔“

”پانچ چھ سال کا بچہ۔“ گول منول ڈاکٹر نے سرد آہ بھری۔ ”میرے دو بچے پانچ اور چھ سال کے ہیں۔ الگ الگ بیویوں سے، لیکن دونوں میرے بھی باپ ہیں۔“

”کیونکہ تم ان کے باپ ہو۔“ فاضلی خطرناک لہجے میں بولا۔ ”ڈاکٹر مجھے لگ رہا ہے تم اس معاملے میں سنجیدہ نہیں ہو۔ یہ مت سمجھنا کہ تم ناکام رہے تو میں اپنی رقم واپس مانگوں، بلکہ یہاں تمہارے کیلینک کی جگہ طے کا ڈھیر چھوڑ کر جاؤں گا۔“

گول منول ڈاکٹر ان چند دنوں میں دیکھ چکا تھا کہ یہ کتنے خطرناک لوگ تھے اور جیج ایسا کرنے کے اہل تھے۔ وہ ڈر گیا اس نے منہ کر کہا۔ ”جناب پوری کوشش کرو تو رہا ہوں اور آپ بھی میرے سر پر ہود دیکھ ہی رہے ہو سب بے شک کسی دوسرے ڈاکٹر سے پوچھ لیتا اس سے زیادہ کوئی نہیں کر سکتا ہے۔“

”میں یہ سب نہیں جانتا مجھے بہر صورت اس کے بارے میں معلوم کرنا ہے کہ یہ ہوش میں ہے یا نہیں۔“

”تب آپ اسے میرے سپرد کر دیں۔ ابھی یہ ہوش میں آئے گا اور دوا کے اثرات مکمل ختم ہونے میں کئی گھنٹے لگیں گے اس کے بعد ہی اس کا پولی گراف ہوگا۔“

میرے ہاتھ پاؤں سے ہتھکڑیاں ہٹادی گئی تھیں اور اب میں کم سے کم بستر کی قید سے آزاد تھا لیکن اس کمرے سے نکل جانا ممکن نہیں تھا۔ اول تو دروازہ ہی بند ہوتا اور اگر دروازہ کھول بھی لیتا تب بھی باہر فاضلی اور اس کے گرگے موجود تھے وہ مجھے بھلا کہاں جانے دیتے؟ بہر حال میں اس قید سے آزادی پر گول منول ڈاکٹر کا شکر گزار تھا جس نے فاضلی سے اختلاف کر کے مجھے بیڑیوں سے آزاد کر لیا تھا۔ مجھے قبل از وقت ہوش آ گیا تھا اور میں نے فاضلی اور ڈاکٹر کی گفتگوں کی تھی اس سے یہ فائدہ ہوا کہ مجھے آنے والے حالات کا پتا چل گیا تھا۔ پولی گراف ٹیٹ کے بارے میں، میں نے سن رکھا تھا۔ ترقی یافتہ ممالک میں اس ٹیٹ کی مدد سے بعض اوقات مجرم پکڑے بھی جاتے تھے لیکن عدالت اسے بطور ثبوت نہیں مانتی ہے۔ اسے صرف رائے قرار دیا جاتا ہے اور اس کی وجہ سے کسی کی بے گناہی یا جرم کا فیصلہ نہیں کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر کی بات درست ہے دماغ دنیا کی طاقتور ترین مشین ہے۔ یہ مشین ایک سینڈ چموتے بڑے تیس فیصلے کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور اس کی رفتار کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دنیا کا تیز ترین سپر کمپیوٹر بھی تین سال کے بچے کے دماغ کا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے۔ یادداشت ذخیرہ کرنے کی صلاحیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دو گھنٹے کسی مصروف بازار میں گزار کر ایک انسان جتنی یادداشت اپنے دماغ میں محفوظ کرتا ہے ان کو بھرنے کے لیے دنیا کی تمام ہارڈ ڈسکیں اور ڈیٹا اسٹوریج بھی ناکافی ہیں۔

مقدمے کے دوران اس نے اعتراف کیا کہ وہ دس سال تک پاگل بن کر ڈاکٹروں کو دھوکا دیتا رہا۔ میں عدالت کی طرف سے بنائے جانے والے میڈیکل بورڈ میں شامل تھا۔

”میں نے سنا ہے کہ ایسی دوائیں ہیں جو انسان کے لاشعور پر اثر کرتی ہیں اور وہ بے اختیار جیج بولنے لگتا ہے۔“

”ایسی دوائیں ہیں لیکن ان کو خاص حالات میں ہی استعمال کیا جاتا ہے اور عام طور سے مریض کی رضا مندی سے استعمال کیا جاتا ہے اگر وہ راضی نہیں ہوتا اور مدافعت کرتا ہے تو یہ دوائیں بھی اثر نہیں کرتی ہیں، یوں سمجھ لو کہ دماغ دنیا کی طاقتور ترین مشین ہے اور جب تک یہ خود اجازت نہ دے باہر سے کوئی اس میں مداخلت نہیں کر سکتا ہے۔“

”میں بھی ایسا ہی سمجھتا تھا۔“ فاضلی نے کہا۔ ”لیکن جانتے ہو اس شخص نے میرے ساتھ کیا کیا.....؟ اس نے مجھے ہیر وڈن کا عادی بنا دیا اور میری ساری مزاحمت ختم ہو گئی۔“

”وہ دوسری بات ہے نشے کی جسمانی طلب نے تمہیں مجبور کیا۔ ویسے تم چاہو تو یہ حربہ اس پر بھی آزمائے ہو۔“

”اتنا وقت نہیں ہے یہ بتاؤ اسے کتنی دیر میں ہوش آئے گا؟“

”مزید ایک گھنٹہ لگے گا۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”لیکن میں اس کا جواگٹا ٹیٹ کرنے والا تھا وہ اب ذرا تاخیر سے ہوگا جب یہ نیند کی دوا کے اثر سے مکمل نجات حاصل کر لے گا۔“

”اگٹا ٹیٹ کیا ہے؟“

”میں اسے جھوٹ اور جیج پکڑنے والی مشین سے ٹیٹ کروں گا اسے پولی گراف کہتے ہیں۔“

”اچھا۔“ فاضلی نے دلچسپی سے کہا۔ ”یہ کس طرح جھوٹ پکڑتی ہے؟“

”مختلف طریقوں سے۔ اس میں انسان کی سانس، دل کی دھڑکن، بلڈ پریشر اور دماغ کی لکیروں کے گراف کی مدد سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ بولنے والا جیج بول رہا ہے یا جھوٹ۔“

”صرف اندازہ۔“ فاضلی نے مایوسی سے کہا۔

”ہاں اور اہم بات یہ ہے کہ بچے، پاگل اور نشے کے عادی فرد پر یہ ٹیٹ بے کار ہے۔ اسی طرح جو شخص مستقل بلڈ پریشر کا مریض ہو اس کے ٹیٹ کا نتیجہ بھی نہیں نکلتا ہے۔“

”یعنی یہ جیج پاگل ہو گیا ہے تو اس ٹیٹ کا نتیجہ تب بھی درست نہیں ہوگا۔“

”یہ تو ہے۔“ گول منول ڈاکٹر نے اعتراف کیا۔ ”لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں کسی شخص کے پاگل ہونے یا نہ ہونے کا اندازہ اسی طرح لگا سکتے ہیں۔“

”ایک دماغ کا ٹیٹ بھی ہوتا ہے جیسے مشین دل کا ٹیٹ کرتی ہے جسے ای سی جی کہتے ہیں۔“

”دماغ کے ٹیٹ کو ای سی جی کہتے ہیں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”یہ گراف کی مدد سے دماغی حالت بتاتا ہے لیکن اس سے بھی یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ انسان سوچنے سمجھنے کے قابل ہے یا نہیں اور وہ اپنی یادداشت کھو چکا ہے یا نہیں۔“

جن کے لیے معمولی سائیک بھی کافی ہوتا ہے اور وہ اس کی بنیاد پر دوسروں کی زندگی و موت کے فیصلے کرتے ہیں۔ اگر دورانِ ٹیسٹ میں خود پر قابو نہیں رکھ پاتا اور ٹیسٹ سے ظاہر ہو جاتا کہ میں نے کچھ سوالات کے جواب میں جھوٹ بولا ہے تو فاضلی کا مقصد پورا ہو جاتا اور وہ مرشد کو یقین سے بتاتا کہ دوائے مجھ پر اثر نہیں کیا ہے اور وہ مجھے بلا تکلف دوسرا انجکشن لگا دیتا۔ اس سے بھی مقصد پورا نہیں ہوتا تو وہ باقی انجکشن بھی میرے جسم میں اتارتا۔ اس بارے میں سوچتے ہوئے اچانک مجھے خیال آیا کہ انسان کا دماغ خراب کرنے والی دواؤں کی کمی نہیں ہے اور ہمارے ملک میں بھی دستیاب ہوتی ہیں۔ تب کیا وجہ ہے مرشد نے یہی خاص انجکشن استعمال کیا؟ کیا اس وجہ سے کہ اس دوا کا جسم میں کوئی سراغ نہیں ملتا ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ مجھے پاگل یا فاجر اعقل بنایا گیا ہے بلکہ یہی کہا جاتا کہ کسی صدمے نے میرا دماغ الٹ دیا ہے۔ دوسری وجہ شاید یہ ہو سکتی تھی کہ دوسری دوائیں انسان کو جھج جھج کا پاگل بنا دیتی ہیں اس کا شعور تباہ ہو جاتا ہے۔ اسے اپنی سوچوں، زبان اور جسم پر کوئی اختیار باقی نہیں رہتا ہے لیکن مرشد کے مطابق یہ دوا انسان کو صرف یادداشت اور شخصیت سے محروم کر کے کسی بچے کی طرح معصوم بنا دیتی ہے۔ اسے پاگل نہیں کہا جاسکتا ہے۔ اگر کسی کو شدید صدمہ پہنچے تو دماغ اس کے اثرات سے بچانے کے لیے شعور سے اس کی یادداشت محو کر دیتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ ان کی یادداشت بحال ہو جاتی ہے۔ اگر انجکشن مجھ پر اثر کر جاتا تو میں بھی ایسا ہی ہو جاتا اور میرے لواحقین اسے کسی دوا کی کارستانی سمجھنے کو تیار نہ ہوتے۔ یوں مرشد کا مقصد پورا ہو جاتا۔

مجھے ہوش میں آنے ہوئے ایک گھنٹہ گزر گیا تھا۔ اس لیے میں نے مقررہ وقت پر آنکھیں کھول دیں اور بستر سے اتر کر فرش پر چلنے پھرنے لگا۔ اتنے دن سے بندھے بندھے جسم بھی بندھ گیا تھا۔ ان لوگوں کو پتا چل گیا کہ میں جاگ گیا ہوں۔ کیونکہ چند منٹ بعد دروازہ کھلا اور اسی نرس کی صورت دکھائی دی۔ اس کے پیچھے فاضلی کا وہی ہوشیار گرگ تھا۔ میں نے نرس کو دیکھتے ہی منہ بنا کر کہا۔ ”مجھے بھوک لگی ہے۔“

”تم یہاں لیٹو۔“ نرس نے پیشہ ورانہ بے حسی سے کہا اور مجھے ہاتھ سے پکڑ کر بستر تک لے آئی۔

”میں..... بہت لیٹ گیا ہوں۔“ میں نے انک کر کہا جیسے وضاحت نہیں کر پار ہوں کہ لیٹ لیٹ کر تھک گیا ہوں۔

”اب تمہیں اجازت مل جائے گی تم خوب چلنا پھرنا۔“ نرس بولی۔ وہ میرا چپک آپ کرنے آئی تھی اس نے درجہ حرارت لیا، پھر نبض اور بلڈ پریشر چیک کر کے نوٹ کیا۔ یہ یقیناً پولی گراف ٹیسٹ کی تیاری تھی۔ اپنا کام کر کے اس نے مجھے ٹخنوں کی اجازت دے دی۔ ”میں ابھی تمہارے لیے کھانا لاتی ہوں۔“

نرس فاضلی کے گرگے کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔ اس کی واپسی آدھے گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ خلاف توقع وہ مرغن کھانا لائی تھی۔ میں اس کھانے کا مقصد بھی سمجھ گیا تھا۔ مرغن کھانے سے انسانی ذہن ویسے ہی سست ہو جاتا ہے۔ بہر حال میں نے انہیں مایوس نہیں کیا اور ڈنٹ کر کھایا۔ کھانے کے بعد جب نرس برتن لے جا رہی تھی تو میں نے نہایت سادگی سے اس سے ہاتھ روم جانے کی حاجت بیان کر دی۔ وہ جھینپ گئی تھی لیکن سر ہلا کر کمرے سے نکل گئی تھی۔ اس بار میں نے ذرا تیز سے کھایا تھا جیسے میں سیکھ رہا ہوں کہ کوئی کام کیسے ہوتا ہے۔ کچھ دیر بعد فاضلی کا گرگ ایک اور مسلح آدمی کے ساتھ آیا۔ اس نے مجھے ساتھ چلنے کو کہا۔ اس کمرے کے ساتھ کوئی واش روم

ماہرین نفسیات دماغ کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس کے تین حصے ہوتے ہیں ایک شعور، دوسرا الاشعور اور تیسرا تحت الاشعور۔ شعور انسان کی جاگتی حالت کو کہتے ہیں۔ الاشعور اس کے پیچھے کام کرتا ہے لیکن انسان اسے اپنی مرضی سے کنٹرول نہیں کر سکتا ہے۔ انسان کی شخصیت اور کردار اصل میں اس کے الاشعور کا عکس ہوتا ہے شعور میں رہ کر انسان اداکاری کر سکتا ہے لیکن الاشعور میں اداکاری ممکن نہیں ہے اسی لیے انسان کی اصلیت یا اس کے نفسیاتی مسائل کا کھوج لگانے کے لیے ماہرین الاشعور کو سامنے لانے کی کوشش ہوتی ہے۔ تین حصوں میں سے دو انسان سے سوالات کا سیشن کرتے ہیں اگر مسئلہ اس سے حل نہ ہو تو پھر دواؤں اور پینا نرم جیسی تکنیکوں کا سہارا لیتے ہیں۔ ماہرین کہتے ہیں کہ شعور کو تابو میں نہیں کیا جاسکتا ہے اسے معطل یا بے حس کیا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس الاشعور کو معطل یا بے حس نہیں کیا جاسکتا لیکن اسے قابو میں کیا جاسکتا ہے۔ جدید دور میں پروپیگنڈہ تحریکیں اسی طرح سے کامیاب ہوتی ہیں۔ انسان کو جب تو اتار سے ایک بات بتائی جائے چاہے ہوتھویر کی صورت میں، ویڈیو کی صورت میں یا لکھے اور بولے جانے والے الفاظ کی صورت میں تو الاشعور اس سے متاثر ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ اسے قبول کر لیتا ہے۔ جیسے دہشت گردی کی اصطلاح ہے۔ مغرب کے میڈیا اور سیاست دانوں نے اسے اس طرح استعمال کیا ہے کہ اب دہشت گردی اور مسلمان یا اسلام ایک ہی چیز کے دو نام بن کر رہ گئے ہیں۔ اس پر پیگنڈے نے دنیا کے الاشعور پر قبضہ کر لیا ہے۔

تحت الاشعور کے بارے میں کہا جاتا ہے جیسے الاشعور کو کنٹرول کرتا ہے اسی طرح تحت الاشعور کو کنٹرول کرتا ہے۔ یہاں انسان کا ضمیر، اس کا کردار اور اس کی فطرت محفوظ ہوتی ہے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ تحت الاشعور کو کوئی قابو نہیں کر سکتا ہے۔ یہاں فیڈ پروگرام بچہ اپنی پیدائش کے ساتھ لے کر آتا ہے۔ روحانیت کے ماہر اس کا اس بارے میں کہتے ہیں یہ پروگرام قدرت کی طرف سے دیا جاتا ہے اور یہ راستی کا پیغام ہوتا ہے۔ جیسے حدیث نبوی ﷺ ہے۔ اس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اور اس کا ماحول اسے عیسائی، یہودی، ہندو، سکھ یا کسی اور مذہب کا ماننے والا بنا دیتا ہے۔ یہ دین فطرت اس کے تحت الاشعور میں موجود ہوتا ہے۔

پولی گراف ٹیسٹ بڑے سادہ اصولوں پر کام کرتا ہے۔ جب انسان جھوٹ بولتا ہے کہ اس کے دل کی رفتار اور بلڈ پریشر میں تبدیلی آتی ہے جب کہ سچ بولنے کی صورت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی ہے۔ مگر یہ کوئی حتمی ٹیسٹ نہیں ہوتا ہے اور عدالتیں اس کے نتیجے پر اہم فیصلے کرنے سے گریز کرتی ہیں لیکن ترقی یافتہ ملکوں کی خفیہ ایجنسیاں اور تفتیشی ادارے طرزموں سے حقیقت اگھوانے کے لیے پولی گراف کا استعمال کرتے ہیں کیونکہ انہیں اپنا یقین حاصل کرنا ہوتا ہے اور وہ اس کے بعد طرزموں سے مناسب سلوک کرتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ حتمی نہیں ہوتا ہے کیونکہ اگر کوئی شخص اتنے مضبوط اعصاب رکھتا ہو کہ دورانِ ٹیسٹ خود پر قابو رکھے تو وہ جھوٹ بھی دے سکتا ہے۔

میں اپنے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں اتنے مضبوط اعصاب رکھتا ہوں کہ جھوٹ بول سکوں اور میری نبض کی رفتار اور بلڈ پریشر میں کوئی تبدیلی نہ آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ڈاکٹر سے اس ٹیسٹ کا سن کر پریشان ہو گیا تھا۔ مجھے کسی عدالت میں پیش نہیں کرنا تھا بلکہ میرا واسطہ مرشد اور فاضلی جیسے لوگوں سے تھا

میرے جواب پر وہ جھنجھلا گئی تھی یہ چیز اس کے تاثرات میں نظر آئی۔ اس نے اگلا سوال کیا۔ ”تمہیں کیا اچھا لگتا ہے؟“

”میں باہر جانا چاہتا ہوں۔“

”باہر کہاں؟“

”پتا نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”بس یہاں سے باہر جانا چاہتا ہوں۔“

سوالات کا یہ سیشن تقریباً آدھا گھنٹہ جاری رہا تھا۔ عورت نے اس دوران میں کئی مرتبہ سوالات بدلے۔ کبھی وہ مجھ سے براہ راست میرے بارے میں سوال کرتی تھی اور کبھی میرے ماضی کو کریدنے کی کوشش کرتی تھی ظاہر ہے میں نے اس کے کسی ایک سوال کا جواب بھی درست نہیں دیا تھا۔ چند ایک بار اس کے خوب صورت چہرے پر جھنجھلاہٹ ضرور آئی تھی لیکن اس کے علاوہ اس کا چہرہ ساٹ ہی رہا تھا جس سے میں یہ اندازہ کرنے سے قاصر تھا کہ پولی گراف کیا کہہ رہا ہے کیا میرا جھوٹ پکڑا جا رہا ہے یا نہیں۔ آدھے گھنٹے بعد اس نے ہیڈ فون اتار دیا اور وارڈ بوائے کو اشارہ کیا۔ اس نے آکر میرے جسم سے لگے الیکٹروڈز اور پھر ہیڈ فون اتارنا۔ فاضلی اور ڈاکٹر آگے آئے تھے۔ ڈاکٹر اسکرین پر غالباً گراف کا ری پلے دکھ رہا اور جواب جاننے کے لیے اس نے کانوں سے ہیڈ فون لگا لیا تھا۔ اس عورت کے مقابلے میں اسے اپنے تاثرات پر قابو نہیں تھا اور میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ جیسے جیسے میرے جوابات کے ساتھ گراف دیکھ رہا ہے اس کے چہرے پر مایوسی چھا رہی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ نتیجہ اس کی اور فاضلی کی مرضی کے مطابق برآمد نہیں ہوا تھا۔ فاضلی اسے دیکھ رہا تھا اور اسے بھی نتیجہ جاننے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ اس کے تاثرات بگڑ گئے۔ اس نے اپنے گروں کو حکم دیا۔

”اسے یہاں سے لے جاؤ۔“

ظاہر ہے اشارہ میری طرف تھا۔ دونوں گروں نے وارڈ بوائے کو اشارہ کیا اور اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر کاؤچ سے اٹھایا۔ وہ لوگ اتنے محتاط تھے کہ کسی بھی مرحلے پر میرے قریب نہیں آتے تھے ہمیشہ نرس یا وارڈ بوائے میرے پاس آتا تھا اور اگر میں انہیں قابو کرتا تو انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے اپنے قابو میں رکھنے کے لیے وہ ان دونوں کی قربانی بھی دے سکتے تھے۔ بے شک میں انہیں مار دیتا لیکن وہ مجھے یہاں سے فرار نہ ہونے دیتے۔ مسلح افراد میرے پاس نہیں آتے تھے اور خود فاضلی بھی مجھ سے محتاط رہتا تھا۔ اتنا محتاط تو مجھ سے فتح خان بھی نہیں ہوتا ہے جسے میں اپنا سب سے ذہین دشمن سمجھتا ہوں اور جو مجھے سب سے زیادہ جانتا ہے۔ جب دونوں گر گئے مجھے لے کر کمرے سے نکل رہے تھے تو فاضلی اور ڈاکٹر کے درمیان جج جج شروع ہو گئی تھی۔

یہ ڈاکٹر کے کلینک کا اسپتال کا اوپری فلور تھا۔ میں نے کسی کھڑکی یا رستے سے نہیں دیکھا تھا کہ ہم کتنی بلندی پر تھے لیکن یہ کم سے کم پہلا فلور تو تھا کیونکہ ایک جگہ میں نے میز ہیاں بھی نیچے جاتے دیکھی تھیں۔ البتہ مجھے یہاں ان گئے چنے افراد کے علاوہ کوئی اور نظر نہیں آیا تھا سوائے اس حسین عورت کے جو آج ہی دکھائی دی اور اس نے میرا پولی گراف لیا تھا۔ وارڈ بوائے نے مجھے لے جا کر بستر پر لٹایا اور میں سعادت مندی سے لیٹ گیا۔ اس نے جاتے ہوئے کہا۔ ”اب تم آرام کرو۔“

ان کے جاتے ہی میں نے ٹراؤزر اوپر کر کے ران کو سہلایا جہاں میں لوہے کی وہ چھوٹی سی کیل چھوٹا رہا

تھا جو میں نے نہانے کے دوران واش روم کی دیوار سے نکالی تھی۔ پولی گراف کے دوران میں انگلیوں کے درمیان دہلی کیل مستقل خود کو چھوٹا رہا تھا اس سے میرا دھیان اس کی تکلیف کی طرف رہا اور میں نے سوالات پر زیادہ غور نہیں کیا اور نہایت آسانی سے پولی گراف کو دھوکا دے دیا۔ تکلیف نے مجھے ٹینشن لینے کا موقع نہیں دیا تھا۔ ران پر وہ جگہ سرخ ہو رہی تھی جہاں میں کیل چھوٹا رہا تھا۔ یہ معمولی سا زخم تھا جو ایک دن میں ٹھیک ہو جاتا لیکن اس نے مجھے بچالیا تھا۔ میں سونا چاہتا تھا اس لیے کچھ دیر میں جج جج سو گیا۔ مجھے نہیں معلوم میں کتنی دیر سویا۔ کسی نے مجھے جھنجھوڑ کر بیدار کیا یہ فاضلی تھا اور کسی قدر بوکھلایا ہوا تھا اس نے مجھ سے کہا۔ ”اٹھو یہیں یہاں سے جانا ہے۔“

میں آرام سے لینا یوں دیکھتا رہا جیسے اس کی بات میرے سر سے گزر گئی ہو میرے اس انداز پر وہ جھنجھلا گیا۔ ”میں بھی کس سے مغرمار کر رہا ہوں۔“

فاضلی کے ساتھ کمرے میں ایک ہی گرگاہ تھا دوسرا نہ جانے کہاں تھا۔ چند لمحوں بعد وہ بھی اندر آیا اور اس نے فاضلی سے کہا۔ ”میں گاڑی گیٹ پر لے آیا ہوں ابھی کوئی نہیں ہے ہم آسانی سے نکل سکتے تھے۔“

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ گرگے کی بات سے لگ رہا تھا کہ فاضلی اینڈ پارٹی یہاں سے فرار کی تیاری کر رہی تھی اور ظاہر ہے میں اس پارٹی کا ایک زبردستی کارکن تھا اس لیے مجھے بھی ساتھ جانا تھا یہی وجہ تھی کہ فاضلی مجھے اٹھانے آیا تھا۔ فاضلی نے آنے والے کو حکم دیا۔ ”اسے ساتھ لے کر باہر آؤ لیکن بہت ہوشیار رہنا کوئی مسئلہ ہوا تو تمہاری خیر نہیں ہوگی۔“

فاضلی کمرے سے نکلا تو گرگے نے برا سامنہ بنایا اور میری طرف دیکھا۔ ”چلو لاٹ صاحب..... تم نے سن لیا نا..... کوئی گڑبڑ کی تو..... میں گولی ماروں گا۔“ اس نے ایک ناقابل تذکرہ جگہ کا ذکر کیا۔ میں بستر سے اتر آیا میرے پیروں میں کوئی جوتا یا چپل نہیں تھی اور جسم پر اسپتال کا لباس تھا۔ میں ان دونوں کے ساتھ باہر آیا۔ وہ مجھے اسی ہال نما کمرے کی طرف لائے جہاں دو بار میرا معائنہ ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہوتے ہی ٹھنک گیا کیونکہ فرش پر ڈاکٹر اور نو جوان وارڈ بوائے کی لاشیں پڑی تھیں۔ دونوں کوسروں میں گولی ماری گئی تھی لیکن آواز اس کمرے سے باہر نہیں گئی ہوگی کیونکہ یہ ساؤنڈ پروف کمرہ تھا۔ لگتا تھا ڈاکٹر اور فاضلی کا تنازعہ اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ اسے اپنی جان سے ہاتھ دھوٹا پڑے تھے۔ ذرا آگے آیا تو وہ حسین عورت پولی گراف کے سامنے کرسی پر نظر آئی اس کی گردن ایک طرف دھکی ہوئی تھی۔ فاضلی نے اس عورت پر بھی رحم نہیں کھایا تھا۔ وارڈ بوائے یعنی شاہد ہونے کی وجہ سے مارا گیا تھا مجھے نرس کا خیال آیا کہ وہ یہاں نہیں تھی اس لیے فحش گئی۔ مگر ذرا آگے آتے ہی میری یہ غلط فہمی دور ہو گئی۔ نرس کی بے لباس اور بے آمد لاش پردے کے پیچھے فرش پر پڑی تھی۔ یہ کام یقیناً فاضلی اور اس کے گروں کا تھا۔ انہوں نے صرف اس کی جان لینا کافی نہیں سمجھا تھا بلکہ اسے مارنے سے پہلے بے آبرو بھی کیا تھا۔

اشتعال کی لہر اٹھی لیکن میں نے اسے قابو میں رکھا اگر میں اسے بے قابو ہونے دیتا تو وہاں پڑی لاشوں میں میری لاش کا بھی اضافہ ہو جاتا۔ میں نے خود کو سمجھایا کہ میری زندگی ہے اور مجھے آزادی ملے گی تو یقیناً مجھے موقع بھی ملے گا۔ میں یوں رک گیا جیسے لاشیں دیکھ کر سہم گیا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ دونوں مجھے یہاں

ناجا نر شے جوڑتے ہوئے اسے بھی ہاتھ بٹانے کا حکم دیا۔ ”لاٹ صاحب بن کر بیٹھا رہ۔“

لاٹ صاحب نے سب سے آسان اور مناسب کام یہ سمجھا کہ عورت کو اٹھالیا۔ اس نے میرے اترنے یا بٹنے کا انتظار بھی نہیں کیا تھا اس پر دونوں گرگوں میں سے ایک نے کہا۔ ”ٹھیک کہا ہے اس کے بارے میں ایک نمبر کا حرامی ہے۔ چل بھئی تو بھی آرام سے بیٹھا ہے۔“

مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچا گرگے کا خیال تھا کہ میں مزاحمت کروں گا لیکن میں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی اور آرام سے کھنچا چلا گیا نتیجے میں اس کے اوپر جا کر اور ہم دونوں ہی زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ وہ چلایا اور مجھے ایک طرف دھکیل دیا اس کا ساتھی ہنس رہا تھا میں جس پر گرا تھا وہ گالیاں دے رہا تھا اس نے میرے پیروں پر ٹھوکر ماری۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ جگہ کسی دیرانے میں تھی زمین کچی تھی اور جنگلی پودوں اور جڑی بوٹیوں کی سبک آ رہی تھی۔ وہاں خاموشی تھی اور وہ کہہ کر کسی پرندے کی آواز آ رہی تھی۔ میں گاڑی ٹٹولتے ہوئے اٹھا اور جلدی سے بولا۔ ”تم نے خود کھینچا تھا اب گالیاں دے رہے ہو۔“

”تو اس طرح آنے کی بوری کی طرح کیوں لڑھک گیا۔“

”کیا ہو رہا ہے ابھی تک اسے اندر کیوں نہیں لائے۔“ فاضلی کی گرجدار آواز سنائی دی۔ اس کے دونوں گرگوں نے جلدی سے مجھے بازو سے پکڑا اور اندر لے آئے۔ میرے پیروں تلے پختہ زمین تھی۔ دروازہ بند ہوتے ہی کسی نے میری آنکھوں سے بندھی پٹی کھینچ لی۔ ہم ایک خالی اور گرد آلود کمرے میں کھڑے تھے۔ کھڑکیاں خالی تھیں اور سلاخوں کی جگہ تختے لگا کر ان کا خلا بند کر دیا گیا تھا۔ کمرہ بارہ پائی بارہ فٹ کا تھا اور کسی کیمین کا حصہ لگ رہا تھا۔ ایک کونے میں چھوٹا سا آتش دان بنا تھا۔ مجھے عورت یہاں نظر نہیں آئی تھی۔ فاضلی مجھے گھور رہا تھا پٹی اسی نے اتاری تھی لیکن میرے ہاتھ کھولنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس دیران جگہ کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ اب اتلا کا کوئی نیا دور شروع ہونے والا ہے۔ ورنہ فاضلی مجھے مرشد ہاؤس لے جاتا۔ فاضلی نے سر دھبے میں کہا۔ ”شہباز تم مرشد کو اس ڈاکٹر کو اور ساری دنیا کو دھوکا دے سکتے ہو لیکن فاضلی کو دھوکا نہیں دے سکتے۔“

”دھوکا کیا ہوتا ہے؟“ میں نے بچکانہ انداز میں پوچھا۔ گرگوں میں سے ایک ہنسا تو فاضلی نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تو اس کی ہنسی فوراً رک گئی تھی۔

”دفع ہو جاؤ تم دونوں اور باہر کا خیال رکھو۔۔۔۔۔ اس ڈرائیور کی اولاد سے کہو جا کر تمہیں قریب سے کھانے اور پینے کے لیے کچھ لے کر آئے پانی لازمی لائے۔“

”وہ دونوں باہر نکل گئے۔ میرے ہاتھ بندھے تھے اس لیے فاضلی مجھ سے خطرہ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ میں نے پھر بچکانہ لہجے میں کہا۔ ”تم نے ڈاکٹر کو کیوں مار دیا وہ اچھا آدمی تھا؟“

”اسی لیے مار دیا میں ہر اچھے آدمی کو مار دیتا ہوں اور جلد اس فہرست میں تمہارا بھی اضافہ ہونے والا ہے۔“

میں عورت کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا لیکن میری چھٹی حس نے بروقت خبردار کیا اور میں پوچھتے پوچھتے رہ گیا۔ فاضلی نے خوب کہا۔ ”تمہیں معلوم ہے تمہارے ساتھ کون بیٹھی تھی؟“

کیوں لائے تھے۔ کیا یہ سب دکھانے کے لیے لائے تھے۔ دوسرا خیال یہ تھا کہ انہوں نے اس عام سی صورت والی ادھیڑ عمر نرس کے ساتھ تو یہ سلوک کیا مگر حسین عورت کو صرف مارا۔ میں نے دیکھ لیا تھا اسے کسی نے چھیڑا نہیں تھا۔ جب ایک گرگے نے مجھے آگے دھکیلا تو میں نے کمرے کے آخر میں وہ دروازہ دیکھ لیا جو کھلا ہوا تھا۔ فاضلی اس سے اندر آیا۔ مجھے دیکھ کر اس نے کہا۔ ”اس کی آنکھوں پر کپڑا باندھ دو اور دونوں ہاتھ بھی پیچھے باندھ کر نیچے گاڑی میں لے جاؤں۔“

انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔ نرس کے پٹی نمادو پٹے سے میری آنکھوں پر پٹی باندھی گئی اور باقی دو پٹے سے میرے ہاتھ پشت سے باندھ دیے گئے۔ اب ایک گرگے ہاتھ سے پکڑ کر چلا رہا تھا اور دوسرا ہمارے پیچھے تھا۔ میرے ساتھ چلنے والا بتا رہا تھا کہ آگے کیا ہے۔ ہم بیڑھیاں اتر کر نیچے آئے اور فوراً ہی کسی گاڑی کا عقبی دروازہ کھول کر مجھے اس میں دھکیل دیا گیا۔ گاڑی میں ڈرائیور پہلے سے موجود تھا دونوں گرگے میرے ساتھ آ گئے۔ وہاں ایسی خاموشی تھی جیسی عام طور سے پوش رہائشی علاقوں میں ہوتی ہے۔ تقریباً دو تین منٹ بعد فاضلی کی آواز آئی۔ ”یہاں کہاں گھس گئے ہو ایک پیچھے بیٹھے۔“

میرے ایک طرف بیٹھا گرگے بادل ناخواستہ گاڑی کے عقبی حصے میں چلا گیا۔ میں سمجھا کہ فاضلی نے اپنے لیے جگہ بنانے کو کہا تھا لیکن گرگے کے ہنسنے ہی ایک نرم و نازک سا وجود میرے ساتھ آ کر اور اس کا خاصا بوجھ مجھ پر آیا تھا۔ میں دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن مخصوص بھینسی خوشبو نے بتایا کہ یہ اسی حسین عورت کا بدن تھا جس نے میرا پولی گراف لیا تھا۔ میں اسے مردہ سمجھا تھا لیکن اس کا دہکتا اور دھڑکتا بدن بتا رہا تھا کہ وہ زندہ تھی۔ شاید اسے بے ہوش کر دیا گیا تھا اور فاضلی کسی وجہ سے اسے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ وہ بے سدھ تھی اس لیے خود کو سنبھال نہیں سکتی تھی، میرے ہاتھ بندھے تھے اور میں اسے سہارا دینے سے قاصر تھا اس لیے وہ تقریباً مجھ پر لڑھک آئی تھی۔ میرے برابر میں بیٹھے گرگے نے حسد سے کباب ہو کر آہستہ سے کہا۔

”مڑے ہیں تیرے۔“

حالانکہ میں خاصی مشکل میں تھا کیونکہ خاتون کی کہنی ایک نہایت نامناسب جگہ چھ رہی تھی اور سر میری بغل میں گھسا ہوا تھا۔ فاضلی آگے بیٹھا کیونکہ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی اور ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ انجن کی آواز بتا رہی تھی کہ یہ کوئی بڑی جیب نما گاڑی تھی اور فاضلی نے جتنی بے خوفی سے عورت کو میرے برابر میں ڈال دیا تھا اس سے یہ بھی ظاہر تھا کہ گاڑی کے شخصے اندھے تھے اور ہمارے باہر سے دیکھ لیے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ شاید ہمیں واپس مرشد ہاؤس لے جا رہا تھا۔ کپڑے کے پیچھے تھمکتی ہلکی سی روشنی سے پتا چل رہا تھا کہ یہ دن کا وقت تھا۔ دوپہر تھی یا شام ہونے والی تھی۔ گاڑی تقریباً آدھے گھنٹے تک تو ہموار راستوں سے گزرتی رہی اس کے بعد ایسا لگا جیسے وہ کثرت سے استعمال ہونے والی کسی کچی سڑک سے گزر رہی ہے اور آخر میں کچا راستہ نہایت خراب ہو گیا تھا کیونکہ جھکے شدید ہو گئے تھے ایک موقع پر خاتون لڑھک کر سیٹوں کے درمیان چلی گئی لیکن کسی نے اس کی پروا نہیں کی تھی۔ بہر حال یہ راستہ زیادہ طویل نہیں تھا چند منٹ بعد گاڑی رک گئی۔

”ان دونوں کو اندر لے آؤ۔“ فاضلی نے نیچے اترتے ہوئے حکم دیا اور پھر ڈرائیور کے خاندان سے کچھ

”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”یہ وہی خوب صورت عورت ہے جو تمہیں ملتی تھی اور تم سے سوال پوچھ رہی تھی۔“

”اچھا یہ وہ عورت ہے۔“ میں نے لا پرواہی سے کہا اور اس پاس دیکھا۔ ”یہ کون سی جگہ ہے؟“

”اب تمہیں یہاں رہنا ہے، ہمیشہ۔“ فاضلی بولا۔

”وہ عورت کہاں ہے؟“

”اس کمرے میں۔“ فاضلی نے ایک مضبوط دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ”کچھ دیر بعد تمہیں بھی اسی

جگہ بند کر دیا جائے گا۔“

”کیوں؟“

”تا کہ تم دونوں بھوک و پیاس سے ہلاک ہو جاؤ۔“ فاضلی نے بے رحم لہجے میں کہا۔

”مگر کیوں۔“ میں نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔ ”تم ایسا کیوں کر رہے ہو۔“

فاضلی کچھ دیر مجھے گہری نظروں سے دیکھتا رہا۔ ”شبہا تم میرے سب سے بڑے دشمن ہو کیونکہ تم میرے باپ کے دشمن ہو اور اگر تم ہوش میں ہو تو خیریت اسی میں ہے کہ ہوش میں ہونے کا اقرار کرو اور اگر ایسا نہیں ہے تم سچ بچ پاگل ہو گئے ہو تو بھوکے پیاسے مرنا تمہارا مقدر ہے۔“

”یہ عورت بھی تمہاری دشمن ہے؟“

”نہیں یہ اس ڈاکٹر کی بیوی ہے میں اسے بھی مارتا لیکن نہ جانے کیوں مجھے اس پر رحم آ گیا، میں اسے چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا اس لیے یہاں لے آیا اب یہ بھی تمہارے ساتھ ہی مرے گی۔“

یہ میرے لیے انکشاف تھا کہ یہ ماڈرن اور روشن خیال نظر آنے والی خوب صورت عورت اصل میں اس گول منول ڈاکٹر کی بیوی تھی اور یقیناً وہی اس کی دوسری بیوی تھی۔ فاضلی کا منصوبہ سچ بچ نہایت خوفناک تھا۔ اس نے میرے لیے زندہ نہ بچنے کا ایک ہی راستہ چھوڑا تھا کہ میں ہوش میں ہونے کا اقرار کر لوں۔ ورنہ بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مرنے کے لیے تیار ہو جاؤں۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا میں اس کمرے میں آسانی سے بند ہو جاؤں جہاں سے امکان یہی تھا کہ میری روح ہی آزاد ہو سکے گی یا مجھے مزاحمت کرنی چاہیے۔ میرے ہاتھ بندھے تھے اور فاضلی کے بارے میں مجھے ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ وہ ایک اچھا لڑاکا ہے۔ صرف ہیروں کی مدد سے میں اسے قابو نہیں کر سکتا تھا دوسرے میری طرف سے کوئی بھی جارحانہ قدم میرا بھید کھول دیتا۔ اگر میں فاضلی پر قابو پانے میں ناکام رہتا تھا دوسرا انجکشن میرا مقدر بن جاتا۔ میں معاملے کو اس حد تک جانے سے روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں سر جھکائے سوچ رہا تھا کہ فاضلی میرے تاثرات نہ دیکھ سکے۔ جب میں نے سر اٹھایا تو اسے پستول بدست پایا۔ وہ چالاک آدمی جانتا تھا کہ میں ہوش میں ہوں اس صورت میں، بین جان کی بازی لگا کر آزاد ہونے کی کوشش کر سکتا ہوں اس لیے اس نے اپنی بات کرتے ہی پستول نکال لیا تھا اب میں اسے لاتوں کا بھوت بھی نہیں سمجھ سکتا تھا کیونکہ وہ اس سے پہلے ہی مجھے گولی مار دیتا۔ میں نے سہم کر کہا۔ ”یہ کیوں نکالا ہے، مجھے بھی مار دو گے؟“

”چلو شاباش اندر چلو۔“ اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ یہ دیوار کی موٹی کنڈی سے بنا ہوا ایک دروازہ تھا جس پر اندر باہر موٹے تختے لگا کر اسے مزید مضبوط بنا دیا گیا تھا۔ دروازے پر ایک انچ موٹی فولادی کنڈی تھی۔ جسے توڑنا تو کیا اس میں خم پیدا کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ میں بادل نا خواستہ آگے بڑھا اور کنڈی سرکا کر دروازہ کھولا۔ فاضلی نے عقب سے دھکا دیا تو میں جان بوجھ کر اندر جا کر۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش نہیں کی حالانکہ نہایت آسانی سے سنبھال سکتا تھا۔ فاضلی نے ایک تہقید لگایا اور دروازہ بند کر دیا۔

ڈاکٹر کی بیوی میرے سامنے فرش پر بے سدھ پڑی تھی۔ اسے ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا پتا نہیں فاضلی نے اس کے سر پر ضرب لگائی تھی یا کوئی دوا استعمال کی تھی۔ میں اٹھنے کے بجائے سرک کر اس کے پاس پہنچا۔ وہ نیم کروٹ کے بل لیٹی تھی ایک ہاتھ پشت پر تھا اور دوسرا سامنے فرش پر پھیلا تھا ٹانگیں گھٹنوں سے خم کر رکھی تھیں۔ ایک ہاتھ پشت کی طرف ہونے سے سینہ نمایاں ہو رہا تھا اور ظاہر ہے ہٹن کھلا ہوا تھا اور اس لیے کچھ زیادہ ہی نمایاں ہو رہا تھا۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا اور اس کا ہاتھ سامنے کی طرف کر کے اس کی شرٹ کا آخری ہٹن بند کر کے شرٹ ممکنہ حد تک درست کر دی۔ اسی لمحے اس نے کراہنا شروع کر دیا۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا ہوش میں آنے کے بعد وہ مجھے اتنے قریب دیکھ کر نہ جانے کیا رد عمل ظاہر کرے۔ مگر ایک بار کراہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ اس میں دو طرف کھڑکیاں تھیں لیکن ان پر کنڈی کے تختوں کے بجائے لوہے کی سلاخیں تھیں اور ان کے باہر جھانپاں یوں کھڑکی تک آگئی تھیں کہ انہوں نے ایک سامنا سامنا بنا دیا تھا ان کی وجہ سے باہر کا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ دیواریں ٹھوس تھیں اور مجھے کھڑکیوں اور دروازے کی چوکھٹ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ خاصی موٹی ہیں۔ آمد و رفت کے لیے ایک ہی دروازہ تھا۔ فرش بھی ننگریٹ کا تھا اور اس پر گرد کی خاصی موٹی تہہ موجود تھی۔ ہم اسی خاک پر پڑے تھے۔ ساکت ہو کر میں نے آوازوں سے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ فاضلی باہر موجود تھا یا نہیں۔ مگر باہر سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ مجھے یاد آیا فاضلی نے ڈرائیور کو کھانا پانی لینے کے لیے بھیجا تھا اگر نہیں یہاں چھوڑ کر واپس جانا ہوتا تو وہ یہ حکم کیوں دیتا۔ اس کا مطلب تھا اسے بھی یہیں رکھنا تھا۔ مجھ پر شک ہونے کے باوجود فاضلی پوری طرح محتاط نہیں تھا اور اکثر ایسی باتیں کر جاتا تھا جو اسے میرے سامنے نہیں کرنی چاہیے۔

اس سے ایک مطلب اور نکالا جاسکتا تھا کہ فاضلی خود مرشد ہاؤس واپس نہیں جا رہا تھا اور اس کا بھی امکان تھا کہ اس نے یہ کام مرشد کی مرضی کے خلاف کیا تھا اور اب وہ فی الحال اس کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مرشد کی دی ہوئی تین دن کی مہلت پوری ہو گئی تھی اور وہ میری ذہنی حالت کے بارے میں کھلی رپورٹ سننے لے سکا تھا۔ مرشد کے حکم کے مطابق فاضلی کو مجھے واپس مرشد ہاؤس لے جانا تھا۔ مگر فاضلی کسی صورت ملکی صحیح سلامت واپسی نہیں چاہتا تھا۔ وہ مجھے مارنا چاہتا تھا ورنہ مجھے پاگل بنا کر واپس کرنا چاہتا تھا اور اس کے وہ مجھے یہاں لے آیا تھا۔ یہاں روشنی کی کوئی صورت نہیں تھی۔ بجلی تو سرے سے نہیں تھی لیکن کوئی لیسپ یا یا جیسی چیز بھی نہیں تھی۔ شام ہو رہی تھی اور کمرے میں ماحول نیم تاریک ہو گیا تھا۔ کچھ دیر اور گزرتی تو یہاں بالکل تاریکی ہو جاتی۔ مگر جو فاضلی یہیں بھوکا پیاسا مرے کے لیے اس کمرے میں بند کر چکا تھا اسے اس کی کیا فکر ہوتی

”تو میں کون سا..... خوش ہوں۔“

”تم صورت حال کو نہیں سمجھ رہے ہو۔ یہ لوگ کسی وجہ سے تمہارے دشمن ہیں۔ کیا تمہیں اپنا ماضی بالکل

یاد نہیں ہے؟“

”مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔“

”پولی گراف ٹیسٹ سے بھی تم سچے ثابت ہوتے ہو۔“ عورت نے وہ بات کہی جو میں اس سے پوچھنا چاہ رہا تھا لیکن پوچھ نہیں پا رہا تھا۔ ”تمہارے کسی جواب پر تمہارے دل کی دھڑکن اور بلڈ پریشر میں تبدیلی نہیں آئی تھی۔“

”پولی گراف کیا ہوتا ہے؟“

وہ مجھے تفصیل سے سمجھانے لگی کہ پولی گراف کیا ہوتا ہے۔ وہ ماہر نفسیات نہیں تھی بلکہ پولی گراف مشین کے استعمال کی ماہر تھی۔ میں خاموشی سے سنتا رہا اور اسے ذرا تاخیر سے احساس ہوا کہ وہ فضول میں بول رہی ہے۔ اس لیے وہ اصل موضوع پر آگئی۔ ”انہوں نے تجھنی اور اس کے ماتحتوں کو کیوں مار دیا؟“

”مجھے نہیں معلوم..... میں نے ان کی لاشیں دیکھی تھیں۔ میں تو سمجھا تم بھی مر گئی ہو۔ یہ تمہیں میرے ساتھ یہاں لے آئے۔“

”مجھے نہیں معلوم وہاں کیا ہوا تھا۔ یہ شخص فاضلی ڈاکٹر تجھنی سے لڑ رہا تھا۔ اچانک میری کرسی کے پیچھے آیا اور اس نے اچانک ہی کوئی چیز میرے سر پر ماری اور میں بے ہوش ہو گئی جب ہوش آیا تو یہاں پڑی تھی۔“

اس کا مطلب تھا کہ فاضلی نے قتل بعد میں کیے تھے۔ عورت کو بے ہوش کر کے اس نے پہلے ڈاکٹر اور وارڈ بوائے کو مارا تھا پھر نرس کو اپنے درندہ مفت ساتھیوں کے حوالے کر دیا۔ انجام اس کا بھی موت ہی ہوا تھا۔ یعنی عورت کے لیے اس کی شروع سے نیت تھی کہ وہ اسے ساتھ لے کر آئے گا۔ یہ خیال آتے ہی میں چونک گیا۔ اگر فاضلی کو عورت کو مارنا ہوتا تو اسے وہیں مار دیتا اسے اتنی دور لانے اور میرے ساتھ یہاں بند کرنے کی زحمت نہ کرتا۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ فاضلی نے مجھے دھمکی تھی وہ ہمیں سچ بھوک پیاس کے ہاتھوں مارنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اس عورت کو میرے ساتھ بند کرنے کا کیا مقصد ہو سکتا تھا؟ یہ میں فی الحال سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس دوران میں تاریکی مکمل ہو چکی تھی اور نظر آنا بالکل بند ہو گیا تھا۔ عورت نے ڈاکٹر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“ میں نے اپنی فریادی۔

”بے وقوف..... یہاں سے نکلنے کی سوچو۔“

”کیا سوچنے سے یہاں سے نکل جائیں گے؟“ میں نے خوش ہو کر پوچھا تو وہ جھنجھلا گئی۔

”نہیں کوئی ترکیب سوچو کہ کسی طرح سے یہاں نکلیں۔“

”دروازے سے نکلیں؟“

”نہیں دروازہ بہت مضبوط ہے یہ تو نازن سے بھی نہیں ٹوٹے گا۔“

”پھر کھڑکیوں سے نکل جائیں۔“

عورت نے دیکھ لیا تھا کہ کھڑکیوں پر کوئی پونانچ موٹی لوہے کی سلاخیں تھیں اگرچہ یہ بری طرح زنگ کھا چکی تھیں لیکن ان کی مضبوطی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس لیے اس نے یہ تجویز بھی مسترد کر دی۔ ”چھوڑ دو میں خود سوچتی ہوں۔“

”تیری مہربانی۔“ میں نے دل میں کہا اور زبان سے بولا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”نعمانہ لیکن سب مجھے نومی کہتے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”یہ لوگ تمہیں شہباز کہتے ہیں کیا یہ تمہارا

اصلی نام ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“ میں نے جھنجھلائے انداز میں کہا۔ ”منا نہیں میں کون ہوں اور کہاں پھنس گیا ہوں۔“

”انہوں نے تمہیں مارا پٹا بھی ہے؟“

”نہیں، لیکن باندھ کر رکھا تھا۔“

”تمہاری ان سے دشمنی ہے لیکن تمہیں یہاں کیوں لائے ہیں۔“

”ہو سکتا ہے تم فاضلی کو اچھی لگی ہو۔“

”حقانہ باتیں مت کرو۔“ اس بار وہ جھنجھلا گئی۔ ”اگر اچھی لگتی تو یہاں بند کرتا۔“

”ہاں، یہاں تو میں بھوکا پیاسا مرنے کے لیے بند کیا گیا ہے۔“

”پلیز ایسی باتیں مت کرو۔“ وہ مجھ سے چپک گئی۔ ”مجھے مرنے سے بہت ڈر لگتا ہے۔“

”مرنے سے ڈرو یا نہ ڈرو مرنے سے ڈرنا تو ہوتا ہے۔“

”پھر بھی، اس کا ذکر بھی مت کرو۔ بس اب چپ رہو۔“

خوف سے اس کا جسم سرد پڑ رہا تھا لیکن اس کی گداز بیت اور اس کے وجود سے آتی خوشبو تو باقی تھی اور

مجھے یہ ٹھیک نہیں لگ رہا تھا اس لیے میں اس سے ڈر اور سرک گیا۔ ”پیچھے ہو کر بیٹھو نا۔“

وہ کھسپانے انداز میں ہنسی۔ ”سوری مجھے ڈر لگ رہا تھا اس لیے تمہارے پاس آگئی۔“

وہ مجھ سے ڈر اور ہوئی تھی لیکن اٹھ کر نہیں گئی۔ مکمل تاریکی کے کچھ دیر بعد میری آنکھیں کسی قدر دیکھنے لگی

تھیں۔ میں اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا اور اس کے تختوں کے درمیان رخنوں سے باہر دیکھنے کی کوشش کرنے

لگا مگر تختے آپس میں جوڑ کر لگائے گئے تھے اور اگر ان میں رخنے تھے تو وہ زمانے کی گرد اور لکڑی کے پھولنے سے

بند ہو چکے تھے۔ میں نے فرش پر لیٹ کر نیچے سے باہر دیکھا تو مجھے معمولی سی روشنی کا احساس ہوا تھا۔ اس کے سوا

کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ نہ کوئی آواز تھی اور نہ کوئی آہٹ تھی۔ اگر وہ یہاں سے گئے نہیں تھے تب بھی کیبن کے اندر

نہیں تھے۔ دروازہ بند ہونے کے باوجود کھلی کھڑکیوں سے کسی قدر تازہ ہوا اندر آ رہی تھی اس لیے جس کا احساس

نہیں تھا۔ اچانک نومی نے کہا۔ ”کیا کر رہے ہو دروازے کے پاس؟“

”الوکی پٹھی۔“ میں نے دل ہی دل میں کہا اور بولا۔ ”مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“

”واپس آ جاؤ۔“ اس نے مشورہ دیا۔ ”انہوں نے میری اتنی پکاروں کا کوئی جواب نہیں دیا۔“

میں اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے میرا بازو پکڑا اور سرگوشی میں بولی۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا یہ

لوگ مجھے یہاں کیوں لے آئے ہیں؟“

”بھوکا پیاسا مارنے کے لیے۔“

”نہیں مارنا ہوتا تو دیں مار دیتے یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی۔“ اس نے بھی وہی نتیجہ نکالا جو میں نے نکالا تھا۔ نومی ذہین عورت تھی۔

”فائنلی کہہ رہا تھا تڑپا تڑپا کر مارے گا۔“

”پلیز پلیز۔“ وہ گھٹکیائی۔ ”اب اس طرح مت کہنا۔“

”تم ڈاکٹر کے ساتھ کام کرتی ہو؟“

”نہیں میں میڈیکل مشینیں سیل کرنے والی ایک فرم میں سیلزا ایگزیکٹو ہوں۔ ہم باہر سے مشینیں منگوا کر یہاں سیل کرتے ہیں۔ ڈاکٹر کو یہ مشین ہم نے ہی فروخت کی تھی۔“

اس لیے ڈاکٹر نے اسے بلایا تھا کہ وہ مشین آپریٹ کرے۔ مگر اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ ڈاکٹر مجھے اس پر اعتبار کرتا تھا ورنہ وہ اسے ہرگز نہ بلاتا۔ معاملہ بہت رازداری کا تھا۔ اعتبار صرف اسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ ڈاکٹر اور نومی کے تعلقات معمول سے ہٹ کر ہوں۔ یہ کہنا تو مشکل تھا کہ وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے کیونکہ ڈاکٹر مجھے اپنی ہی بے کشش تھی جتنی پرکشش نومی کی شخصیت تھی۔ مگر کیا کہا جاسکتا ہے بعض اوقات بالکل بے جواز لوگ بھی ایک دوسرے کو پسند کر بیٹھتے ہیں۔ اس سے ہٹ کر کاروباری تعلقات ہو سکتے تھے اور ان کی وجہ سے ڈاکٹر نومی پر اعتماد کرتا تھا۔ وہ اپنی فرم میں سیلزا ایگزیکٹو تھی خود کاروبار نہیں کرتی تھی بلکہ اوپری درجے کی ملازم تھی۔ ممکن ہے اپنی اسی حیثیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے کوئی متوازی کام شروع کر رکھا ہو اور ڈاکٹر اس میں نومی کا معاون ہو۔ اس لیے جب اسے ضرورت پڑی تو اس نے نومی کو بلایا۔

میں کم سے کم بولنے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ جتنا بولتا پھنسنے کے اتنے ہی زیادہ امکانات تھے۔ کچھ وقت گزرا تو میں نے محسوس کیا کہ باہر روشنی ہوئی ہے۔ مجھے چاند کی تاریخی یاد نہیں تھی لیکن جب میں ان لوگوں کے ہاتھ آیا تو مجھے یاد ہے ایک رات پہلے آسمان پر تقریباً نصف چاند تھا جو بڑا ہورہا تھا اب اسے مزید بڑا ہو جانا چاہیے تھا۔ باہر چاندنی تھی اس کی روشنی بلا واسطہ طریقے سے اندر کرے کی تاریکی کو کسی قدر کم کر رہی تھی۔ ایک بار مجھے پھر نومی کا ہیولہ نظر آنے لگا تھا۔ اس کی نظر کانہیں پتا تھا کہ کتنی تیز ہے۔ میں نے کہا۔ ”تم مجھے تھوڑی سی نظر آ رہی ہو۔“

”وہ تو تم بھی نظر آ رہے ہو آج آسمان پر پورا چاند ہو گا اسی کی روشنی اندر آ رہی ہے۔“

میں نے اٹھ کر کھڑکی کا معائنہ کیا اور پھر سلاخوں سے ہاتھ باہر نکال کر جھاڑیاں بنانے کی کوشش کی لیکن جھاڑیاں بہت گھنی تھیں اور ان کی شاخیں آپس میں یوں گھٹ گئی تھیں کہ انہیں الگ کرنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے ہاتھ واپس اندر کھینچ لیا۔ یہ کام صبح کی روشنی میں بہتر طور پر کیا جاسکتا تھا میں فرش پر لیٹ گیا۔ فرش سرد تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ ناقابل برداشت ہو جاتا۔ نومی نے کہا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟“

”سورہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”بھوک لگ رہی ہے کھانا تو مل نہیں رہا تو سو ہی جاؤں۔“

نومی کو غصہ آ گیا۔ ”ان لوگوں کو کیا حق ہے ہمیں اس طرح بند کر دیں۔“ اس نے کہا اور پھر دروازہ پینٹے لگی۔ میرا خیال تھا کہ اس بار بھی کوئی جواب نہیں ملے گا لیکن خلاف توقع ایک منٹ سے بھی پہلے دروازہ کھل گیا۔

یہ بات نومی کے لیے بھی غیر متوقع تھی وہ ڈر کر پیچھے ہٹی اور میں اٹھ بیٹھا۔ باہر روشنی تھی کوئی لیمپ جل رہا تھا اور اس کی روشنی میں فاضلی کسی سائے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ مجھے لگا اب نومی کی شامت آئے گی لیکن خلاف توقع وہ نرم لہجے میں بولا۔

”کیا بات ہے؟“

”تم نے اسے اور مجھے یہاں کیوں بند کیا ہے۔“ نومی دبے لہجے میں بولی۔ ”میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”تعلق تو ہے۔“ فاضلی نرمی سے ہی بولا۔ ”آخر تم اس شخص کی اصلیت جاننے کے لیے آئی تھیں۔“ اس کا اشارہ میری طرف تھا۔ ”اسی تعلق کی وجہ سے تم یہاں آئی ہو اور یہی شخص تمہاری جان بچا سکتا ہے ورنہ اس نے تمہیں بتا دیا ہو گا کہ تم دونوں کی موت کس طرح واقع ہوگی۔“

نومی کانپ اٹھی تھی۔ ”تنت..... تو کیا تم سچ بچ ہمیں بھوک پیاس سے مر جانے دو گے؟“

”اس میں کوئی شک نہیں ہے مجھے بہر صورت اس کی اصلیت درکار ہے ورنہ میں یہی چاہوں گا کہ اس کی لاش ہی یہاں سے باہر آئے۔“

”لیکن میرا کیا تصور ہے؟“

”میں نے کہا تا تم نے خود سے داری قبول کی تھی اس لیے اب یا تو اسے پورا کرو یا سزا بھگتو۔“

”میں نے ذمے داری پوری کی تھی۔ پولی گراف سے ثابت ہوا تھا کہ یہ سچ بول رہا ہے۔“

”یہ سچ نہیں بول رہا۔“ فاضلی قطعی لہجے میں بولا۔ ”تمہاں شخص کو نہیں جانتی ہو یہ تم جیسے دس ماہرین نفسیات کو سچ کرکھا جائے اور تمہیں پتا بھی نہ چلے۔“

”مشین تو جھوٹ نہیں بولتی ہے۔“

”مشین انسان نے بنائی ہے اس لیے انسان مشین کو دھوکا دے سکتا ہے۔“ فاضلی اپنی بات پراڑا ہوا تھا۔

”اب تمہاری عافیت اسی میں ہے کہ اس سے حقیقت اگلاؤ یا اس کے ساتھ ہی سسک سسک کر مر جاؤ۔ اب دوبارہ دروازہ نہیں بھانا ورنہ میں ایک گھنٹے کے لیے تمہیں اپنے آدمیوں کے حوالے کر دوں گا وہ عورت کا کیا حشر کرتے ہیں شہباز سے پوچھ لو۔“

دروازہ بند ہوا تو نومی اپنی جگہ واپس آ گئی۔ فاضلی کی دھمکی نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا اس نے آہستہ سے مجھ سے کہا۔ ”یہ کیا بکواس کر رہا ہے مجھے اپنے آدمیوں کے حوالے کر دے گا؟“

”اس کے آدمیوں نے بے چاری نرس کو مار دیا اس کے سارے کپڑے اتار دیئے تھے۔“ میں نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق نومی کو بتایا کہ نرس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔

”مائی گاڈ یہ درندے ہیں۔“ وہ سہم گئی۔

”بہت گندے لوگ ہیں۔“ میں نے تائید کی۔ ”مجھے ڈر ہے یہ تمہیں لے گئے تو اس نرس جیسا کریں گے۔“

اچانک اسے خیال آیا اور اس نے میری طرف جھک کر کہا۔ ”سنو تم ہوش مند ہو۔“

”ہاں۔“ میں نے فخریہ انداز میں کہا۔

وہ جھنجھلائی۔ ”میرا مطلب ہے تمہیں اپنا ماضی یاد ہے؟“

”نہیں یاد ہے اسی لیے تو یہ ساری مصیبت ہے۔“

”سنو اگر تم اداکاری کر رہے ہو تو فوراً ترک کر دو ورنہ ہمارا بہت برا حشر ہوگا۔“

”یہ بات تو فاضلی کہتا ہے۔“ میں اس سے ذرا دور سرک گیا وہ ویسے بھی کھسی آ رہی تھی۔ ”وہ میرا دشمن

ہے تم بھی دشمن ہو۔“

”نہیں..... نہیں میں دشمن نہیں ہوں۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ ”میں تمہاری دوست ہوں ورنہ مجھے

یہاں کیوں بند کیا جاتا۔“

”اچھا تم دوست ہو لیکن فاضلی والی بات کیوں کر رہی ہو وہ بھی یہی کہتا ہے۔“

”اچھا اب نہیں کہوں گی۔“

ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی۔ میں ایک بار پھر فرش پر لیٹ گیا میرا تجربہ رہا ہے کہ بھوک پیاس کے عالم میں جب انسان کچھ نہ کر سکے تو توانائی بچانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ سو جائے۔ اس لیے میں بھی سو گیا۔ چنگی بات ہے اس وقت بھوک اور پیاس سے زیادہ مجھے یہ فکر تھی کہ کہیں اخراج کا کوئی مسئلہ نہ پیدا ہو جائے۔ یہاں اس بند کمرے میں اس کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور فاضلی سے امید نہیں تھی کہ وہ کسی بھی صورت میں ہمیں یہاں سے باہر جانے کی اجازت دے گا۔ بلکہ اسے تو خوشی ہوگی کہ ہم لوگوں کو ذہنی اذیت بھی برداشت کرنی پڑے گی۔ ایک بند کمرے میں بول و براز کا مطلب ہے بدبو آپ کا دماغ الگ خراب کرے گی اور اس وقت ہم دونوں میں سے کوئی یہ اذیت برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں بے خبر سو رہا تھا جب نومی نے جھنجھوڑ کر مجھے اٹھایا میں بوکھلا کر اٹھا۔

”کیا ہوا..... کون ہے؟“

کمرے میں تان کی کئی لیکن کڑکیوں سے ہلکی سی سفیدی بھٹک رہی تھی جیسے باہر صبح ہونے والی ہے۔

”میں ہوں۔“ نومی نے جھنجھنی آواز میں کہا۔ ”میرے ساتھ یورین کا مسئلہ ہو رہا ہے؟“

”یورین کیا؟“

”الحق سمجھتے نہیں ہو۔“ وہ بولی اور ذرا کھل کر مجھے سمجھایا حالانکہ سمجھ میں پہلے ہی گیا تھا لیکن انگریزی کے

لفظ سے واقفیت ظاہر کرنا ٹھیک نہیں تھا۔ میں فکر مند ہو گیا۔

”اب کیا ہوگا یہاں تو بدبو ہو جائے گی۔“

وہ بھٹائی۔ ”تمہیں بدبو کی پڑی ہے۔ میرا خیال نہیں ہے۔“

”تمہارا کیا خیال کرنا۔“ میں نے حیرت سے کہا۔

”تم واقعی عقل سے ہاتھ دھو چکے ہو۔“ وہ بولی اور اس نے اٹھ کر ایک بار پھر دروازہ پشیمان شروع کر دیا اس

سے ظاہر تھا کہ ابیر جنسی کتنی شدید تھی کیونکہ رات کو ہی فاضلی نے اسے دھمکی دی تھی کہ دوبارہ دروازہ بجانے پر وہ

اسے اپنے آدمیوں کے حوالے کر دے گا۔ اس بار جواب ذرا دیر سے ملا باہر سے فاضلی کے آدمی کی غصیلی آواز

آئی۔

”کیا بات ہے؟“

”مجھے یورین آ رہا ہے۔“ نومی نے چلا کر کہا۔ ”مجھے باہر جانے دو۔“

”وہیں کرلو۔“ فاضلی کا گرگا ہنس کر بولا۔

”تم لوگ درندے ہو۔“ نومی چلائی۔ ”اگر تم نے مجھے باہر جانے کی اجازت نہیں دی تھی تو میں اسی

دروازے کے نیچے کر دوں گی اور وہ بہہ کر تمہارے کمرے میں بھی آئے گا۔“

نومی نے بڑی اچھی دھمکی دی تھی۔ دروازے کے نیچے اتنا خلا ضرور تھا کہ کوئی مانع چیز بہہ کر باہر چلی

جائے۔ ظاہر ہے بدبو ان کا بھی دماغ خراب کرتی کیونکہ اس کیمین میں بس یہی دو کمرے تھے۔ گرگا خاموش ہو گیا

اور شاید پھر فاضلی کو بتانے چلا گیا کیونکہ فاضلی کی آواز نہیں آئی تھی وہ کیمین میں نہیں تھا یا کہیں گیا ہوا تھا اگر وہ گیا

ہوا تھا تو نومی کی دھمکی بے کار تھی۔ وہ لوگ کسی صورت دروازہ نہیں کھولتے۔ ہاں فاضلی ہوتا تو وہ کوئی فیصلہ کرتا۔

نومی کو اجازت مل جاتی یا شاید نہ ملتی۔ نومی خاموشی کے باوجود کچھ دیر دروازہ پتیتی رہی اور پھر تھک کر واپس آ گئی وہ

دہلی زبان میں گالیاں دے رہی تھی اور ان میں سے بعض خاصی وزنی تھیں۔ اس کے خیال میں میرے سامنے

ایسی گالیاں دینے میں کوئی حرج نہیں تھا کیونکہ ذہنی لحاظ سے میں ”بچہ“ تھا۔

”نہیں جانے دیتا۔“

”بہت ذلیل اور گھٹیا لوگ ہیں۔“ وہ بولی۔ ”میرے لیے برداشت کرنا مشکل ہو رہا ہے۔“

مسئلہ ایسا تھا کہ مجھے بھی اس کا کوئی حل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ نومی کچھ دیر بیٹھی رہی پھر اس نے کھڑے

ہوتے ہوئے کہا۔ ”اب میں برداشت نہیں کر سکتی، پلیز تم منہ دوسری طرف کرلو۔“

میں نے دل ہی دل میں فاضلی کو برا بھلا کہتے ہوئے منہ دوسری طرف کر لیا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا

کہ کبھی ایسی مشکل سے بھی گزرنا پڑے گا۔ نومی خاصی آزاد خیال عورت تھی لیکن وہ بھی اس بیچویشن میں بری طرح

جھنجھنی ہوئی تھی۔ کچھ دیر وہ واپس آئی اور سامنے والی دیوار سے ٹک کر بیٹھ گئی۔ فضا میں ہلکی سی بو آ گئی تھی اور مجھے

معلوم تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ یہ بڑھے گی لیکن ساتھ ہی دوسرے مسائل جن میں بھوک و پیاس کا مسئلہ

سرفہرست ہوتا اس سے کہیں زیادہ تیزی سے سامنے آتا اور جلد ہم انسانی رکھ رکھاؤ بھول کر صرف کھانے اور پانی

کے بارے میں سوچتے۔ میں نے آخری کھانا اچھی طرح کھایا تھا اس لیے بھوک کا مسئلہ ابھی زیادہ نہیں تھا مگر

پیاس نے پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔

”مجھے پیاس لگ رہی ہے۔“ میں نے کہا تو اس نے بے دلی سے صرف سر ہلایا۔ باہر روشنی تیز ہوتی جا

رہی تھی اور اب ہم بہتر طور پر دیکھ سکتے تھے۔ مٹی پر لیٹنے بیٹھنے سے ہمارے کپڑے اور جسم مٹی سے بھر گئے تھے۔

نومی کے بالوں پر بھی مٹی لگی تھی اور شاید میرے بالوں پر بھی لگی تھی لیکن اس سے مفر ممکن نہیں تھا۔ سورج نکل آیا تو

کمرے میں بھی اتنی روشنی ہو گئی تھی کہ ہم سب صاف دیکھ سکتے تھے۔ میں نے اٹھ کر ایک کھڑکی کے ساتھ آئی

جھاڑیاں اندر کی طرف کھینچیں۔ یہ نرم شاخوں اور بڑے پتوں والی جھاڑیاں تھیں۔ میں انہیں کھینچ کھینچ کر توڑنے

اور اندر ڈھیر کرنے لگا۔ نومی اٹھ کر میرے پاس آئی۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟“

”تم نے جھاڑیاں کیوں توڑی ہیں؟“

”بس روشنی زیادہ کرنے کے لیے توڑی تھیں اب ان پر لینے ہیں۔“

نومی نے اسے گھورا۔ ”تمہیں کیا ہے تم سے تو کچھ نہیں مانگا ہے؟“

”تیری زبان بہت چلتی ہے۔“ اس نے دانت پیس کر کہا۔ ”اگر استاد اجازت دے تو آج سے گھنٹے میں تیرے سارے کس بل نکال دوں۔“ اس نے جملے کے آخر میں ایک قحش اشارہ کیا۔ نومی کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا لیکن اس نے کچھ کہا نہیں اور میں انجان بنا رہا۔ دروازہ دھڑام سے بند ہوا تو نومی نے دہلی زبان میں پھر جھک لیا دیں۔ وہ سخت مشتعل تھی اور اس کی سانسوں کی تیزی کے آگے شرٹ کا تیسرا بٹن جواب دے گیا۔ کمر بن میں نہیں تھی بلکہ شرٹ ہی کچھ جک تھی۔ کچھ دیر بعد اس کے غصے کا رخ میری طرف مڑ گیا تھا۔ میں نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

”تم اتنے کم عقل نہیں ہو جتنا بن رہے ہو۔“

”پھر کتنا کم عقل ہوں؟“

”اب مجھے بھی شبہ ہونے لگا ہے تم بن رہے ہو۔ ورنہ اس طرح جھاڑیاں توڑ کر ان سے بستر بنانے کا خیال تو مجھے بھی نہیں آیا۔“

”میں نے روشنی کے لیے جھاڑیاں توڑی تھیں۔“ میں نے صفائی پیش کی۔

”لیکن اب ان کا بستر بنالیا۔“

”پتا نہیں تم کیا کہہ رہی ہو۔“ میں انجان بن گیا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ ”مجھے نیند آرہی ہے۔“

اس نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔ ”اٹھو۔۔۔۔۔۔ یہ وقت سونے کا نہیں ہے۔ اگر تم اپنی یادداشت کھو چکے ہو تب بھی ان لوگوں سے کہہ سکتے ہو تمہیں سب یاد آ گیا ہے۔“

”اس سے کیا ہوگا؟“ میں نے منہ کھول کر پوچھا۔

”یہ ہمیں چھوڑ دیں گے۔“

میں خوش ہو گیا۔ ”بس اتنی سی بات کہہ دینے سے چھوڑ دیں گے، میں ابھی کہتا ہوں۔“ میں کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا لیکن اس نے ہاتھ سے پکڑ کر مجھے دوبارہ بٹھالیا اور سرگوشی میں بولی۔

”احسانہ داتیں نہ کرو۔۔۔۔۔۔ انہیں اس طرح یقین نہیں آئے گا۔“

”پھر کس طرح یقین آئے گا؟“

”تمہیں کہنا ہوگا کہ تمہیں کچھ یاد آنے لگا ہے جیسے تمہارا نام شہباز ملک ہے اور فاضلی تمہارا دشمن ہے تم نے اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔“

”واقعی؟“ میں نے سہم کر کہا۔ ”میں قتل کر سکتا ہوں۔“

نومی جھنجھلائی لیکن خود پر قابو پالیا۔ ”کر سکتے ہو، جب آدمی کی جان پر بنی ہو تو وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ابھی تم نے ظاہر یہی کرنا ہے۔“

”ٹھیک ہے میں فاضلی سے کہتا ہوں۔ مجھے اپنا نام یاد آ گیا ہے اور میں نے اسے قتل کرنے کی کوشش کی

”کھڑکی کے سامنے سے انہیں ہٹا رہا ہوں۔“ میں نے سادہ جواب دیا۔ ذرا دیر میں کچھ جھاڑیاں صاف ہوئیں تو نومی بھی اٹھ کر اس کام میں شامل ہو گئی۔ شاخیں اور پتے فرش پر ڈھیر کر رہے تھے۔ در پندرہ منٹ کی محنت کے بعد کھڑکی سے دوفٹ کی دوری تک جھاڑیاں صاف ہو گئی تھیں لیکن کھڑکی سے اوپر اب بھی جھاڑیاں تھیں میں چوکھٹ پر کھڑا ہوا اور یہ جھاڑیاں بھی صاف کرنے لگا اندر اچھی خاصی آگئی تھیں اس لیے اب میں توڑی جانے والی جھاڑیاں نیچے گرانے لگا۔ اوپر کی جھاڑیاں صاف ہوئیں تو کسی قدر آسان نظر آنے لگا اور روشنی تیز ہو گئی تھی۔ مگر اس مشقت کا یہ نقصان ہوا کہ پیاس لگنے لگی تھی۔ میں فرش پر ڈھیر جھاڑیوں پر بیٹھ گیا۔ نومی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

”پیاس لگ رہی ہے۔“

”مجھے بھی لگ رہی ہے۔“ میں نے کہا اور دوبارہ اٹھ کر باہر دیکھنے کے بہانے سلاخوں کا جائزہ لینے لگا۔ میں اوپر سے نیچے تک سلاخوں کو ہاتھ سے کھینچ کر ان کی مضبوطی کا اندازہ کر رہا تھا لیکن تمام ہی سلاخیں اپنی جگہ جمی ہوئی تھیں اور ان میں کسی میں جنبش کے آثار بھی نظر نہیں آئے تھے۔ تمام سلاخیں لکڑی کی مضبوط چوکھٹ میں گہرائی تک گڑی ہوئی تھیں۔ زنگ کا اثر بھی صرف اوپر تھا اندر سے لوہا زور اول کی طرح مضبوط تھا۔ زور آزمائی کے دوران زنگ اتر کر میری ہتھیلیوں پر آ گیا اور نیچے سے سیاہ دھات جھلکنے لگی تھی۔ میں نے پتوں سے رگڑ ہاتھ صاف کیے۔ ان میں ہلکی سی نمی تھی۔ میں نے تجربے کے طور پر ایک پتے کی نمی کو ہاتھوں میں دبا کر چند قطرہوں کی صورت میں حاصل کیا اور انہیں کچھ کر دیکھا۔ ذائقہ ہلکا سا کیلا تھا لیکن یہ پانی ہی تھا۔ نومی بیڑا اور خود میں گم ایک طرف بیٹھی تھی اس لیے اس نے توجہ نہیں دی کہ میں کیا کر رہا ہوں اور یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ وہ توجہ دیتی تو لازمی سوالات شروع کر دیتی اور فاضلی اینڈ پارٹی کو پتا چل جاتا کہ میں کچھ کر رہا ہوں۔ میں نے غیر محسوس انداز میں ہاتھ مار کر شاخیں اور پتے فرش پر بچھا دیئے اور ان پر لیٹ گیا۔ سخت اور گرد آلود فرش کے مقابلے میں یہ خاصا نرم چھوٹا تھا۔ پتوں اور شاخوں کی نمی سے ایک طرح کا سکون مل رہا تھا۔ پتے اور شاخیں اچھی خاصی مقدار میں تھے میں نے جو چھوٹا بنایا تھا اس کے علاوہ بھی اتنے بچ گئے تھے کہ نومی بھی بستر بنا سکتی تھی اس نے کچھ دیر بعد دیکھا۔

”تم اتنے مزے سے لینے ہو اور مجھے بتایا نہیں۔“

”تم بھی لیٹ جاؤ۔“ میں نے پیشکش کی۔ ”بہت مزہ آرہا ہے۔“

نومی پاس آئی اس نے شاخیں اور پتے زمین پر پھیلائے اور ان پر بیٹھ گئی۔ ”ہاں فرش سے تو اچھا ہے لیکن

کہیں کہیں پھہر رہا ہے۔“

میں خود بھی چاہتا تھا کہ ہم اس بارے میں بات کریں لیکن میں خود سے نہیں کرنا چاہتا تھا اب نومی بول اٹھی تھی اور میں منتظر تھا کہ فاضلی اینڈ پارٹی کی طرف سے اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے اگر وہ ہماری باتیں سن رہے تھے تو لازمی تجسس کا شکار ہوتے کہ ہم نے اس اجازت خانے میں کون سے سہولت حاصل کر لی ہے۔ توقع کے عین مطابق کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور فاضلی کے ایک گرگے نے اندر جھانکا۔ ہمیں شاخوں اور پتوں پر لینے دیکھ کر اس نے غرا کر کہا۔ ”یہ کیا حرکت ہے؟“

”کون سی؟“ میں نے معصومیت سے پوچھا۔

”اس طرح نہیں..... وہ بہت چالاک آدمی ہے سمجھ جائے گا۔“
”پھر کس طرح؟“

”تم اسے بلاؤ اور کہو کہ مجھے جانے دے پھر تم اسے حقیقت بتاؤ گے۔“
”مجھے جانے دے گا وہ؟“

”تمہیں نہیں مجھے۔“ وہ جھنجھلائی۔ ”تم ذرا عقل مندوں کی طرح بات کرنا۔“
”وہ کیسے کرتے ہیں؟“

اس کا صبر جواب دے رہا تھا اور میں جانتا تھا فاضلی یا اس کے آدمی ہماری گفتگو کا ایک ایک لفظ سن رہے ہیں لہذا اس کی اسکیم پر عمل درآمد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے بھنا کر کہا۔ ”جیسے ابھی تم کر رہے ہو۔“
”ٹھیک ہے میں کر لوں گا کیا دروازہ بجا کر اسے بلاؤں۔ پہلے وہ تمہیں جانے دے اور جب میں اسے بتا دوں کہ مجھے کچھ یاد آ گیا ہے تو وہ مجھے بھی جانے دے گا۔“

”ہاں وہ تمہیں بھی جانے دے گا۔“ نوی نے صفائی سے جھوٹ بولا۔

میں نے اٹھ کر دروازہ چننا۔ ”دروازہ کھولو مجھے یاد آ گیا ہے..... نہیں مجھے کچھ یاد آ گیا ہے۔“
نوی نے سر پر ہاتھ مارا تھا لیکن اس نے مجھے روکا نہیں۔ میں دروازہ پھینکا رہا اور میری توقع کے مطابق کسی نے جواب نہیں دیا۔ میں باپوس ہو کر واپس آ گیا۔ ”کوئی آہی نہیں رہا ہے۔ میں کس سے بات کروں۔“
”کوشش کرتے رہو کبھی نہ کبھی تو جواب یں گے۔“

میری کوشش سے حوصلہ پا کر نوی مجھے سکھانے پڑھانے میں لگ گئی تھی کبھی کبھی وہ جھنجھلا جاتی اور غصہ کرتی لیکن فوراً ہی خود پر قابو پا کر نسنے سرے سے لگ جاتی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ یہ زندگی و موت کا مسئلہ ہے وہ کسی بھی طریقے سے یا میری قربانی دے کر یہاں سے نکل سکتی ہے تو اسے نکل جانا چاہیے۔ یہ سارا دن اسی طرح گزرا تھا۔ میں نے وقفے وقفے سے دروازہ چننا لیکن کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ شام ہوئی اور رات ہوئی تو نوی کا حوصلہ اور طاقت دونوں جواب دے گئے۔ بھوک و پیاس نے اسے نڈھال کر دیا تھا اور وہ لیٹ گئی۔ میری حالت اتنی بری نہیں تھی مجھے اس سے پہلے بھی بھوک و پیاس کا کئی بار تجربہ ہو چکا تھا لیکن میں ظاہر یہی کر رہا تھا کہ میری حالت خراب ہے۔ نوی نے مجھے دن میں سونے نہیں دیا تھا اس لیے رات ہوتے ہی میں لیٹ کر سو گیا۔ بھوک پیٹ میں کروٹیں لے رہی تھی اور پیاس سے حلق خشک ہو رہا تھا اگرچہ اسے کانٹے پڑنا تو نہیں کہا جاسکتا تھا مگر کیفیت اس سے کچھ مختلف بھی نہیں تھی۔ بہر حال ابھی میں برداشت کر سکتا تھا۔ البتہ نوی کی حالت بری تھی وہ سوتے میں کراہ رہی تھی اور کھانے پینے کو مانگ رہی تھی۔

مجھے انفسوس تھا لیکن میں اپنے لیے ہی کچھ نہیں کر سکتا تھا اس لیے کیا کرتا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک بار فاضلی کو میری حقیقت کا علم ہو گیا تو میرے ساتھ وہ جو کرے گا وہ کرے گا لیکن نوی کا مقدر صرف موت ہوگی جو نہایت اذیت سے گزر کر نصیب ہوگی۔ وہ اسے عینی گواہ کی حیثیت سے چھوڑنے کا خطرہ مول لے ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لیے مجھے صبر کے ساتھ اپنی اداکاری پر جے رہنا تھا اسی میں میری اور نوی کی بچت تھی۔ اندر سے مجھے یقین تھا کہ

فاضلی ہمیں ڈرا رہا ہے اس کا مقصد ہرگز ہمیں بھوک و پیاس سے ہلاک کرنے کا نہیں تھا۔ اس کا اصل پلان کیا تھا میں سمجھ نہیں پایا تھا۔ یہ تو وقت آنے پر ہی پتا چلتا کہ وہ کیا چکر چلا رہا تھا۔ میں رات کسی وقت جاگ گیا تھا۔ نوی سو رہی تھی یا غشی میں تھی۔

وہ بہر حال نرم و نازک عورت تھی اور شاید ان حالات سے پہلی بار واسطہ پڑا تھا۔ بھوک پیاس اس کے لیے اجنبی چیز تھی۔ ان لوگوں میں سے تھی جو صبح سے شام تک عادتاً کھاتے پیتے ہیں اور ان کا حقیقی بھوک پیاس سے واسطہ بہت کم پڑتا ہے۔ میں بنا آہٹ کیے اٹھا اور ایک بار پھر کھڑکی کی سلاخوں کو ٹٹولنے لگا۔ لینے لینے چھت کا بغور معائنہ کرنے سے مجھے اس کا تو سو فیصد یقین ہو گیا تھا کہ وہاں کوئی کیمرہ پوشیدہ نہیں تھا۔ ورنہ میں رات میں بھی اپنی اداکاری جاری رکھتا۔ اب ایسے سی سی ٹی وی کیمرے عام ہیں جو گھپ اندھیرے میں بھی دکھاتے ہیں۔ کھڑکی کی سلاخیں چھ چھانچ کے بعد لگی تھیں اگر ان میں سے ایک سلاخ نکل جاتی تو اتنا خلا بن جاتا جس سے ہم کوشش کر کے گزر سکتے تھے۔

اس بار میں نے تسلی سے اور پوری طاقت لگا کر کھڑکی کی سلاخوں کو آزمایا۔ مگر ان میں جنبش نہیں ہوئی تھی۔ ظاہر ہے فاضلی نے بھی اپنی تسلی کے بعد ہمیں یہاں قید کیا ہوگا۔ اس نے یقیناً ان سلاخوں کو چیک کیا ہوگا۔ سلاخیں اور کھڑکی کی چوکت پوری طرح اپنی جگہ جمی ہوئی تھیں۔ پھر میں نے سلاخوں سے ہاتھ باہر نکال کر جہاں تک یہ جا رہا تھا دیوار اور زمین کو چیک کیا۔ کھڑکی پرانے طرز کی تھی اور فرش سے صرف تین فٹ اوپر تھی۔ باہر مسلسل مٹی جمع ہونے سے زمین اونچی ہو گئی تھی اور میرا ہاتھ زمین کو چھو رہا تھا۔ میں خاصی دیر تک کھڑکی سے ہاتھ نکال کر باہر ٹوٹتا رہا۔ اس دوران میں پتے توڑ کر اور انہیں مسل کر ان کی نمی اپنی زبان پر لیتا رہا۔ ایک پتے سے بشکل ایک بوند پانی نکل رہا تھا لیکن ان حالات میں یہ بھی نینمیت تھا۔ جب میں اس شغل سے تھک گیا تو واپس اپنی جگہ آ کر لیٹ گیا۔ نوی بے سدھ پڑی تھی۔ میں نے اسے چیک کرنے کی کوشش نہیں کی۔ صبح کی روشنی پھیلی تو میں نے اسے ہلایا۔ وہ نیم غودگی میں تھی۔

”ہاں..... ہاں..... پانی ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”بہتر ہے سو جاؤ۔“

وہ اٹھ بیٹھی۔ ”میں ابھی خواب میں پانی دیکھ رہی تھی۔“

”کاش کہ میں بھی سو جاتا۔“

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”تم نے عقل مندی کی بات کی ہے۔“

”میں بے وقوف نہیں ہوں۔“ میں نے نکلی سے کہا۔ ”بس مجھے کچھ یاد نہیں ہے لیکن میں عقل رکھتا ہوں۔“

وہ زبردستی مسکرائی تھی۔ دو دن کے فاقے اور پیاس سے اس کا چہرہ ست گیا تھا اور چہرے پر بھرپور نمودار ہونے لگی تھیں۔ وہ ایک لخت ہی چالیس سال سے زیادہ کی گتے لگی تھی اور اس تاثر نے اس کی ساری کشش ختم کر دی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”اب مجھے یقین آ گیا ہے یہ لوگ جیج جی ہمیں اس طرح مار دینا چاہتے ہیں۔“

”اس سے تو بہتر ہے یہ ہمیں گولی مار دیں جیسے ڈاکٹر اور دوسرے آدمی کو ماری تھی پھر نرس کو بھی مار دیا تھا۔“

گولی کا سن کر اس کے چہرے پر خوف نمودار ہوا۔ ”میں مرنا نہیں چاہتی ہوں۔“

”مرنا تو ایسے بھی ہے تو سسک سسک کر کیوں مرے گی؟“

”مگر میں گولی کھا کر نہیں مرنا چاہتی۔“ اس کا لہجہ ہڈیاں ہونگیا۔

میں نے اٹھ کر دروازہ پینا اور بھوک پیاس کا رونا رونے لگا۔ ظاہر ہے ان لوگوں کے کان پر جوں بھی نہیں رہتی تھی۔ میری چیخ و پکار اور داد و فریاد رانیاں گئی۔ نوی میں یہ سب کرنے کی ہمت نہیں تھی اس لیے وہ لپٹی ہوئی فاضلی اور اس کے آدمیوں کو گالیاں دیتی رہی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”واپس آ جاؤ۔۔۔۔۔ یہ بے رحم لوگ ہماری نہیں سنیں گے۔“

میں واپس آ کر بیٹھا تو پہلی بار میرے دل میں خیال آیا کہ کہیں فاضلی نے جیج کو نہیں مرنے کے لیے بند نہیں کر دیا ہے۔ میں بدترین حالات کا حوصلے سے مقابلہ کرتا آیا ہوں اور ہار ماننے کا خیال بھی میرے ذہن میں کبھی نہیں آیا لیکن مجھے اعتراف ہے اس خیال نے مجھے خوف زدہ کر دیا تھا۔ بھوک و پیاس سے سسک سسک کر ہلاک ہونے کا خیال ہی بہت خوفناک تھا۔ میرا خیال تھا بلکہ یقین تھا کہ فاضلی ڈرامہ کر رہا ہے وہ مجھے خوف زدہ کر رہا ہے اور اس عورت کو میرے ساتھ بند کرنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ مجھ پر دباؤ ڈالے۔ مگر اس لمحے یہ یقین ڈانواں ڈول ہو گیا تھا۔ فاضلی دشمن تھا اور دشمن کا کیا بھروسہ، اس کی تو یہی خواہش ہوتی ہے کہ دشمن دنیا میں نہ رہے۔ شاید فاضلی نے بھی یہ فیصلہ کر لیا تھا اور وہ اس لیے یہاں موجود تھا کہ ہمارے مرنے کا تماشہ دیکھے۔

مگر میں نے فوراً ہی اس خیال کو جھٹک دیا۔ واقعات اور حالات بتا رہے تھے فاضلی کسی پلان پر عمل کر رہا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ پلان مرشد کا ہو اور اس نے خود پس پردہ رہتے ہوئے فاضلی کو آگے کیا ہو۔ ورنہ فاضلی کچھ بھی سہی، تھا تو اس کا ماتحت۔ وہ اس کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔ جیسے جیسے دن چڑھ رہا تھا نوی کی حالت خراب ہو رہی تھی وہ بار بار غشی میں چلی جاتی تھی۔ موسم سرد نہیں رہا تھا لیکن گرم بھی نہیں تھا۔ اگر موسم گرم ہوتا تو ان دونوں میں ہماری حالت خراب ہو جاتی۔ اس وقت کچھ کھائے پیے بغیر اڑتا لیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں نے دن بھی سو کر گزارا تھا۔ شام کے قریب نوی اٹھ بیٹھی اور اس نے مجھ سے کہا۔ ”مجھے لگ رہا ہے میں مر جاؤں گی۔“

”حوصلہ کرو ہو سکتا ہے کوئی مدد آ جائے۔“

اس نے مایوسی سے کہا۔ ”کہاں سے۔۔۔۔۔ یہ جگہ دیرانے میں ہے دودن سے ہمیں ایک بھی آواز سنائی نہیں دی ہے۔ مدد کو کون آئے گا۔ آئے گا تو پہلے ان لوگوں سے نئے گا۔“

”تمہارا کوئی نہیں ہے جو تمہاری مدد کرے؟“

”میرا۔“ اس نے تلخی سے کہا۔ ”میرے جو ہیں وہ صرف گدھ ہیں جنہیں موقع ملے تو مجھے نوچ کر کھا جائیں۔“ کہنے کو وہ بہن بھائی اور ماں باپ ہیں۔

”ان کو پتا چل گیا ہوگا کہ تم غائب ہو؟“

”نہیں، میں اکیلی رہتی ہوں اور کوئی مجھ سے ملنے نہیں آتا ہے میں خود اپنے گھر والوں سے ملتی ہوں۔“

”ان کو تو پتا ہوگا جہاں تم کام کرتی ہو؟“

”ہاں ان کو پتا ہوگا۔“ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا لیکن کچھ کہانیں اسے میرے سوالات سے پھر

شک ہو رہا تھا۔

”تب وہ تمہیں تلاش کر رہے ہوں گے۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ میں دو تین دن دفتر نہ جاؤں تو کسی کو بھی شک نہیں ہوگا، ہاں اس دوران میں وہ مجھے کال

کریں گے اور میرا نمبر بند ملے گا۔“

ابھی دودن ہوئے تھے اس لیے دفتر والوں کا حرکت میں آنے کا کوئی پروگرام نہیں ہوگا اور اگر وہ حرکت میں آ بھی جائیں تو زیادہ سے زیادہ پولیس میں رپورٹ درج کرانے کے اور کیا کر سکتے تھے۔ پولیس نوی کو تلاش کرتی یہاں نہیں آ سکتی تھی۔ وہ مجھے اپنے بارے میں بتانے لگی۔ وقفے وقفے سے وہ رک جاتی تھی کیونکہ گلا پہلے ہی خشک ہو رہا تھا بولنے سے مزید خشک ہو جاتا تھا۔ اس نے بہت غریبانہ پس منظر سے اٹھ کر اتنی ترقی کر لی تھی۔ اس کے پاس واحد اثاثہ اس کی خوب صورتی تھی۔ آج اس کے پاس بہت اچھی جاب تھی، اسلام آباد میں ذاتی فلیٹ تھا اس کے پاس لکڑی کا رتھی۔ وہ بہت محنت کر کے اور بہت ”قربانیاں“ دے کر اس مقام تک پہنچی تھی اور اب اس کا سب کچھ خطرے میں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ پچھتا بھی رہی تھی۔ مگر اس نے الفاظ میں اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔

وہ بولتی رہی اور تاریکی چھا گئی۔ پھر وہ خاموش ہو گئی جیسے اس کے پاس کہنے کو کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ کچھ دیر

میں چاند طلوع ہوا تو اس کی روشنی کمرے میں جھلکنے لگی۔ نوی لیٹ گئی تھی میں نے آہستہ سے کہا۔ ”سو گئی ہو؟“

”نہیں پیٹ میں کوئی نوکیلی سی چیز چھ رہی ہے۔“

ہمیں بھوک پیاس برداشت کرتے ہوئے یہ صرف دوسرا دن تھا۔ میں نے سنا ہے کہ انسان تین ہفتے تک بغیر خوراک کے زندہ رہ سکتا ہے اور پانی کے بغیر مشکل سے ایک ہفتہ۔ مگر یہ ایک اوسط اندازہ ہے ممکن ہے بعض لوگ کھائے پیے بغیر اس سے زیادہ عرصے زندہ رہ سکتے ہوں اور بعض جلدی مر سکتے ہیں۔ اس کا انحصار جسمانی قوت اور عزم و حوصلے پر بھی ہو سکتا ہے اور اس کا انحصار بھوک پیاس برداشت کرنے کی صلاحیت پر بھی ہوتا ہے۔ افریقہ میں خطہ کا شکار اقوام کے افراد اس معاملے میں حیرت انگیز قوت مدافعت رکھتے ہیں وہ کھائے بغیر مہینوں بھی زندہ رہتے ہیں لیکن وہ آزاد ہوتے ہیں۔ نہیں قید کر دیا گیا تھا اور اب ہمارے مرنے کا تماشہ دیکھا جا رہا تھا۔ ہمارے قریب کچھ لوگ کھتا پی رہے تھے اور انہوں نے ہم پر خوراک کا ایک ذرہ اور پانی کا ایک قطرہ بھی بند کر دیا تھا۔ یہ احساس خوراک کی بندش سے زیادہ جان لیوا تھا۔ کم سے کم نوی اسی وجہ سے ادھ موٹی ہوئی جا رہی تھی اسے معلوم تھا کہ بچنے کی امید نہیں ہے اس ناامیدی نے اسے قبل از وقت ہی قریب المرگ کر دیا تھا۔ وہ ساری رات سوتی اور روتی رہی جب جاگتی تو اس کی ہچکیاں صاف سنائی دیتی تھیں نیند بھی کہاں آتی تھی۔ بس غشی طاری ہو جاتی تھی۔

اس کے مقابلے میں میری حالت اتنی بہتر ضرور تھی کہ میں اپنی مرضی سے سو سکتا تھا۔ اس لیے اس رات کا

بڑا حصہ بھی سو کر گزارا تھا۔ جب صبح کی روشنی پھیلی تو میں نے نوی کو عجیب حالت میں پایا۔ ایسا لگا جیسے اس کا سر پیا سکر گیا ہو۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں نمایاں ہو گئی تھیں اور جو شرٹ اسے پہلے تنگ تھی اب پہلے جیسی تنگ نہیں رہی تھی۔ اس کی گردن، بازوؤں اور پنڈلیوں کا جو حصہ کھلا ہوا تھا اس پر کھال سکرسی لگی تھی اور اس پر باریک سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔ اس کے جسم میں پانی کی کمی شدت اختیار کر گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسے آج کے دن پانی نہیں ملا تو وہ اس جہان سے گزر جائے گی۔ وہ ہوش میں تھی لیکن سوائے آنکھیں کھلی رکھنے کے وہ اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ آج کے دن خود میری حالت بھی خراب ہو رہی تھی۔ کمزوری کی وجہ سے سانس بھی کھینچ کر لینا پڑ رہی تھی۔

اچانک دروازہ کھلا اور فاضلی اندر آیا۔ اس نے ہمارا جائزہ لیا اور مسکرایا۔ ”میرا خیال ہے یہ عورت شاید کل تک زندہ نہیں رہے گی۔“

میں دیوار کے ساتھ نیم دراز ہانپتا رہا اور اسے دیکھتا رہا۔ میں نے بولنے کی کوشش نہیں کی۔ فاضلی کچھ دیر نہیں دیکھتا رہا پھر وہ چلا گیا اور دروازہ بند ہو گیا۔ فاضلی دیکھنے آیا تھا کہ ہماری حالت اب کیسی ہے۔ وقت گزرتا رہا، نوی کبھی آنکھیں بند کر لیتی تھی اور کبھی کھولتی تب بھی بولنے یا غصے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔ اس میں ہمت باقی نہیں رہی تھی۔ شام کے وقت میں ہمت کر کے اٹھا اور کھڑکی سے باہر ہاتھ نکال کر بھانڈیاں ٹٹولنے لگا۔ پھر واپس آ کر اسی انداز میں لیٹ گیا جیسے پہلے لیٹا ہوا تھا۔ نوی مجھ سے کچھ دور چت لیٹی ہوئی تھی لیکن اس کا یہ پوز بالکل بھی کشش انگیز یا جذبات ابھارنے والا نہیں لگ رہا تھا۔ بھوک و پیاس انسان کے احساسات کس طرح بدلتی ہے اس کا مجھے خوب تجربہ ہو رہا تھا۔ ابھی تاریکی چھانے میں کچھ وقت تھا کہ دروازہ پہلے کی طرح اچانک کھلا اور فاضلی اندر آیا۔ اس کا خاص گرگراؤ دروازے پر موجود تھا اور اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ میں فاضلی کے ہاتھ میں سلینڈر دیکھ کر چونکا جن میں وہ نیلے سیال والے انجکشن رکھے جاتے ہیں۔ یہ دو سلینڈر تھے۔ مگر میں نے اپنے اندر کے تاثرات چہرے پر آنے نہیں دیئے تھے۔ نیم کروٹ لیے فرش پر دیوار کا سہارا لیے لیٹا رہا۔

”اسے پہچانا۔“ فاضلی نے سلینڈر لہرائے۔ ”یہ میں تمہارے اور اس حسینہ کے لیے لایا ہوں جس کی اصلیت کھل گئی ہے۔“ اس نے نوی کی طرف دیکھا۔ ”اس سے اچھی تو وہ نرس تھی کم سے کم جوان تو تھی۔“

”یہ کیا ہے؟“ میں نے بہت دھیمی آواز میں پوچھا۔

”یہ ایک دوا ہے جو میں پہلے اسے انجکٹ کروں گا۔“ اس نے نوی کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور اس کا نتیجہ دیکھنے کے بعد تمہیں دوں گا۔“

”اس سے کیا ہوگا؟“

”اس سے تمہاری ساری بھوک پیاس ختم ہو جائے گی۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

”تب پہلے مجھے دو۔“ میں نے بے تابی سے کہا۔

”صبر۔ صبر۔“ اس نے سلینڈر کھول کر اس میں سے سرخ نکالی جس میں نیلا سیال پہلے ہی موجود تھا۔

وہ نوی کے پاس گھٹنے کے بل بیٹھا اور اس نے نوی کا ہاتھ سیدھا کیا وہ اس پر نرس تلاش کر رہا تھا لیکن پانی کی کمی اس کی نرس غائب ہو گئی تھی۔ فاضلی کچھ دیر نرس تلاش کرتا رہا پھر جھجھکا کر بولا۔ ”لعنت ہو۔۔۔ ایسے ہی لگا دیتا

ہوں۔“

فاضلی کا گرگا بھی دلچسپی سے نوی اور فاضلی کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ اس لمحے میری طرف سے غافل ہو گیا تھا۔ اس کے خیال میں مجھ میں اتنا دم کہاں رہا تھا کہ میں اپنی جگہ سے حرکت بھی کر سکوں۔ مگر یہ اس کی غلط فہمی تھی اس نے لا پرواہی سے کام لیا اور مجھے موقع دیا۔ میں نقاہت اور کمزوری کے باوجود ہر ممکن تیزی سے حرکت میں آیا تھا۔ فاضلی اس طرح بیٹھا تھا کہ اس کی آنکھیں میری طرف بھی دیکھ سکتی تھیں لیکن سرخ نکالنے کے بعد اس کی ساری توجہ سرخ اور نوی کی طرف تھی۔ اسے ذرا تاخیر سے احساس ہوا اور میرا گھومتا ہوا ہاتھ اس کے سر پر لگا۔ اگر یہ خالی ہاتھ ہوتا تو اسے کچھ بھی نہ ہوتا لیکن میرے ہاتھ میں ایک گول اور تقریباً پون سیر کا پتھر دبا ہوا تھا اور اس نے فاضلی کو تارے دکھا دیئے تھے وہ کراہ کر نوی پر ڈھیر ہو گیا۔

”خبردار۔۔۔ خبردار۔“ فاضلی کا آدی بوکھلا کر دھسکیاں دیتا رہ گیا لیکن میں نے اتنی دیر میں سرخ اٹھا کر فاضلی کے بازو میں داخل کر دی۔ وہ گولی نہیں چلا سکتا تھا کیونکہ فاضلی اور میں بالکل پاس تھے اور اسے گولی لگنے کا پورا امکان تھا۔ میں نے دانت پیس کر کہا۔

”جہنم میں جاؤ۔“ اور سرخ کا پلٹن دبا دیا۔ دوا فاضلی کے جسم میں داخل ہو گئی۔ وہ بے ہوش نہیں ہوا تھا البتہ چکرانہ ضرور گیا تھا بہر حال سوئی کی تکلیف اور پھر جسم میں دوا کے داخل ہونے سے اسے ہوش آ گیا اور وہ حلق پھاڑ کر چلایا۔

”نہیں۔۔۔ شازی اسے گولی مار دے۔“

”ضرور۔“ میں نے فاضلی کو گردن سے جکڑ کر سامنے کر لیا۔ ”پہلے یہ تمہارا آقا مرے گا اس کے بعد گولی میرے جسم میں اترے گی۔“

شازی تذبذب میں پڑ گیا تھا اور اسی میں مارا گیا۔ میں فاضلی کا لباس ٹٹول رہا تھا اور مجھے اس کی قمیص تلے پتلون کی پلٹ میں اڑسا ہوا پستول مل گیا۔ میں نے پستول نکالنے ہی شازی پر گولی چلا دی۔ گولی اس کے شانے پر لگی تھی اور وہ فرش پر گر پڑا۔ میں فاضلی کو دھکیل کر باہر کی طرف لپکا۔ فاضلی کا دوسرا گرگا شات گمن سنبھالے اندر آ رہا تھا اور اس نے گمن میری طرف اٹھا دی تھی اسے موقع دینا خود کشی کرنے کے مترادف تھا میں نے دوسری گولی اس کے ماتھے میں اتار دی اور وہ جھٹکے سے کبین کے دروازے سے باہر جاگرا۔ اس وقت میں اپنی حالت بھول کر پوری طرح فعال ہو گیا تھا یہ زندگی و موت کا معرکہ تھا اس میں ذرا سی غفلت سے بازی پلٹ جاتی۔ شازی ہوش میں تھا میں نے پستول کا دستہ اس کی کینٹی پر مارا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ میں واپس اندر کی طرف لپکا۔ فاضلی کے گردوں سے نمٹ کر مجھے اس کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ ضروری نہیں تھا کہ اس کے پاس یہی ایک ہتھیار ہوتا لیکن وہ نوی کے برابر فرش پر چت پڑا تھا اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ بے تاثر انداز میں چھت کو گھور رہا تھا اس کی وقفے وقفے سے جھپٹکی پلکیں بتا رہی تھیں کہ وہ ہوش میں ہے۔ میں نے اس کی مکمل تلاشی لی۔ اس کے پاس سے ایک چھوٹا بند ہو جانے والا خنجر نکلا تھا اس کے سوا صرف گاڑی کی چابیاں اور اس کا پرس تھا جس میں اچھی خاصی رقم تھی میں نے تمام چیزیں نکال لیں اور آخر میں وہ پتھر کھڑکی سے باہر اچھال دیا جو میں نے وچیں سے حاصل کیا تھا۔ نوی کو سہارا دے کر اٹھایا اور باہر لا کر دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ اسے اپنا ہوش نہیں تھا

بس وہ میرے سہارے چلی جا رہی تھی۔ اسے ایک طرف بٹھا کر میں مارے جانے والے کی لاش بھی اندر لے آیا تھا۔

اسی جگہ موجود ہونے کے باوجود نوئی کو لاش اور زخمی شخص نظر نہیں آیا تھا۔ میں باہر آیا تو حسب توقع یہ جگہ ویرانہ ثابت ہوئی تھی۔ کیمن نہایت خستہ اور قدیم تھا۔ اس کے چاروں طرف دس سے پندرہ فٹ اونچی جھاڑیاں تھیں اور ایک کچا گھاس سے ڈھکا راستہ بتا رہا تھا کہ یہاں آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ کیمن کے سامنے ڈبل کیمن جیب کھڑی تھی ہمیں اسی میں یہاں لایا گیا تھا۔ میں نے اس کا پچھلا حصہ کھولا تو میرے منہ سے خود بہ خود کاکری نکل گئی تھی۔ وہاں ایک بڑے سائز کی باسکٹ اور منرل واٹر کی بڑی والی بوتل موجود تھی۔ میں نے نوئی کو نیچے لٹایا اور سب سے پہلے بوتل سے کچھ پانی ایک گلاس میں نکال کر اسے تھوڑا تھوڑا پیاد۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ سات آٹھ لیٹرز کی یہ پوری بوتل منہ سے لگا کر ایک ہی بار میں خالی کر دوں لیکن یہ نقصان دہ ہوتا۔ اس لیے میں نے دل پر جبر کر کے یہ گلاس آہستہ آہستہ خالی کیا اور اس پانی نے مجھے پھر سے تروتازہ کر دیا تھا۔ دوسرا گلاس میں نے تھوڑا تھوڑا کر کے اسی طرح نوئی کو پلایا اور اس کی ٹھلکی کی کوشش کو بزدلانا کام بنادیا۔ وہ پانی جیتی رہی اور مجھے برا بھلا کہتی رہی۔ ایک گلاس پانی پی کر اس کے حواس بھی بحال ہو گئے تھے۔ میں نے باسکٹ کا جائزہ لیا۔ اس میں ڈبل روٹی اور مکھن کے ساتھ کھانے کو اور بھی بہت کچھ تھا لیکن میں نے مکھن اور ڈبل روٹی کو ترجیح دی۔ یہ سادہ اور قوت بخش غذا تھی۔

جتنی دیر میں نوئی نے تین پیس حلق سے اتارے میں پوری ڈبل روٹی صاف کر چکا تھا۔ اس نے خفگی سے خالی شاپر دیکھا۔ ”اب میں کیا کھاؤں گی؟“

”باسکٹ میں بہت کچھ ہے۔“ میں نے آدھا گلاس پانی اور پیا۔ ”کھاؤ لیکن احتیاط سے اور پانی تو بہت احتیاط سے پینا ورنہ پیٹیں بے ہوش ہو جاؤ گی اور دوبارہ ان لوگوں کی قید میں چلی جاؤ گی۔“

اگر اس کا بے دھڑک کھانے پینے کا ارادہ تھا تو اس نے فوراً ترک کر دیا۔ ”لیکن یہ ہوا کیسے... تم نے ان پر قابو پا لیا اور تم تو عقل مند لگ رہے ہو۔“

”اس لیے کہ میں عقل مند ہوں۔“ میں نے جواب دیا اور اندر کی طرف روانہ ہوا۔ فاضلی اٹھ بیٹھا تھا اس نے دروازہ کھلنے پر سب سے پہلے نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”کیسے ہو فاضلی؟“

اس سوال پر بھی وہ مجھے اسی طرح دیکھتا رہا ایسا لگ رہا تھا انجکشن نے اثر کر دیا تھا۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا تو بغیر مزاحمت کے کھڑا ہو گیا۔ میں اسے باہر لایا اپنے دونوں آدمیوں کو خون میں لت پت پا کر اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات آئے تھے۔ میں اسے باہر لایا تو نوئی اچھل پڑی تھی۔ ”میرے خدایہ آزاد ہے۔“

”فکر مت کرو۔“ میں نے جیب کے عقبی حصے سے رسی نکالتے ہوئے کہا اور فاضلی کے دونوں ہاتھ پشت سے باندھ کر اسے جیب کے پچھلے حصے میں دھکیل دیا۔ اس سے پہلے اطمینان کر لیا تھا کہ وہاں کوئی ہتھیار یا ایسی چیز تو نہیں ہے جس سے فاضلی خود کو آزاد کرالے اگرچہ ایسا لگ رہا تھا کہ انجکشن کی وجہ سے فاضلی اپنی شخصیت اور یادداشت کھو چکا تھا لیکن میں اس پر بھروسہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ممکن ہے جس طرح یہ انجکشن مجھ پر

بے اثر ثابت ہوا تھا فاضلی پر بھی اثر نہ کرتا۔ اس کا امکان تھا کہ میری چال مجھ پر ہی الٹ دے اس لیے میں اس کی طرف سے پوری طرح محتاط تھا۔ نوئی نے پیٹ بھر لیا تھا اور اس کی توانائی بحال ہو گئی تھی۔ میں نے اسے فاضلی کی نگرانی پر لگایا۔ باہر گرنے والے نگران کی لاش میں پہلے ہی اندر پہنچا چکا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ نوئی یہ لاش دیکھے۔ اب مجھے دوسرے کا فیصلہ کرنا تھا۔ وہ بے ہوش تھا اور اسے ہوش میں لانے کے لیے ایک گلاس پانی استعمال کرنا پڑا تھا۔ گولی نے اس کا شانہ توڑ دیا تھا لیکن یہ اس کے کروتوتوں کی بہت کم سزا تھی۔ وہ ہوش میں آیا اور کرا بنے لگا۔

”پانی.....“

”میرے بس میں ہو تو تمہیں پیٹاب پلاؤں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن میں تمہاری طرح حیوان نہیں ہوں اس لیے یہ لو۔“ میں نے گلاس میں بچا پانی اس کی طرف بڑھا دیا اس نے بے تابی سے پانی پیا۔

”تمہارا شکریہ۔“ اس نے ہچکچا کر کہا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے یہ تمہارا آخری پانی تھا جو تم نے پیا اور اب تم زندگی سے محروم ہونے جا رہے ہو۔“

میں نے پستول سیدھا کیا تو اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ ”مگر کیوں؟“

”یہ سوال تم سے اس نرس نے بھی کیا ہو گا تم نے کیا جواب دیا تھا۔“

وہ خاموش رہا اور اس کی خاموشی ہی اقرار جرم تھی میں نے ٹریگر دبا دیا گولی اس کے دل میں اتر گئی اور وہ بغیر آواز نکالے لڑھک گیا تھا۔ جب میں نے نرس کی لاش دیکھی تھی تو اسی وقت عہد کیا تھا کہ مجھے موقع ملا تو میں اس کے مجرموں کو ضرور کیفر کردار تک پہنچاؤں گا۔ قدرت نے مجھے یہ موقع دے دیا تھا۔ میں نے پستول قبضے کی جیب میں رکھا تھا کہ باہر سے نوئی کی چیخ سنائی دی۔ میں باہر کی طرف لپکا اور پھر ٹھٹک گیا نوئی گاڑی کے سامنے زمین پر پڑی تڑپ رہی تھی۔ اس کا گلا کٹا ہوا تھا اور اس سے خون فوارے کی طرح اچھل رہا تھا۔ میں اس کے پاس آیا اس نے مجھے دیکھ کر ہاتھ اوپر کیا جیسے مجھے خبردار کر رہی ہو لیکن کس سے؟ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اسی لمحے مجھے فاضلی کا خلیہ آیا اور اس سے پہلے میں اپنی جگہ سے حرکت کرتا اچانک جیب کا انجن غرا کر اشارت ہوا اور فاضلی ڈرائیونگ سیٹ پر نمودار ہوا وہ نیچے جھکا ہوا تھا۔ جیب جھکے سے آگے آئی میں مشکل سے دو گز کے فاصلے پر تھا۔ بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔



جیب کا طاقتور انجن غرایا۔ اس نے پہلے نوئی کی لاش کو روندنا اور پھر میری طرف کسی خون آشام درندے کی طرح لپکی۔ میں ذرا ترچھا ہوا کہ تصادم کی شدت کم کر سکوں۔ مجھے بس اتنی ہی مہلت ملی تھی۔ اس کے باوجود جیب کی نگرانی مجھے معمولی کھلونے کی طرح ہوا میں اچھال دیا اور میں اڑ کر عقب میں موجود ایک درخت کے تنے سے کمر کے بل ٹکرایا تھا اور میری کمر میں شدید تکلیف کے ساتھ ایک چمک سی اٹھی جو ذہن تک گئی تھی۔ یہ ایسی تکلیف تھی جیسے کسی نے میری کمر سے بجلی کا ننگا تار لگا دیا ہو۔ درخت سے ٹکرا کر میں نیچے گرا اور پھر الٹ کر درخت کے پیچھے چلا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ میں جیب اور درخت کے درمیان آنے سے بچ گیا۔ میں آج تک نہیں

میں وہ میرے پاس آ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موجود چاقو زیادہ بڑا نہیں تھا اس کا بلینڈ مشکل سے چار انچ چوڑا تھا لیکن یہ دونوں طرف سے ریزر جیسی دھار والا چاقو تھا اور مشاق ہاتھوں میں نہایت مہلک ہتھیار کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں اپنا دفاع کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ فاضلی نے خود پر قابو پالیا تھا اور اس کی سانپ جیسی تیز آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ وہ یقیناً سوچ رہا تھا کہ کس زاویے سے حملہ کرے کہ مجھے مدافعت کا موقع نہ ملے۔ اسے دھوکے میں رکھنے کے لیے میں اپنی حالت کچھ زیادہ ہی خراب کر کے پیش کر رہا تھا میری آنکھیں نیم دائیں اور سر یوں اٹھا تھا جیسے میرے لیے یہ چھوٹا سا کام بھی آسان نہ ہو۔ مگر فاضلی جیسے عیار آدمی کو دھوکا دینا آسان نہیں تھا۔ اس نے پہلے بھی دھوکا نہیں کھایا تھا جب مرشد بھی مطمئن ہو گیا تھا کہ میں واقعی اپنے ہوش کھو بیٹھا ہوں۔

”شہباز تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔“ فاضلی نے اچانک کہا وہ رک گیا تھا۔ ”میرا خیال ہے تم اتنے کمزور نہیں ہو جتنا خود کو ظاہر کر رہے ہو۔“

میں چاہ رہا تھا کہ وہ میرے پاس آئے اور اس کے خبیث ذہن میں خیال نہ آئے کہ کیمین میں اس کے مرے ساتھیوں کے کئی ہتھیار موجود ہیں۔ مگر ایسا لگ رہا تھا کہ میری یہ دعا قبول نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ فاضلی رک گیا تھا اور سوچ رہا تھا۔ ”کیا..... سوچ رہے ہو مرشد کی ناجائز اولاد۔“ میں نے اسے اکسانے کے لیے گالی دی۔ ”آؤ مجھے قتل کرو۔“

اس کا موڈ آف ہو گیا۔ ”بکواس مت کرو۔“

”تمہارے نام نہاد باپ کو تمہاری اصل ولدیت کا علم ہے؟“

”اسی نے مجھے بتایا تھا وہ بچپن سے مجھ سے خاک کھاتا تھا، مجھے بلاوجہ مارتا تھا، نفرت کا اظہار کرتا تھا۔ ایک دن جب میں جوان ہو گیا تھا تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تب اس نے بتایا کہ میں اصل میں مرشد کی اولاد ہوں۔“

”تم نے کیا کیا؟“

”میں نے اس ذلیل شخص کو قتل کر دیا جو بے غیرت تھا۔“

”حالانکہ تمہیں مرشد کو قتل کرنا چاہیے تھا۔“

”میں اسے بھی قتل کروں گا لیکن ابھی نہیں۔ جب میں اس کی ساری طاقت اور دولت حاصل کر لوں گا تب اسے قتل کروں گا۔“

”یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”جو شخص اپنے گتے بھائی کی پروا نہ کرے وہ اپنی ناجائز اولاد کی پروا کیوں کرنے لگا۔“

”اسے ابھی میرے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہے۔“

مجھے فاضلی کی بات پر ہنسی آئی۔ وہ مرشد جیسے عیار آدمی کو اتنا انجان سمجھ رہا تھا اسے معلوم نہیں تھا کہ مرشد خود بے خبر بن کر اسے بے وقوف بنا رہا ہے لیکن میں نے فاضلی کو بتایا نہیں اس کے بجائے میں نے کہا۔ ”تمہاری حالت بتا رہی ہے کہ انکیشن نے تم پر بھی اثر نہیں کیا ہے؟“

”میرا خیال ہے یہ سیٹ کسی وجہ سے بیکار ہو گیا ہے۔ شاید مرشد نے اسے رکھنے میں احتیاط نہیں کی اور دوا

کچھ سکا کہ میں درخت کے پیچھے کس طرح چلا گیا تھا جب آکر درخت کے تنے سے ٹکرائی اور تصادم سے اس کا ہونٹ اوپر اٹھ گیا تھا۔

یہ پتیل کا مضبوط تنے والا درخت تھا ورنہ کوئی عام درخت ہوتا تو یقیناً گر جاتا۔ جب بہت قوت سے ٹکرائی تھی کیونکہ فاضلی مسلسل ایکسی لیٹر دے رہا تھا اور چپ نے جس رفتار سے مجھے ٹکرائی تھی وہ اس سے زیادہ رفتار سے آکر درخت سے ٹکرائی تھی۔ دھماکہ یقیناً شدید تھا لیکن مجھے دھماکہ سننے کا ہوش کہاں تھا؟ میرے اپنے ہوش اڑے ہوئے تھے۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن مجھ سے اٹھنا نہیں گیا تھا۔ ریزر کی ہڈی پر لگنے والی چوٹ نے فی الحال مجھے ناکارہ کر دیا تھا۔ میں رینگ کر پیچھے ہٹنے لگا۔ اس درخت کے پیچھے کئی اور درخت تھے اور چپ آنے کی تمنا نہیں تھی۔ فاضلی نے جس طرح مجھ پر چپ چڑھائی تھی صاف لگ رہا تھا کہ وہ ہو میرے خاتمے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے اس بات کی پروا بھی نہیں کی تھی کہ کچھ فاصلے پر درخت تھا اور چپ اس سے ٹکرائی تو اسے بھی نقصان ہو سکتا تھا۔

میں پیچھے سرک رہا تھا کہ وہ چپ سے اترا اور اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا چاقو تھا اسی سے اس نے نوی کا گلا کاٹ دیا تھا۔ صاف ظاہر تھا انکیشن نے جس طرح مجھ پر اثر نہیں کیا تھا اسی طرح فاضلی پر بھی بے اثر رہا تھا اور اس نے میری ترکیب مجھ پر آزمائی تھی۔ وہ شرافت سے ظاہر کرتا رہا کہ اپنی شخصیت کھو بیٹھا ہے اور جب میں نے اسے چپ کے عقبی حصے میں بند کیا تو اس نے وہاں کہیں چھپا ہوا یہ چاقو نکال لیا پہلے اپنی بندشیں کاٹیں اور پھر باہر نکل کر نوی کا گلا کاٹ دیا۔ میں پوری طرح چپ کی تلاشی نہیں لے سکا تھا۔ فاضلی نے اسی کا فائدہ اٹھایا تھا۔ درخت اور چپ کے تصادم میں اسے بھی چوٹ آئی تھی اور اس کے سر سے بہنے والا خون اس کے چہرے پر پھیل کر اسے خوفناک بنا رہا تھا۔ اس نے بھیڑیے کی طرح دانت نکالے۔

”شہباز تمہارا آخری وقت آ گیا ہے؟“

”ممکن ہے۔“ میں نے بدستور پیچھے سرکتے ہوئے جواب دیا۔ ”لیکن میں نے بہت سے لوگوں کے منہ

سے آخری جملہ یہی سنا ہے اور اس کے بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔“

”لیکن میں تمہیں مار کر مروں گا۔“ اس نے کہا اور میری طرف بڑھتا رہا۔ حالت اس کی بھی اچھی نہیں تھی کیونکہ وہ ڈمگاتے قدموں سے آگے آ رہا تھا۔ میں بدستور پیچھے سرک رہا تھا۔ میں درخت سے ٹکرا کر اگر تو پستول نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ تصادم کے بعد میرے پاؤں سن ہو گئے تھے لیکن کچھ دیر بعد وہ حرکت کرنے لگے تھے۔ اس سے میرا یہ غدشہ دور ہو گیا کہ میری ریزر کی ہڈی کو کوئی ناقابلِ تلاشی نقصان ہو گیا ہے۔ مگر ابھی میں اس قابل نہیں ہوا تھا کہ پیروں پر کھڑا ہو سکوں۔

”تم نے بیچاری نوی کو بھی مار دیا۔“ میں نے اس کی توجہ ہٹانے کے لیے کہا۔ ”وہ بے گناہ تھی۔“

”اسے مرنا ہی تھا وہ ہمارے خلاف گواہ تھی لیکن میں نے سوچا اسے تمہارے ساتھ ہی ماروں گا۔“

چپ نے درخت سے ٹکرائے سے پہلے نوی کے بے جان جسم کو بھی روند دیا تھا۔ اسے تو فرق نہیں پڑا کیونکہ وہ میرے سامنے ہی دم توڑ چکی تھی البتہ اس کی لاش کی حالت بری ہو گئی ہوگی۔ میں زمین پر سرک رہا تھا اور فاضلی سست قدموں سے سہی لیکن چل کر میری طرف آ رہا تھا اس لیے اس کی رفتار زیادہ تیز تھی۔ چند لمحوں

ناکارہ ہو گئی۔“

”تم نے میری ٹوپی میرے سر رکھ دی اور کامیاب رہے۔“ میں نے کہا۔ ”اب انتظار کس بات کا ہے۔“
فاضلی عیاری سے مسکرایا۔ ”میرا خیال ہے اس حالت میں بھی تمہارے نزدیک آنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔“

”مجھے افسوس ہے میں اب تک تمہیں بہادر سمجھتا رہا تھا۔“

”میں بزدل ہی بھلا۔“ اس نے جواب دیا اور مرکز کیبن کی طرف جانے لگا اس کا ارادہ یقیناً وہاں سے کوئی گمن لا کر مجھے دور سے شوٹ کرنے کا تھا۔ اس حالت میں بھی وہ میرے پاس آنے کو تیار نہیں تھا جب کہ اس کے ہاتھ میں چاقو تھا اور میں قطعی نہ تھا۔ جیسے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوا میں حرکت میں آ گیا۔ اتنی دیر میں میرا جسم خاصی حد تک میرے قابو میں آ گیا تھا۔ مگر میں خاصی مشکل سے کھڑا ہو سکا تھا ریزہ کی ہڈی اور کمر میں خوفناک قسم کے درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں اور کھڑے ہونے پر ایک لمحے کے لیے وہی بجلی والی چمک ہوئی جو درماغ تک گئی تھی۔ پستول تلاش کرنے میں وقت کا ضیاع ہوتا اس لیے میں ہر ممکن تیزی سے کیبن سے دور جانے لگا۔ میری عافیت اسی میں تھی کہ فاضلی سے ممکن حد تک دور رہوں۔ درختوں کا یہ جھنڈ زیادہ بڑا نہیں تھا۔

اب تک میں تنوں اور شاخوں کا سہارا لے کر چل رہا تھا لیکن جھنڈ سے باہر آ کر جب مجھے اپنے بل بوتے پر چلنا پڑا تو تب مجھے صحیح معنوں میں تکلیف کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اگر حالات اور مصائب نے مجھے غیر معمولی قوت برداشت نہ دی ہوتی تو اس وقت میری چیخیں نکل رہی ہوتیں۔ ذرا آگے جھاریاں تھیں ایک بار میں ان میں گھس جاتا تو فاضلی کے لیے مجھے تلاش کرنا آسان نہ رہتا۔ اس لیے میں تکلیف کو نظر انداز کر کے ہر ممکن تیزی سے چل رہا تھا۔ فاضلی کسی لمحے بھی واپس آ سکتا تھا اور مجھے جھنڈ میں نہ پا کر زخمی بھیڑیے کی طرح میری تلاش میں نکل کھڑا ہوتا۔ اب اس میں شبہ نہیں تھا کہ وہ مجھے قتل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا اور دیکھتے ہی گولی مار دیتا۔ میری طرف سے ہر ممکن تیزی کے باوجود فاضلی عین اس وقت نمودار ہوا جب میں جھاریوں میں داخل ہو رہا تھا اس نے مجھے دیکھتے ہی شاٹ گن سے فائر کیا اور گولی نہ جانے کہاں گئی۔ درمیان میں کوئی دو سو گز کا فاصلہ آ گیا تھا اس لیے شاٹ گن غیر موثر تھی۔

اس کے اگلے فائر سے پہلے میں جھاریوں میں داخل ہو گیا تھا۔ مگر اب یہ حصار میرے لیے اتنا کارآمد نہیں رہا تھا کیونکہ فاضلی نے دیکھ لیا تھا کہ میں کہاں ہوں اور وہ سیدھا وہیں آتا اگر میں اس کی لاعلمی میں جھاریوں تک آ جاتا تو اسے وسیع رقبے پر پھیلی جھاریاں کھگانا پڑتیں اور میری بچت کا امکان بڑھ جاتا تھا لیکن اب وہ سیدھا ہی میں آتا اور میرے پاس چانس کم رہ گیا تھا مجھے جلد از جلد کوئی جگہ تلاش کرنی تھی جہاں میں کچھ دیر کے لیے پناہ لے سکوں۔ اس حالت میں میرے لیے مزید بھاگ دوڑ محال ہوتی جا رہی تھی۔ میں جھاریوں میں کوئی ایسی جگہ دیکھ رہا تھا جہاں میں چھپ سکوں اور فاضلی کو شک بھی نہ ہو۔ ایک چھوٹی اور کم اونچی جھاری کے پاس سے گزرتے ہوئے میرا پاؤں کسی گڑھے میں گیا اور میں گرتے گرتے بچا تھا۔ میں نے جبک کر دیکھا۔ جھاری ایک گڑھے کی تہ میں اگی ہوئی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اس کی اونچائی کم لگ رہی تھی۔ جانوروں نے اس کے پتے چر لیے تھے اس لیے اس کا حجم بھی کم تھا اور باہر یہ چھوٹی جھاری لگ رہی تھی لیکن گڑھا پوری طرح

چھپ گیا تھا اور جب تک بالکل جھک کر نہ دیکھا جائے گڑھا نظر نہیں آتا۔

مجھے یہ جگہ مناسب لگی اور میں کوشش کر کے اس گڑھے میں داخل ہو گیا جس کی تہ سے جھاری اگی تھی۔ یہاں جگہ بہت کم تھی مجھے اپنا جسم کمان کی طرح رکھنا پڑا تب کہیں جا کر میں گڑھے میں پورا آیا تھا لیکن بیٹھے کی وجہ سے تکلیف بڑھ گئی تھی اس لیے میں یوں لیٹ گیا جیسے آدی سردی لگنے پر نیند کے دوران کروٹ لے کر اور گھٹنے کیڑ کر سنے سے لگا لیتا ہے۔ اس پوزیشن میں مجھے آرام ملا تھا اور میں نسبتاً آسانی سے گڑھے میں سا گیا تھا۔ میری کوشش تھی کہ میری کسی حرکت سے جھاری نہ ہلے۔ فاضلی یقیناً جھاریوں میں آچکا تھا اور مجھے تلاش کر رہا ہو گا۔ جب میں اسے نظر نہیں آتا تو وہ سمجھ جاتا کہ میں کہیں چھپ گیا ہوں اور پھر وہ مجھے جھاریوں میں تلاش کرتا۔ کچھ دیر اس کے قدموں کی آواز آنے لگی اور پھر اس کی آواز آئی۔

”شہزاد مجھے معلوم ہے تم یہیں کہیں چھپے ہوئے ہو۔“

میں نے جواب میں دل ہی دل میں کہا۔ ”اللہ تمہیں عقل سے محروم کرے اور گمراہی اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔“

”میں جلد تمہیں تلاش کر لوں گا اور کتے کی موت مار دوں گا۔“ فاضلی بولا وہ جھاریاں ہٹا ہٹا کر دیکھ رہا تھا اور رفتہ رفتہ اس جھاری کے پاس آتا جا رہا تھا جس کے نیچے میں موجود تھا۔ ”کاش کہ میں نے اس زہریلے ناگ کو زندہ پکڑنے کے بجائے اسی وقت اس کا سر کچل دیا ہوتا۔“ میں نے سوچا لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ زندگی اور موت کا فیصلہ تو اللہ کرتا ہے اگر فاضلی کی موت آگئی ہوتی تو وہ یقیناً میرے ہاتھ سے مارا جا چکا ہوتا لیکن ابھی اس کی موت کا وقت نہیں آیا تھا۔ فاضلی نزدیک آتا جا رہا تھا اور وہ جس طرح ایک ایک جھاری کو نزل رہا تھا مجھے قطعی خوش فہمی نہیں تھی کہ وہ اس جھاری کو دیکھے بغیر چھوڑ دے گا۔ اس نے میری حالت دیکھ لی تھی اور جان گیا تھا کہ اس حالت میں، میں زیادہ دور نہیں جا سکتا تھا جب کہ میں پہلے ہی اپنی ہمت سے بڑھ کر چل چکا تھا اس لیے لازمی کہیں آس پاس ہی چھپا ہوں گا۔ اس لیے وہ سکون سے ایک ایک جھاری نزل رہا تھا اس یقین کے ساتھ کہ جلد یا بدیر وہ مجھ تک پہنچ جائے گا۔ مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔

فاضلی اس جھاری کے اتنے پاس آ گیا تھا کہ اس کے جوتے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ وہ شاٹ گن کی نال سے جھاریاں نزل رہا تھا پھر وہ جھاری کے پاس آ کھڑا ہوا میں نے سانس بھی رک لیا تھا۔ وہ شاٹ گن کی نال سے پتے ہٹا رہا تھا اور کسی بھی لمحے کوئی شاخ ہٹاتا اور اسے میرا پیدار نصب ہو جانا۔ اس کے بعد وہ مارے خوشی کے فائر کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کرتا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ جھاری ہٹاتا۔ کسی کے لاکار نے کی آواز آئی۔ ”اوائے یہاں کیا کر رہا ہے؟“

میرا دل ڈوب گیا کیا فاضلی کے مزید کچھ آدی آگئے تھے۔ مگر فاضلی کا رد عمل بالکل مختلف تھا۔ اس نے بھڑک کر بولنے والے پر فائر کر دیا۔ شاٹ گن اتنے قریب سے چلی کہ اس کے بارد کا دھواں مجھ تک آیا تھا۔ کوئی چلایا اور جواب میں بیک وقت کئی گولیاں چلیں اور فاضلی لڑکھڑا کر نیچے گرا۔ کوئی گولی اسے لگی تھی کیونکہ اس کی کراہ میں اذیت شامل تھی۔ میں نے ذرا سرو پر کر کے دیکھا تو فاضلی میرے بالکل سامنے زمین پر چت پڑا تھا اور اس کے سینے سے رہ رہ کر خون اہل رہا تھا۔ گولی کسی قدر دائیں طرف لگی تھی اور یقیناً بچھڑوں میں گھس گئی

آئے تھے۔ میں نے جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان والا میدان تیزی سے طے کیا کیونکہ اسی میں مجھے دیکھ لیے جانے کا سب سے زیادہ خطرہ تھا لیکن خیریت رہی کسی طرف سے لاکارستانی نہیں دی۔ درختوں میں داخل ہو کر میں نے چند منٹ آرام کیا۔ پھر جیب کی طرف بڑھا۔ اگر وہ چلنے کے قابل تھی تو میں اسی میں یہاں سے نکل سکتا تھا۔

مگر جیب کی حالت دیکھ کر لگ رہا تھا کہ وہ چلنے کے قابل نہیں ہے نکر سے ریڈی ایٹر نوٹ یہ تھا اور پانی بہہ چکا تھا اس حالت میں اگر جیب کا انجن اشارت بھی ہو جاتا تو چند منٹ سے زیادہ نہیں چل سکتا تھا اس کے بعد وہ سبز ہو جاتا۔ میں ذرا گے آیا تو زمین پر پڑا پستول مل گیا۔ میری نظر نہیں پڑی تھی وہ دھوپ میں چکا تو مجھے پتا چلا میں نے جھک کر اسے اٹھایا اور پھر جیب کی طرف آیا۔ کھجلی نشست پر کمرے پینے کا سامان موجود تھا جو جھٹکے کی وجہ سے سیٹ سے نیچے گر گیا تھا۔ پانی کی بوتل محفوظ تھی اس کا ڈسک بند تھا اس لیے پانی بہہ جانے سے بچ گیا میں نے ڈھکن کھول کر چند بڑے گھونٹ لیے تو میری حالت میں نمایاں بہتری آئی تھی۔ کھانے کی باسکٹ بھی گر گئی تھی لیکن اس میں چیزیں محفوظ تھیں میں نے باسکٹ اور پانی کی بوتل اٹھائی اور کیمین کی طرف آیا۔ میں نے جان بوجھ کرنومی کی لاش کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔

کیمین میں آکر شازی کے دوسرے ساتھی کے جسم سے جیکٹ اور اس کے جوتے اتارے۔ مجھے ان دونوں چیزوں کی ضرورت تھی۔ موسم معتدل ہو گیا تھا لیکن مجھے سامان رکھنے کے لیے جیکٹ کی ضرورت تھی میرے لباس میں جیمیں نہیں تھیں اور جوتے میری ضرورت تھے ننگے پاؤں میں زیادہ دور نہیں جا سکتا تھا۔ جیکٹ پہن کر میں نے جیموں میں کھانے پینے کی چیزیں اور شاٹ گن کے اضافی بلیٹ بھر لیے۔ پستول کے دو فاضل میگزین بھی ساتھ رکھ لیے تھے۔ پانی کی بوتل نصف ہو چکی تھی لیکن اب بھی اس میں ساڑھے تین لیٹرز کے قریب پانی موجود تھا۔ میں نے مزید پانی بیا کیونکہ میں بوتل ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ نہ جانے مجھے کتنی دیر بھٹکانا پڑے اس دوران میں یہی پانی میرے کام آتا۔ دونوں کے لباس سے میں نے رقم بھی نکال لی تھی انہیں اس کی ضرورت نہیں تھی افسوس کہ ان میں سے کسی کے پاس موبائل فون نہیں تھا۔ ورنہ وہ میرے کام آتا۔ ایک شاٹ گن فاضلی لے گیا تھا دوسری میں نے اٹھالی۔

باہر آیا تو نہ چاہتے ہوئے بھی میری نظر کرنومی کی لاش پر پڑ گئی۔ جیب کے پیہوں نے اس کا جسم روند دیا تھا اور وہ کسی تڑی مڑی گزیا کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی مغفرت کی دعا کی اور وہاں سے چل پڑا اس سے زیادہ میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ سورج کی پوزیشن سے میں نے مشرق کا تعین کیا۔ مغرب کی طرف پہاڑ تھے اور مشرق کی طرف مجھے کوئی نہ کوئی آبادی مل جاتی۔ اگر میں مرشد کے علاقے میں تھا تب بھی مجھے مشرق کا ہی رخ کرنا تھا۔ میری حالت پہلے سے خاصی بہتر ہو گئی تھی لیکن کچھ دیر چلنے کے بعد کمر میں تکلیف شروع ہو جاتی اور مجھے رکنا پڑتا تھا۔ اپرل کا آغاز تھا اس لیے دھوپ میں شدت آگئی تھی اور مجھے بار بار پیاس لگ رہی تھی۔ یہ اتنے عرصے تک پانی سے محرومی کا قدرتی نتیجہ بھی تھا اس لیے میں ہر پانچ منٹ بعد ایک گھونٹ پانی پی رہا تھا اس سے میرے جسم میں پانی کی کمی رفتہ رفتہ دور ہو رہی تھی۔ ایک گھنٹے بعد میں نے ڈبل روٹی کا ایک ٹوس کھایا۔ باقی ہونے سے اس کا ذائقہ کسی قدر بدلا تھا مگر مجھے ٹھیک لگا۔

سی۔ فاضلی نے سر ہمایا اور غالباً مجھے بالکل سامنے پا کر دم بخود رہ گیا تھا۔ میں مسکرایا اور آہستہ سے کہا۔
”میں نے کیا کہا تھا میں نے کئی افراد کے منہ سے اپنی موت کی پیش گوئی سنی ہے اور وہ خود فوت ہو گئے شاید تم بھی ان میں شامل ہونے والے ہو۔“

فاضلی نے کوشش کر کے شاٹ گن اٹھانا چاہی لیکن اسی لمحے کسی نے اس کے ہاتھ پر لات ماری اور شاٹ گن دور جا گری۔ اس پر گولی چلانے والے آن پہنچے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کون تھے۔ ان کی تعداد پیروں سے تین لگ رہی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو الزام دے رہے تھے۔ ”مجھے کس نے کہا تھا گولی چلانے کو۔“ کوئی بولا۔

”تو کیا اسے پھول مارتا، حرامی نے بھی تو گولی چلائی تھی۔“ دوسرا بولا۔ ”بس مولانا بچت کی۔“
”بچت کی اولاد، چودھری صاحب کو کیا جواب دے گا۔“ تیسرے نے کہا۔ ”ہم یہاں زمین دیکھتے ہیں بندے مارنے کے لیے نہیں ہیں۔“
”بکو اس کیے جا رہے ہو پہلے اس نے گولی چلائی تھی۔“ دوسرا بھنا گیا۔ ”چودھری صاحب نے یہ تو نہیں کہا ہے کہ کوئی گولی مارے تو تم کچھ نہ کرو۔“

فاضلی ہاتھ کے اشارے سے ان لوگوں کو متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا غالباً وہ انہیں میرے بارے میں بتانا چاہتا تھا لیکن وہ آپس کی بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ بالآخر فاضلی کا حوصلہ جواب دے گیا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ اچانک پہلے والے نے تشویش سے کہا۔ ”اوئے مجھے یہ بندہ جانا پچانا لگ رہا ہے۔“
اب تیسرے کو یاد آ گیا۔ ”یہ تو مرشد بادشاہ کا آدمی ہے۔ ہاں یاد آ گیا فاضلی نام ہے اس کا۔۔۔۔۔۔“
”مارے گئے۔“ پہلا کراہا۔ ”اب کیا جواب دے گا۔“ اس کے بارے میں؟“
”اسے اٹھاؤ۔“ گولی چلانے والا پریشان ہو گیا۔ ”یہ مریدا تو اور مصیبت آئے گی۔“

”مصیبت کے پتر گولی چلانے سے پہلے سوچنا تھا۔“ تیسرا بولا۔ ان میں ایک مختصر سا جھگڑا ہوا جس میں ایک دوسرے کی ماں بہنوں کو بے تکلفی سے گھسیٹا گیا اور بالآخر منہ بہ منہ ہو گئی۔ تینوں کو احساس تھا کہ انہوں نے مرشد کے خاص آدمی پر گولی چلا کر کتنی بڑی غلطی کی تھی اور وہ مر جاتا وہ یہ غلطی نہایت سنگین ہو جاتی اور عین ممکن ہے انہیں اس کا تادان اپنی جان کی صورت میں دینا پڑتا۔ اس لیے انہوں نے مل جل کر فاضلی کو اٹھایا اور وہاں سے رخصت ہو گئے۔ ان کا رخ کیمین سے مخالف سمت میں تھا۔ ان کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ کسی چودھری کے کارندے تھے اور اس کی زمین کی حفاظت کے لیے یہاں موجود تھے۔ دوسرے ان کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ مرشد اور فاضلی سے واقف تھے اس کا مطلب تھا کہ میں مرشد کے علاقے میں ہی تھا۔ اس صورت میں میرا جلد از جلد یہاں سے دوڑنا لازمی تھا۔

جیسے ہی وہ فاضلی سمیت جھاڑیوں سے نکلے میں بھی گڑھے سے نکل آیا۔ اتنی دیر آرام کرنے کے بعد میری حالت پہلے سے خاصی بہتر ہو گئی تھی۔ میں جھاڑیوں کی حد تک جھک کر چلا رہا اگرچہ یہ پوز تکلیف دہ تھا لیکن میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ ممکن تھا کہ چودھری کے مزید کارندے تفتیش کے لیے اس طرف آ نکلتے اور میں ان کی نظروں میں آ جاتا۔ یہ تو واضح تھا کہ وہ فاضلی کی جانب سے کیے جانے والے فائر کی آواز سن کر

جب دوبارہ روانہ ہوا تو دس منٹ بعد ایک کچی سڑک مل گئی۔ میں نے اس کے راستے سے جان بوجھ کر اجتناب کیا تھا جس سے گزر کر فاضلی اور اس کے ساتھی کیبن تک آتے جاتے تھے۔ اگر فاضلی ہوش میں آ جاتا اور میرے بارے میں انکشاف کر دیتا تو چودھری کے آدمی یقیناً اسی طرف میری تلاش کرتے اس لیے میں ویران جگہوں سے گزرتا رہا۔ البتہ اس راستے پر آ کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں اس جگہ سے پانچ چھ کلومیٹر زور در نکل آیا تھا اور عین ممکن تھا کہ یہ وہ کچا راستہ نہ ہو۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور کچے راستے پر چل پڑا لیکن میں نے کان کھلے رکھے تھے اگر مجھے کسی گاڑی کی آواز سنائی دیتی تو میں راستہ چھوڑ کر نزدیکی جگہ پناہ لیتا جہاں گزرنے والوں کی نظر مجھے نہ دیکھ پاتی لیکن خاصی دیر گزر جانے کے باوجود کوئی گاڑی تو کیا کوئی پیدل بندہ بھی نہیں ملا اور نہ ہی کسی آبادی کے آثار دکھائی دیئے تھے۔

شام کے چار بج رہے تھے اور اب سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ میں نے شازی کی کلائی سے گھڑی اتار لی تھی۔ اس سے وقت دیکھنے کی آسانی ہو گئی تھی۔ ساڑھے چھ بجے تک سورج غروب ہو جاتا اور تاریکی چھا جاتی اگر میں اس وقت تک کسی آبادی تک پہنچنے میں ناکام رہتا تو رات مجھے اسی ویرانے میں گزرنی پڑتی لیکن مجھے اس کی زیادہ فکر نہیں تھی کیونکہ میرے پاس کھانا پانی تو تھا۔ میں آرام سے کل کا دن بھی گزار سکتا تھا۔ پانچ بجے ایک جگہ رک کر میں نے قبل از وقت ڈنر کیا کیونکہ اندھیرا چھانے کے بعد یہ کام ذرا مشکل ہو جاتا اور اس کا بھی امکان تھا کہ کھانے کی چیزیں خراب ہو سکتی ہیں۔ ویسے بھی کئی دن بھوکے رہنے کے بعد مجھے رہ رہ کر بھوک لگ رہی تھی اور مسلسل چلنے سے کھائی جانے والی چیزیں فوراً ہی ہضم بھی ہو رہی تھیں۔ سورج غروب ہونے کے بعد میں نے تقریباً تمام چیزیں ختم کر دی تھیں اور اب میرے پاس صرف پانی رہ گیا تھا۔ یہ بھی اب دو لیٹر ز رہ گیا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کمر کی تکلیف کم ہو گئی تھی مگر اب بھی چلنے ہوئے جھکا گلتا تو کمر میں چپک سی اٹھتی تھی۔ مجھے فاضلی کا خیال آیا۔ گولی اس کے سینے میں لگی تھی اور اس وقت وہ چند منٹ کا مہمان نظر آ رہا تھا لیکن اس کا بھی امکان تھا کہ فوری طبی امداد ملنے سے وہ جیج جائے۔ اس نے مجھے مارنے کی پوری کوشش کی تھی۔ بلکہ آخری لمحے تو وہ دیوانہ ہو گیا تھا۔ جیسے اپنی زندگی کی قیمت پر مجھے مار دینا چاہتا ہو۔ مگر ہوا یہ کہ قدرت نے میرے بجائے اس کا نام مرنے والوں میں شامل کر رکھا تھا۔ اس وقت جب یہ ظاہر ہو پوری طرح با اختیار تھا اور موت مجھ سے صرف ایک جنش کے فاصلے پر ہو گئی تھی۔ تو اچانک تقدیر نے پلٹا کھایا۔ شاید فاضلی نے بھی نہیں سوچا ہوگا کہ گولی میرے جسم میں اترنے کے بجائے اس کے سینے میں اتر جائے گی۔ اس گولی نے اسے مجبور کر دیا ورنہ اس نے ہار نہیں مانی تھی اور آخری وقت میں بھی مجھے مارنے کی کوشش کی۔ وہ بھول گیا کہ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے۔

تاریکی چھانے کے بعد میں نے سفر کی رفتار سست کر دی تھی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ آج چاند کی سولہ یا سترہ تاریخ ہے اور کچھ دیر میں چاند طلوع ہو جائے گا تب میں زیادہ آسانی سے سفر کر سکوں گا اس لیے میں ایک جگہ رک گیا۔ جھاڑیوں اور گھاس میں رکنے کے بجائے میں نے ایک صاف جگہ منتخب کی جہاں سانپ یا کسی زہریلے کیڑے کے پائے جانے کے امکانات کم تھے۔ کئی گھنٹے کے مسلسل سفر نے مجھے تھکا دیا تھا اس لیے لیٹا تو

پہا نہیں چلا کہ کب آنکھ لگ گئی۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ کوئی میرے پاس ہے کوئی بول رہا تھا۔ میرا ذہن چونکا ہو گیا۔ جاگتے ہی مجھے اپنے پاس دو افراد کی موجودگی کا احساس ہوا لیکن میں نے حرکت سے گریز کیا پھر ایک سہمی ہوئی نسوانی آواز آئی۔ ”اماں اے زندہ اے کہ مر گیا۔“

”چپ کر کم بخت۔“ دوسری عورت نے جو آواز سے عمر رسیدہ لگ رہی تھی اسے جھڑک دیا۔

”اماں دیکھ تو۔“

”نہ کوئی چکر نہ ہو، کوئی مار کر ڈال گیا ہے پولیس ہمیں پکڑ لے۔“

اتنی دیر میں مجھے پہلی بار کسی انسان سے واسطہ پڑا تھا۔ میں اچانک اٹھا تو دونوں عورتیں کی چیخ نکلی گئی۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”ڈرو نہیں، میں سو رہا تھا۔ مسافر ہوں تھک گیا تو ادھر آنکھ لگ گئی۔“

”کہاں سے آ رہا ہے۔“ بوڑھی عورت نے پوچھا۔ چاند نکل آیا تھا اور اس کی روشنی میں وہ دونوں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ جوان لڑکی یا عورت خود چاند سے کم نہیں تھی وہ بوڑھی عورت کے پیچھے دکی اپنی فوس نیز آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔

”مجھے راولپنڈی جانا ہے۔ یہاں پاس کوئی آبادی ہے جہاں سے مجھے پنڈی جانے کے لیے سواری مل جائے۔“

”پاس ہمارا گاؤں ہے۔“ لڑکی نے جرات کر کے کہا۔ ”یہاں سے تا نکل مل جائے گا۔“

”گاؤں کہاں ہے؟“

”اس نیلے کے پیچھے۔“ لڑکی نے جواب دیا۔ بوڑھی عورت خاموش تھی اور اسے لڑکی کا بولنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

اس نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔ ”بس اب گھر چل۔“

دونوں نیلے کی طرف چل پڑیں ان کے ہاتھوں میں مٹی کے لوٹے تھے اور وہ رفح حاجت کے لیے یہاں آئی تھیں جیسا کہ دیہات کا رواج ہے عورتیں رات کے ابتدائی پہر میں باہر جاتی ہیں لیکن اب یہ رواج بہت ہی دور دراز اور پس ماندہ دیہات میں رہ گیا تھا۔ میں نے عورتوں کے پیچھے جانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ شکر ہے انہوں نے شاٹ گن نہیں دیکھی تھی وہ زمین پر پڑی تھی اور ان کی نظر اس پر نہیں گئی۔ ان کے جانے کے بعد میں نے شاٹ گن اٹھائی۔ جب میں دوسری طرف سے نیلے کے پیچھے گاؤں کے پاس پہنچا تو میرا اندازہ درست ثابت ہوا یہ چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں تقریباً سارے مکان غریب غریب تھے۔ گھروں کی تعداد سو سے بھی کم تھی اور ہاں بجلی بھی نہیں تھی باقی سہولتوں کا حال سوچا جاسکتا تھا۔ باڑوں کی کثرت بتا رہی تھی کہ یہ لوگ چرواہے تھے اور مویشی پالتے تھے۔ میں نے گاؤں سے باہر جانے والے راستے کا جائزہ لیا اور شاٹ گن ایک جگہ چھپا دی۔ گاؤں کی واحد دکان کھلی ہوئی تھی۔ لائیں کی روشنی میں چند افراد بچوں پر بیٹھے کپ شپ کر رہے تھے مجھے دیکھ کر سب خاموش ہو گئے میں چلیے اور انداز سے گاؤں یا اس پاس کا نہیں لگ رہا تھا۔ اس خاموشی کو میں نے توڑا۔

”السلام علیکم۔“

ان الفاظ نے خوف اور اجنبیت کی دیواریں گرا دیں اور وہ سب اٹھ کر گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملانے

لگے۔ مجھے بیٹھنے کی دعوت دی گئی اور دکاندار نے عقب میں موجود مکان کی طرف بچے کو دوڑایا کہ چائے لے کر آئے۔ چائے کے لفظ نے میرے اندر زندگی بھر دی تھی۔ انہوں نے کنویں کا تازہ اور مٹی کی خوشبو والا پانی پیش کیا جسے میں بلا تکلف پی گیا۔ حالانکہ میرے پاس منرل واٹر موجود تھا۔ پانی پی کر میں نے اپنا تعارف کرایا اور ظاہر ہے غلط کرنا تھا۔ ”شکاری ہوں، راولپنڈی سے آیا ہوں اور یہاں ایک جگہ راستہ بھول گیا پھر گاڑی بھی خراب ہو گئی۔ اب مجھے راولپنڈی واپس جانا ہے اور میں کئی گھنٹے سے اس علاقے میں بھٹک رہا ہوں لیکن راستہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔“

ان حضرات نے پہلے پوچھا کہ میں شکار کے لیے کہاں گیا تھا میں نے مرشد کی درگاہ والی جگہ کے نزدیک ایک جگہ کا نام لیا۔ ایک آدمی چمک کر بولا۔ ”میں سمجھ گیا جی..... آپ کی گڈی کہاں ہے؟“

”یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم، شہر جاؤں گا تو مدد لے کر آؤں گا میرا تو سامان بھی گاڑی میں بند پڑا ہے۔ بس کھانے پینے کا سامان لے کر چلا تھا۔“

انہوں نے ایک کچے نقشے کی مدد سے سمجھایا کہ میں پنڈی سے کوئی پندرہ میل دور تھا اور مجھے یہاں سے پنڈی لے جانے کے لیے تا نگہ مل سکتا تھا لیکن وہ مجھے نزدیکی سڑک تک لے جاتا جہاں رات کو بھی ٹریفک چلتا ہے اور مجھے پنڈی جانے کے لیے کوئی نہ کوئی گاڑی مل جاتی۔ تا نگے والے کو بلا یا گیا۔ درحقیقت یہ ریڑھا تھا جس پر روز صبح و شام دودھ رکھ کر شہر لے جایا جاتا تھا۔ اسے تا نگہ کہنا ایسا ہی تھا جیسے کسی کرشل پک آپ کو کار کہنا، مگر یہ تا نگے سے یوں بہتر تھا کہ اس میں جھٹکے کم لگتے۔ تا نگے والے سے پہلے چائے آگئی جو خاص دیہاتی طرز کی تھی۔ دودھ میں چند دانے چائے کی پتی کے پکا کر اسے چائے قرار دیتے ہیں۔ میں چائے پی کر روانہ ہونے کو تیار تھا۔ اس نے چائے کا سرور بخشا ہونہ ہو لیکن مجھے تازہ دم ضرور کر دیا تھا۔ خوش قسمتی سے دکان والے کے پاس پینا ڈول بھی تھی۔ میں نے اس سے ایک پتالے لیا اور دو گولیاں اسی وقت کھالیں۔ دکاندار میری مہمان نوازی پر آمادہ تھا لیکن میں نے منع کر دیا۔

”دوستو تم لوگوں نے جتنی خاطر کر دی ہے وہی بہت ہے۔ میرے گھر والے پیچھے پریشان ہوں گے اور بیوی نے تو اعلان بھی کر دیا ہوگا کہ میں کسی کے ساتھ بھاگ گیا ہوں شکار کا تو بہانہ ہے۔“

وہ مسکرانے لگے تھے بہر حال اس جھوٹ کی وجہ سے مجھے جانے کی اجازت مل گئی۔ ریڑھا ایک سپر لیس سواری تھی اور اس پر دودھ کے فولادی ڈرم جاتے تھے لیکن میں ڈرم نہیں انسان تھا اس لیے ریڑھے کی تاہوار سطح پر میرے لیے تکلیف کے بے شمار اسباب تھے۔ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ دکان والے نے گھر سے ایک روٹی کا گدا منگو کر اس پر بچھا دیا اور میں آرام سے بیٹھ گیا۔ ان لوگوں کے خلوص اور مہمان نوازی نے مجھے متاثر کیا تھا لیکن میں نے غلطی سے بھی ایسا کوئی سوال نہیں کیا جو بعد میں میری نشاندہی کا باعث بن جاتا۔ میں تو یہاں سے جا رہا تھا لیکن یہ معصوم لوگ فاضلی یا چودھری کے عتاب کا نشانہ بن سے تھے۔ اب وہ پورے یقین سے کہہ سکتے تھے کہ ادھر آنے والا تو اصل میں شکاری تھا۔ اسی وجہ سے میں نے شاٹ گن اٹھانے کا ارادہ بھی ترک کر دیا۔ ریڑھے والا بعد میں بتاتا کہ شکاری باؤ نے راستے سے ایک شاٹ گن بھی اٹھائی تھی تو میرا کردار مشکوک ہو جاتا۔ راستہ چکا تھا مگر گدے کی وجہ سے آسانی سے طے ہو گیا۔ میں باقاعدہ لیٹ کر سفر کرتا رہا۔

آدھے گھنٹے بعد ریڑھے والے نے مجھے ایک کچی سڑک کے کنارے اتارا۔ رات کے دس بج رہے تھے اور سڑک ویران تھی لیکن ریڑھے کے مالک نے مجھے یقین دلایا کہ یہاں سے وقفے وقفے سے بسیں گزرتی تھیں۔ دوسری ٹریفک بھی چلتی رہتی تھی۔ وہ ہاتھ ملا کر جانے لگا تو میں نے زبردستی اسے دوسروں پر تھادیے وہ بہت خوش ہو کر اور بار بار سلام کرتا گیا تھا۔ یہی دوسروں کے میں اتنی طویل مسافت پر کسی ٹیکسی والے کو پیش کرتا تو اس کا منہ سیدھا نہیں ہوتا۔ آدھے گھنٹے بعد تو نہیں لیکن پون گھنٹے بعد ایک بس نمودار ہوئی جو پنڈی کی طرف جا رہی تھی۔ رات کے اس وقت بھی یہ مسافروں اور ان کے اسباب سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ مگر کتنے پر پتا چلا کہ بس بارات لے کر واپس جا رہی ہے۔ مجھے چھت پر موجود بارات کے ساتھ بیٹھنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ دولہا بھی وہیں موجود تھا اور دلہن نیچے زانہ کپڑاٹ میں تھی۔ بارات پنڈی سے بھی آگے کہیں واپس جا رہی تھی۔ یہ شہر میں داخل نہیں ہوتی لیکن مجھے شہر کے پاس اتار دیتی۔ آدھے گھنٹے بعد میں ایک ٹیکسی میں پنڈی کی طرف جا رہا تھا۔ راجا بازار میں ساری رات کھلے رہنے والے ایک ہوٹل کے فون سے میں نے عبداللہ کو کال کی۔

”شہباز صاحب.....“ اس نے بے یقینی سے کہا۔

”یار اب تک تو تم لوگوں کو عادی ہو جانا چاہیے میں ایسے ہی غائب ہو کر ایسے ہی واپس آ جاتا ہوں۔ ہاں جب دنیا میں نہ رہا تو پھر واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔“

”اللہ نہ کرے۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ ”یہ بتائیں کہ آپ کہاں سے بات کر رہے ہیں؟“

”لائٹ محفوظ ہے؟“

”ہاں آپ اس کی فکر نہ کریں۔“

میں نے عبداللہ کو ہوٹل کے بارے میں بتایا۔ جب تک وہ یا اس کے آدمی آتے میں نے ذکر کر لینا مناسب سمجھا۔ چلیے سے قطع نظر میرے پاس خاصی رقم تھی اس لیے میں نے ویٹر کی مشکوک نظروں کی بالکل پروا نہیں کی البتہ طے کر لیا کہ اس بدتمیز ویٹر کو پھر ہرگز نہیں دوں گا۔ جب تک میں ڈنر سے فارغ ہو کر کافی پی رہا تھا تو ایک سیاہ وین آ کر ہوٹل کے دوسری طرف رکی۔ میں چونکا ہو گیا لیکن جب دین سے عبداللہ دو افراد کے ساتھ اترے تو میرے سنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ عبداللہ اپنے آدمیوں کو باہر چھوڑ کر اندر آیا اس نے اندر آتے ہی مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس لیے سیدھا میرے پاس آیا اس نے بلا تمہید کہا۔ ”شہباز صاحب فوراً چلیں، حالات ٹھیک نہیں ہیں آپ کا اس طرح منظر عام پر ہونا ٹھیک نہیں ہے۔“

میں پہلے ہی بل ادا کر چکا تھا اس لیے فوری روانگی میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ عبداللہ کا لہجہ بتا رہا تھا کہ حالات واقعی سمجھیر ہیں لیکن میں نے سوال جواب کسی جگہ پہنچنے تک کے لیے ملتوی کر دیے۔ سیاہ وین میں مزید تین افراد تھے ایک ڈرائیور اور دو مسلح افراد موجود تھے۔ گویا عبداللہ پانچ افراد کے ساتھ آیا تھا لیکن سیاہ وین چلی تو مزید دو گاڑیاں اور حرکت میں آئیں۔ ان میں سے ایک وین کے پیچھے آگئی اور ایک آگے نکل گئی۔ میں نے عبداللہ کی طرف دیکھا تو اس نے سر کی جنبش سے تصدیق کی کہ یہ اس کے آدمی تھے۔ گویا وہ پوری تیاری کے ساتھ آیا تھا اگر کوئی مداخلت کرتا تو اسے بھرپور جواب دیا جاسکتا تھا لیکن سیاہ وین کا رخ عبداللہ کی کوشی کی طرف نہیں تھا۔ اس لیے میں نے پہلا سوال ضروری سمجھا۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”ہڈی میں ایک جگہ ہے۔“ عبداللہ نے جواب دیا۔ ”اسلام آباد میں ہتھیاروں کے ساتھ نقل و حرکت مشکل ہو گئی ہے۔“

میں چونکا۔ ”تم نے کونسی چھوڑ دی ہے، سعدیہ اور مونا کہاں ہیں؟“

عبداللہ مسکرایا۔ ”وہ سفیر صاحب کے ساتھ حویلی جا چکی ہیں۔ بیٹو اور مانی بھی وہیں ہیں۔“

”یہ کب گئے؟“

”تین دن ہو گئے ہیں۔“

”وسیم اور دوسرے لوگ؟“

”سب اپنی اپنی جگہوں پر ہیں اور خیریت سے ہیں۔“

میں نے سکون کا سانس لیا۔ ورنہ اسیری کے دنوں میں مجھے سب سے زیادہ یہی خیال پریشان کرتا تھا کہ میرے ساتھی جذباتی ہو کر کوئی ایسا قدم نہ اٹھالیں کہ خود انہیں نقصان پہنچ جائے۔ مگر انہوں نے عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔ اس دوران میں انہوں نے کرنے والا کام کر لیا تھا یعنی مونا اور سعدیہ کو حویلی پہنچا دیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ عبداللہ نے چار مزید تربیت یافتہ آدمی بھی وہاں بھیج دیے تھے جب کہ چھ انجینی گارڈز پہلے ہی تھے۔ مانی حویلی کی الیکٹرانک سیکورٹی کرنے گیا تھا تمام آلات اس نے میرے ساتھ لے کر پہلے ہی حاصل کر لیے تھے۔ وہ لوگ یہاں سے زیادہ محفوظ تھے۔ عبداللہ سے موبائل لے کر میں نے حویلی کال کی اور جب تک ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچے میری تقریباً سب سے بات ہو گئی تھی۔ صرف سویرا وہ گئی تھی اور میں چاہنے کے باوجود کسی سے نہیں کہہ سکا تھا کہ اس سے میری بات کرا دے۔ پھر یہاں دین میں بھی سب موجود تھے اس لیے سویرا سے بات میں نے بعد کے لیے ملتوی کر دی۔

نیا ٹھکانہ فیض آباد کے پاس ایک کونٹری تھا۔ یہ جگہ مری روڈ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ یہ زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن اس کی دو خوبیاں تھیں ایک تو اس کے دونوں طرف گلی تھی اور طویل ڈرائیو دے ایک گیٹ سے دوسرے گیٹ تک تھا۔ آنے جانے کے لیے کوئی بھی گیٹ استعمال کیا جاسکتا تھا۔ دوسرے اس کے دائیں بائیں کوئی مکان نہیں تھا اس لیے یہ آبادی میں ہوتے ہوئے بھی آبادی سے الگ تھی۔ میں اندر آیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ کونٹری باہر سے خالی اور خاموش لگ رہی تھی لیکن اندر سے پوری طرح آباد تھی۔ وہ اس طرح کہ عبداللہ کی کونٹری والے تقریباً تمام افراد یہاں نظر آ رہے تھے۔ میں نے عبداللہ کی طرف دیکھا۔ ”گلتا ہے تم نے مستقل ٹھکانہ بنا لیا ہے؟“

”ایسا ہی سمجھ لیں۔ میں کچھ عرصے سے چکر میں تھا کہ کوئی مناسب جگہ ملے جسے دشمنوں سے چھپ کر حاصل کیا جاسکے۔ اتفاق سے یہ کونٹری بک رہی تھی مالک باہر جا رہا تھا۔ میں نے سامنے آئے بغیر ایک وکیل کے توسط سے خرید لی۔ پھر اسی وکیل کی مدد سے یہاں کام کراتا رہا اور جب ہمیں ضرورت پڑی تو یہاں منتقل ہو گئے۔ یہ پہلی کونٹری کی طرح بڑی اور پُر آسائش تو نہیں ہے لیکن سیکورٹی کے لحاظ سے اچھی ہے۔“

پہلی منزل تو صرف نشست گاہ، ملازموں اور دوسرے کاموں کے لیے مخصوص تھی دوسری منزل پر رہائشی کمرے تھے۔ نیچے آٹھ کمرے تھے تو اوپر بھی آٹھ کمرے تھے اور ان میں سے پانچ مکمل بیڈروم تھے باقی کونٹری

اس مقصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک بڑا سا لاونج تھا۔ عبداللہ نے اوپر آتے ہوئے کافی کا کہہ دیا تھا پھر اس نے مجھے ایک بیڈروم دکھایا۔ ”یہ آپ کے لیے ہے، یہاں آپ کا سامان بھی آگیا ہے اگر چاہیں تو ہاتھ لے کر چینی کر لیں۔“

خود میرا دل بھی یہی چاہ رہا تھا اس لیے میں تولیہ لے کر ہاتھ روم میں چلا گیا۔ موسم رات کو سرد ہو جاتا تھا اس لیے گرم پانی مزہ دے گیا۔ پھر میں نے کمر کی بھی سکانی کی جس میں اب بھی درد باقی تھا۔ دس منٹ بعد میں ہاتھ روم سے نکلا تو جیسے گزشتہ دنوں کے مصائب بھی پانی کے ساتھ بہا آیا تھا اور بالکل ہلکا پھلکا ہو رہا تھا۔ ایک آرام دہ ٹراؤزر اور ٹی شرٹ پہن کر میں لاونج میں آیا تو کافی اور کچھ چیزیں آچکی تھیں۔ عبداللہ نے کہا۔ ”وسیم صاحب بھی روانہ ہو چکے ہیں وہ دس پندرہ منٹ میں یہاں پہنچ جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے سند باز جہازی کے نئے سفر نامے کی تفصیل اس وقت تک کے لیے ملتوی کی جاتی ہے۔“ عبداللہ مسکرانے لگا۔ ”یہ آپ نے ٹھیک فرمایا۔ اچانک ہی کسی نئے سفر پر لے جائے جاتے ہیں اور واپسی کے بعد حیرت انگیز کہانیاں سناتے ہیں۔“

”راجا صاحب کیسے ہیں؟“

”ٹھیک ہیں درمیان میں ان کی طبیعت خراب ہوئی تھی لیکن اب بہتر ہے۔ وہ آپ کے بارے میں روز ہی پوچھتے ہیں۔“

”اللہ ان کو صحت دے۔“ میں نے کہا اور نادر کے بارے میں پوچھا۔

”وہ بدستور سرکاری تھویل میں ہے۔“ عبداللہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”اس نے کچھ انکشافات بھی کیے ہیں۔“

”کیسے انکشافات؟“

”ایک تو یہ کہ مرشد کے ڈیرے یعنی نام نہاد درگاہ پر غیر ملکی آکر کھتے ہیں اور اپنے حلیے اور ڈیل ڈول سے وہ کسی خاص شعبے سے متعلق لگتے ہیں۔“

”کمانڈوز ٹاپ؟“

”آپ نے درست کہا۔ جب وہ آتے ہیں اور عام طور سے گروپ کی صورت میں آتے ہیں تو درگاہ کو عارضی طور پر عام لوگوں کے لیے بند کر دیا جاتا ہے۔“

”یہ نادر کا مشاہدہ ہے یا وہ اس بارے میں کچھ جانتا ہے؟“

”میرا خیال ہے وہ جانتا ہے لیکن بتائیں رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اسے یہ بات اس کے ایک آدمی نے بتائی ہے۔ جو درگاہ میں ہوتا ہے اور نادر کا وفادار ہے۔“

میں سوچ میں پڑ گیا تھا۔ عبداللہ غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے مرشد نے ہمارے خلاف باہر سے کرائے کے گوریلے منگوائے ہیں؟“

”نہیں اسے ان کی ضرورت نہیں ہے اس کے پاس ایسے آدمیوں کی کمی نہیں ہے جو اس کے ایک اشارے پر جان قربان کر دیں۔ یہ کوئی اور ہی چکر لگتا ہے۔ یہ بتاؤ کہ میری غیر موجودگی میں تم لوگوں نے مرشد کے خلاف

کوئی قدم تو نہیں اٹھایا؟“

”اس بارے میں آپ کو وسم صاحب ہی بتائیں گے۔“

ادھر عبداللہ نے یہ جملہ کہا اور ادھر وسم نے اندر قدم رکھا۔ ”میرا ذکر ہو رہا تھا۔“ اس نے کہا اور مجھ سے

بغل گیر ہو گیا۔ ”شکر ہے آپ کو صحیح سلامت دیکھ رہا ہوں۔“

”لیکن اس سے یہ مت سمجھنا کہ دشمنوں نے کوئی کسر چھوڑ دی تھی۔ بس یہ سمجھ لو کہ اللہ کی مہربانی ہے کہ اس

وقت تم لوگوں کے سامنے ٹھیک ٹھاک کھڑا ہوں۔“

”ہم نے جو دیو یوں دیکھا تھا وہی بتانے کو کافی تھا۔“ کہتے ہوئے وسم کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ”لیکن

مرشد کو اس کا خیارہ بھی بھگتنا پڑے گا۔“

”شکر ہے تم لوگوں نے کوئی اندھا قدم نہیں اٹھایا۔“

”نہیں قدم تو اٹھایا تھا۔“ وسم معنی خیز انداز میں بولا۔ ”مرشد، مرشد ہاؤس کے لان میں چہل قدمی کر رہا

تھا کہ ایک گولی نے اس کے کلاہ کے اٹھے ہوئے حصے میں سوراخ کر دیا تھا۔“

”اتنا سچا نشانہ؟“

وسم نے سر ہلایا۔ ”میں نے خود لگایا تھا۔ مرشد ہاؤس سے کوئی سات سو گز کی دوری پر ایک چھ منزلہ فلیٹ

کمپلکس ہے اس کی چھت سے نشانہ لیا تھا۔“

”یہ کب کی بات ہے؟“

”ایک ہفتہ ہو گیا ہے جب آپ کو غائب ہوئے دوسرا دن تھا اور اس کے بعد ہی ہمیں ویڈیو ملی تھی۔“

”اس وقت میں اکرم چشمی کے عتاب سے گزر رہا تھا۔ اس حرامزادے نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔“

”عقرب وہ ہمارے پاس ہوگا اور تب ہم بھی کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے۔“ وسم نے کہا۔ ”اس واقعے

کے بعد مرشد دہل گیا تھا اس نے فون پر ہم سے وعدہ کیا کہ آپ کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔“

”مرشد اور اس کا وعدہ۔“ میں نے تخی سے کہا۔ ”تم شیطان کے وعدے پر اعتبار کر سکتے ہو مرشد کے

وعدے پر نہیں۔“

”کیا اس نے پھر کچھ کیا تھا؟“

”کچھ نہیں بہت سمجھ لو اس نے مجھ سے ہمیشہ کے لیے جان چھڑانے کا پلان بنالیا تھا وہ تو قدرت کو منظور

نہیں تھا ورنہ اس وقت میں تمہارے پاس کسی پانچ سالہ بچے کی طرح موجود ہوتا۔ اپنی شخصیت اور ماضی سب

بھول چکا ہوتا۔“

میں نے انہیں کسی قدر تفصیل سے بتایا کہ مجھ پر کیا گزری تھی۔ جب میں فاضلی کی واپسی تک پہنچا تو وسم

نے کہا۔ ”وہ نہایت شاطر آدمی ہے اس نے نہ جانے کیسے فیصل کو تشے میں اتار لیا اور اس کی مدد سے فرار ہو گیا۔“

”اس نے فیصل کو دس لاکھ روپے کا لالچ دیا تھا اور جب وہ خطرے کی حدود سے نکلا تو اس نے سب سے

پہلے اس غدار کا کام تمام کیا تھا۔“

”ہمیں اس کی لاش مل گئی تھی۔ وہ اچھا آدمی تھا نہ جانے کیسے فاضلی کے چکر میں آ گیا۔“ وسم نے افسردہ

لہجے میں کہا۔ ”اس کے بھائی آکر اس کی لاش لے گئے تھے۔“

میں نے داستان آگے شروع کی۔ شخصیت اور یادداشت ختم کرنے والے انجکشن کا سن کر وسم نے پھر

مداخلت کی۔ ”مجھے معلوم ہے، ایک جاپانی کمپنی نے چند سال پہلے بنائے تھے کہ وہ مجرم جو کسی صورت نہیں سدھر

سکتے ہیں اور وہ جیل میں بھی سکون سے نہیں رہتے ان کو یہ انجکشن لگا کر مسئلہ ہی ختم کر دیا جائے۔ جاپان میں

سزائے موت پر پابندی ہے لیکن جب انسانی حقوق کی تنظیموں نے شور کیا تو اس انجکشن کو بین قرار دے دیا مگر سنا

تھا کہ یہ چوری چھپے بک رہے ہیں۔“

”تم بھی کچھ انجکشن منگواؤ۔“ میں نے مشورہ دیا۔ ”ہم اپنے دشمنوں پر آزما سکتے ہیں۔“

”یہ کام مجھ پر چھوڑ دیں۔“ عبداللہ نے کہا۔

داستان سمیٹتے ہوئے بھی صبح کے تین بج گئے تھے۔ آخر میں فاضلی کے شدید زخمی ہونے کا سن کر وسم

پُر جوش ہو گیا۔ ”اگر وہ مرا نہیں ہے تو کسی اسپتال میں ہوگا وہیں اس کا کام تمام کر دیتے ہیں۔“

میں نے اس سے اختلاف نہیں کیا کیونکہ میرے ساتھی متفق ہو گئے تھے کہ اب دشمن کو اس کے سکون میں

ادائیگی کی جائے اور انہماکی پالیسی کو بالائے طاق رکھ دیا جائے کیونکہ دشمن اسے مانتا ہی نہیں ہے۔ عبداللہ نے

تائید کی۔ ”اگر ایسا ہے تو ایک دشمن سے تو جان چھوٹے گی۔“

”اب مجھے صحیح معنوں میں اندازہ ہوا ہے کہ فاضلی کس قدر خطرناک شخص ہے۔“ وسم نے کہا۔ ”اس شخص

کو پہلی فرصت میں اس دنیا سے رخصت کر دینا چاہیے۔“

”اس کے عزائم تو اپنے حقیقی باپ کے لیے بھی خطرناک ہیں وہ مرشد کا بھی صفایا کرنا چاہتا ہے لیکن اس

سے پہلے وہ اس کی جگہ حاصل کر لے گا۔“ میں نے کہا۔ ”یہ اچھا ہوا کہ فیصل نے اسے حویلی سے یوں نکالا کہ وہ

اس کی لوکیشن نہیں دیکھ سکا ورنہ ہمیں بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑتا۔“

وسم نے سر ہلایا۔ ”اسی وجہ سے میں نے فیصل کا قصور معاف کر دیا اور اس کے گھر والوں کو دس لاکھ روپے

بھیجے ہیں۔ اب سانپ زخمی ہے اور اس سے پہلے وہ دوبارہ صحت یاب ہو کر ڈسنے کے قابل ہو جائے اس کا سر

ہمیشہ کے لیے کچل دینا ہی بہتر ہوگا۔“

”میں ابھی اپنے آدمیوں کو لگاتا ہوں وہ شہر کے تمام اسپتالوں میں اسے دیکھیں۔“ عبداللہ کھڑا ہو گیا۔

”شہباز صاحب آپ آرام کریں۔ اگر کمر میں تکلیف زیادہ ہے تو ڈاکٹر بھی آ سکتا ہے۔“

”نہیں اب تو معمولی سی رہ گئی ہے۔“ میں نے انکار کر دیا۔ ”اگر تکلیف بڑھ گئی تو صبح کسی ڈاکٹر کو دکھا لوں

گا لیکن یہاں کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

میں کمرے آیا میں نے سونے سے پہلے ایک گلاس گرم دودھ کے ساتھ دو چین کھر گولیاں لیں اور پھر جو

غافل ہو کر سو یا تو اگلے دن دوپہر میں جا کر آنکھ کھلی تھی۔ اتنی طویل نیند کی وجہ سے جسم ٹوٹ رہا تھا اور پیٹ میں

خوفناک قسم کی ہموک اٹھائیاں لے رہی تھی۔ میں نے انٹرکام پر کچن سے رابطہ کر کے کھانے کا پوچھا۔ دوسری

طرف سے بتایا گیا کہ کھانا آدھے گھنٹے میں تیار ہو جائے گا۔ اس دوران میں ہمیں نے غسل کر لینا مناسب سمجھا۔

گرم پانی نے میری ساری کسٹمدی دور کر دی تھی اور میں تیار ہو کر نیچے آیا تو عبداللہ بھی اسی وقت باہر سے آیا تھا

کھانا لگ گیا تھا اس میں پلاؤ کے ساتھ ساتھ شامی کباب تھے اور بیخ بوٹی کے ساتھ پتلی چپاتیاں تھیں۔ یہ سب یہیں بنا تھا۔ عبداللہ کوٹھی سے باورچی کو بھی لے آیا تھا۔ میں نے عبداللہ سے فاضلی کا پوچھا۔ اس نے جواب دیا۔ ”اس کا پتا نہیں چلا ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ کسی اسپتال میں ہوا تو اصل نام سے نہیں ہوگا اس لیے میں نے گوئی کے ذمہ کے حوالے سے معلوم کرایا۔ میرے آدمی ابجینی کے سادہ لباس نمائندے بن کر پوچھ گچھ کر رہے تھے لیکن ایسا لگ رہا ہے کہ یا تو فاضلی کو کسی عام سے کلینک یا اسپتال میں داخل کرایا گیا ہے یا پھر اس کا گھر میں علاج ہو رہا ہے یا پھر.....“

”وہ دنیا سے گزر چکا ہے۔“ میں نے عبداللہ کا جملہ مکمل کیا۔ ”لیکن فاضلی جیسے ڈھیت اتنی آسانی سے دنیا سے نہیں جاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے وہ فوج گیا ہوگا۔“

”میری بھی یہی خواہش ہے وہ فوج جائے اور ہم میں سے کسی کے ہاتھ مارا جائے۔“ عبداللہ نے تائید کی۔ ”دسم صاحب کل روکنے کے باوجود واپس چلے گئے تھے۔“

”اس کا اپنی جگہ ہونا ضروری ہے۔ وہ ہماری اصل فورس ہے اور اسے صرف ضرورت کے وقت ہی منظر عام پر آنا چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”یہاں کتنے آدمی ہیں؟“

”اگر آپ کی مراد اڑنے والوں سے ہے تو ایسے سات افراد ہیں آٹھواں آپ مجھے شرا کر لیں۔“

”گو یا مجھ سمیت نو افراد ہیں؟“

”جی باقی تین نوکر ہیں گھر کے کام کرتے ہیں۔ ایک باورچی ہے۔ ایک نگران ہے اور ایک چوکیدار ہے۔“

”یہ علاقہ کیسا ہے؟“

”یہاں سب اپنے کام سے کام رکھتے ہیں لیکن ہم بھی احتیاط کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ کوٹھی سے باہر جاتے وقت مسلح نظر نہ آئیں اس طرح کوٹھی کے کھلے حصوں میں بھی کم آتے جاتے ہیں۔“

”یہ اچھی پالیسی ہے جتنا لوگوں کی نظروں میں کم آئیں گے وہ اتنا ہی کم ہمارے بارے میں سوچیں گے۔“

”گاڑیاں میں نے ساری بدل دی ہیں۔ یہاں فروخت کرنے کے بعد ساری گاڑیاں باہر سے منگوائی ہیں وہ بھی ایک دو کر کے۔ دولاہور کی گاڑیاں ہیں اور ایک گوجرانوالہ کی اور ایک نوشہرہ کی گاڑی ہے۔“

”یہ بھی اچھا ہوا سوائے کیونیکیشن دین کے تقریباً ساری گاڑیاں دشمنوں کی نظروں میں آچکی تھیں اور شاید ان کی مدد سے تلاش کر لیا جاتا ہوگا۔“

”یہی سوچ کر میں نے ایک ڈوشین پالیسی سوچ لی ہے۔ ایک مہینے بعد ان کی جگہ چار دوسری گاڑیاں آجائیں گی۔ اس کے لیے میں نے وہیں کے آٹو انجنینس سے بات کی ہے۔ وہ گاڑیاں آئیں گی تو انہیں یہیں فروخت کر دیا جائے گا۔ اس میں کچھ رقم لگے گی لیکن ہمیں تحفظ حاصل ہو جائے گا۔“

”کوشش کرنا کہ گاڑیاں زیادہ پرانی نہ ہوں اور اپنے کام میں بہترین ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”ایاز کہاں ہے؟“

”اس کی ماں کی طبیعت خراب تھی وہ گھر گیا ہوا ہے۔“

ماں سے مراد ایاز کی خالہ تھی جس نے اس کی پرورش کی تھی۔ ”ایاز مخلص آدمی ہے لیکن اب اس پر گھر اور بیوی کا بوجھ آ گیا ہے۔“

”میں نے اس سے ایک دو بار اس سلسلے میں بات کی ہے لیکن وہ ہمارا ساتھ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے۔“

”یہ بھی ہے۔“ میں نے گہری سانس لی۔ ”اللہ نے ایسے مخلص ساتھی دیئے ہیں جو ہر قدم پر میرے ساتھ ہوتے ہیں اور کبھی چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہیں ہوتے ہیں۔“

مرشد، فاضلی، اکرم چشتی، فتح خان اور ڈیوڈ شاہ جیسے دشمن ہونے کے باوجود میں اسکی وجہ سے آج بھی زندہ اور آزاد تھا کہ اللہ نے مجھے اتنے ہی مخلص دوست بھی دیئے تھے جتنے خطرناک اور سفاک میرے دشمن تھے اتنے ہی مضبوط اور پُر خلوص دوست تھے۔ کھانے کے بعد میں نے ایاز سے رابطہ کیا وہ میری آواز سن کر خوش ہو گیا۔

”مجھے دسم صاحب سے اطلاع مل گئی تھی کہ آپ واپس آ گئے ہیں۔ میں آج روانہ ہو جاؤں گا۔“

”نہیں تم ابھی وہیں رکو۔ تمہاری والدہ کی طبیعت کیسی ہے؟“

”پہلے سے بہتر ہے، لیکن آپ آنے سے کیوں منع کر رہے ہیں؟“

”ابھی تمہاری اتنی ضرورت نہیں ہے تمہیں معلوم ہوگا عبداللہ والی کوٹھی چھوڑ دی ہے۔ اکثر لوگ میری حویلی جا چکے ہیں۔ دسم کا سیٹ اپ الگ ہے اور ہم ایک نئی جگہ منتقل ہوئے ہیں۔ میں کل رات آیا ہوں اور ابھی کچھ دن حالات کا جائزہ لینا ہے جیسے ہی آگے کا کوئی فیصلہ ہوا تم بھی آ جانا لیکن فی الحال تم اپنی والدہ کی خدمت کرو اور شاہین کو وقت دو۔“

یہ کہیں آپ مجھے آرام تو نہیں دے رہے ہیں؟“ اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

”نہیں یار، سچ کہہ رہا ہوں یہاں واقعی فی الحال امن ہے۔ جب کوئی معرکہ ہوگا تب دیکھا جائے گا۔“

”ٹھیک ہے میں کچھ دن اور رک جاتا ہوں۔“

”نہیں تم تاحکم ثانی گھر پر رہو گے اور رابطے میں بھی محتاط رہو کیونکہ دشمن ہمارا خاتمہ چاہتا ہے۔ اگر ذرا سا بھی خطرہ محسوس کرو تو گھر والوں کو کہیں اور منتقل کر دینا۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے بادل نا خواستہ کہا۔ ”لیکن جیسے ہی میری ضرورت ہو آپ لازمی مجھے بلائیں گے۔“

”دشمنوں سے گھرے انسان کو اللہ کے بعد سب سے زیادہ ضرورت جاں نثار دوستوں کی ہوتی ہے۔ تمہارے پاس رقم ہے؟“

”ہاں عبداللہ نے آتے وقت مجھے پچاس ہزار دیئے تھے۔“

”اگر مزید ضرورت ہو تو بلا تکلف کہہ دینا۔“

ایاز سے بات کر کے مجھے صابر کا خیال آیا۔ اسے روانہ ہوئے سات دن ہو چکے تھے۔ میں نے جس دن صابر کو منظر آباد جانے کے لیے چھوڑا تھا اسی دن اکرم چشتی کے اسکوڑنے نے مجھے اٹھالیا تھا اور آج اس واقعے کو

آٹھواں دن تھا۔ مجھے اس کی لڑکی شازیہ کا خیال آیا اس کے بارے میں عبداللہ سے پوچھا نہیں تھا۔ کھانے کے بعد عبداللہ کہیں چلا گیا تھا میں نے ایک ملازم سے پوچھا تو اس نے بتایا۔ ”وہ باہر نکلے ہیں جناب۔“

ملازم کوٹھی سے آیا تھا۔ ”تمہیں یاد ہے کچھ دن پہلے ایک نئی لڑکی آئی تھی وہ اب کہاں ہے؟“

”وہ جی سعدیہ بی بی اور مونا بی بی کے ساتھ چلی گئی تھی۔“ ملازم نے جواب دیا۔ یعنی وہ جو حلی چلی گئی تھی اور عبداللہ اس کا ذکر کرتا بھول گیا تھا۔ میرے پاس موبائل نہیں تھا ورنہ میں عبداللہ سے کال کر کے صابر کے رابطے کے بارے میں پوچھتا۔ اسے ایک مخصوص اخبار میں کلاسیفائیڈ میں اشتہار دینا تھا۔ یہاں فون نہیں تھا اور میں سویرا سے بات کرنا چاہ رہا تھا مجھے معلوم تھا وہ کتنی شدت سے میری کال کی منتظر ہوگی۔ عبداللہ کی واپسی تک مجھے انتظار کرنا تھا۔ وقت گزاری کے لیے میں آج کا اخبار لے کر اوپر آ گیا اور ملازم سے کہہ دیا کہ عبداللہ کے آتے ہی وہ اسے میرا پیغام دے دے۔ اخبار میں کوئی خاص خبر نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ آنے والے الیکشنز میں سیاسی پارٹیوں اور سیاست دانوں نے ابھی سے جوڑو شروع کر دیا تھا۔ ایک چھوٹی سی خبر مرشد کے بارے میں تھی اس نے جوئی پارٹی جو ان کی تھی اس کی طرف سے ایک جلسے میں خطاب کرتے ہوئے اس نے فکر انگیز انکشافات کیے تھے۔ یہ وہی فکر انگیز انکشافات ہیں جو ہمارے سیاست دان ملک کے قیام سے لے کر آج تک کرتے آئے ہیں۔ مثلاً ملک خطرے میں ہے۔ اندرونی اور بیرونی سازشیں جاری ہیں، ملک ایک نئے خطرے کی طرف بڑھ رہا ہے اور ان سب باتوں کا لب لباب یہ ہوتا ہے کہ نئی قیادت لائی جائے۔

مرشد نئی پارٹی میں زیادہ سرگرم تھا اور یقیناً وہ آنے والے الیکشن میں کوئی بڑا عہدہ حاصل کرنے کے چکر میں تھا اس کی نظر کسی اہم وزارت پر لگی ہوگی۔ ایم این اے اور ایم پی اے بننا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ بلکہ اس کے اپنے علاقے میں ایک قومی اسمبلی اور دو صوبائی اسمبلیوں کی نشستیں پکی تھیں۔ پارٹی کے لیے یہ بھی کشش انگیز چیز تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر مرشد آنے والا انتخاب جیت جاتا ہے اور حکومت میں کوئی اہم عہدہ بھی حاصل کر لیتا ہے تو اس کی فرعونیت مزید بڑھ جائے گی اس سے پہلے اسے روکنا لازمی تھا۔ اس وقت وہ پھنسا ہوا تھا۔ نادر غائب تھا اس کا دست راست اور ناجائز بیٹا فاضلی اگر مرشد نہیں تھا تب بھی شدید زخمی ضرور ہوا تھا۔ اس کے سارے پلان ناکام رہے تھے اور وہ دم نے اس کے گلے میں سوراخ کر کے اسے عملی طور پر سمجھا دیا تھا کہ اب اس کے مقابل کتنے طاقتور ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مجھے جسمانی نقصان پہنچاتے ہوئے ڈر رہا تھا۔



مجھے لگ رہا تھا کہ میں رفتہ رفتہ اس فیصلے کی طرف جا رہا تھا جو میں کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر میرے دشمن مجھے اسی طرف دھکیل رہے تھے انہوں نے میرے باعزت جینے کی کوئی راہ نہیں چھوڑی تھی اور عملاً بتا دیا تھا کہ جب تک ان کا وجود باقی ہے مجھے چین سے رہنا نصیب نہیں ہوگا۔ مرشد کے اشارے پر پولیس پہلے سے زیادہ سرگرمی سے میرے پیچھے لگ چکی تھی۔ امکان یہی تھا کہ اب میں پولیس کے ہاتھ لگا تو مجھے پولیس مقابلے میں پار کر دیا جائے گا۔ اس طرح براہ راست مرشد پر الزام بھی نہیں آئے گا۔ مرشد اور اکرم چشتی جیسے لوگوں نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں انہیں انہی کے سکوں میں ادائیگی کروں۔ سب سے پہلے مجھے اکرم چشتی سے نمٹنا تھا۔ یہ شیطان صفت شخص میرا ذاتی دشمن نہیں تھا لیکن شاہ سے زیادہ شاہ کا وفادار بننے کے لیے اس نے حد کر دی تھی۔ عبداللہ کچھ دیر سے آیا تھا اور خاصا بڑا جوش لگ رہا تھا۔ اس نے آتے ہی کہا۔ ”میرے آدمیوں نے پتا لگا لیا ہے۔ فاضلی مرشد ہاؤس میں موجود ہے۔ گزشتہ رات اس کا کسی نامعلوم اسپتال میں آپریشن ہوا اور پھر صبح اسے ایسبوالینس میں مرشد ہاؤس منتقل کر دیا گیا۔“

”اس کا مطلب ہے وہ بچ گیا ہے۔“

”میں نے کہا تھا نا کہ وہ بچ جائے تاکہ ہم اسے جہنم رسید کر سکیں۔“ عبداللہ خوش تھا۔ ”اب آپ دیکھئے

گا۔“

”اسے چھوڑ دو وہ ابھی ایک دو ہفتے باہر نہیں آ سکتا ہے مجھے اکرم چشتی کے بارے میں معلوم کر کے بتاؤ۔“

”اس کے بارے میں جو معلوم کرنا ہے مجھ سے پوچھ لیں؟“

”وہ آج کل کہاں ہوتا ہے اور اس کی رہائش کہاں ہے۔“

”وہ خود انویسٹی گیشن آفس میں ہوتا ہے ڈی آئی جی انویسٹی گیشن کے ساتھ اور رہائش اس کی سیٹلائٹ

ٹاؤن میں ہے۔“

”اس کا پتا اور ڈیوٹی کے اوقات مجھے بتا دو۔“

”آپ کا کیا ارادہ ہے جناب؟“

”اسے اٹھا کر حویلی پہنچانا ہے۔“

عبداللہ ہچکچایا۔ ”جناب اس سے اچھا یہ نہیں ہے کہ اس کا قصہ ہی پاک کر دیا جائے۔“

”نہیں فی الحال میں اس کا خاتمہ نہیں چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اسے مارنے سے مرشد کو کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ ایک اکرم چشتی چلا جائے گا تو پولیس میں اس جیسے لوگوں کی کوئی کمی نہیں ہے جو مرشد کے ایک اشارے پر دم بلانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اکرم چشتی کو زندہ رہنا چاہیے لیکن ساتھ ہی مرشد کے لیے تنبیہ بن جانا چاہیے۔“

”آپ کے ذہن میں کوئی خیال ہے؟“

”ہاں پہلے اسے اٹھا کر حویلی پہنچانا ہے۔“

عبداللہ فکرمند ہو گیا۔ ”اس کے گھر سے حویلی خاصے فاصلے پر ہے اور ایک پولیس والے کا انخودوں شہروں کی پولیس کو فوری حرکت میں لے آئے گا۔“

”مجھے ایک سیل فون کی ضرورت ہے میرا خیال ہے وسیم کو بلوا لیتے ہیں اور پھر اس پر بات کرتے ہیں۔“ عبداللہ نے مجھے میرا سیل فون دیا جو میں نے اکرم چشتی کے ہاتھ لگنے سے پہلے عبداللہ کے آدی کو دے دیا تھا۔ میں نے وسیم کو کال کی۔ ”یہاں آ جاؤ یا ایک ضروری معرکہ درپیش ہے تیاری کے ساتھ آنا ممکن ہے واپسی میں ایک پارسل لے جانا پڑے۔“

”میں سمجھ گیا جناب۔“ وسیم کی پُر جوش آواز آئی۔ ”میں ایک گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔“

کچھ عرصے پہلے تک وسیم خود بھی خاصا محتاط تھا لیکن اب اس میں بھی تبدیلی آئی تھی اور اس نے سمجھ لیا تھا کہ دشمن اس طرح باز نہیں آئے گا۔ اس کے مقابلے میں عبداللہ محتاط تھا کیونکہ بنیادی طور پر وہ مار دھاڑ والا آدمی نہیں تھا وہ منتظم تھا اس لیے ہر کام احتیاط سے کرتا تھا۔ دشمن کو معاف کرنے کا وہ بھی قائل نہیں تھا لیکن ساتھ ہی وہ بلاوجہ پنگا لینے کا مخالف تھا۔ میں نے عبداللہ سے کہا۔ ”میرا خیال ہے ہم وسیم سے کہیں باہر ملتے ہیں۔“

”جیسا آپ کہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ میں نے وسیم سے رابطہ کر کے ایک جگہ ملے کی عبداللہ کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ میں نے بہت عرصے سے شیونہیں بنائی تھی پہلے فریج تھی اب شیو بڑھنے سے وہ باقاعدہ داڑھی کی شکل اختیار کر گئی تھی اور مرشد کے آدی مجھے اسی حلیے میں دیکھتے رہے تھے اس لیے میں نے کلین شیو کی اور پھر سر پر خود موٹی مشین پھیری۔ مشین ہاتھ روم میں موجود تھی۔ باریک بالوں کی وجہ سے میرا حلیہ خاصا بدل گیا۔ پھر میں نے مونے فریم والی عینک لگائی جس میں زیر و کے ڈارک شیشے تھے۔ یہ عبداللہ نے مہیا کی تھی۔ اس نے میرا معائنہ کیا اور بولا۔ ”اب آپ تقریباً ستر فیصد بدل گئے ہیں۔“

”لیکن دشمن پھر بھی پہچان جاتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”البتہ پولیس والے دھوکا کھا جائیں گے۔“

ہم ایک کرونا کار میں باہر نکلے اس کے شیشے بھی کسی قدر تاریک تھے۔ اس لیے قریب سے دیکھنے بغیر کوئی اندر والوں کو نہیں جان سکتا تھا۔ میں نے وسیم کو ایک پارک کا پتا بتایا تھا۔ وسیم دین کے ساتھ ایک ڈانما جیپ بھی لایا تھا یہ پرانی لیکن طاقتور انجن والی ملٹری ماڈل جیپ تھی۔ جس کے پچھلے حصے میں مقامی ساختہ فولا دنا بنا ہوا ڈبا لگایا گیا تھا۔ وسیم دین کے پچھلے حصے میں ہمارا منتظر تھا۔ سلام دعا کے بعد میں نے اکرم چشتی کا معاملہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے سر ہلایا۔ ”اس سے ہم اللہ کرنا نہایت مناسب رہے گا۔ میرا تو خون کھول رہا ہے جب سے اس کی خباثت کا پتا چلا ہے۔“

”جب مجھ پر گزری تھی تو میں نے بھی بہت سارے ارادے باندھے تھے لیکن اب مجھے صرف انتقام کے لیے اسے اٹھانا یا مار دینا مناسب نہیں لگ رہا ہے ہم اس سے کثیر القاصد فائدے حاصل کریں گے اور پھر اس کا فیصلہ کریں گے کہ کیا کرنا ہے اس لیے فی الحال اسے یوں اٹھانا ہے کہ اس کے ساتھ سوئی بیوی کو کون پتا نہ چلے۔“

وسیم مسکرایا۔ ”میں پوری تیاری کے ساتھ آیا ہوں۔“

”سب سے پہلے ہمیں اس کے گھر کا معائنہ کرنا ہے۔“

”اس کے لیے یہ دین نہایت موزوں رہے گی۔“ وسیم نے کہا۔ ”ہم کسی کی نظروں میں آئے بغیر گھر کا معائنہ کر سکتے ہیں۔“

”بس تو ہمیں یہ کام کر لینا چاہیے۔“ میں نے سر ہلایا۔ ہم نے اپنی کرونا اسی پارک کے ساتھ چھوڑ دی۔ وسیم کے ساتھ آئی دوسری گاڑی اور اس میں سوار افراد بھی وہیں رک گئے اور ہم دین میں اکرم چشتی کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ سٹیٹلیٹ ٹاؤن یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا اور اس کا شمار پنڈی کی پرانی پوش آبادی میں ہوتا ہے۔ یہاں خاندانی رئیس لوگ رہتے ہیں اور ایک زمانے میں بیچ بچ خاندانی ہی ہوتے تھے اب تو ہر دولت مند خاندانی ہو جاتا ہے۔ اکرم چشتی کا گھر نسبتاً چھوٹے پلاٹوں والے علاقے میں تھا۔ اس کے باوجود اس کا گھر باہر سے کسی کو بھی کا منظر پیش کرتا تھا۔ حیرت انگیز طور پر ایک ڈی ایس پی کے گھر پر پولیس گارڈز لگی تھی اور دو پولیس والے خود کار رائفلیں اٹھائے گیٹ کے سامنے کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ہتھیار خطرناک تھے لیکن پولیس روایتی تھی۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ ضرورت پڑنے پر رائفلیں اٹھا کر فائر کرنے کا سوچنے میں بھی ان کو ایک دو منٹ لگ سکتے ہیں۔ ہم دین میں بڑی اسکرین پر یہ منظر نہایت وضاحت سے دیکھ رہے تھے۔ کیمرا نہ صرف کوئی کا منظر دکھا رہا تھا بلکہ اسے ریکارڈ بھی کر رہا تھا۔ ڈرائیور نے جان بوجھ کر دین کی رفتار نہایت سست کر دی۔ یہ دو طرفہ لگی تھی جس میں ایک طرف سے داخل ہو کر دوسری طرف سے نکلا جاسکتا تھا اگر ایک طرف لگی ہوتی تو ہمیں مشکل ہو جاتی۔ پلٹ کر واپس آنا پڑتا۔ ہم گلی سے نکلے اور دین ایک طرف روک کر کیمرا کی بنائی ویڈیو دیکھی۔ وسیم نے اسے ذرا سلوموشن میں کر دیا تھا۔ یہ دو منزلہ کوئی تھی جس کے سامنے والے حصے میں خاصا بڑا کارپورج تھا اور اس وقت بھی وہاں ایک نیلی ہنڈا کار کھڑی تھی۔ عبداللہ نے کہا۔ ”اکرم چشتی گھر پر نہیں ہے کیونکہ وہ سرکاری رنگ کی وٹا استعمال کرتا ہے یہ نئی کار ہے۔“

”حالانکہ اس کی تنخواہ موٹر سائیکل سے اوپر جانے کی اجازت نہیں دیتی ہوگی۔“ میں نے تقنی سے کہا۔ ”یہ کوئی بھی اس کی حرام کمائی سے بنی ہوگی اور اس کی بیوی یا کسی قریبی عزیز کے نام پر ہوگی۔“

”اکرم چشتی کی دو بیویاں ہیں۔“ عبداللہ نے انکشافات کا سلسلہ جاری رکھا۔ ”ایک کسی گاؤں میں ہوتی ہے وہ اس کی خاندانی بیوی ہے دوسری شہری اور ماڈرن ہے لیکن نام نہاد ہی ماڈرن کہہ سکتے ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ ایسی ہے جیسے بھینس کے مقابلے میں لگے ہوئے ہے۔ پہلی بیوی سے نامعلوم تعداد میں بچے ہیں لیکن اس بیوی سے اکرم چشتی کی تین اولاد ہیں۔“

”اس کے علاوہ بھی وہ دوسری جگہوں پر منہ مارتا ہوگا۔“ وسیم نے لقمہ دیا تو عبداللہ ہنسا۔

”تو حرام کس لیے کماتا ہے؟“

”حالات ٹھیک نہیں لگ رہے ہیں۔“ وسیم نے تشویش سے کہا۔ ”اکرم چشتی نے اپنے گھر کی سیکورٹی سخت کی ہوئی ہے۔ پلان ایسا ہوجس میں ناکامی کا خطرہ ایک فیصد سے بھی کم ہو۔“

”کوٹھی شاید نصف کنال رقبے پر ہے۔ سامنے مکانیت کم ہے کیونکہ کورڈ کار پورچ ہے لیکن اوپر والی عمارت زیادہ بڑی ہے اور میرے خیال میں بیڈرومز اوپر ہی ہوں گے۔“ میں نے کوٹھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وسیم نے کوٹھی کا منظر پوز کر دیا تھا۔ ”زیے سامنے دکھائی دے رہے ہیں یہ اوپر کورڈ میز میں نکلتے ہوں گے۔“

نیرس کو فواد کی گرل کی مدد سے بند کر دیا گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ زینوں کے آخر میں کوئی دروازہ ہو گا۔ وسیم نے کہا۔ ”اگر یہ دروازہ کسی طرح سے کھلوا لیا جائے تو اس کے بعد کام آسان ہو جائے گا۔“

”سوال یہ ہے کہ اکرم چشتی یا کوئی اور دروازہ کھولے گا ہی کیوں؟“

وسیم عبداللہ کے سوال پر سوچ میں پڑ گیا۔ ”اگر ان دونوں پولیس والوں میں سے کوئی کسی وجہ سے اکرم چشتی سے بات کرنا چاہے تو.....؟“

”وہ کائنات آدی ہے میرا خیال ہے پولیس والوں کی تمام ضروریات کوٹھی کے بیرونی حصے میں پوری ہو جاتی ہوں گی اور انہیں کوٹھی کے اندر جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس لیے اگر رات کسی وقت کوئی پولیس والا اوپر کا دروازہ کھلوانے کی کوشش کرے گا تو اکرم چشتی جیسا شخص لازمی چوکس ہو جائے گا۔“ میں نے کہا۔

”یہ بھی ممکن ہے اندر اور باہر سیکورٹی کیمرے لگے ہوں۔ یہ آج کل بہت عام ہو گئے ہیں۔“ عبداللہ نے خیال پیش کیا۔ ”اس صورت میں اکرم چشتی پہلے سے ہوشیار ہو جائے گا۔“

”براہ راست کارروائی کیسی رہے گی؟“ وسیم نے پوچھا۔

”اس کے بجائے اسے راستے میں اٹھا لینا زیادہ مناسب ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”گھر میں گھسنے سے دوسرے مسائل پیدا ہوں گے۔ ممکن ہے شور کی وجہ سے غیر متعلقہ لوگ بھی ملوث ہو سکتے ہیں جیسے اکرم چشتی کے بیوی بچے، اس صورت میں راستے میں کارروائی بہترین آپشن ہے۔“

”اس کی دن کی ڈیوٹی ہوتی ہے نائن ٹو فائیو۔“ عبداللہ نے کہا۔ ”لیکن واپسی کا کچھ پتا نہیں ہوتا ہے۔“

”البتہ دفتر کے لیے نکلنے کا وقت تقریباً طے شدہ ہوگا۔ نو یا دس بجے تک وہ گھر سے نکل جائے گا۔“ وسیم بولا۔ ”یہی وقت بہترین ہوگا۔“

”بس کل صبح اسے اٹھا لو۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”اکرم چشتی کے نہ ہونے سے پولیس کی میرے خلاف جاری ہم کم زور پڑ جائے گی۔“

”میں اپنا ریکی اسکوڈ بولا لیتا ہوں۔“ وسیم نے کہا۔ ”ہم کل صبح سورج نکلنے سے پہلے یہاں پہنچ جائیں گے۔“

”میں بھی آؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اکرم چشتی کے گھر کی نگرانی ابھی سے شروع ہو جانی چاہیے۔“

”میں دو افراد ابھی لگا دیتا ہوں وہ گھر اور اکرم چشتی کی نقل و حرکت پر نظر رکھیں گے۔“

وسیم نے حویلی رابطہ کر کے بائیک سوار بلوا لیے۔ یہ اپنے کام کے باہر تھے۔ اکرم چشتی کے گھر والی گلی دونوں طرف کھلتی تھی۔ اس لیے دو افراد ضروری تھے۔ ہم گلی سے نکل کر اس سڑک کی پر آگئے جہاں اندازے کے مطابق اکرم چشتی کو دفتر سے آتے ہوئے گزرتا تھا۔ دین ایک طرف پارک کر دی۔ وسیم نے اس کے کیمرے سامنے سے آنے والی ٹریفک پر مرکوز کر دیئے تھے۔ اب ہم ہر گاڑی کے ڈرائیور کو دیکھ سکتے تھے۔ ہمیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ اکرم چشتی کی وٹز خاصی تیزی سے گزری تھی لیکن کیمرے نے اس کے منہ سے کچھ کوریکارڈ کر لیا تھا۔ تشویشناک بات یہ تھی کہ اس کے ساتھ ایک پولیس والا اور بھی بیٹھا تھا۔ یعنی وہ کسی وقت بھی اکیلا نہیں ہوتا تھا سفر میں اپنے ساتھ ایک گارڈ رکھتا تھا۔

”اس کے ٹھٹا دیکھو ایک گارڈ ساتھ بھی رکھتا ہے۔“ وسیم نے کہا۔ ”خیر کوئی مسئلہ نہیں ہے گھر کے باہر سب سے نمٹا جاسکتا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”اب فرض کر لیں کہ یہ کل صبح بھی دفتر جانے کے لیے نکلے گا تو اسے گھیرنے کے لیے سب سے موزوں جگہ کون سی ہو سکتی ہے۔“

”یہ ابھی دیکھ لیتے ہیں۔“ وسیم نے کہا اور ڈرائیور سے پولیس ہیڈ کوارٹر کی طرف چلنے کو کہا لیکن آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد کوئی ایسی جگہ نہیں ملی جو سنان ہو اور ہم وہاں آرام سے کارروائی کر سکیں۔ اتفاق سے یہ بہت مصروف رہنے والی سڑک تھی جو سیٹلائٹ ٹاؤن سے پولیس ہیڈ کوارٹر کی طرف جاتی تھی۔ کسی کارروائی کی صورت میں درجنوں گواہ بن جاتے۔ میں نے کہا۔

”اس طرح کام نہیں بنے گا۔ اس میں چھسنے کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔“

”اکرم چشتی کے گھر کی طرف آنے والی ذیلی سڑک کے بارے میں کیا خیال ہے۔“ عبداللہ نے اچانک کہا۔ ”وہاں سناٹا ہوتا ہے بڑے پلاٹوں والا رہائشی علاقہ ہے اس لیے لوگ بھی کم نظر آتے ہیں۔“

عبداللہ کا خیال اچھا تھا۔ کم سے کم ہائی وے کے مقابلے میں یہاں خطرہ بہت کم تھا۔ پلاننگ وسیم کا کام تھا اس لیے جگہ کا انتخاب ہونے کے بعد یہ اس پر چھوڑ دیا گیا۔ اس دوران میں اس کے آدھی پہنچ گئے تھے۔ وسیم نے انہیں دس داری سمجھائی اور ہمیں واپس پارک کی طرف چھوڑنے روانہ ہو گیا۔ میں نے راستے میں مشورہ دیا۔

”اس کام میں دین مت استعمال کرنا، میرا مطلب ہے یہ ظاہر دین دور رہے اور اکرم چشتی کو کسی دوسری گاڑی میں لے جانا۔“

”یہ ٹھیک ہے دین کا ہر بار نظر آنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔“ وسیم بولا۔ ”میں نے آئیڈ اسپرے گن لے لی ہے اور ہمارے پاس کچا پینٹ بھی ہے۔ اس کا رنگ آدھے گھنٹے میں بدلا جاسکتا ہے اور رنگ کو صرف دس منٹ میں وائر پریشنگ سے اتارا جاسکتا ہے۔“

”تب اس کا رنگ بدل دو اس کا سیاہ رنگ متوجہ کرتا ہے۔“

ہمیں پارک کے پاس چھوڑ کر وسیم واپس روانہ ہو گیا۔ وسیم واپس روانہ ہوا تو ہم بھی چل پڑے میں نے عبداللہ سے شاز یہ اور صابر کے بارے میں پوچھا۔ ”شاز یہ سعدیہ بی بی سے انچ ہو گئی تھی اور پھر میں اسے یہاں کہاں رکھتا اس لیے میں نے اسے بھی حویلی بھیج دیا۔ دوسرے مجھے ایک شبہ ہو رہا تھا۔“

”میں کوشش کرتا ہوں۔“ عبداللہ نے کہا۔ ”اس کے لیے سب سے موزوں شخص نادر رہے گا۔ وہ پہلے ہی آدھا مر چکا ہے لیکن اس کا شیطانی دماغ زندہ ہے وہ ناکارہ ہو جائے تو ہمیں اس کا خون اپنے سر لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

”صرف نادر نہیں بلکہ شاید کسی بھی دشمن کا خون سر لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

”مگر مرشد، فاضلی اور فتح خان جیسے لوگ سزاے موت کے پوری طرح مستحق ہیں۔“

”یہ بھی ٹھیک ہے لیکن ان کی موت ہمارے لیے مسائل بھی کھڑی کر سکتی ہے اس لیے ہمیں ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا ہوگا۔ مرشد ایک بہت بڑی جاگیر، گدی اور بے شمار دولت کا مالک ہے اس کے بعد جوان چیزوں کا مالک بنے گا اسے ہم سے دشمنی بھی وراثت میں ملے گی اس لیے اگر مرشد ناکارہ ہو جائے اور زندہ رہے تو یہ سب کسی دوسرے کو نہیں ملے گا اور جب دولت و گدی نہیں ملے گی تو کسی کو ہم سے دشمنی کرنے کی ضرورت بھی باقی نہیں رہے گی۔“

عبداللہ نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”یہ تو آپ نے بہت دور کی سوچی ہے۔ ہم میں سے کسی کے دماغ میں یہ بات نہیں آتی ہے۔“

عبداللہ اور میرے دوسرے ساتھی ذہین تھے لیکن وہ فیلڈ میں کام کرنے والے لوگ تھے ان کے ذہن محدود پلاننگ کے ماہر تھے کہ اپنا ناسک کیسے حاصل کرنا ہے۔ مگر مستقبل کے بارے میں سوچنا ان کے لیے مشکل کام تھا۔ دوسری بے شمار ذمے داریوں کی وجہ سے ان کے پاس وقت بھی نہیں ہوتا تھا جب کہ دشمنوں کی مہربانی سے مجھے سوچنے اور آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنے کا بہت موقع ملتا تھا۔ میں نے عبداللہ سے کہا۔ ”کیونکہ مجھے سوچنے کے لیے وقت ملتا ہے۔ اس سے بہت ساری چیزیں سمجھ میں آ جاتی ہیں۔“

عبداللہ ہنسی بھرا ہوا۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب، لیکن مرشد اور فتح خان جیسے لوگوں کو زندہ چھوڑنے کو دل نہیں آتا ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو دل تو میرا بھی نہیں چاہتا ہے لیکن یہ انسانوں میں فرق کی بات بھی ہے مرشد اور فتح خان جیسے لوگ ہماری سطح پر نہیں آ سکتے ہیں اسی طرح ہم ان کی سطح پر نہیں جا سکتے ہیں۔ ہم اور ان میں بنیادی فرق ہمیشہ رہے گا۔ اگر تقدیر نے ان کی موت ہمارے ہاتھ سے لکھی ہے تو یہ الگ بات ہے لیکن ہمیں صرف جوش انتقام میں ان کی موت کا فیصلہ نہیں کر لینا چاہیے۔“

عبداللہ نے سر جھٹکا۔ ”شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

”انسانی معاملات میں آخری چیز موت ہوتی ہے اور اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے ہوئے ہمیشہ سوچو کیونکہ اس کے دور رس اثرات ہوتے ہیں۔“

ہم کوٹھی میں داخل ہوئے تو رات ہو چکی تھی۔ ملازم نے، جسے سب صوفی کہتے تھے اور وہی ایک طرح سے ملازموں کا انچارج تھا ہمیں آتے ہی رات کا کھانا تیار ہونے کی خبر دی۔ عبداللہ نے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا۔ ”آدمے گھنٹے بعد لگا دینا اور یہ تاؤ یہاں کوئی کمپیوٹر اور انٹرنیٹ ہے۔“

”آپ کالیپ ٹاپ ہے اور انٹرنیٹ کے لیے میں نے براڈ بینڈ کی درخواست دے دی ہے شاید ایک دو

میں چونکا۔ ”شاز یہ کے بارے میں؟“

”جی میرا خیال ہے وہ پکینینٹ ہو گئی ہے۔“

”میرے خدا، یہ اس بے چاری کے لیے ایک اور دھچکہ ہوگا۔“

عبداللہ نے سر ہلایا۔ ”وہ بہت مظلوم ہے، باپ کے کیے کی سزا اسے بھگتنا پڑی۔ میں نے ویم کے توسط سے سعدیہ کو پیغام دے دیا ہے کہ وہ اس مسئلے کا کچھ حل کریں۔ یہ خواتین کا شعبہ ہے۔“

”وہاں ماں جی دیکھ لیں گی۔“ میں نے کہا۔ ”یہ تو خود نا تجربے کار ہیں یہ کیا دیکھیں گی۔ اگر یہ مسئلہ یہیں ہو گیا تھا تو اسے یہیں کسی ڈاکٹر کو دکھا دینا چاہیے تھا۔“

”اس کا وقت نہیں تھا ان لوگوں کی روانگی ہونے والی تھی جب اس کی طبیعت خراب ہوئی اور وہ اسی حالت میں گئی تھی۔ میرے آدمیوں نے بتایا کہ راستے میں بھی اس کی طبیعت خراب رہی تھی۔“

”تم نے کس طرح انہیں روانہ کیا تھا۔“

”میں نے پہلی کا پڑکار سک لینے کے بجائے انہیں سڑک سے بھیجنے کا فیصلہ کیا اور ہمارے تقریباً سارے آدمی پوری طرح مسلح ہو کر انہیں چھوڑنے گئے تھے راستے میں، میں وہ ہر صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھے۔“

میں مسکرایا۔ ”گو یا تم نے ڈنکے کی چوٹ پر کام کیا؟“

”نہیں ایسا تو نہیں ہے ہر ممکن احتیاطی تدبیر بھی کر لی تھی۔ اس کے بعد انہیں روانہ کیا تھا۔“

”صابر کی طرف سے کوئی پیغام ملا؟“

”نہیں میں باقاعدگی سے اخبار چیک کر رہا ہوں ابھی تک اس کی طرف سے کوئی اشتہار نہیں آیا ہے۔“

”میں نے اسے ایک مہینے کی مہلت دی تھی اور اس میں سے آٹھ دن گزر چکے ہیں۔“

”شہباز صاحب یہ کام بہت مشکل ہے اگر قسمت نے یاوری کی تو صابر کامیاب ہو سکے گا۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”میرا بھی یہی خیال ہے لیکن اس میں نے اسے پوری طرح دہشت زدہ کر دیا

تھا کہ وہ ناکام رہا تو میں اس کی لڑکی کو مرشد کے حوالے کر دوں گا۔“

عبداللہ نے میری طرف دیکھا۔ ”سچ جی؟“

”یار میں ایسا کر سکتا ہوں وہ معمولی بچی ہے میں کسی جانور کو بھی مرشد کے حوالے نہ کر دوں۔ اگر صابر ناکام

رہا تب بھی اس کی بیٹی اس کے سپرد کر دوں گا۔ چینی بریف کیس اہم ہے لیکن یہ ہمارے اولین مقاصد میں نہیں

آتا ہے۔“

عبداللہ نے سر ہلایا۔ ”ہمارا اولین نشانہ مرشد ہے اس سے جان چھوٹ جائے تو باقی افراد کی اتنی اہمیت

نہیں ہے۔“

”تم ایسا کرو کہیں سے وہ انجکشن حاصل کرو جو مرشد نے مجھے لگا یا تھا لیکن اس کام میں بہت احتیاط کی

ضرورت ہے کوئی ماہر بھی ساتھ ہو۔ مرشد کے ساتھ کسی نے ہاتھ کر دیا اور اسے ناکارہ ہو جانے والے انجکشن تھا

دیئے تھے۔“

ہیں۔“

”اکرم کے ساتھ اس کا گارڈ بھی ہے؟“

”بالکل ہے جناب۔ وہ اس وقت بھی مکان کے باہر گاڑی میں موجود ہے۔“

”اگر یہ کوئی باقاعدہ اسکیم ہے تو یہاں کوئی چوکیداری سسٹم بھی ہوگا اپنے آدمی سے کہو چوکیدار کو تلاش کرے اور اس سے معلومات حاصل کرے لیکن اسے شک کا موقع نہ دے۔“

”وہ شک تو کرے گا۔“ وسیم نے جواب دیا۔ ”لیکن اس کا طریقہ ہے۔ رٹم اس کا منہ بند کر دے اور رقم کے ساتھ دھمکی اسے خاموش رہنے پر مجبور کرے گی۔“

”اپنے آدمی سے کہو یہ کام کر گزرے، وہاں کتنے لوگ ہیں؟“

”دونوں ہیں۔“

”ٹھیک ہے ایک آدمی مکان اور اکرم چشتی کی نگرانی کرے اور دوسرا چوکیدار کو تلاش کرے۔“

”کیا خیال ہے یہیں اکرم چشتی کو نہ چھاپ لیا جائے؟“

”نہیں کوئی کچا کام نہیں کرتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”نہ جانے اس مکان میں کون ہے اور پھر وہی بات ہوگی معاملہ فوراً کھل جائے گا اور اکرم چشتی کو حویلی تک لے جانے میں مشکل پیش آسکتی ہے۔ دوسرے مکان میں موجود افراد گواہ بن جائیں گے۔“

”میں ہدایت کرتا ہوں۔“ وسیم نے کہا اور کال کاٹ دی۔ میں کمرے میں آیا کیونکہ صبح سویرے اٹھنا تھا اس لیے میں نے کھانا کم کھایا تھا۔ کچھ دیر بعد غسل کر کے ایک گلاس دودھ لیا اور سو گیا۔ موبائل میں پانچ کا الارم لگا لیا تھا۔ میری محسن خاصی حد تک ازمنہ تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ میں پوری طرح فٹ نہیں ہوں۔ مجھے اس میں ایک دو دن اور لگتے۔ الارم بجا تو میری آنکھ کھل گئی میں نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھو یا اور نیچے آیا جہاں عبداللہ اور اس کے آدمی تیار تھے میں نے کافی کا کہہ کر عبداللہ سے رپورٹ لی۔ اس نے بتایا۔

”اکرم چشتی اس مکان سے گیارہ بجے نکلا اور وہاں اپنی کوشی پر آ گیا تھا۔ چوکیدار سے جو معلومات حاصل ہوئیں ان کے مطابق اس گھر میں ایک عورت اور ایک مرد رہتے ہیں لیکن ان کا کردار نہایت مشکوک ہے کیونکہ تقریباً روز ہی نئی شکلوں والے افراد یہاں آتے ہیں اور اکثر لوگ رات کو رک جاتے ہیں۔ کیونکہ آبادی زیادہ نہیں ہے اور جو ہیں وہ بھی خود میں گمن ہوتے ہیں اس لیے عام لوگوں کو ان کے کردار کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہے لیکن چوکیداروں سے اس قسم کی چیزیں نہیں چھپ سکتی ہیں۔

”یعنی قصہ مختصر ہے کہ اکرم چشتی یہاں عیاشی کے لیے جاتا ہے۔“

”اس جیسے آدمی سے اسی کردار کی توقع کی جاسکتی ہے۔“

”رواگئی کب ہے؟“

”دس منٹ میں۔“

میں تیار تھا عبداللہ نے ایک بریٹا اور اس کے دو عدد فاضل میگزین میرے سپرد کیے۔ کافی پیتے ہوئے میں نے ان کا معائنہ کیا اور مطمئن ہو کر اپنی جیکٹ میں رکھ لیا۔ موسم بہت سرد نہیں تھا لیکن جیکٹ پہننے کی محبتاں تھی۔

دن میں لگ جائے گا۔“

”مائی نے بڑی زبردست سروس لی ہوئی ہے۔“

”آپ کہیں تو اس کا بندوبست کر لیتے ہیں؟“

”نہیں اتنی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے کہا اور پراگیا۔ کمرے میں آتے ہی سویرا کا نمبر ملایا۔ حویلی میں سورج ڈوبتے ہی رات کا کھانا کھالیا جاتا ہے۔ مجھے امید تھی کہ سویرا فارغ ہوگی۔ مگر تیل جاتی رہی اور اس نے کال ریسیو نہیں کی۔ شاید وہ کچن میں تھی اور موبائل کمرے میں پڑا ہوا تھا میں نے اس کے نمبر پر میسج کر دیا۔ چند منٹ بعد ہی سویرا کے نمبر سے کال آئی۔

”شہباز۔“ اس نے بے تابی اور سانس میں بھر کر میرا نام لیا۔

”سویرا۔“

”آپ کہاں تھے، میں کب سے انتظار کر رہی تھی۔“ اس نے شکوہ کیا۔ ”بار بار کمرے کی طرف آتی

تھی۔“

”دوسرے لوگوں سے میں نے کسی اور نمبر سے بات کی تھی میرا موبائل میرے ایک ساتھی کے پاس تھا اور اب ملا ہے۔“

”آپ کیسے ہیں، میں ہر روز پانچ وقت کی نماز کے بعد آپ کے لیے دعا کرتی ہوں۔“

”سویرا مجھے دنیا میں کسی چیز کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی تمہاری دعاؤں کی ہے۔“

”وہ تو میرا دل رواں کرتا ہے۔“ وہ بولی اور پھر چپک کر کہا۔ ”اللہ، اتنی روتی ہو گئی ہے حویلی میں، سارا سناٹا ختم ہو گیا ہے۔ شہباز یہ لڑکی شاز یہ کون ہے؟“

”میرے ایک دشمن کی بیٹی ہے اور میرے دوسرے دشمن کی بدسلوکی کا شکار ہوئی ہے۔“

”کیا مطلب؟“

میں نے سویرا کو مختصر آشنائی کے بارے میں بتایا۔ سویرا حیران رہ گئی۔ ”اس بے چاری کے ساتھ اتنا برا ہوا ہے، مجھے مونا نے کچھ بتایا تو تھا۔ وہ تو امید سے ہے۔“ سویرا کی آواز جھینپ گئی تھی۔

”اس مسئلے کا کوئی حل نکالنا ہوگا۔ تم ماں جی سے بات کرو اور اسے کسی لیڈی ڈاکٹر کو کھاؤ۔“

”آپ کا مطلب ہے..... وہ..... مسئلہ ختم کر دیا جائے۔“ سویرا نے انک انک کر کہا۔

”بالکل اس کے سوا اور کیا راستہ ہے دوسری صورت میں اس لڑکی کی رہی سہی زندگی بھی تباہ ہو جائے گی اسے کون قبول کرے گا؟“

”ٹھیک ہے میں ماں جی سے بات کرتی ہوں۔“ سویرا نے کہا۔ اس سے کچھ ویرات کر کے میں نے پچھلے آٹھ گھنٹے کا کھانا کھا۔ کھانے کے بعد میں نے وسیم کو کال کر کے اکرم چشتی کے بارے میں رپورٹ لی۔ وہ گھر آنے کے کچھ دیر بعد ہی گھر سے نکل گیا تھا اور اس نے مری روڈ کی ایک نئی اسکیم کا رخ کیا تھا وہاں وہ ایک مکان میں موجود تھا۔ مکان پانچ چھ مہرے لے کا تھا اور یہ ظاہر عام سا لگ رہا تھا۔ میں نے وسیم سے کہا۔ ”یہ جگہ کیسی ہے؟“

”میرے آدمی کے مطابق وہاں ہے نئی اسکیم ہے اور بہت کم آبادی ہے گھر بھی دور دور بنے ہوئے

ساڑھے پانچ بجے ہم روانہ ہوئے تو صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ دسبم اور اس کے ساتھی اکرم چشتی کے گھر کے پاس پہنچ چکے تھے۔ اس کے آدمیوں نے دور سے کوٹھی کا جائزہ لیا تھا۔ وہاں تاریکی تھی اور کوٹھی کے باہر ایک گاڑو موجود تھا دوسرا یقیناً اندر آرام کر رہا تھا جیسی روح ویسے فرشتے تھے۔ اکرم چشتی جیسے کرپٹ پولیس افسر کے محافظ بھی اس کی طرح حرام خور تھے۔ ہمارے وہاں پہنچنے تک روشنی ہو گئی تھی لیکن ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ دین کے ساتھ دسبم وہی ڈبانا جیب بھی لایا تھا۔ اکرم چشتی کو اسی میں ڈال کر لے جاتا تھا۔ اس کے علاوہ تین بائیک سوار تھے۔ مجموعی طور پر دسبم کے ساتھ سات افراد تھے اور عبداللہ جو اصل میں بیک آپ میں تھا وہاں مسلح آدمی ساتھ لایا تھا اس کا کام کسی ہنگامی صورت حال میں مداخلت کرنا تھا۔ ہمارے ساتھ دو گاڑیاں تھیں ایک میں ہمیں اور عبداللہ تھے اور دوسری گاڑی میں اس کے پانچ آدمی تھے۔ دسبم نے دین پر نہ صرف کلر کر لیا تھا بلکہ اسے دور کھڑا کیا تھا۔ دین کی وجہ سے تمام لوگ آپس میں ریڈیو سے ایک دوسرے سے منسلک تھے۔ میں نے ہیڈ سیٹ لگایا اور دسبم سے پوزیشن پوچھی۔ ”تمام لوگ اپنی جگہوں پر ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”پلان کیا ہے؟“

”جیسے ہی اکرم چشتی گھر سے نکلے گا۔ بائیک سوار اس کا پیچھا کریں گے اور خاموش پستول سے گاڑی کا ٹائر برسٹ کر دیں گے۔ آگے سے جب کار کا راستہ روکے گی۔“

”اکرم چشتی اتنی آسانی سے قابو میں نہیں آئے گا وہ مزاحمت کرے گا۔“

”اس کے لیے ہمارے آدمی تیار ہوں گے۔ ان کے پاس بے ہوش کرنے والی ڈارٹ گن ہوگی۔“

”بے ہوشی کی دوا کچھ دیر سے اثر کرتی ہے۔“

”اگر زیادہ مزاحمت کی تو میں نے اپنے آدمیوں کو ہدایت کر دی ہے وہ جان لیے بغیر گولی چلا سکتے ہیں۔“

دسبم نے کہا۔ ”ویسے اس قسم کے کاموں میں خطرہ تو ہوتا ہے۔“

گلی کے دونوں سروں پر دسبم کے آدمی موجود تھے اور وہ کوٹھی پر مکمل نظر رکھے ہوئے تھے۔ سات بجے ان میں سے ایک نے اطلاع دی۔ ”جناب اندر سے ایک گاڑی نکلی ہے۔“

”کون سی گاڑی ہے؟“

”نیلی ہنڈا ہے جناب۔“

کارگل کے کونے پر پہنچی تو ایک بائیک اس کے پیچھے لگ گئی۔ بائیک سوار نے اطلاع دی۔ ”کار میں کوئی ملازم ہے۔ اس کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔“

”شاید یہ کسی عارضی کام سے نکلا ہوگا۔“ دسبم نے کہا۔ ”اس کے پیچھے لگے رہو اور جب ریڈیو کی حد سے نکل جاؤ تو موبائل پر رابطہ کرنا۔“

دس منٹ بعد اطلاع ملی کہ ملازم ایک معروف حلوائی سے طلوہ پوری اور دوسرا سامان لے رہا تھا۔ یہ کام کر کے وہ ساڑھے سات بجے تک واپس کوٹھی پہنچ گیا گویا وہاں ناشتے کی تیاری تھی۔ صبح ہوتے ہی دوسرا گاڑی بھی ڈیوٹی پر واپس آ گیا تھا۔ دن اور رات کے الگ الگ محافظ ہوتے لیکن فی الحال ان کی تبدیلی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ آٹھ بجے ان کے لیے بھی اندر سے ناشتہ آ گیا تھا۔ ہم صبر سے انتظار کر رہے تھے کہ اکرم چشتی دفتر

جانے کے لیے باہر نکلے تو ہم اپنی کار روانہ کریں۔ سب اپنی اپنی جگہ مستعد تھے تمام گاڑیوں اور بائیکس کی نمبر پلیٹس بدلی ہوئی تھیں۔ جو لوگ اکرم چشتی اور اس کے گاڑو کے سامنے آتے ان کے چہرے چھپے ہوتے اس لیے بعد میں کوئی ثبوت باقی نہیں رہتا۔ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب گیٹ پر موجود گاڑو مستعد ہو گئے اور اپنی رائفلیں سنبھال کر کھڑے ہو گئے۔

”میرا خیال ہے اکرم چشتی باہر آنے والا ہے۔“ دسبم نے کہا۔

سب چوکنے ہو گئے۔ چند منٹ بعد وٹو باہر آئی اور اس نے گلی کے اس سرے کا رخ کیا جہاں ہم موجود تھے۔ دسبم کے آدمی لمحہ بہ لمحہ خبردار کر رہے تھے۔ ایک منٹ بعد کارگل کے سرے پر نمودار ہوئی اور بڑی سڑک کی طرف جانے لگی فوراً ہی تینوں بائیک والے اس کے پیچھے نمودار ہوئے تھے۔ میں عبداللہ کے ساتھ دور تھا اور صرف رواں کنسٹری پر گزارا کر رہا تھا پھر دسبم نے بتایا۔ ”اسے روک لیا گیا ہے۔“

یہ سنتے ہی عبداللہ نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی اور جب تک ہم اس جگہ پہنچے اکرم چشتی اور اس کا محافظ بے ہوش کیے جا چکے تھے انہیں حرکت کا موقع نہیں ملا تھا۔ جیب نے راستہ روکا تھا اور اس سے پہلے کہ اکرم چشتی یا اس کا گاڑو ہوشیار ہوتے انہیں ڈارٹ گن کی مدد سے بے ہوش کیا جا چکا تھا۔ اکرم چشتی کو نہایت بھرتی سے جیب کے فولادی بکس میں منتقل کر دیا گیا تھا اور اس پر ایسی بوریاں ڈال دی گئی تھیں جن میں کچی روٹی بھری ہوئی تھی۔ اب کوئی گاڑی روک کر چیک بھی کرتا تو اسے روٹی کی بوریاں ہی ملتیں۔ ہم وہاں نہیں رکے تھے بلکہ یوں دیکھتے ہوئے گزرے جیسے عام لوگ ہوں۔ دین اپنی جگہ موجود تھی اور بائیک والے آگے نکل گئے تھے۔ جیب روانہ ہوئی اور اکرم چشتی کی کار بے ہوش گاڑو کے ساتھ رہ گئی تھی۔ وہ بچکر کھڑی تھی اور اس کے دروازے بند تھے اتفاق سے کسی نے بھی یہ سینہ ہوتے نہیں دیکھا تھا اس لیے اب جب تک کوئی خاص طور سے کار کے پاس جا کر نہ دیکھتا اسے بے ہوش گاڑو کا بھی پتا نہیں چلتا۔

”کمال کر دیا۔“ میں نے ریڈیو پر کہا۔ ”اتنی صفائی سے کام کیا ہے۔“

”ڈارٹ گن صرف دو منٹ میں بے ہوش کر دیتی ہے اور آدمی کو تین چار گھنٹے سے پہلے ہوش نہیں آتا۔“

دسبم نے کہا۔ ”دین پیچھے رہے گی میں خود جیب میں آ گیا ہوں۔“

”اچھا میں تو تمہیں دین میں سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے کہا اور عبداللہ کی طرف دیکھا۔ ”میرا خیال ہے تم اپنے باقی آدمیوں کو وہاں بھیج دو ہم دسبم کے ساتھ چل رہے ہیں۔“

عبداللہ موبائل پر اپنے آدمیوں سے رابطہ کرنے لگا جو دوسری گاڑی میں تھے اس گاڑی میں صرف میں اور عبداللہ تھے۔ جیب میں دسبم اور اس کے ساتھ ڈرائیور تھا۔ باقی تین بائیک سوار تھے۔ مجھے اکرم چشتی کے پکڑے جانے کی خوشی تھی۔ اس شخص سے اپنا حساب برابر کرنا تھا۔ ابھی میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کا کیا کرنا ہے۔ ممکن ہے اس کے لیے سزائے موت تجویز کی جاتی لیکن ایک چیز میں نے سوچ لی تھی اس سانپ کو اب زہر اور دانت کے ساتھ نہیں چھوڑنا ہے۔ اگر اسے زندہ رہا بھی کیا تو ناکارہ کر کے رہا کریں گے اور اس سے پہلے حویلی کے تہ خانے میں اسے کچھ یادگار وقت گزارنا تھا جسے وہ مرتے دم تک نہ فراموش کر سکے۔ عبداللہ نے اپنے آدمی واپس بھجوا دیے تھے اور اب خاموشی سے ڈرائیور کر رہا تھا۔ دین کہیں آس پاس تھی لیکن اس کا مواصلاتی سسٹم بند

”گڈ تہارے ساتھی بھی ہیں؟“

”ہاں وہ تینوں بھی پیچھے آئے ہیں۔“

”پولیس موبائل؟“

”ان کا نہیں پتا، وہ خاصی پیچھے ہیں۔“

”اپنے آدمیوں کو حکم دو کہ اگر موبائلز پیچھے آنے کی کوشش کریں تو ان کے نائز برسٹ کر دیں۔“

”میں پہلے ہی ان سے کہہ چکا ہوں۔“ وسیم نے بتایا۔ ”لیکن ابھی تک کوئی موبائل پیچھے آتی نظر نہیں آ رہی ہے البتہ لوگوں نے بہت گالیاں دیں ہوں گی جن سے جیپ ٹکراتے کتراتے پھرتے۔“

”ان کی فکر مت کرو۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”وہ بے چارے حق بجانب ہیں گالیاں دینے میں۔“

میں اور عبداللہ سروس روڈ پر تھے اور اسی پرواہی کے لیے چل پڑے۔ عبداللہ نے مشورہ دیا۔ ”جب تک پولیس متحرک ہے آپ کا باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں ہے اس لیے ہم واپس چلتے ہیں۔ حویلی بعد میں جاسکتے ہیں۔“

میں نے اس کی بات پر غور کیا اور پھر خود کو اتفاق پر مجبور پایا۔ پولیس جس طرح سے ناکارہ لگا کر کھڑی تھی اس سے صاف ظاہر تھا کہ کوئی بڑی گڑبڑ تھی اور شاید دہشت گردی کا معاملہ تھا ورنہ عام مجرموں کے لیے پولیس اور انتظامیہ اس طرح مستعد نہیں ہوتی ہے۔ میں نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے ہم پنڈی سے نکلنے کی کوشش نہیں کریں گے لیکن جب تک وسیم بحفاظت نہیں نکل جاتا ہے ہم یہیں رہیں گے۔“

”میرا خیال ہے وسیم صاحب کو جی ٹی روڈ کے بجائے پشاور جانے والی موٹر وے پکڑنی چاہیے اس پر رش کم ہوتا ہے اور وہاں ناکے کا امکان بھی کم ہوگا۔ بس راستہ ذرا طویل ہو جائے گا۔“

میں نے وسیم کو کال کر کے موٹر وے سے جانے کا مشورہ دیا۔ وہ جی ٹی روڈ تک پہنچ گیا تھا۔ اسے ایک خورد سے پہلے جانا تھا۔ حویلی جی ٹی روڈ اور موٹر وے کے درمیان کے علاقے میں تھی۔ وسیم کے تینوں بایک سوار اس کے ساتھ تھے۔ جیسے جیسے سورج بلند ہو رہا تھا دن گرم ہوتا جا رہا تھا۔ یہ غیر متوقع گرمی تھی کیونکہ اپریل کے آغاز میں بھی راولپنڈی اسلام آباد کا موسم خوشگوار ہی ہوتا ہے۔ عبداللہ نے گاڑی ایک چھوٹے سے ریسٹوران کے سامنے روک لی اور ہم اندر چلے آئے۔ یہاں ایک دور دراز کی میز سنبھال کر ناشتے کا آرڈر کیا۔ عبداللہ نے ناشتہ کر لیا تھا لیکن میں نے صرف ایک کافی لی تھی اور اب مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ عبداللہ نے اپنے لیے چائے منگوائی تھی۔ جب تک میں ناشتہ کرتا رہا وہ وقفے وقفے سے وسیم کو کال کر کے آپ ڈیٹ لیتا رہا۔ وسیم موٹر وے تک پہنچ گیا تھا۔ جب تک میں ناشتے سے فارغ ہوا وسیم اکرم چشتی سمیت پنڈی کی حدود سے نکل چکا تھا۔

”میرا خیال ہے اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔“ عبداللہ نے سکون کا سانس لیا۔ ”یہ اکرم چشتی ج جی نہایت مخنوس آدمی ہے۔ کتنی آسانی سے ہاتھ آگیا اور کیسی مشکل میں پڑتے پڑتے پہنچے ہیں۔ اگر وسیم صاحب ذرا اور آگے نکل جاتے تو پھر واپسی کا امکان باقی نہ رہتا۔“

”یہ بہتر ہوا کیونکہ جی ٹی روڈ پر ناکے کا امکان تھا اگر وسیم یہاں نہ پھنستا تو وہاں پھنس جاتا اب وہ موٹر وے سے نکل گیا ہے۔“

کر دیا گیا تھا اس لیے ہم آپس میں بات نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے ہیڈ سیٹ اتار دیا۔ میرے موبائل کی بیل بجی وسیم کال کر رہا تھا۔ میں نے کال ریسیو کی۔

”کیا ہوا وسیم؟“

”کوئی گڑبڑ ہے جناب اس سڑک پر آگے پولیس نے ناکہ لگا رکھا ہے۔ گاڑیوں کی تلاشی لی جا رہی ہے۔“

ابھی ہم دور تھے میں نے عبداللہ سے گاڑی سڑک سے ہٹانے کو کہا اور وہ اسے گھما کر سروس روڈ پر لے آیا۔ مزید آگے جا کر ہم ٹریفک کے جھوم میں پھنس سکتے تھے۔ میں نے کہا۔ ”وسیم یہ نامکھن ہے کہ پولیس اتنی جلدی حرکت میں آجائے انہیں اکرم چشتی کی تلاش نہیں۔ یہ کوئی اور پتھر ہے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن ہم بھی اس چکر کی پلیٹ میں آسکتے ہیں۔ ہم آگے آچکے ہیں اور واپسی کی گنجائش نہیں ہے۔“ صورت حال اچانک تشویشناک ہو گئی تھی۔ اکرم چشتی جتنی آسانی سے ہمارے ہاتھ لگا تھا اس سے لگ رہا تھا کہ اب کوئی مشکل نہیں ہے لیکن مشکل اچانک ہی سامنے آئی تھی۔ یہ سڑک پنڈی شہر کے اندر تھی اور یہاں اس طرح چیکنگ کا مطلب تھا پولیس کوئی بڑی سرگرمی کر رہی تھی۔ پچھلے کچھ عرصے سے جڑواں شہروں کے حالات ٹھیک نہیں رہے تھے۔ تو اتارے دہشت گردی کی وارداتوں نے پولیس اور انتظامیہ کو چونکا کر دیا تھا اور ممکن ہے یہ تلاشی بھی اسی سلسلے میں لی جا رہی ہو۔ میں نے وسیم سے کہا۔ ”دائیں بائیں نکلنے کی گنجائش نہیں ہے؟“

”ہے لیکن گرین بیٹل ہے اسے روند کر نکلے تو پولیس فوراً پیچھے آئے گی ناکے پر دو موبائل موجود ہیں۔“

”تلاشی کس طرح سے لی جا رہی ہے صرف کاغذات دیکھ رہے ہیں یا عملی تلاشی بھی لے رہے ہیں۔“

”عملی تلاشی لی جا رہی ہے۔ تین تین کی قطاروں میں گاڑیاں لگی ہیں۔ ان کی ڈکیاں تک کھلو کر دیکھ رہے ہیں۔“

”کسی بھی طرح سے وہاں سے نکلو۔“ میں نے کہا۔ ”ایک بار ناکے کے پاس پہنچ گئے تو گلو خلاصی مشکل ہو جائے گی۔“

”ہم دائیں طرف ہیں۔ دوسری والی سڑک پر نکل کر ہم واپس آئیں گے۔ اس پر ٹریفک بہت کم ہے۔“

عبداللہ سن رہا تھا اس نے کہا۔ ”وسیم صاحب سے کہیں واپس آتے ہوئے بائیں طرف سڑک نکل رہی ہے اس پر آجائیں۔ یہ سیدھی جی ٹی روڈ پر نکلے گی۔“

”جی ٹی روڈ پر پولیس مستعد ہوگی۔“ وسیم نے کہا۔

”آپ نکلیں تو جناب اس کے بعد دیکھتے ہیں۔“ عبداللہ بولا۔ ”یہیں نہ پھنس جائیں۔“

حویلی انک سے پہلے جی ٹی روڈ اور پشاور جانے والی موٹر وے کے درمیان ایک عام شاہراہ کے قریب تھی۔ یہ علاقہ زیادہ آباد بھی نہیں تھا اور اس سڑک پر بھی زیادہ رش نہیں ہوتا تھا لیکن اب اس تک پہنچنا مشکل لگ رہا تھا۔ ہم پنڈی میں ہی پھنس گئے تھے۔ وسیم نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”ہم گرین بیٹل کراس کر کے دوسری طرف آگئے ہیں۔“

”حویلی اچھی جگہ ہے لیکن دور بہت ہے ہمیں کہیں آس پاس بھی کوئی ایسا ہی ٹھکانہ تلاش کرنا چاہیے۔“
 ”اس کے برعکس ان لوگوں کا دور دراز رہنا ہی ٹھیک ہے شہر ہوتے ہوئے دشمنوں کی نظروں میں آنے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ جیسے راجا صاحب والی کوٹھی سے تمام دشمن واقف ہو گئے تھے اور بالآخر میں وہیں سے نکلنے کے بعد دشمن کے ہتھے چڑھا۔ اس سارے کھیل میں اہمیت وقت اور فاصلوں کی نہیں رازداری کی ہے۔ حویلی دور دراز ہے اس لیے ہمارے دشمن اس تک رسائی نہیں رکھتے ہیں جب کہ پنڈی اور اسلام آباد شہر یا آس پاس ہمارے جتنے ٹھکانے تھے بالآخر دشمن ان تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔“
 ”ہاں تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

”اب ہو یہ سکتا ہے کہ ہم متبادل ٹھکانے بنائیں اور یہ کام تم کر رہے ہو۔ یہ کوٹھی لے لی ہے۔ اسی طرح ہم نے فارم ہاؤس لیا تھا اور خاصے عرصے تک اسے استعمال کرتے رہے۔ جب خطرہ محسوس ہوا تو اسے چھوڑ دیا۔ اب ہمیں فارم ہاؤس جیسے کرائے کے ٹھکانے تلاش کرتے رہنے چاہئیں۔“

ہم ریستوران سے نکلے تو دسب موٹر وے پر خاصا آگے نکل چکا تھا اور اب وہ حویلی کے قریب تھا۔ مگر حویلی کے لیے اسے بہت آگے جا کر واپس کا راستہ ملتا کیونکہ پاس کوئی انٹرچینج نہیں تھا۔ میں اور عبداللہ واپس کوٹھی پہنچ گئے۔ اکرم چشتی کا یوں ہاتھ آنا ہماری بڑی کامیابی تھی اور اب میں مرشد سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ خوش قسمتی سے جب ہم واپس آئے تو کوٹھی پر پٹی سی ایل کی ٹیم آئی تھی اور وہ انٹرنیٹ کے لیے براڈ بینڈ کنکشن کر رہے تھے۔ اس کوٹھی میں ٹیلی فون کا کنکشن پہلے سے موجود تھا لیکن فون کاٹ دیا گیا تھا انہوں نے اسی فون کو بحال کیا اور پھر لائن کو براڈ بینڈ کر دیا۔ چند گھنٹوں بعد انہوں نے انٹرنیٹ آن کر دیا تھا۔ وہ والی فائی روٹر لگا گئے تھے۔ اس سے لیپ ٹاپ سے بغیر کوئی تار لگائے انٹرنیٹ استعمال کیا جاسکتا تھا۔ اس وقت براڈ بینڈ آنے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اور اسپڈ بھی اتنی نہیں تھی لیکن جتنی تھی وہ کام کرنے کے لیے کافی تھی۔ میں نے مانی کا بنایا ہوا انٹرنیٹ کال کا اکاؤنٹ کھولا اور مرشد ہاؤس کا نمبر ملایا۔ نمبر سیکرٹری نے اٹھایا۔

”مرشد سے بات کراؤ۔“ میں نے کہا۔

”شہباز صاحب؟“ سیکرٹری نے میری آواز پہچان لی تھی۔

”مجھے کوئی موبائل نمبر دو جس پر مرشد سے بات ہو سکے۔“ میں نے اس کا سوال نظر انداز کر کے کہا۔

”ایک منٹ۔“ اس نے کہا اور پھر مرشد سے بات کی اور کچھ دیر بعد مجھے ایک نمبر نوٹ کرا دیا۔ ”مرشد

صاحب اس پرپلس گے شہباز صاحب۔“

”میں شہباز نہیں ہوں۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے کال کرنے والے سافٹ ویئر کا وائس ویئر آن کیا تاکہ مرشد تک میری آواز بدلی ہوئی جائے اور وہ اس کال کو ریکارڈ کر کے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ میں نے نمبر ملایا۔ مرشد نے فوراً کال ریسیو کی۔

”شہباز.....“

”میں کون ہوں تم اچھی طرح جانتے ہو اس لیے نام لینے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے اس کی بات

کاٹ کر کہا۔

”وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔“ تم جانتے ہو جو ہوا اس میں قصور فاضلی کا تھا۔“
 ”تب فاضلی کو میرے حوالے کر دو۔“

”اسے اس کے کیے کی سزا مل چکی ہے۔“ مرشد نے چالاکی سے جواب دیا۔ ”وہ شدید زخمی ہے اور اب بھی کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی جان بچتی ہے یا نہیں۔“

”مرشد تم حسبِ عادت جھوٹ بول رہے ہو۔ اگر اس کی حالت اتنی ہی خراب ہے تو اسے اسپتال میں رکھنے کے بجائے مرشد ہاؤس کیوں منتقل کر دیا گیا ہے۔“

”یہاں بھی بہترین ڈاکٹر تمام انتظامات کے ساتھ اس کا علاج کر رہے ہیں۔ اسپتال میں تم لوگوں کی طرف سے اس کی جان کو خطرہ تھا۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ میں نے چالاکی کا جواب چالاکی سے دیا۔ ”اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو تم ایک ہفتہ پہلے مرحوم ہو چکے ہوتے۔ مرشد اب بھی وقت ہے سنبھل جاؤ اور اس حقیقت کو تسلیم کر لو کہ تمہاری اہلیا بھی جیواور جینے دو میں ہے۔ ہم پہلے کی طرح کنزرو نہیں رہے ہیں۔ اہمیت تین چیزوں کی ہوتی ہے۔ دولت، طاقت اور انہیں استعمال کرنے کا حوصلہ۔ یہ تین چیزیں ہمارے پاس موجود ہیں۔ اس لیے تم اُس وقت سے ڈرو جب ہم تمہاری سطح پر آنے کا فیصلہ کر لیں اور وہ وقت زیادہ دور بھی نہیں ہے جو گولی تمہارے کٹے میں سوراخ کرتی گزری تھی اگلی بار وہ تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کرے گی۔“

”میں ایسی دھمکیوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔“ اس نے حوصلے سے جواب دیا۔

”مجھے معلوم ہے تم دھمکیوں سے ڈرنے والے شخص نہیں ہو۔ مگر تم نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت کی ہے کہ اس دنیا کے تمام رنگ و بو اور تمام پیشہ تہاارے وجود کے دم سے ہیں اگر تم نہ رہے تو یہ سب بے کار ہو جائے گا۔ تم نے جو جمع کیا ہے اس پر دوسرے پیشہ کر رہے ہوں گے۔“

”تم چاہتے ہو کہ میں اپنی جمع کی ہوئی دولت پر عیش کروں۔“ اس نے طنز کیا۔ ”تم میرے اتنے ہمدرد رہے ہو؟“

”ہاں کیونکہ تم سے میری کوئی براہِ راست دشمنی نہیں ہے۔ نادر نے جو کیا تھا وہ اس کے سامنے آ رہا ہے۔ قدرت نے اسے خود سزا دے دی ہے۔ میرا اس سے مزید الجھنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اس لیے اب معاملہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم میرا چھچھا چھوڑ دو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جلد یا بدیر تمہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ دو طاقتوروں کے درمیان پُر اسن بھائے ہی بہترین پالیسی ہے۔“

”نادر تمہارے پاس ہے؟“

”فرض کرو وہ میرے پاس ہے تب بھی میں نے تمہارا درد سہی کم کیا ہے ورنہ تم اچھی طرح جانتے ہو وہ تمہارے خاندان کے ان لوگوں کی گود میں جانے کے لیے پر توڑ رہا تھا جو اس گدی پر اب تمہارا وجود مزید برداشت کرنے کو تیار نہیں ہیں۔“

مرشد نے میرے الفاظ کو ٹولا اور کہا۔ ”اگر نادر تمہارے پاس ہے تو میں تم سے سودا کرنے کے لیے تیار ہوں تم اسے میرے حوالے کر دو اور میں تم سے دشمنی ختم کر دوں گا۔“

لینے کی ضرورت نہیں ہے۔

”بس آپ دو دن بعد اسے دیکھئے گا آپ بھی عیش کر نہیں گئے۔“

مجھے لگتا تھا کہ اکرم چشتی کی شامت قریب تھی اور اس نے ساری عمر میں جو کیا تھا شاید وہ اسے دو دن میں بھگتنا پڑے لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ میں انسانیت اور کسی بھی اچھی صفت سے عاری اس شخص سے اپنے ساتھیوں کا موازنہ کر رہا ہوں۔ وہ کسی بھی سطح پر چلے جائیں اکرم چشتی کی سطح پر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ تھانوں میں عام پولیس والے سولہ سترہ سال یا اس سے بھی کم عمر کے افراد کے ساتھ جو بہانہ سلوک کرتے ہیں اس کی خبریں آئے دن اخبارات اور ٹی وی پر آتی رہتی ہیں۔ تھانوں میں لوگ تفتیش کے آگے ہار مان کر جان بھی دے دے دیتے کیونکہ ان کے پاس بتانے کے لیے سچ کے سوا کچھ نہیں ہوتا ہے۔ وہ اپنے سچ پر ڈٹے رہتے ہیں جو عقل مند ہوتے ہیں وہ جھوٹا الزام تسلیم کر کے کھال اور جان بچا لیتے ہیں اور اس کے بعد جب معاملہ عدالت میں جاتا ہے تو وہ عام طور سے بری ہو جاتے ہیں۔ دسہم اور اس کے ساتھی اکرم چشتی کے ساتھ وہ سلوک نہیں کر سکتے تھے جو وہ دوسروں کے ساتھ روا رکھتا تھا۔

بہر حال اکرم چشتی کو زندگی میں پہلی بار یہ ضرورت پڑا چل جاتا کہ تشدد کیا چیز ہوتی ہے خاص طور پر جب آپ پر کیا جا رہا ہو۔ دسہم سے بات کر کے مجھے ایمین کا خیال آیا بہت دنوں سے اس سے بھی رابطہ نہیں تھا۔ فتح خان کی پہنائی بارودی جیکٹ سے نجات حاصل کرنے کے بعد وہ واپس انگلینڈ چلی گئی تھی۔ میرے موبائل میں اس کا نمبر محفوظ تھا لیکن میں نے اسے انٹرنیٹ کی مدد سے کال کی۔ اس نے کال ریسیو کی اور بوجھل لہجے میں ہیلو کہا۔

”ایمین کیسی ہو؟“

”شہباز“ وہ چونک کر بولی۔ ”تم کہاں ہو میں تم سے رابطہ کرنا چاہ رہی تھی لیکن تمہارا نمبر بند جا رہا تھا اور میں نے اکیٹل بھی کی ہے۔“

”میں حسب معمول غائب تھا کل واپس آیا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تمہیں کیا ہوا تمہارا لہجہ بدلا ہے۔“

”شہباز میں بہت تکلیف میں ہوں۔“ ایمین کہتے ہوئے رو دی تھی۔ ”میں اس وقت بھی اسپتال میں ہوں اور ڈاکٹر بھی میری تکلیف کم نہیں کر پارہے ہیں۔“

”کیا ہوا ہے..... کوئی حادثہ ہوا ہے؟“

”میری زندگی میں ڈیوڈ شا سے بڑا حادثہ اور کیا ہوگا۔“ اس نے خود کو سنبھال کر تلخ لہجے میں کہا۔ ”وہ کل مجھ سے ملنے آیا تھا۔“

”ایمین کیا اس نے کچھ کہا ہے؟“

”ہاں یہ اسی کا کیا دھرا ہے لیکن شہباز میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے اس نے کیا کیا ہے۔ میرے بانیں بازو میں ایسا درد ہے جیسے کسی نے میرا بازو آگ میں ڈال دیا ہے اور وہ مستقل جل رہا ہے۔ تکلیف کی شدت میں ایک لمحے کو بھی کی نہیں آئی ہے۔“ وہ پھر رونے لگی۔

میں نے جہاں تک ایمین کو دیکھا تھا وہ بہت حوصلے والی لڑکی تھی۔ جب فتح خان نے اسے بارودی جیکٹ

پہنائی تب بھی اس نے بہت حوصلے سے اس صورت حال کا سامنا کیا تھا ورنہ جسم سے لگی موت کا احساس اچھے اچھوں کے حواس اڑا دیتا ہے۔ مگر اس وقت وہ بچوں کی طرح رو رہی تھی میں نے بشکل اسے چپ کرایا اور تسلی دے کر اصل کہانی سنی جو اس نے سسکیوں اور ہچکیوں کے درمیان سنائی تھی۔

گزشتہ روز ایمین شام کے وقت لندن میں واقع اپنے فلیٹ میں پہنچی تو اس نے وہاں غیر متوقع طور پر ڈیوڈ شا کو فلیٹ کی نشست گاہ میں موجود پایا۔ اسے دیکھ کر ایمین مشتعل ہو گئی تھی۔ ”تم اندر کیسے آئے، تم نے ٹریس پاس کیا ہے۔“

”آرام سے لڑکی۔“ ڈیوڈ شانے اسے گھور کر دیکھا۔ ”میں نے کسی چیز کو نہیں چھیڑا ہے اور میں تم سے بات کرنے آیا ہوں۔“

ڈیوڈ شا کے گھورتے ہی ایمین کو لگا جیسے اس کے اندر اچلتے غصے پر کسی نے برف کا ڈھیر الٹ دیا ہو اور وہ لمحوں میں بالکل ششدر پڑ گئی۔ بلکہ اسے ڈیوڈ شا سے خوف بھی محسوس ہونے لگا تھا جو شخص چوروں کی طرح لاک کھول کر اندر آئے اس کے ارادے اچھے نہیں ہو سکتے تھے کیا وہ اسے مارنے آیا تھا؟ یہ سوچ کر اس کا جسم مزید سرد پڑ گیا کیونکہ آس پاس کے فلیٹ خالی تھے اور یہاں زیادہ تر بوڑھے لوگ رہتے تھے جن سے کسی مدد کی توقع محال تھی اگر وہ مدد کے لیے چلاتا تو شاید کوئی سننے والا بھی نہ ہوتا۔ ڈیوڈ شانے اس کی کیفیت بھانپ لی اور اس بار نرمی سے بولا۔ ”ذرا دمت میں تمہیں کوئی نقصان پہنچانے نہیں آیا ہوں اگر تم میری بات مانو گی تو آنے والی مشکل سے بچ جاؤ گی۔“

”کیسی مشکل؟“ ایمین نے ہمت کر کے پوچھا۔ ”کیا تم مجھے دھمکی دے رہے ہو۔“

ڈیوڈ شانے اس کا سوال نظر انداز کر کے کہا۔ ”تم نے میرے خلاف عدالت میں کیس فائل کرنے کی تیاری کر لی ہے میں چاہتا ہوں تم ایسا نہ کرو اس کے بدلے تم مجھ سے جو چاہے مانگ لو۔“

”مجھے اپنے باپ کی جاگیر اور خطاب واپس چاہیے۔“ ایمین نے کہا۔

”وہ تمہیں کسی صورت نہیں مل سکتا چاہے تم اس کے لیے عدالت میں ہی کیوں نہ چلی جاؤ لیکن میں عدالت کے چکر میں میں نہیں پڑنا چاہتا ہوں کیونکہ ان دنوں میں اپنی زندگی کے اہم ترین کام میں مصروف ہوں۔ اس لیے تمہارے پاس آیا ہوں۔ تم چاہو تو مجھ سے نقد رقم یا جاگیر یعنی زمین کہیں بھی لے سکتی ہو۔“

ایمین کا حوصلہ ٹوٹ آیا اس نے انکار کر دیا۔ ”مجھے بھیک نہیں اپنا حق چاہیے۔“

”تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔“ ڈیوڈ شا کا لہجہ دوبارہ سرد ہو گیا۔ ”میں صرف اس خیال سے چلا آیا کہ میرا تم سے ایک رشتہ بھی ہے لیکن تم ایک ہٹ دھرم اور ضدی لڑکی ہو اس لیے اب سزا بھگتو گی۔“ یہ کہہ کر ڈیوڈ شا ایمین کی طرف بڑھا وہ خوف زدہ ہو گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ڈیوڈ شا اس پر حملہ کرنے والا ہے لیکن پاس آ کر ڈیوڈ شانے نرمی سے ایمین کا بایاں بازو پکڑا۔ اس نے بازو ایک لمحے کے لیے پکڑا تھا اور پھر چھوڑ دیا۔ اس وقت ایمین نے محسوس کیا کہ کسی سردی چیز نے اسے لمس دیا ہو۔ ڈیوڈ شا پیچھے ہٹا اور دروازے کے پاس جا کر اس نے اپنا ہیٹ اور کوٹ اٹھا کر پہنے پھر ایمین کی طرف دیکھا۔ ”اگر تمہیں میری پیش کش کا خیال آئے تو میرے گھر کال کر لینا میرا نمبر تمہیں معلوم ہوگا۔“

ایمن نے منہ سے جواب نہیں دیا لیکن دل ہی دل میں اس نے ڈیوڈ شا کی پیش کش پتھو کا تھا۔ اس کے جاتے ہی ایمن نے دروازہ بند کر کے تمام زنجیریں اور حفاظتی لاک بند کر دیئے تھے۔ اس وقت اسے کچھ محسوس نہیں ہوا تھا البتہ رات تک اسے بازو میں جہاں ڈیوڈ شا نے چھوا تھا لمبائی سوزش ہونے لگی۔ یہ سوزش بس ایک دو لمحے کے لیے ہوتی تھی اور پھر وہ نازل ہو جاتی۔ ایمن نے زیادہ توجہ نہیں دی تھی کیونکہ بازو پر بظاہر کوئی نشان بھی نہیں تھا۔ وہ رات سکون سے سو گئی لیکن صبح چار بجے اس کی آنکھ تکلیف سے کھلی اسے لگا جیسے اس کے بازو پر کوئی گرم چیز گر گئی ہو وہ بولکھلا کر اٹھی اور اپنا بازو چیک کیا وہ بالکل نازل تھا۔ مگر تکلیف شدت کی تھی اور ٹھیک اسی جگہ ہو رہی تھی جہاں ڈیوڈ شا نے اس کا بازو پکڑا تھا۔ اسے خیال آیا کہ یہ ڈیوڈ شا کی حرکت تھی وہ اس کے بازو کے ساتھ کچھ کر کے گیا تھا اور تب ہی اس نے جاتے ہوئے معنی خیز انداز میں اسے پیشکش کی تھی۔

تکلیف اتنی شدید تھی کہ ایمن نے امیر جنسی کو کال کر دی اور کچھ دیر میں ایبولینس معہ ڈاکٹر کے وہاں آ چکی تھی۔ ڈاکٹر نے ایمن کے بازو کا معائنہ کیا لیکن اس کی سمجھ میں بھی نہیں آیا کہ یہ کیا چکر ہو سکتا ہے۔ اس نے بہتر سمجھا کہ ایمن کو اسپتال لے جائے جہاں اس کا زیادہ بہتر معائنہ ہو سکتا تھا۔ اسپتال میں چند گھنٹوں کے اندر اس کے بازو کے بے شمار ٹیسٹ ہو گئے تھے۔ اس کا بلڈ اور یورین ٹیسٹ بھی لیا گیا تھا۔ بازو کا ایم آئی آر ہوا مگر نتیجہ صفر نکلا کہیں کوئی خرابی یا ایسی علامت نہیں تھی جو اس تکلیف کی وضاحت کر سکتی۔ مگر ایمن کی حالت دیکھ کر ڈاکٹر اسے غلط بھی نہیں کہہ سکتے تھے اس کا رنگ تکلیف سے پیلا پڑ گیا تھا اور چہرے سے ہی وہ برسوں کی بیمار لگنے لگی تھی۔ جب کسی طرح بھی کچھ سامنے نہیں آیا اور تکلیف میں بھی کمی نہیں ہوئی تو ڈاکٹروں نے اسے مارفین کا انجکشن دے کر سلا دیا۔ مگر تکلیف کی شدت سے وہ کچھ دیر بعد ہی ہوش میں آ گئی تھی۔ دوسرا انجکشن بھی بے اثر رہا تو ڈاکٹروں نے مزید انجکشن لگانے سے گریز کیا۔ تکلیف کے ان لمحوں میں ایمن کو میرا خیال آیا اور اس نے اپنے اسمارٹ فون سے مجھے کال کرنے کی کوشش کے ساتھ ای میل بھی کی۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتی تھی۔

”میری خوش قسمتی کہ تم نے خود رابطہ کر لیا۔“ اس نے اپنی کہانی کے آخر میں کہا۔ ”پلیز شہباز کچھ کر دو میں مر رہی ہوں۔“

”حوصلہ رکھو میرا خیال یہ ہے ڈیوڈ شا کی شرارت ہے اس کا مقصد تمہیں عدالت میں جانے سے باز رکھنا ہے۔ مجھے یقین ہے اس کے پاس اس تکلیف کا توڑ بھی ہوگا۔“

”لیکن میں اس ذلیل شخص سے بھیک نہیں مانگنا چاہتی ہوں۔“

”اسے بھیک مانگنا نہیں حکمت عملی کہتے ہیں۔ میں فکر مت کرو میں اس سے بات کرتا ہوں۔“

”شہباز میں اسے چھوڑ دوں گی نہیں اسے عدالت میں ضرور لے کر جاؤں گی۔“ اس نے ضدی لہجے میں کہا۔

”دیکھو ابھی تم مشکل میں ہو اس لیے ضد سے کام مت لو اور صبر سے اس وقت کا انتظار کرو جب ڈیوڈ شا کمزور ہو جائے اور پھر تم اپنا کام کر سکو میں نے تمہیں پہلے بھی خبردار کیا تھا وہ بہت خطرناک آدمی ہے وہ صرف مادی لحاظ سے خطرناک نہیں ہے بلکہ اس کے پاس کچھ ایسے علوم ہیں جن کی مدد سے وہ کسی کو اس کی مرضی کے خلاف کسی کام کے لیے مجبور کر سکتا ہے۔ کسی کو ضرر پہنچا سکتا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے اس نے میرے خلاف بھی کچھ ایسا ہی کیا ہے؟“

”اس کا امکان ہے ورنہ تم خود سوچو کہ ڈاکٹر تمہیں نازل قرار دے رہے ہیں اور تم کہہ رہی ہو کہ تمہیں شدید تکلیف ہے۔“

”میں بھی اور ڈاکٹر بھی حیران ہیں یہ کیسی تکلیف ہے جس کی کوئی وجہ سامنے نہیں آ رہی ہے۔“

”اسی لیے میں کہہ رہا ہوں کہ مجھے ڈیوڈ شا سے بات کرنے دو۔“

”تم اس سے کیا کہو گے؟“

”دیکھو ابھی کچھ سوچائیں ہے لیکن تمہاری تکلیف ختم کرانا اصل مقصد ہے۔“

”وہ تم سے اپنی شرائط منوائے گا۔“ ایمن نے خدشہ ظاہر کیا۔

”وہ پہلے بھی کئی بار مجھ سے اپنی شرائط منوا چکا ہے۔“ میں نے لاپرواہی سے کہا۔ ”اس لیے تم اس کی فکر مت کرو۔“

”ٹھیک ہے تم اس سے بات کر کے دیکھ لو۔“ ایمن نے بے دلی سے کہا۔ ”مجھے نہیں خیال کہ وہ اتنی آسانی سے مانے گا۔“

”میں بات کرتا ہوں۔“ میں نے ایمن کو تسلی دی اور کال کاٹ کر ڈیوڈ شا کے گھر کا نمبر ملایا۔ کال اس کے بلئر نے ریسیو کی اور مشینی لہجے میں بولا۔

”ہواؤس۔“

”شہباز احمد۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مجھے ڈیوڈ شا سے بات کرنی ہے فوراً۔“

بلئر کو میرا الجھا اچھا نہیں لگا اس لیے اس نے روکھے لہجے میں کہا۔ ”میں سسر شاکو مطلع کرتا ہوں۔“

تقریباً دو منٹ بعد ڈیوڈ شا کی مخصوص سرد آواز ابھری۔ ”شہباز تم اس معاملے سے الگ رہو۔“

”تمہیں کیا پتا کہ میں نے کس معاملے میں کال کی ہے؟“

”مجھے معلوم ہے تم نے ایمن کے سلسلے میں کال کی ہے۔ اس ضدی لڑکی کو اپنی ضد کی سزا بھگتنی ہوگی۔“

”ڈیوڈ شا تم بھول رہے ہو وہ تمہارے خاندان سے ہے اس لیے اس میں ضد تو آئے گی۔ بہر حال تمہارا اندازہ درست ہے میں نے ایمن کے سلسلے میں کال کی ہے۔“

”میں نے کہا تھا میں اس سلسلے میں تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا اس سے کہو اگر وہ اپنی تکلیف ختم کرنا چاہتی ہے تو خود مجھ سے بات کرے۔“

”وہ تمہیں کال نہیں کرے گی چاہے وہ تکلیف سے مرکیوں نہ جائے وہ تو مجھے بھی کال کرنے سے روک رہی تھی۔ حالانکہ وہ بہت تکلیف میں ہے۔ تم نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے؟“

”یہ ایک خاص زہر ہے جو جلد کے نشوز میں سرایت کر کے بارہ سے سولہ گھنٹے بعد شدید سوزش اور جلن کا باعث بنتا ہے۔ اس کا کوئی توڑ نہیں ہے اور اسے جلد میں تلاش بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔“ ڈیوڈ شا نے صاف گوئی سے بتا دیا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ کوئی دوسرا ایمن کی تکلیف دور نہیں کر سکتا تھا چاہے وہ کتنی جدید طبی سائنس سے کام لے۔

”وہ نہیں مانے گی چاہے یہ تکلیف اس کی جان کیوں نہ لے لے اور وہ مرگئی تو ہمارے درمیان ہمیشہ کے لیے ایک دراڑ آجائے گی۔“

”تم اس کی اتنی حمایت کیوں کر رہے ہو۔“ ڈیوڈ شا کے لہجے میں شک آ گیا۔ ”کیا تم اسے پسند کرتے ہو؟“

”ان معنوں میں نہیں جو تمہارے ذہن میں ہے۔ وہ میری بہت اچھی دوست ہے اور ایک بار اس نے میری جان بچائی تھی۔“

”جان تو تم نے بھی اس کی بچائی ہے۔“

”یہ میرا اور اس کا حساب ہے۔ تم اپنی بات کرو۔ ڈیوڈ شا میں جانتا ہوں تم مجھ سے کیا چاہتے ہو اور میں نے بھی تمہیں انکار نہیں کیا ہے لیکن اس کے بدلے تمہیں میرے لیے بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔“

”یعنی اگر میں امین ٹھیک کر دوں تو تم میرے لیے کام کر گے۔“

”نہیں میرے اندر کوئی ناقابل مزاحمت انکار نہیں آئے گا۔ تم جو چاہتے ہو اس کی اتنی معمولی قیمت لگا کر اپنے مقصد کی تو بین مت کرو۔“

ڈیوڈ شا نے چند لمحے سوچا اور پھر گہری سانس لی۔ ”ٹھیک ہے۔ شہباز تم ان چند لوگوں میں سے ہو جو مجھ سے کوئی بات مناسکتے ہیں لیکن یاد رکھنا اس کی ایک حد ہوگی۔“

”تو تم امین کی تکلیف ختم کر دو گے؟“

”ہاں چند گھنٹوں بعد اسپتال والوں کو کوریئر سے ایک انجکشن ملے گا اور وہ اسے امین کے بازو میں لگا دیں چند منٹ کے اندر اس کی تکلیف ختم ہو جائے گی۔“

”اسپتال والے آسانی سے راضی نہیں ہوں گے اور ان کے علم میں آئی تو بات آگے تک جائے گی۔“

”ٹھیک ہے میرا آدمی براہ راست امین کے پاس آئے گا وہ اپنا نام پتیرک بتائے گا اور پھر میرا حوالہ دے گا انجکشن اس کے پاس ہوگا امین لگوائے گی۔“

”دیکھو وہ بھی اتنی آسانی سے نہیں مانے گی اس کے ذہن میں بھی شک ہوگا کہ کہیں اس بہانے اسے زہر نہ دے دیا جائے۔“

”جنہم میں جاؤ تم سب۔“ اس نے چڑ کر کہا۔ ”کیا میں اس وقت اسے زہر نہیں دے سکتا تھا جب اس کے پاس آیا تھا۔“

”ہاں یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ میں نے قائل ہو کر کہا۔ ”ٹھیک ہے تم اپنا آدمی امین کے پاس بھیج دو میں اس سے بات کرتا ہوں۔“

”پولیس کو خبردار کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اگر میرے آدمی نے وہاں نگرانی محسوس کی تو وہ خاموشی سے واپس چلا جائے گا اور امین کو زہر کا اثر ختم ہونے تک یہ تکلیف بھگتنا ہوگی۔ اگر وہ اس وقت تک زندہ رہی یا

اس کا ذہنی توازن درست رہا۔ یہ تکلیف اسے پاگل بھی کر سکتی ہے۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہوگی اور میرے خیال میں تم جیسے آدمی کو پولیس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”زہر..... وہ مر بھی سکتی ہے؟“ میں نے تشویش سے پوچھا۔

”نہیں اس سے کوئی مرنا نہیں ہے۔ یہ زہر اصل میں اعصابی خلیوں کو وہ پیغام دینے پر مجبور کرتا ہے جو وہ تکلیف کی صورت میں دیتے ہیں۔ ہوتا کچھ نہیں ہے مگر دماغ کو ایسا پیغام مل رہا ہوتا ہے کہ جسم کے مذکورہ حصے میں بے پناہ تکلیف ہے۔ اگر وہ تکلیف برداشت کر سکتی ہے تو دس سے بارہ دن میں زہر کا اثر ختم ہو جائے گا۔“

”اس کا کوئی تو زہمی ہوگا۔“ میں نے سوال کیا کیونکہ ڈیوڈ شا خود ہی مجھے زہر کے بارے میں تفصیل سے بتا رہا تھا۔

”توڑ ہے اور اگر امین مجھ سے بات کرے اور کیس کو عدالت میں نہ لے جانے کا وعدہ کرے تو میں توڑتا سکتا ہوں۔“

”اس کی طرف سے یہ وعدہ میں کرتا ہوں وہ کس عدالت میں لے کر نہیں جائے گی۔“ میں نے کہا۔ ”تم جانتے ہو میں وعدہ خلافی کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔“

”میں تمہیں جانتا ہوں لیکن یہ معاملہ میرے اور امین کے درمیان میں ہے اس لیے تم اس میں دخل دینے سے گریز کرو۔“

”ڈیوڈ شا میرے بہت سارے معاملات ایسے تھے جن میں تمہیں دخل نہیں دینا چاہیے تھا لیکن تم نے دخل دیا۔ ابھی بھارتیوں کے ساتھ تمہارا جو معاہدہ ہوا ہے میں اس کے بارے میں بھی جانتا ہوں لیکن میں نے تم سے کوئی شکایت نہیں کی ہے۔ اس لیے اگر تم چاہتے ہو کہ ہمارے درمیان آگے بھی اسی طرح کا تعلق رہے تو تمہیں میری دخل اندازی قبول کرنا ہوگی ورنہ تم آئندہ مجھ سے کچھ منوانے کی پوزیشن میں نہیں رہو گے۔ تم نے مرشد کے بارے میں جو گارنٹی دی تھی وہ اس نے مسترد کر دی اس لیے میں بھی اب تمہارے لیے کچھ کرنے کا پابند نہیں ہوں۔“

”مرشد۔“ ڈیوڈ شا نے غالباً دانت پیسے۔ ”اس نے اچھا نہیں کیا ہے۔“

”وہ پہلے بھی اچھا نہیں کرتا رہا ہے اس لیے آئندہ بھی نہیں کرے گا۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”تمہیں یہ خوش فہمی کیوں ہوگی کہ وہ تمہارے ساتھ اچھا کرے گا؟“

”میں ڈیوڈ شا ہوں۔“

”تم شاید خود کو بہت کچھ سمجھنے لگے ہو لیکن ڈیوڈ شا تم ایک انسان ہو اور موت کے سامنے اتنے ہی کمزور ہو جتنا ایک انسان ہوتا ہے۔“ میں نے اس کی حقیقت بیان کی۔

”تم کیا چاہتے ہو؟“ وہ جھجھکا گیا۔

”امین کا بازو ٹھیک کر دو۔“

”جب تک وہ مجھ سے بات نہیں کرے گی یہ ممکن نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے یہ تم چچا بھائی کا معاملہ ہے اس لیے میں اس میں دخل نہیں دے رہا لیکن ڈیوڈ شا اس بات کو یاد رکھنا کہ میں نے تم سے ایک درخواست کی تھی اور تم نے اسے مسترد کر دیا۔“

”وہ نرم پڑ گیا۔“ میں نے مسترد نہیں کیا ہے۔ میں نے اپنی شرط بتا دی ہے۔“

خیال آیا میں نے وائس چیئر آن کیا ہوا تھا اسے آف کر کے دوبارہ کہا۔

”ابے میں ہوں تیرا مجازی باپ۔ اتنی جلدی تو لوگ باپ کو نہیں بھولتے ہیں۔“

وہ ہنسا۔ ”اب بولا نا تو اپنی اصل خیر جیسی آواز میں، پہلے تو زکام زدہ گدھے جیسی آواز آرہی تھی۔“

”کچھ اس بندہ کی، یہ بتا کہ یہ نمبر محفوظ ہے۔“

”ہاں بہت سارے موبائلوں میں محفوظ ہے۔“

”ندیم سنجیدہ ہو جا۔“ میں نے جھنجھلا کر کہا۔ ”آج تجھے کامیڈی سوچ رہی ہے۔“

”ہاں یا محفوظ ہے میں نے کر دیا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ٹوکھل کربات کر سکتا ہے۔“

میں نے اسے اپنے اور مرشد کے درمیان ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا اور پھر اس کی رائے پوچھی۔ ”ٹو نے ٹھیک بات کی ہے، اگر مرشد چاہے اور پولیس پر ٹھیک طریقے سے دباؤ ڈالے تو معاملہ ختم ہو سکتا ہے ایک مہینہ تو نہیں لیکن دو سے تین مہینے میں تیرے سارے کیس غیر موثر ہونے اور نئے شواہد کی روشنی میں عدالت سے خارج ہو سکتے ہیں۔“

”اس کے لیے میرا عدالت میں حاضر ہونا ضروری تو نہیں ہوگا؟“

”نہیں وہ تو اگر میں تیری بریت کی درخواست کروں تب ایسا ہونا ضروری ہوگا لیکن یہ مرشد بڑی حرامی چیز ہے تجھے یقین ہے وہ واقعی کیمرہ ختم کرانے میں سنجیدہ ہے؟“

”یہ کہنا تو اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہنے کی ذم کے بارے میں یقین سے کہنا کہ وہ سیدھی ہو سکتی ہے۔ بہر حال اس کی گوٹ پھنسی ہے اور ممکن ہے وہ جج مان جائے اس کا وکیل کل کسی وقت تجھ سے رابطہ کرے گا۔ اس سے پتا چلے گا کہ اس کی اصل نیت کیا ہے۔“

”اگر اس کے وکیل نے رابطہ کر لیا تو اس کا مطلب ہوگا کہ مرشد واقعی سنجیدہ ہے۔“ ندیم نے کہا۔ ”فقیر والا کیس تو ختم ہو گیا ہے۔ اب تجھ پر اصل کیس نادر علی پر حملے کا ہے۔ دوسرا کیس مرشد کی کونجی کی تباہی کا تھا جس میں سات ملازمین سمیت چار پولیس اہلکار بھی اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ مگر اس کیس میں جان نہیں ہے مسئلہ وہی ہے۔ اسے دہشت گردی ایکٹ کے تحت درج کیا ہے اور پولیس اوپر سے دباؤ کی وجہ سے سرگرم ہے کہ ایک بارٹو اس کے شکبے میں آجائے۔ عدالت میں اصل کیس نادر والا ہی ہے۔“

”ایف آئی آر مرشد نے خود درج کرائی ہے؟“

”نہیں اس کے ایک ملازم نے جو بدقول اس کے اس وقت کونجی کے پاس موجود تھا اور اس نے تجھے اور تیرے ساتھیوں کو کونجی پر حملہ کرتے اور اسے آگ لگاتے دیکھا تھا۔ وہ چشم دید گواہ بھی ہے۔“

”وہ جھوٹا ہے وہاں موجود ہر فرد مارا گیا تھا۔“

”مجھے معلوم ہے لیکن بھائی یہاں تو جھوٹ بچ ہوتا اور جو بچ ہوتا ہے اسے جھوٹ قرار دیا جاتا ہے۔“ ندیم نے کہا۔ ”بہر حال ٹو فکر نہ کر میں یہ معاملہ دیکھ لوں گا۔“

کافی لمبی کر مجھے بھوک لگنے لگی تھی میں نیچے آیا اور باورچی کو کھانا لگانے کو کہا۔ عبد اللہ حسب معمول غائب تھا میں نے اکیلے کھانا کھایا اور پھر اوپر آ گیا۔ اب مجھے ایمن کی کال کا انتظار تھا۔ اسی انتظار میں بیڈ پر لیٹے لیٹے

”یہ پاکستان نہیں برطانیہ ہے۔“ اس نے خشک لہجے میں کہا اور فون رکھ دیا۔ میں شرمندہ ہو گیا وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ اپنی حکومت کا کتنا ہی اہم آدمی سمجھ لیکن وہ کوئی قانون شکنی کرتے ہوئے پکڑا جاتا تو اسے عدالت کا سامنا کرنا پڑتا لیکن یہ میری غلط فہمی بھی ہو سکتی تھی۔ ساری دنیا میں غلط کاریوں اور قانون شکنی کی جو روایات انگریز چھوڑ کر آئے تھے وہ بالآخر انگلینڈ تک بھی پہنچ گئی ہیں۔ انہوں نے جو کائنات دنیا میں بوئے تھے اس کی فصل خود ان کے ہاں بھی اگ آئی ہے۔ میں خیالوں سے چونکا مجھے ایمن کو بھی بتانا تھا میں نے اسے کال ملائی تو اس کا نمبر انگریج جا رہا تھا۔ وقفہ غنیمت جان کر میں نیچے آیا اور صوفی سے کافی کا کہا۔

”صاحب اب تو بچ کا وقت ہو رہا ہے۔“

”ابھی بھوک نہیں ہے تم کافی اوپر بھجوادو۔ نو شوگر نو کریم۔“

میں اوپر آیا اور ایمن کا نمبر دوبارہ ملا یا۔ اس بار تیل جا رہی تھی اس نے کال ریسیو کی۔ ”میری ایک فرینڈ کا فون آیا تھا۔“ اس نے میری آواز سن کر کہا۔ ”اس لیے تمہیں انگریج ملا ہوگا بہت باتونی ہے بڑی مشکل سے جان چھڑائی ہے میں نے۔“

”میری ڈیوڈ شا سے بات ہو گئی ہے۔ اس کا ایک آدمی اسپتال آئے گا اور تمہیں ایک انجکشن لگائے گا بازو میں۔“

”میں کوئی انجکشن نہیں لگواؤں گی۔“ حسب توقع اس نے صاف انکار کر دیا۔ ”مجھے اس شخص پر ایک فیصد اعتبار بھی نہیں ہے۔ وہ مجھے مار دینا چاہتا ہے۔“

”اگر وہ تمہیں زہر دینا چاہتا تو تمہارے گھر میں دے سکتا تھا کسی کو پتا بھی نہیں چلتا اور تم دنیا سے گزر جاتیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ اس زہر کا توڑ ہوگا جو اس نے تمہارے ہاتھ پر لگایا ہے۔ انجکشن کے بغیر اثر ختم ہونے میں دس بارہ دن لگ سکتے ہیں کیا تم اتنے دن یہ تکلیف برداشت کر سکتی ہو؟“

”نہیں۔“ اس کی آواز لرز گئی۔ ”میں تو ابھی سے مر رہی ہوں۔“

”تو بس ہمت کرو اور انجکشن لگو الودہ آدمی خاموشی سے آئے گا اپنا نام پینک بتائے گا اور ڈیوڈ شا کا حوالہ دے گا۔ اس انجکشن سے چند منٹ کے اندر تمہاری تکلیف ختم ہو جائے گی۔“

بڑی مشکل سے ایمن اس کے لیے راضی ہوئی تھی لیکن اس نے شرط رکھی کہ جب وہ آدمی آئے گا تو وہ مجھے کال کرے گی اور میری کال کے دوران ہی انجکشن لگوائے گی۔ میں نے اسے اپنا موبائل نمبر دے دیا۔ صوفی خود کافی لے آیا تھا۔ لیپ ٹاپ بند کر کے میں نے کافی لی۔ حالات بڑی تیزی سے بدل رہے تھے مجھے کسی ایسا لگتا کہ معاملات سمٹ رہے تھے اور کبھی ایسا ہوتا کہ جیسے مزید پھیلنے جا رہے تھے۔ اصل مسئلہ میرے کیمرہ کا تھا وہ حل ہو جاتا تو پھر میں اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکتا تھا۔ کیمرہ سے مجھے ندیم کا خیال آیا اور میں نے انٹر نیٹ سے اس کا نمبر ملا یا۔ براہ راست ملانے میں خطرہ تھا۔ ہے اس کا نمبر انڈر آبزرویشن ہو اب تو پولیس بھی سرگرمی سے مجھے تلاش کر رہی تھی۔ ندیم نے کال ریسیو کی۔ ”ہیلو کون؟“

”ندیم میں بات کر رہا ہوں۔“ میں نے نام لیے بغیر کہا۔

”میں کون؟ اس طرح تو نیک پیپیاں اپنے شوہر کے لیے بولتی ہیں نام لیے بغیر۔“ ندیم نے کہا تو مجھے

کسی وقت آنکھ لگ گئی۔ پھر موبائل کی بیل سے آنکھ کھلی تو شام ہو چکی تھی۔ نمبر ایمن کا تھا میں نے جلدی سے کال ریسیڈی۔ میری آواز سنتے ہی وہ مرتش لہجے میں بولی۔ ”شہباز وہ آگیا ہے۔“

”اپنا نام کیا بتایا ہے؟“

”پیٹرک اور ڈیوڈ شا کا حوالہ بھی دیا ہے۔“ ایمن بولی۔

”اس سے میری بات کراؤ۔“

”کچھ دیر بعد فون پر ایک اکھڑ آواز آئی۔“ کیا بات ہے؟“

”تمہیں ڈیوڈ شا نے بھیجا ہے۔“

”ہاں مجھے اس عورت کو ایک انجکشن دینا ہے۔“

”میری بات غور سے سنو اگر اس انجکشن میں کوئی گڑبڑ ہو تو یقین رکھو تم اس اسپتال سے زندہ باہر نہیں جا سکو گے۔“

”کیا بکواس ہے۔“ اس نے بگڑ کر کہا۔

”اسپتال سے باہر ایک اسٹریٹ موجود ہے اور اگر تم نے میری اجازت کے بغیر یہاں سے جانے کی کوشش کی تو باہر نکلتے ہی وہ تمہاری کھوپڑی اڑا دے گا۔“ میں نے اس کی بات نظر انداز کر کے غلط بیانی کی۔

”اچھا اسے کیسے پتا چلے گا کہ میں ہی وہ شخص ہوں۔“

”کیونکہ وہ یہاں چھپے ایک کیمرے کی ویڈیو دیکھ رہا ہے اور اس نے تمہیں اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔“ میں نے غلط بیانی کا سلسلہ جاری رکھا۔ ”اس لیے جو کرنا ہے سوچ سمجھ کر نا اور تم اسی وقت یہاں سے واپس جا سکو گے جب ایمن کے ہاتھ کا در دھیک ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ کچھ ہوا تو میں تمہیں نتائج سے آگاہ کر چکا ہوں۔“

”مجھے دھمکیاں مت دو۔“ اس نے بد مزگی سے کہا۔ ”یہ زہر کا توڑ ہے۔“

”ٹھیک ہے سیل فون ایمن کو دو۔“ میں نے کہا تو اس نے موبائل ایمن کو واپس کر دیا۔ ”ایمن تم انجکشن

لگوا لو۔“

”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”کچھ نہیں ہوگا اس لیے ڈرو مت۔“

ایمن نے اسے انجکشن لگانے کی اجازت دے دی اور چند لمبے بعد اس کی سسکی سنائی دی۔ ”اس نے

انجکشن لگا دیا ہے۔“

”کیسا محسوس ہو رہا ہے؟“

”پتا نہیں لیکن تکلیف کم ہو رہی ہے۔“

پیٹرک کی ہلکی سی آواز آئی۔ ”فکرمات کرو صرف تین منٹ میں تمہاری تکلیف بیکل طور پر ختم ہو جائے

گی۔“

واقعی ایسا ہی ہوا تھا تین منٹ بعد ایمن نے کہا۔ ”شہباز میری تکلیف بالکل ختم ہو گئی ہے یقین ہی نہیں آ

رہا ہے کہ چند منٹ پہلے میں مر رہی تھی۔“

”ڈیوڈ شانے بھی یہی کہا تھا۔“

پیٹرک کی آواز آئی۔ ”تمہارا کام ہو گیا ہے کیا اب مجھے جانے کی اجازت ہے۔“

”یہ جانے کو کہہ رہا ہے۔“ ایمن بولی۔

”نہیں اس سے کہو ابھی پندرہ منٹ اور رکے، میں انجکشن کے بارے میں مکمل اطمینان چاہتا ہوں۔“

ایمن نے اسے پندرہ منٹ رکنے کے لیے کہا تو وہ بگڑ گیا۔ ”میں خطرہ مول لے کر اندر آیا ہوں سب سے

چھپ کر اور کوئی ڈاکٹر یا اسپتال کا کوئی آدمی آگیا تو میں مشکل میں پڑ جاؤں گا۔“

”تم فکرمات کرو میں تمہیں اپنا ملاقاتی قرار دوں گی۔“ ایمن نے ہوشیاری سے اس کا اعتراض مسترد کر

دیا۔ ”صرف پندرہ منٹ کی تو بات ہے۔“

”ٹھیک ہے لیکن اس کے بعد میں یہاں نہیں رکوں گا۔“ اس نے غرا کر کہا۔ ایمن اٹھ بیٹھی تھی اس نے مجھ

سے کہا۔

”شہباز ڈیوڈ شانے زہر کیسے میرے بازو میں داخل کیا ہوگا؟“

”میں بتاتا ہوں۔“ پیٹرک بولا۔ ”یہ چھوٹے سے بھی جلد میں سرایت کر جاتا ہے اسے کوئی بھی ہاتھ میں

لے کر لگا سکتا ہے۔“

”لیکن پھر اسے بھی اس کی تکلیف کا سامنا کرنا پڑے گا۔“ ایمن نے کہا تو پیٹرک نے جواب دیا۔

”جس کے پاس یہ انجکشن ہے اسے کسی تکلیف کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔“

میں نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے ڈیوڈ شانے زہر اپنے ہاتھ پر لگا رکھا تھا جب اس نے تمہارا بازو پکڑا تو

زہر تمہاری جلد میں سرایت کر گیا اور بارہ گھنٹے بعد اس نے اثر کیا۔“

پندرہ منٹ پورے ہوتے ہی پیٹرک اکھڑا ہو گیا۔ ”اب میں جا رہا ہوں۔“

اس کے جانے کے بعد ایمن نے کہا۔ ”شہباز اب میں بالکل ٹھیک ہوں حیرت کی بات ہے کہ انجکشن کا

نشان بھی نہیں آیا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے تمہاری کھال موٹی ہے ورنہ مرمریں جلد پر تو چھوٹنے سے بھی نشان آ جاتا ہے۔“

”جی نہیں ایسی نہیں ہے میری جلد۔“ اس نے حقگی سے کہا۔ ”کیا تم نے مجھے دیکھا اور چھوا نہیں ہے۔“

”ہاں خوش قسمتی سے یہ دونوں کام کیسے ہیں۔“

”تب ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟“

”مذاق کر رہا تھا مجھے خوشی ہے تمہاری تکلیف ختم ہو گئی۔“

”شہباز یہ تمہارا مجھ پر ایک اور احسان ہے۔“ اس نے جذباتی لہجے میں کہا اور کیونکہ میں اس سے کوئی چار

پانچ ہزار میل کے فاصلے پر تھا اس لیے اس نے فون کے ساتھ ایک پُر شور حرکت کی۔ میں نے بوکھلا کر کہا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے تم میری دوست ہو اور دوستی میں احسان نہیں ہوتا ہے۔“

”پھر بھی میں اسے احسان ہی کہوں گی کاش کہ تم میرے سامنے ہوتے۔“ اس نے مزید جذباتی ہو کر کہا

اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں اس کے سامنے نہیں تھا ورنہ وہ نہ جانے کیا کر گزرتی۔ وہ ایک کھلی ہوئی اور

بے باک تہذیب کی پروردہ تھی۔ مجھے یاد ہے پہلی بار جب میں نے فتح خان کی خوشخوار محبوبہ شینا سے اسے بچا تھا تو اس نے میرا منہ چوم لیا تھا حالانکہ وہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ یہ کام اس نے بنا کسی جھجک یا شرم کے کیا تھا کیونکہ اس کی تہذیب میں یہ شکر ہے کہ ایک انداز تھا۔ اس کے پیچھے جنس کا کوئی جذبہ کارفرما نہیں تھا۔ مگر اس وقت اس کا انداز بڑا خطرناک تھا۔ اس لیے میں نے موضوع بدل دیا۔

”ایمن اب تمہیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے پہلی بات تو یہ کہ میں نے ڈیوڈ شا سے وعدہ کیا ہے کہ تم اس کے خلاف عدالت میں نہیں جاؤ گی۔“

”صرف تمہاری خاطر میں یہ بات مان لیتی ہوں۔“ اس نے سرد آہ بھر کر کہا۔

”دوسرے یہ کہ تم ڈیوڈ شا سے دور رہو گی۔ اپنے فلیٹ کے لاک چینیج کراؤ اور وہاں کوئی الارم یا خفیہ کمرہ

لگاؤ جو آنے جانے والوں کو ریکارڈ کر سکے۔“

”یہ اچھا مشورہ ہے میں ایسا ہی کروں گی۔“

”اور ہو سکتے تو کچھ دن کے لیے ملک سے باہر چلی جاؤ۔“

وہ ہنسی۔ ”یہ بھی ہو جائے گا کیونکہ سائبریا میں ایک ڈاکومنٹری بنانی ہے ہم پندرہ اپریل کو روانہ ہو رہے

ہیں اور تقریباً ایک مہینے بعد واپس ہوگی۔“

”یہ تمہاری ڈاکومنٹری ہے؟“

”نہیں یہ ایک ساتھی کی ہے میں کوپروڈیوسر اور میزبان ہوں۔“

”ٹھیک ہے اس بہانے تم یہاں سے چلی جاؤ۔“

”کیا تم میرے لیے خطرہ محسوس کر رہے ہو؟“

”ہاں مجھے محسوس ہوا کہ ڈیوڈ شا بلاوجہ حرکت میں نہیں آیا ہے۔ بد ظاہر اس نے تمہیں شکار کیا ہے لیکن

درحقیقت اس نے مجھ سے رابطہ کیا ہے۔ ورنہ وہ اتنی آسانی سے تمہاری تکلیف ختم کرنے پر آمادہ نہ ہوتا۔“

”کیا اسے معلوم تھا کہ تم اس سے رابطہ کرو گے؟“

”ہاں اسے معلوم ہے کہ تکلیف کا شکار ہونے کے بعد تم مجھ سے رابطہ کرو گی اور میں اس سے بات کروں

گا۔“

”یعنی اس نے مجھے چارے کی جگہ استعمال کیا ہے۔“ وہ خفا ہو گئی۔

”اسے شکار کی زبان میں گارابی کہتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”شیر کو شکار کرنے کے لیے کوئی بکری یا دوسرا

جانور کہیں باندھ دیا جاتا ہے جب شیر اسے مار کر کھانے آتا ہے تو چان پر بیٹھا شکاری اسے شکار کر لیتا ہے۔“

”یعنی میں بکری ہوں تم شیر ہو اور ڈیوڈ شا شکاری ہے۔“

”تقریباً ایسا ہی سمجھو بس ذرا سافرق ہے کہ میں تمہارا شکار کرنے نہیں آیا بلکہ ہمدردی میں آیا اور ڈیوڈ شا

کا مقصد پورا ہو گیا۔“

”وہ آخر تم سے چاہتا کیا ہے؟“

”اس کے دماغ میں وہی سودا سلیا ہوا ہے جو تمہارے دادا کے دماغ میں سلیا تھا یعنی وادی تک جانے کا

اور وہاں کے عجائبات حاصل کرنے کا نیز وادی کی دریافت کا سہرا اپنے سر باندھنے کا۔ اس کے علاوہ بھی ڈیوڈ شا کے کچھ مقاصد ہوں تو مجھے ان کا علم نہیں ہے۔“

”تم نے سب تو بتا دیا۔“

”ڈیوڈ شا ولیم شا کے مقابلے میں مختلف سوچ کا مالک ہے۔ ولیم شا کی سوچ نوآبادیاتی تھی لیکن ڈیوڈ شا کی سوچ سازشی ہے۔ ولیم شا سپاہی تھا اور ڈیوڈ شا ایک ایجنٹ ہے جو ملکوں میں انتشار برپا کرتا ہے اور قوموں کے خلاف سازشیں کرتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ ابھی تم جھگڑ چکی ہو۔“

”تم کہہ رہے تھے کہ وہ جادو بھی جانتا ہے۔“

”ہاں وہ اس معاملے میں بھی دخل رکھتا ہے لیکن تم پر اس نے زہر آزمایا تھا۔“

”وہ تمہیں اس وادی تک لے جانا چاہتا ہے؟“

”ہاں کیونکہ بد قول اس کے اور راجا عمر دراز کے، وادی میں داخلے کی کنجی میں ہوں جو مجھے وہاں لے

جائے گا اسے وادی میں داخل ہونے کا راستہ مل جائے گا اور اگر مجھے نہ لے جایا گیا تو وہ ناکام ہو جائیں گے۔“

”شہباز یہ تو میرے لیے بھی ایک اچھا ٹاپک ہے اگر میں اس وادی کو دنیا کے سامنے لے آؤں تو میں

ایک دن میں ساری دنیا میں مشہور ہو جاؤں گی۔“

”یہ اتنا آسان نہیں ہے۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا میں اسے مخالفت یا موافقت کا کوئی تاثر دینا نہیں

چاہتا تھا۔ ”تم نے سوچا نہیں یہ اتنا ہی آسان ہوتا تو ڈیوڈ شا جیسا بے انداز وسائل رکھنے والا شخص اب تک وادی

اور اس کے عجائبات کو دنیا کے سامنے نہ لا چکا ہوتا۔“

”ممکن ہے اس کی کچھ مجبوریوں ہوں۔“

”ہو سکتا ہے لیکن ایمن اس وادی کی طرف جانا موت کے منہ میں جانے کے مترادف ہے۔ راستہ نہایت

دشوار گزار ہے۔ وادی تک نفاذ سے رسائی بھی ممکن نہیں ہے کیونکہ وہاں کا موسم ناقابل اعتبار ہے۔ پہلی کا پڑا تھی

بلندی پر نہیں جاسکتا ہے اور طیارے کے وہاں اترنے کی گنجائش نہیں ہے۔“

”یعنی صرف زمینی راستے سے وہاں جایا جاسکتا ہے؟“

”بالکل اور اسے تم کے نو یا ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کے برابر دشوار سمجھو بلکہ ناگاہ پر بت جتنی دشوار سمجھو۔“

”تم مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہے ہو؟“ اس کے لہجے میں شک تھا۔

”نہیں حقیقت بیان کر رہا ہوں راجا عمر دراز دو بار اس وادی کی طرف چا چکا ہے اور میں نے اس کی زبانی

وادی کی کہانی سنی ہے۔“

”وہ بھی تو وہاں جانا چاہتا ہے۔“

”ہاں لیکن اس کی عمر بہت ہو گئی ہے اور وہ بیمار بھی ہے۔“ میں نے جواب دیا میں نے مناسب نہیں سمجھا

کہ ایمن کو راجا کی اصل بیماری کے بارے میں بتاؤں۔ ”اس کی طرف سے اب کسی کوشش کا کوئی امکان نہیں

ہے۔“

”مجھے شک ہے۔“ ایمن نے صاف گوئی سے کہا۔ ”میں نے راجا عمر دراز کو دیکھا ہے اور وہ انتہائی

مستقل مزاج اور اپنی ضد پر اڑا رہے والا شخص ہے اگر اسے معلوم ہو کہ اس کی زندگی بس چند گھنٹوں کی رہ گئی ہے تب بھی وہ اپنی وادی کی طرف جانے کی خواہش سے باز نہیں آئے گا۔

میں نے دل میں تسلیم کیا کہ وہ درست کہہ رہی تھی۔ کینسر کے موذی مرض میں مبتلا راجا عمر دراز ابھی بھی وہی فکر میں تھا کہ کسی طرح میں مان جاؤں اور وہ مجھے لے کر وادی کی طرف روانہ ہو جائے۔ اس کے لیے وہ میری ہر طرح کی مدد کے ساتھ نہایت صبر و سکون سے اس وقت کا انتظار کر رہا تھا جب میں اپنے مسائل پر قابو پا لوں۔ اس نے ایک بار بھی مجھ پر اپنے احسان جتانے یا ان کا صلہ چاہنے کی کوشش نہیں کی تھی اس کے برعکس اس کے انداز میں مجھے اپنے لیے غرض کے بجائے خلوص نظر آتا تھا۔ میں نے ایمن سے بحث کرنے سے گریز کیا۔

”یہ تیار پاکستان آنے کا ارادہ ہے؟“

”نہیں آج کل وہاں حالات غیر ملکیوں خاص طور سے سفید فاموں کے لیے اچھے نہیں ہیں۔ کچھ ڈاکو مسٹر یز کا پروگرام تھا لیکن وہ بھی ملتوی کر دیا گیا ہے۔“

”حالات واقعی اچھے نہیں ہیں۔ مگر یہ تم لوگوں کی ہی مہربانی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ چمک کر بولی۔

”مطلب یہ کہ پہلے اگر یہاں مسائل چھوڑ گئے اور اس کے بعد رہی سہی کسر امریکہ اور روس کی آپس کی جھگ سے پوری کر دی۔ اب امریکہ خود براہ راست یہاں موجود ہے لیکن حالات سدھرنے کے بجائے مزید خراب ہوتے جا رہے ہیں۔“

”یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن تم لوگوں کو خود بھی اپنی بہتری کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔“

”کاش کہ جو اخلاقیات تمہارے معاشرے میں نظر آتی ہے جہاں کوئی اخبار فٹ پاتھ سے رقم رکھے بغیر نمیس اٹھاتا ہے اور آدھی رات کو اکیلا ڈرائیور بھی سگنل پر رک جاتا ہے۔ یہی اخلاقیات تم لوگوں کی بین الاقوامی سیاست میں نظر آتی تو آج دنیا جنت ہوتی۔“

ایمن نے براہمان کر کہا۔ ”تم لوگ سارا الزام مغرب ہی کو کیوں دیتے ہو۔“

”کیونکہ طاقتور مغرب ہے اور یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ کمزور ممالک کو ترقی میں مدد دے نہ کہ ان کے خلاف سازشیں کرے اور پولیس افسر کے بجائے ڈاکو کا کردار ادا کرے۔ ہم کمزور ہیں اپنا دفاع نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ایسا کریں تو اسے دہشت گردی کا نام دیا جاتا ہے۔ اپنے ملک میں ایک کرپٹ وزیر برداشت نہ کرنے والے مسائل ہمارے ہاں کرپٹ ترین حکومتوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ ان کو آشیر باد دیتے ہیں اور جب وہ اقتدار سے اتر کر چوروں کی طرف ملک سے رخصت ہوتے ہیں تو انہیں اپنے ہاں پناہ دیتے ہیں۔ تیسری دنیا کے کرپشن سے لوٹے گئے کھربوں ڈالر زکاتیں محفوظ ہیں؟ ہر بادشاہ، ہر امرا اور ہر نام نہاد جمہوریت پسند اپنے ملک سے بھاگ کر کہاں پناہ حاصل کرتا ہے۔“

”اوکے..... اوکے۔“ اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ ”یہ بین الاقوامی سیاست ہے جس سے میرا یا تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”مس ایمن شاہ، تعلق تو عراق کی عوام کا صدام کے جرائم سے بھی نہیں تھا انہوں نے اسے منتخب نہیں کیا تھا

اس کے باوجود انہیں گزشتہ دس سال سے اس بات کی سزا بھگتنا پڑ رہی ہے۔ اس کے برعکس مغرب کے تم جیسے لوگ جو اپنے سیاست دانوں کو اس طرح منتخب کرتے ہو جیسے ہم جوتے یا کپڑے منتخب کرتے ہیں تو تم لوگ ان کے کیسے سے کیسے بری الذمہ ہو سکتے ہو؟“

وہ زبردستی ہنسی۔ ”کیا ہو گیا ہے تمہیں..... آج تم مختلف لگ رہے ہو۔“

میں نے گہری سانس لے کر اپنے اعصاب کا بوجھ کم کیا۔ ”سوری..... میرے مسائل اور میرے ملک کے مسائل بڑھ رہے ہیں اور بہ ظاہر دونوں کا کوئی حل نظر نہیں آ رہا ہے۔ شاید اسی لیے میں فرسٹریٹ ہو رہا ہوں۔ ایمن ایک بات میں پوری سنجیدگی اور خلوص سے کہہ رہا ہوں اگر مغرب میں افراد نے اسی طرح اپنی حکومتوں کو بین الاقوامی معاملات میں کھلی جھوٹ دے کر کبھی تو وہ دن دور نہیں ہے جب ان کی دنیا میں لگائی آگ خود ان کے گھر کا رخ کرے گی اور اس وقت تم لوگ کسی کو الزام نہیں دے سکو گے۔“

”جی بات ہے میں اور دوسرے بہت سارے لوگ اس بات کو محسوس کرتے ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے ہم بعض معاملات میں تم لوگوں سے بھی زیادہ بے بس ہیں۔ تمہارے پاس عمل کرنے کی دوسری راہیں ہوتی ہیں لیکن ہمارے پاس اس کے سوا کوئی راہ نہیں ہے جو پہلے سے طے کر دی گئی ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہو ہم وہ خوش قسمت ملت ہیں جس میں کوئی کام غلط ہو رہا ہو تو کچھ نہ کچھ لوگ اٹھ کر اسے غلط ضرور کہتے ہیں اور اسے روکنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔“

”شکر ہے تم سمجھ گئے۔ ہم اس چیز سے محروم ہیں۔ ہم جانتے ہوئے بھی غلط کو غلط نہیں کہہ سکتے اور اپنے دائرے سے ہٹ کر اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔“ ایمن نے کہا۔ ”اب میں ڈاکٹر سے بات کرنے جا رہی ہوں کہ میں ٹھیک ہوں اور وہ مجھے ڈسچارج کر دیں۔“

”میرا خیال ہے ٹھیک ہونے پر بھی تمہارے ٹیسٹ لیے جائیں گے کہ تم بیٹھے بیٹھے ٹھیک کیسے ہو گئیں۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے اپنا خیال رکھنا بائے۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں نے ذرا سخت لہجے میں بات کی تھی۔ بہر حال اب تو کر دی تھی۔ میں نے لیپ ٹاپ آن کر کے ڈیوڈ شا کو کال کی۔ کال منظر نے ریسیو کی اور مجھے رکھائی سے اطلاع دی کہ مسٹر ڈیوڈ شا گھر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے میں پوچھتا کہ وہ کب تشریف لائیں گے اس بدتیز فون رکھ دیا۔ میں نے دل ہی دل میں اسے سنائیں کہ تم اور تمہارا آقا دونوں جہنم میں جائیں تو اس کا شکر یہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ اگرچہ وہ اس کا مستحق نہیں تھا۔ شام ہو چکی تھی کچھ دیر بعد عبداللہ نے دستک دی اور اندر آیا۔ وہ چائے لے آیا تھا۔

”تم نے کیوں زحمت کی ملازم سے بھجوا دیتے۔“

”زحمت کیسی جناب، آپ کی خدمت کر کے خوش ملتی ہے۔“ اس نے ٹرے میرے سامنے رکھی جس میں

تازہ سمو سے بھی تھے۔ ”دل پسند کے ہیں جناب ایسے سمو سے پورے ملک میں کہیں نہیں ملتے ہیں۔“

”یہ تو ہے۔“ میں نے کہا اور سموں سے انصاف کرنے لگا۔ ”تم کیا سمو سے لینے گئے تھے؟“

”نہیں جناب، کام سے نکلتا ہوا راستے میں یہ بھی آگئے تو لینا آیا۔“

تو سمجھ لیں آپ آدمی بازی جیت لیں گے۔“

”یہ سوچ کر میں نے نادر کی تحویل کا اقرار کر لیا ہے اب میں نادر سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں بھی چل سکتا ہوں؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں کیوں نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ہم صبح سویرے نکلیں گے جب لوگ دفنوں اور کام پر جانے کے لیے

نکلے ہیں۔“

”اس وقت ریش زیادہ ہوتا ہے۔“ عبداللہ مسکرایا۔ ”کسی ایک آدمی یا گاڑی پر توجہ دینا مشکل ہوتا ہے۔“

”ہاں اس وقت پولیس یا ٹریفک والے بھی گاڑیاں کم روکتے ہیں کیونکہ ہر شخص کو جانے کی جلدی ہوتی

ہے۔“

”یہی تاہم ہے ہمارے شہر سے نکلنے کا درنہ مجھے یقین ہے پولیس اب بھی مستعد ہوگی۔ کل کچھ دہشت

گردوں کی شہر میں موجودگی کی اطلاع ملی تھی اس وجہ سے پولیس کل اور آج چوکس تھی۔“



میں دو پہر میں سولیا تھا اس لیے رات کے کھانے کے بعد میرس میں چہل قدمی کرتا رہا۔ بارش کی ہلکی سی

پھواروں کے ساتھ خنوج کے جھونکے بھی آرہے تھے لیکن اس وقت برے نہیں لگ رہے تھے۔ کیونکہ میں نے

شال لے لی تھی۔ اگر عام لباس کے ساتھ باہر آتا تو ہوا کے جھونکے اتنے اچھے نہیں لگتے۔ جب نیند کا خیال آیا تو

اندر آیا۔ گرم پانی سے نہانے کے بعد سونے کے لیے لیٹ گیا۔ گزشتہ دنوں جو ذہنی و جسمانی سختیاں برداشت کی

تھیں اب ان کے اثرات تقریباً ختم ہو چکے تھے۔ مسلسل آرام اور بہترین خوراک نے میری ذہنی و جسمانی

توانائیاں بحال کر دی تھیں۔ اب میں کسی بھی مہم جوئی کے لیے بالکل تیار تھا۔ صبح میری آنکھ خود بہ خود سورج نکلنے

سے پہلے کھل گئی اور میں نے مناسب سمجھا کہ ناشتے سے پہلے کچھ ایکسرسائز کر لوں۔ لان میں زیادہ سے زیادہ

چہل قدمی کی جاسکتی تھی اس لیے میں نے کمرے میں ہی کچھ ورزشیں کیں اور پھر دواش روم سے فارغ ہو کر نیچے

آیا تو عبداللہ بھی تیار موجود تھا۔ میں نے اکثر اسے جاگتے ہوئے اور چاک و چوبندی دیکھا تھا آرام کرتے کم پایا

تھا اور وہ بھی مختصر وقت کے لیے۔ وہ عام طور سے رات دیر تک جاگتا تھا اور صبح جلدی اٹھ جاتا تھا۔ عبداللہ نے

پوچھا۔ ”آپ تیار ہیں؟“

”بالکل..... ناشتہ کرتے ہی نکلے ہیں۔“

لیکن ناشتے کے دوران ہی عبداللہ کو اسٹیٹ ایجنٹ کی کال آگئی۔ ”ہیلو..... موجود ہوں..... کس وقت.....

اچھا ٹھیک ہے۔“ اس نے کال کے بعد میری طرف دیکھا۔ ”مسئلہ ہو گیا ہے جناب..... کوٹھی کا ایک خریدار اب

سے دو گھنٹے بعد کوٹھی دیکھنے آ رہا ہے میرا ہاں موجود ہونا ضروری ہے۔“

”کوئی بات نہیں تم چلے جاؤ، میں ابھی روانہ ہوتا ہوں تم بعد میں آ جانا۔“

”یہ ٹھیک رہے گا آپ کو نئی گاڑی میں جانا پسند کریں گے۔“

”یہاں مجھے کوئی بایک نظر نہیں آ رہی ہے اس لیے کوئی کار لے جاتا ہوں۔“

”ایسا کریں آپ منی جیپ لے جائیں طویل فاصلوں کے لیے اچھی گاڑی ہے اس کا پک آپ بھی زیادہ

”کام کیا تھا؟“

”راجا صاحب نے کوٹھی فروخت کرنے کا حکم دیا ہے۔“

میں چونک گیا۔ ”کوٹھی فروخت کرنے کا حکم دیا ہے لیکن کیوں؟“

”میں ایک ملازم ہوں راجا صاحب سے کسی فیصلے کی وجہ کیسے معلوم کر سکتا ہوں؟“ اس نے معذرت

خواہناہ انداز میں کہا۔

”میرا مطلب ہے کہ راجا صاحب کوٹھی اس لیے فروخت کر رہے ہیں کہ وہ دشمن کی نظر میں آ چکی ہے یا

کوئی اور وجہ ہو سکتی ہے؟“

”میرا خیال ہے یہی وجہ ہے کیونکہ سنا ہے راجا صاحب کسی اور توسط سے اسلام آباد میں بنی نئی کوٹھی خرید

رہے ہیں لیکن اس کے بارے میں مجھے پتا نہیں ہے۔“

”راجا صاحب کا یہاں بزنس کیا ہے؟“

”رئیل اسٹیٹ کا بزنس ہے۔ پورے اسلام آباد میں ان کی کئی جائیدادیں ہیں جو کرائے پر ہیں میری

ذمہ داری اصل میں ان کے منجری ہے۔ میں کرایہ جمع کرتا ہوں اور جائیداد کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔ ایک ہوٹل

بھی ہے لیکن وہ میرے ماتحت نہیں آتا ہے میں صرف اس کی ماہانہ رپورٹ تیار کرتا ہوں۔“

مجھے یہ تو معلوم تھا کہ راجا عمر دراز نہایت دولت مند آدمی ہے لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ اسلام آباد میں بھی

اس کا اتنا بڑا سیٹ آپ ہے۔ عبداللہ نے اس کی جائیدادوں کی جو لوکیشن اور دوسری تفصیلات بتائی تھیں ان سے

پتا چلتا تھا کہ ان کی مالیت اربوں میں ہے۔ راجا عمر دراز کا ہوٹل ویسے تو قہری اشار تھا لیکن معیار میں وہ کسی فانیو

اشار سے کم نہیں تھا۔ ظاہری سی بات ہے اس نے کوٹھی فروخت کرنے کا ارادہ اس لیے نہیں کیا تھا کہ اسے رقم کی

ضرورت تھی وہ اسے غیر محفوظ ہونے کی وجہ سے فروخت کر رہا تھا۔ عبداللہ اس پر کچھ افسردہ تھا کیونکہ وہ گزشتہ کئی

سالوں سے وہاں رہتا آیا تھا اور اس جگہ سے انیسیت ہو گئی تھی۔ شام کے وقت آسمان پر کچھ بادل آئے تھے اور

سورج غروب ہونے کے بعد ہلکی سی بارش ہونے لگی۔ بارش زیادہ تیز نہیں تھی لیکن اس کی وجہ سے موسم اچانک

سرد ہو گیا۔

”اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟“ عبداللہ نے پوچھا۔

”کل صبح حویلی کی طرف جانے کا ارادہ ہے۔ میں اکرم چشتی سے ملاقات کے لیے بے چین ہوں اور پھر

نادر سے بھی بات کرنی ہے۔“

”آپ کے سامنے جانے سے حقیقت کھل جائے گی۔“

”حقیقت کھل چکی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے مرشد کو بتا دیا ہے کہ اس کا بھائی میرے پاس ہے اور وہ

نادر کی واپسی کے لیے سمجھوتا کرنے کو تیار ہو گیا ہے۔“

”واقعی؟“ عبداللہ حیران ہوا۔

میں نے اسے تفصیل سے اپنی اور مرشد کے درمیان ہونے والی گفتگو سنائی پھر برسمیل تذکرہ ایمن اور

ذیوڈ شا کے بارے میں بھی بتایا۔ عبداللہ نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ ”جناب اگر آپ کے خلاف کیس ختم ہو جائیں

ناشتے کے بعد میں نے وسیم سے رابطہ کیا۔ ”میں آ رہا ہوں حالات کیسے ہیں؟“

”بہترین ہیں۔ اپنے ڈی ایس پی صاحب اس وقت کوکوس رہے ہیں جب وہ پیدا ہوئے اور پھر پولیس میں بھرتی ہوئے۔“

”ابھی تو مقامات آہ و فغاں اور آئیں گے بس ذرا مجھے آنے دو۔“ میں نے ہنس کر کہا اور فون بند کر دیا۔ عبداللہ رک گیا تھا اسے کچھ دیر بعد جانا تھا اس لیے میں نکل گیا۔ احتیاط کے طور پر میں نے بڑے سائز کا سن گلاس لگا لیا تھا اور ہلکی جیکٹ کے کالر اوپر کر لیے تھے اس سے میں خاصا مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ بارش کے بعد دھوپ نکل آئی تھی اور سڑکوں پر ٹریفک کا جھوم تھا۔ میں نے جی ٹی روڈ کا راستہ اختیار کیا اور اس وقت سکون کا سانس لیا جب کسی پولیس والے کی صورت دیکھے بغیر پنڈی شہر کی حدود سے باہر نکل گیا۔ اب میرا رخ پشاور کی طرف تھا۔ ترنول سے گزرنے کے بعد میں مختلف چھوٹے شہروں سے گزرتا رہا پھر اس لنک سڑک پر آ گیا جو حلی کی طرف جاتی تھی۔ اس پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد میں حویلی کے سامنے تھا۔ گاڑی دیکھتے ہی اس کا عقبی گیٹ کھل گیا۔ یہاں بارش کچھ زیادہ ہوئی تھی کیونکہ جاہ جاچکے میں پانی جمع تھا اور حویلی کا عقبی صحن کچھ بکچڑ ہو رہا تھا۔ میں کچھ بے شکل پچتا ہوا اندر آیا۔ وسیم نظر نہیں آیا میں نے اس کے بارے میں پوچھا۔ ایک آدمی نے بتایا۔

”وہ نیچے تہہ خانے میں ہیں۔“

یعنی وہ اکرم چشتی کے ساتھ تھا۔ میں نیچے تہہ خانے میں آیا تو اس کی درود یوار پر سیٹن آئی تھی۔ یہ بارش کا اثر تھا۔ اکرم چشتی سچ سچ ایک جگہ الٹا لٹکا ہوا تھا اور اس کے گلے میں موجود سیاہ ڈوری والا مونٹا چاندی کا منقش تعویذ اس کے منہ سے نکل رہا تھا ڈوری کا حلقہ اتنا بڑا نہیں تھا کہ اس کے سر سے گزر جاتا۔ ایک انڈریوز کے علاوہ کوئی لباس اس کے جسم پر نہیں تھا۔ مستقل الٹا لٹکے رہنے سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی پشت پر سیاہ کبیروں کا ایک جال بنا ہوا تھا۔ ظاہر ہے اس کی ہنر سے مرمت ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے جسم پر اور کوئی زخم نہیں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے گڑگڑا کر کچھ کہا لیکن اس کی ٹوٹی پھوٹی زبان میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وسیم اس کی پشت پر موجود تھا اس نے عقب سے لات ماری۔

”ٹھیک سے بول۔۔۔ اپنی مادی زبان میں۔۔۔ باپ تو تیرا کوئی دوغلی نسل کا کتا ہوگا۔“ درمیان میں وسیم نے خالص پولیس اسٹائل کی گالیاں فٹ کی تھیں۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

”گلتا ہے تم بھی پولیس میں بھرتی ہونے کے خواہش مند ہو۔“

”اگر ہوا تو صرف اس کے لیے ہوں گا۔“ وسیم نے ایک لات اور رسید کی اکرم چشتی تڑپ کر رہ گیا تھا میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

”ڈی ایس پی کی خاطر تو فیض صرف لاتوں سے۔۔۔۔۔ یہ لاتوں کے بھوت بھی نہیں ہیں ان کو منانے کے لیے کسی اور چیز کی ضرورت ہے۔“

”کس چیز کی جناب آپ حکم کریں۔“ وسیم نے کہا۔

”یہاں بجلی کی کوئی تار ہے؟“

یہ سن کر ہی اکرم چشتی تڑپ گیا تھا۔ اس نے پھر غوٹ غاٹ کر کے فریاد کی۔ وسیم سمجھ گیا اور تار کا بندوبست لے لے گیا۔ میں اکرم چشتی کے پاس بیٹھ گیا۔ ”صبر کرو اتنی جلدی کیا ہے کرٹ کھانے کی، یاد ہے تم نے اسے ساتھ کیا کیا تھا۔ مجھے یقین ہے صرف میرے ساتھ ہی نہیں لا تعداد بے گناہوں کے ساتھ تم نے اس سے لاواہ بہانہ سلوک کیا ہوگا۔ مجھے کسی سے ذاتی انتقام لینا اچھا نہیں لگتا ہے لیکن ہم تمہیں احساس دلانا چاہتے ہیں۔ اب تم بے بس لوگوں پر تشدد کا ہتھیار آزماؤ تو ان پر کیا گزرتی ہے۔“

اکرم چشتی کا مونٹا تعویذ اس کے منہ سے نکل رہا تھا اور اس وجہ سے بھی اسے بولنے میں دشواری پیش آرہی تھی لیکن اس نے کسی طرح سر ہلا کر کہا۔ ”شہباز خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔“

”یہ معافی ہی ہے ورنہ اگر تمہاری موت کا فیصلہ ہو چکا ہوتا تو تمہیں یہاں لانے کی زحمت ہی نہ کی جاتی اور اس وقت تمہاری لاش مردہ خانے میں پڑی ہوتی۔ جو ڈارٹ گن چلا سکتے ہیں ان کے لیے ایک گولی چلا نا کون ماہر تھا۔ مگر تمہیں اپنے اعمال کی کچھ نہ کچھ سزا تو بھگتنا ہوگی۔“

”وسیم ایک دوپٹے اسٹیلانز اور تار لے آیا۔ اس کی مدد سے کرٹ کو کنٹرول کیا جاسکتا تھا اور اسے جان لیوا طعنے سے بچا کر رکھا جاسکتا تھا۔ اس نے تار کا ننگا والا حصہ اکرم چشتی کی دونوں رانوں کے درمیان ایک نہایت حساس مقام سے باندھا۔ وہ تڑپ رہا تھا اور مزاحمت کے ساتھ ساتھ التجائیں بھی کر رہا تھا لیکن وسیم نے اس کی فریادوں کو دھماکا دینے بغیر اپنا کام کیا اور تار کا دوسرا حصہ اسٹیلانز کے ساکٹ میں لگا دیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور میں نے جیلر کی طرح سر سے اشارہ کیا جو جلد کو اجازت دیتا ہے اور وسیم نے مٹن آن کر دیا۔ کرٹ لگتے ہی لرم چشتی نے ایسی چیخ ماری کہ میں بھی اچھل پڑا تھا۔ اس چیخ کے بعد وہ الٹے لٹکے لٹکے یوں تھر تھرانے لگا جیسے کسی تم کا کوئی رقص کر رہا ہو اس کا چہرہ انتہائی سرخ ہو گیا اور یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا سر پھٹ جائے گا۔ آدھے منٹ بعد میں نے کرٹ بند کرنے کو کہا تو اکرم چشتی کی حالت غیر ہو گئی تھی اس کی زبان منہ سے نکل آئی تھی اور اٹھیں حلقوں میں گردش کر رہی تھیں اور تہہ خانے میں خشکی کے باوجود پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ جب اس کی حالت ذرا سدرہی تو وسیم نے مجھ سے پوچھے بغیر سوئچ آن کر دیا اس بار اکرم چشتی کٹے بکرے کی طرح چلایا۔

دقتی و قفے سے ایسے چار دور چلے تو اس کی ہمت جواب دے گئی اور اس نے بے ہوشی میں عافیت سمجھی تھی۔ وہ جھولنے لگا تھا اس کی زبان دانتوں کے درمیان آکر کٹ گئی تھی اور اس کے پاس سے وٹت چلنے جیسی بو رہی تھی میری طبیعت متلائے لگی اور میں اس جگہ سے ہٹ گیا۔ وسیم نے تار اتار دیا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ لرم چشتی کو کھول کر اس کے پیروں میں کڑا ڈال دیں۔ ہم اوپر آئے تو وسیم نے کہا۔ ”فرعون صفت شخص ہے، وہ میں آنے کے بعد ہمیں دھمکیاں دے رہا تھا لیکن جب اسے الٹا لٹکا کر پہلی دھوئی دی تو دماغ ٹھکانے پر آ گیا اور صحت ساجت پر اتر آیا تھا۔“

”میرا خیال ہے اتنا کافی ہے۔“ میں نے کہا۔

وسیم نے میری طرف عجیب نظروں سے دیکھا۔ ”شہباز صاحب ابھی تو چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے ہیں

آپ نے دودن کی اجازت دی تھی۔“

”نہیں یار، میں کسی انسان پر چاہے وہ اکرم چشتی ہی کیوں نہ ہو اس حد تشدد نہیں کر سکتا۔ اسے سزا دینی ہے تو براہ راست دے دو۔“

”آپ کے خیال میں اسے کیا سزا دینی چاہیے؟“

”شیر کے دانت اور پنچے نکال دو تو وہ بے کار ہو جاتا ہے پھر اس کی بے پناہ طاقت بھی کسی کام کی نہیں رہتی ہے۔“

”اس کی طاقت ہے اس کی نوکری اور ہم اس کی نوکری کس طرح چھین سکتے ہیں۔“

”ہم اس کی نوکری نہیں چھین سکتے ہیں لیکن اگر ہم اسے نوکری کے قابل ہی نہ چھوڑیں تو.....؟“ میرا الجھ

معنی خیز ہو گیا وہ سیم نے چونک کر مجھے دیکھا۔

”آپ کا مطلب ہے اسے فزیکلی طور پر ملازمت کے قابل نہ چھوڑا جائے۔“

”بالکل۔“

وسیم سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کہا۔ ”کس طرح.....؟ کیا اسے اندھا، گونگا اور بہرا کر دیا جائے۔“

”ہاں یہ کام زیادہ مشکل نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”چپکنے والے کسی سلوٹن کی ایک ٹیوب کام کر دے گی۔“

اس کے بعد اکرم چشتی کسی کام کا نہیں رہے گا۔“

یہ موضوع ایسا تھا کہ اس پر بات کرتے ہوئے میں اور وسیم دونوں ہی سنجیدہ تھے۔ ہم ایک انسان کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ وہ انسان ہمارا جانی دشمن تھا اور اس کا بس چلتا تو ہمیں دنیا سے مٹا دیتا۔ اس کے باوجود ہم اسے جان سے مارنا نہیں چاہتے تھے لیکن اسے چھوڑ بھی نہیں سکتے تھے۔ اسے بے ضرر بنانے کا یہ عمل اس کے ساتھ ہمارے لیے بھی تکلیف دہ تھا لیکن یہ تاگزیر تھا۔ میری تجویز کے بعد اصولی طور پر فیصلہ ہو گیا تھا کہ اکرم چشتی کے ساتھ کیا کرنا ہے۔ اب اس فیصلے پر عمل درآمد وسیم کی ذمہ داری تھی۔ مزید گفتگو کے لیے میں نے دوسرے موضوع کا انتخاب کیا۔ ”تم نے اپنے آدمیوں کی اسکرٹنی کی۔“

”ممکن حد تک..... دو افراد مجھے ذرا ہلکے محسوس ہوتے ہیں۔ ایک تو فیصل کا ساتھی ہے۔“

”ان پر نظر رکھو اور جب ہم اس ٹھکانے کو چھوڑنے کا وقت آئے تو انہیں چلتا کرنا۔“

”میں نے یہی سوچا ہے۔“ وسیم نے سر ہلایا اسی لمحے کوئی باہر چلایا اور جو لفظ میری سمجھ میں آیا تھا وہ پولیس

تھا۔ میں اور وسیم بے ساختہ کھڑے ہو گئے۔ وسیم کا ایک آدمی نمودار ہوا۔ اس نے تیزی سے کہا۔

”جناب پولیس..... اس نے چاروں طرف سے حویلی کو گھیر لیا ہے۔“

○.....❖.....○

پولیس کا سن کر ہم سب ہی اچھل پڑے تھے۔ وسیم اس کمرے کی طرف لپکا جہاں کیمروں کے مانیٹرز تھے۔ اس کے آدمی بھاگ دوڑ کر رہے تھے اور اپنے ہتھیار اٹھا رہے تھے۔ کنٹرول روم میں چھ عدد مانیٹرز تھے جو یہاں لگے درجن بھر کیمروں کی مدد سے حویلی کے اطراف دور تک دکھا سکتے تھے۔ پولیس سامنے کی طرف سے آئی تھی، اور اس وقت حویلی کے سامنے والے حصے میں پھیل رہی تھی۔ کم سے کم دو پولیس موبائلز سامنے تھیں اور ان

سے اتر کر مسلح سپاہی درختوں اور پتھروں کے پیچھے پوزیشن سنبھال رہے تھے۔ میں نے وسیم سے کہا۔ ”عقبی حصے میں دیکھو۔“

وسیم نے عقبی حصے کے کیمروں کی طرف توجہ دی۔ مگر یہاں فی الحال پولیس نہیں پہنچی تھی۔ میں نے کہا۔ ”فوری نکلوا اس سے پہلے کہ پولیس یہاں بھی پہنچ جائے اپنے آدمیوں سے کوجھٹ سے فائرنگ کر کے پولیس کو اس طرف آنے سے روکیں۔“

وسیم ہدایت دینے لگا اس نے دو افراد کو جو پہلے ہی جھٹ پر موجود تھے پولیس پر فائرنگ کا حکم دیا لیکن انہیں براہ راست نشانہ لینے سے منع کیا تھا۔ پہلے فائر کے ساتھ ہی پھلتے ہوئے پولیس والے اپنی جگہ دبک گئے تھے۔ اس دوران میں دو موبائلز مزید سائرن بجاتی آگئی تھیں۔ اب وہاں چار عدد موبائلز اور کم سے کم دو درجن مسلح پولیس والے موجود تھے۔ یہاں حویلی میں چار عدد گاڑیاں تھیں ان میں کئی ٹیکسیشن وین شامل نہیں تھی۔ میں نے وین کا پوچھا تو وسیم نے کہا۔ ”اس کے انجن میں کچھ مسئلہ ہو رہا تھا۔ اسے ایک قریبی ورکشاپ بھیج دیا ہے۔“

پولیس والوں کی اچانک آمد غیر متوقع تھی اور ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ انہیں باقاعدہ خبر ہے کہ یہاں ان کا مقابلہ کن لوگوں سے ہے اور وہ اسی لحاظ سے تیاری کر کے آئے تھے۔ مگر سوال یہ تھا کہ انہیں ہمارے بارے میں پتا کیسے چلا؟ اگر وہ اکرم چشتی کے لیے آئے تھے تو چوبیس گھنٹے پہلے کیوں نہیں آ گئے۔ انہیں کیسے پتا چلا کہ اکرم چشتی کہاں ہے؟ پولیس والوں کی جانب سے فائرنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ وسیم کے آدمی نکلنے کی تیاری کر رہے تھے سامان یعنی اسلحہ اور ضروری چیزیں گاڑیوں میں رکھی جا رہی تھیں۔ اب کنٹرول روم میں، میں اور وسیم تھے۔ اچانک مجھے خیال آیا اور میں نے عبداللہ کو کال کی۔ کال ریسو کرتے ہی اسے صورت حال کا اندازہ ہو گیا کیونکہ فائرنگ کی آواز اس کمرے تک بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”فائرنگ کیوں ہو رہی ہے؟“

”پولیس نے حویلی پر ریڈ کیا ہے وہ سامنے موجود ہیں اور ہم یہاں سے نکلنے کی تیاری کر رہے ہیں اب تم میں سے کوئی اس طرف کا رخ نہ کرے۔“

”آپ کہاں جائیں گے؟“

”یہ تو یہاں سے نکلنے کے بعد پتا چلے گا۔“ میں نے کہا۔ ”سنو ہم نادر کو یہیں چھوڑ کر جائیں گے اور پولیس اسے یقیناً ہسپتال لے جائے گی۔ میرا اندازہ ہے کہ اسے پنڈی لے جایا جائے گا۔ میں چاہتا ہوں تم اپنے آدمیوں کے ساتھ نادر کو حاصل کرنے کی کوشش کرو امید ہے ایبویٹنس کے ساتھ ایک دوسرا ہی ہوں گے۔“

”میں سمجھ گیا لیکن اس کے لیے مجھے اپنے آدمیوں سمیت حویلی والی سڑک پر آنا پڑے گا۔ وہیں کہیں گھات لگا کر ایبویٹنس کو روکا جاسکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے لیکن اپنی واپسی کا خیال بھی رکھنا راستہ اتنا طویل نہ ہو کہ پولیس کو پیچھا کرنے یا ناکا بندی کرنے کا موقع مل جائے۔“

وسیم میری گفتگو سے مطمئن نظر آ رہا تھا۔ ہم نادر کو ساتھ نہیں لے جاسکتے تھے۔ وہ بوجھ بن جاتا اور فراز میں رکاوٹ ثابت ہوتا۔ اسے اس طرح آسانی سے دوبارہ اپنے قبضے میں لیا جاسکتا تھا۔ جیسے ہی میں نے بات مکمل کی

اس نے اکرم چشتی کے بارے میں پوچھا۔ ”اس کا کیا کرنا ہے؟“

میں نے سر دھجے میں کہا۔ ”وہی جو طے ہوا تھا اپنے کسی آدمی کو اس بارے میں کہہ دو، یہاں نکلنے سے پہلے یہ کام ہو جانا چاہیے۔“

وسیم نے واکی ناک پر اپنے کسی آدمی کو حکم دیا۔ میں مانیٹر کی طرف متوجہ تھا۔ حویلی کی طرف سے فائزنگ کے بعد پولیس کے اندازے کی تصدیق ہو گئی تھی اور اب ان کی طرف سے اندھا دھند فائزنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ اس فائزنگ میں وہ دور مار رائفلوں کے ساتھ خود کار رائفلیں بھی استعمال کر رہے تھے حالانکہ تین چار سو گز کی دوری سے یہ رائفلیں غیر موثر تھیں۔ البتہ دور مار رائفلوں سے خطرہ تھا۔ مگر وسیم کے آدمی مہارت سے خود کو محفوظ رکھتے ہوئے پولیس والوں کو الجھائے ہوئے تھے۔ میں نے وسیم سے کہا۔ ”ہم پیچھے کی طرف سے نکلنے کے یہاں کے راستوں کے بارے میں علم ہے۔“

وسیم مسکرایا۔ ”اچھی طرح جناب..... فارغ وقت میں ہمیں اور میرے ساتھی یہاں آس پاس گھومتے رہے ہیں اور ہم نے پہلے سے کئی ایسے راستے دیکھ لیے ہیں جن سے ہنگامی صورت حال میں فرار ہو سکتے ہیں۔“

”یہ تم نے اچھا کیا اب ایسا کرو کہ وہ تمام جگہیں جو تمہارے استعمال میں رہی ہیں ان میں آگ والے بم لگا دو تاکہ پولیس کو کوئی نشان نہ مل سکے۔“

وسیم نے سوچا اور خبردار کیا۔ ”اس صورت میں نادور اور اکرم کی جان کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔“

میں نے سوچ کر کہا۔ ”تب انہیں باہر نکال دو لیکن حویلی میں ایسی کوئی چیز مت چھوڑنا جس سے پولیس کو سراغ مل سکے۔“

ابتدائی سراسمی کے بعد ہم نے اپنے اعصاب پر قابو پا لیا تھا۔ پندرہ منٹ ہونے کو آئے تھے لیکن اس دوران میں اچھا خاصا کام کر لیا گیا تھا۔ اب وسیم خود کمروں میں آگ لگانے والے بم رکھ رہا تھا۔ یہ ریویو سے اڑانے جا سکتے تھے۔ حویلی سے نکلنے کے بعد صرف ایک مین دبا پڑتا۔ اس کا طریقہ بہت آسان تھا۔ بم کو ایکٹو کرنا پڑتا تھا اور ریویو کا مین دباتے ہی جتنے بم ایکٹو ہوتے تھے وہ سب بلاسٹ ہو جاتے کیونکہ فریکوئنسی ایک ہی تھی۔ جو بم ان ایکٹو ہوتے وہ ایسے ہی پڑے رہتے۔ اگرچہ اس کا خطرہ تھا کہ پولیس حویلی کے عقب میں بھی آ چکی ہو اور کہیں جھاڑیوں اور ٹیلوں میں زد پوش ہوتا کہ ہم فرار کی کوشش کریں تو وہ حرکت میں آجائے لیکن یہ خدشہ مبہوم تھا۔ اول تو پولیس اس طرح گھات لگا کر کسی کا راستہ نہیں روکتی ہے دوسرے ہماری پولیس میں اتنی صلاحیت بھی نہیں ہے۔

میں باہر آیا تو وسیم کے آدمی نادور اور اکرم چشتی دونوں کو باہر لے آئے تھے۔ وہ بے ہوش تھے اس نازک موقع پر انہیں کسی دخل اندازی سے روکنے کے لیے بے ہوش کر دیا گیا تھا۔ اکرم چشتی کے بارے میں جو حکم دیا گیا تھا اس کی تعمیل بھی ہو گئی تھی۔ یعنی اس کی آنکھوں اور کان میں سلٹوں ڈال دیا گیا تھا۔ میں نے اس کا معائنہ کیا اور میرے روٹنے کھڑے ہو گئے تھے اس کی آنکھیں جڑ گئی تھیں اور اگر وہ ہوش میں ہوتا تو اس وقت سخت اذیت میں ہوتا۔ اسے دیکھتے ہوئے میرا دھیان اس کے تعویذ کی طرف گیا۔ پہلی بار میں نے اس پر غور کیا تھا۔ یہ ساز میں عام تعویذ سے خاصا بڑا اور چاندی جیسی کسی دھات کا بنا ہوا تھا۔ میں نے ڈوری کھینچ کر اسے اکرم چشتی کی گردن

سے اتار تو مجھے احساس ہوا کہ یہ غیر معمولی وزنی بھی تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ ٹھوس چاندی کا بنا ہو۔ اگر اس کے اندر کوئی تعویذ ہوتا تو یہ اتنا وزنی نہ ہوتا۔ مجھے شبہ ہوا کہ اس میں کچھ اور تھا۔ اسے کھول کر دیکھنا ضروری تھا لیکن یہ چاروں طرف سے بند تھا۔

میں نے وسیم کے ایک آدمی سے چاقو طلب کیا اس کے پاس نہیں تھا لیکن اس نے لا دیا۔ میں نے اس کی نوک سے تعویذ کے کناروں کو کھرچا اور پھر اسے کھولنے کی کوشش کی چاندی نرم دھات ہوتی ہے اس لیے وہ اسٹیل بلیڈ کا مقابلہ نہ کر سکی اور تعویذ کھل گیا۔ پھر جو چیز سامنے آئی اس نے مجھے اچھل پڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ ایک سیاہ دھاتی آلہ تھا جو نصف اخروٹ کے برابر اور تقریباً ایسی ہی صورت کا تھا اور یقیناً یہ سنگل دینے والا آلہ تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ پولیس کس طرح حویلی تک چلی آئی تھی۔ اکرم چشتی کو یقیناً ہم سے خطرہ لاحق تھا تبھی اس نے اتنی حفاظتی تدابیر کی تھیں۔ اس کی حفاظت پر کئی گاڑز تھے۔ مگر اسے معلوم تھا کہ ہم اسے پھر بھی اٹھا سکتے ہیں اس لیے اس نے ایسی کسی صورت حال کے لیے آلہ تعویذ بنا کر گلے میں پہنا ہوا تھا لیکن اس کے سنگل محدود علاقے میں کام کرتے تھے اسی وجہ سے پولیس کو یہاں تک آنے میں کچھ وقت لگا تھا۔ اگر ہم اسے شہر میں رکھتے تو پولیس کل ہی اسے تلاش کر چکی ہوتی۔ میں نے وسیم کو آلہ دکھایا۔ اس نے سر دھجے بھری۔ ”بس اسی بے احتیاطی نے مروادیا میرے پاس سنگل ڈی ٹیکٹر ہے اگر میں اس سے اکرم چشتی کو چیک کر لیتا تو یہ آلہ پکڑا جاتا۔“

”کوئی بات نہیں یار جو نصیب میں لکھا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”یہاں سے ٹھکانہ اٹھ گیا ہے۔ بس اب نکلنے کی کرو۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ ہم پہلے خبردار ہو گئے۔“

پولیس کو آئے ہوئے تقریباً آدھا گھنٹہ ہونے کو آیا تھا اور اب یہاں سے نکل جانا لازمی تھا۔ اس دوران میں وسیم کے آدمیوں نے ایک کام اور کیا تھا انہوں نے دور مار طاقتور رائفل کی مدد سے تمام موبائل گاڑیوں کے دکھائی دینے والے ٹائز اڑا دیے تھے اب کم سے کم پولیس اس قابل نہیں رہی تھی کہ گاڑیوں پر ہمارا پیچھا کرتی۔ اکرم چشتی کے پاس سے برآمد ہونے والے تعویذ سے مجھے اطمینان ہوا کہ پولیس ہماری کسی غلطی کی وجہ سے خاص طور سے ہمارے لیے نہیں آئی تھی بلکہ وہ اکرم چشتی کو تلاش کر رہی تھی۔ تمام ضروری سامان گاڑیوں میں رکھ دیا گیا تھا۔ ہم تقریباً ڈیڑھ درجن افراد تھے جو آرام سے ان چار گاڑیوں میں آگئے تھے۔ اشارہ پاتے ہی اوپر موجود ساتھی بھی نیچے آگئے۔ حویلی کا عقبی گیٹ کھل گیا تھا اور گاڑیاں باہر نکلنے لگیں۔ اگرچہ اس طرف پولیس نہیں تھی لیکن ہم پوری طرح تیار تھے۔ حویلی کے گیٹ پر اپنی گاڑی روک کر وسیم نے جب سے ایک چھوٹا سا ریویو کنٹرول نکالا اور اس کا مین دبا یا اندر سے دبے دبے دھماکوں کی آواز کے ساتھ ہی شعلے نمودار ہوئی تھی۔ وسیم نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

”حویلی میں لکڑی کا کام بہت زیادہ ہے ممکن ہے آگ ساری حویلی کو چاٹ جائے۔“

”یہ اور بھی اچھا ہوگا۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”کیا کیمرے اتار لیے تھے؟“

”اس کا موقع نہیں تھا لیکن وہ سسٹم لے آئے ہیں جو کمروں اور مانیٹرز کو کنٹرول کرتا ہے یہی اصل چیز ہے باقی کیمرے اور مانیٹرز تو بازار میں بہت مل جائیں گے۔ اس کے علاوہ اسلحہ اور رقم والا سوٹ کیس ہے۔“

ہم عقب میں میدان عبور کر کے جھاڑیوں اور ٹیلوں میں داخل ہوئے یہ سارا پٹھو ہمارا مخصوص علاقہ تھا۔

”بس تو ہمیں پہلے لنک روڈ تک پہنچنا ہے اور اس کے بعد ہمیں جی ٹی روڈ تک پہنچ کر الگ الگ کر سفر کرنا ہوگا۔“

”الگ الگ۔“ دیم نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”ہاں ہمیں اب بسوں اور دیکھوں میں سفر کرنا ہوگا۔“

”گاڑیاں اور اسلحے کا کیا ہوگا۔“

”میرا خیال ہے ہمیں گاڑیاں اور اسلحہ چھوڑنا ہوگا کیونکہ جی ٹی روڈ پر پولیس چیکنگ کر رہی ہوگی اور اس صورت میں پکڑے جانے کا بہت زیادہ امکان ہے۔“

”میرے ذہن میں ایک تجویز اور ہے۔“

”وہ کیا؟“

”جی ٹی روڈ سے ایک راستہ نکلتا ہے جو گھومتا ہوا شمال کی طرف ماسمہ جا نکلتا ہے۔“ دیم نے کہا اور نقشے پر اس راستے کو واضح کیا۔ ”یہ مشکل ہے مگر محفوظ ہے۔“

”ہم نے ماسمہ نہیں پھنڈی جاتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”پھنڈی صرف ہم جائیں گے۔ گاڑیاں اور اسلحہ ماسمہ جائے گا اس طرف کوئی چیکنگ نہیں ہو رہی ہے۔ بعد میں یہ واپس آ سکتے ہیں۔“

”ماسمہ یہ کس کے پاس جائیں گے؟“

”وہاں ایک جاننے والا ہے ملک شفقت اللہ۔ وہ کچھ دن میرے آدمیوں اور گاڑیوں کو اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔“

”اتحاد کا آدمی ہے۔“

”ہاں ہے تو۔“ دیم نے جھجک کر کہا۔ ”میرا پانچ سال سے اس سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔“

مجھے یہ بات درست نہیں لگی تھی۔ ”تب وہ تمہارے آدمیوں کو کیسے پناہ دے گا۔“

”یہ وہاں پہنچ کر اس کی مجھ سے بات کرا دیں گے۔“

درحقیقت ہم گاڑیوں اور اسلحے کے حوالے سے بہت مشکل میں پڑ گئے تھے ان کے ساتھ جی ٹی روڈ پر جانا خود کو پولیس کے حوالے کرنے کے مترادف تھا۔ دوسری طرف ہم یہ گاڑیاں اور اسلحہ چھوڑ بھی نہیں سکتے تھے جب تک ایسا کرنا ناگزیر نہ ہو جائے۔ فیصلہ کرتے ہی دیم نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ راستے میں اس نے ایک ریزہ

لے جانے والے لڑکے سے تعہد لیا کہ لنک روڈ کچھ دور تھی۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد ہم وہاں تھے۔ یہاں رک کر دیم نے اپنے پلان پر مزید غور کیا۔ سوائے ہم دونوں کے باقی سب کو ماسمہ جانا تھا۔ اپنے آدمیوں کو اچھی طرح

بریف کرنے کے بعد دیم روانگی اختیار کی۔ ہمیں جی ٹی روڈ سے کچھ پہلے اتر جانا تھا۔ ہمیں بس یا وگن میں سفر کرنا تھا۔ میں کچھ سوچ رہا تھا کہ اس طرح سفر کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کم سے کم اس وقت پھنڈی کی طرف

جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے دیم سے کہا۔ ”کیا حرج ہے کہ ہم آج رک جائیں۔“

”کہاں رک جائیں؟“

جہاں ہموار زمین کم ہے۔ مسلسل بارش زمین کی زرخیزی بہا کر لے جاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ علاقہ کاشت کاری کے لیے زیادہ موزوں نہیں ہے اور صرف وہیں زمین کاشت کی جاتی ہے جو پانی کی زد میں نہ ہو۔ ورنہ یہ اصل میں چراگاہوں کا علاقہ ہے۔ ہم کچھ دور گئے تھے کہ جانور اور ان کے رکھوالے نظر آنے لگے تھے۔ گاڑیاں ان کے لیے اجنبی تھیں اس لیے وہ تجسس نظروں سے ہمیں دیکھتے تھے مگر کسی نے راستے میں آنے یا روکنے کی کوشش نہیں کی۔ آدھے گھنٹے بعد ہم حویلی سے خاصے دور نکل آئے تھے۔ دیم نے کہا۔ ”میرا خیال ہے پولیس والے بس پہنچے تھے اور ابھی انہیں موقع نہیں ملا تھا کہ حویلی کو گھیر سکتے۔“

”ہمیں حویلی کے سامنے اور عقب میں موجود ہموار میدان نے بچا لیا اسی وجہ سے پولیس والے زیادہ نزدیک نہیں آ سکے تھے۔“

”آپ نے ٹھیک کہا۔“ دیم نے کہا۔ ”میرا خیال ہے وہ اب تک حویلی میں داخل ہو چکے ہوں گے اور انہیں نادر اور ڈی ایس پی صاحب مل گئے ہوں گے۔“

میں ہنسا۔ ”نکلتا ہے اکرم چشتی پر تمہاری بھڑاس لگی نہیں ہے؟“

”درست فرمایا آپ نے..... میں نے کئی پلان بتا رکھے تھے افسوس کہ وہ دل میں رہ گئے۔“

”تمہارے آدمی نے اپنا کام اچھی طرح کیا ہے میرا خیال ہے اس کی بیٹائی اور ساحت دونوں بیکار ہو چکی ہیں۔“

”ہاں یہ نہایت خطرناک سلوشن ہے انسانی جسم کا تو یہ حشر کر دیتا ہے۔“

دیم نے یہ سارا علاقہ دیکھا ہوا تھا اور اسے معلوم تھا کہ کہاں کہاں آبادی تھی وہ اس سے بچ کر گزر رہا تھا۔ یہاں اکا دکا چھوٹے گاؤں تھے جو مقامی کاشت کاروں اور چراگاہوں کے تھے۔ ایک جگہ ہم ایک درگاہ کے پاس

سے گزرے اس کے باہر درختوں تلے پڑے ملک بتا رہے تھے کہ یہاں بھی لوگوں کو بے وقوف بنانے کا کاروبار پورے زور و شور سے جاری ہے۔ ہم درگاہ سے دور سے گزرے تھے اس کے باوجود وہاں موجود لوگوں نے یقیناً

گاڑیوں کو دیکھا ہوگا۔ مجھے تشویش ہونے لگی تھی۔ میں نے دیم سے کہا۔ ”پولیس لازمی پیچھے آئے گی۔ ان کے پاس دائرہ لیس ہے اور وہ ہمارے فرار کے روٹ کا اندازہ کر کے اس سارے علاقے کی پولیس کو خبردار کر سکتے

ہیں۔“

”میرے ذہن میں بھی یہی خیال ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”ہم کہاں ہیں؟“

دیم نے گاڑی روک لی، ہمیں رکتے دیکھ کر باقی بھی رک گئے۔ دیم نے ایک بڑا نقشہ نکال کر اسے اسٹیرنگ پر پھیلا دیا۔ یہ راولپنڈی ڈویژن اور اس کے آس پاس کے علاقوں کا تفصیلی نقشہ تھا اور اس میں معمولی سے

معمولی چیز کی بھی نشاندہی کی گئی تھی۔ پھر دیم نے جی ٹی ایس براہی لوکیشن دیکھی اور اسے نقشے سے ملانے لگا۔ پھر اس نے ایک جگہ انگلی رکھی۔ ”ہم اس وقت یہاں ہیں..... نادر یہ جگہ جی ٹی روڈ سے کوئی بارہ میل دور ہے۔“

”اگر جی ٹی روڈ قریب ہے تو اس تک جانے کے لیے کوئی نہ کوئی لنک روڈ بھی ہوگی۔“

دیم نے لنک روڈ تلاش کر لی۔ ”یہ ہے..... یہاں سے کوئی دوڑھائی میل شمال میں ہے۔“

”اللہ کی زمین بہت بڑی ہے۔“ میں نے آس پاس اشارہ کیا۔ ”میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ آج جی ٹی روڈ پر جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔“

”اتفاق سے میری چھٹی حس اس بار بھی آپ کی تائید کر رہی ہے۔“ وہ خوش دلی سے ہنسا۔ ”معاملہ ایک ڈی ایس بی کا ہے اس لیے پولیس بہت مستعد ہوگی اور اگر مچشتی کے بیان کے بعد وہ زیادہ سرگرمی سے آپ کو تلاش کرے گی۔“

”اس لیے ہمیں پنڈی سے دور رہنا چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے کیا حرج ہے اگر ہم بھی ہانسمہ چلیں۔“ دسم نے بُرے خیال انداز میں سر ہلایا۔ ”خیال تو برا نہیں ہے اور آج کل وہاں موسم بھی شاندار ہوگا۔ اگر ملک شفقت اللہ پہلے جیسا ہوا تو چند دن بڑے مزے سے گزر سکتے ہیں۔“

”بس تو پھر ہم وہیں جا رہے ہیں۔“ میں نے فیصلہ کر لیا۔ ”ملک صاحب اگر میزبانی پر آمادہ نہ ہوئے تو ہمارے پاس متبادل طریقے بھی ہیں۔“

دسم خوش نظر آنے لگا۔ ”یہ اچھی بات ہے آپ ہوں گے تو مجھے پرانے تعلق کا خیال بھی نہیں کرنا پڑے گا۔“

جی ٹی روڈ کراس کرنے سے پہلے ہم نے ایک جگہ رک کر دوبارہ نقشے کا بغور معائنہ کیا اور طے کیا کہ کہاں سے ہمیں سڑک سے اترنا ہوگا۔ ویسے وہ سڑک خاصی دور تھی لیکن اس تک جانے کے لیے ہم جی ٹی روڈ کراس کر کے کچھ دیر ایک کچے راستے پر سسر کرتے۔ یہ ظاہر ہے سڑک کی نسبت مشکل تھا لیکن محفوظ بھی تھا۔ جب ہم نے سڑک عبور کی تو دو پہر ہو چکی تھی۔ خاصی دیر سے مسلسل سفر میں تھے۔ خوش قسمتی سے یہاں ایک پیڑول پمپ بھی تھا اس لیے آگے بڑھنے سے پہلے ہم نے اپنی تمام گاڑیوں کے ٹینک فل کرا لیے۔ پلاسٹک کے ڈرموں میں فاضل ایندھن تھا لیکن اسے ہم نے راستے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ یہیں دسم نے اپنے دس ساتھیوں کو چھٹی دے دی کہ وہ ابھی اپنے گھر جائیں اور آئندہ کال کا انتظار کریں۔ ظاہر ہے اس نے انہیں بتایا تھا کہ اب ہم کہاں جائیں گے۔ اب ہمارے ساتھ چھ آدمی تھے اور یہ سب دسم کے انتہائی بھروسے کے تھے۔ وہ خاصے عرصے سے اس کے ساتھ تھے اور آزمودہ کار تھے۔ اب ہر گاڑی میں دو دو آدمی تھے۔ خوش قسمتی سے یہاں موبائل سٹیشن موجود تھے۔ میں نے عبد اللہ کو کال کی اور اس نے میری آواز سننے ہی چپک کر کہا۔

”جناب ٹیئر پکڑ لیا ہے اب بنجرے میں لے جا رہے ہیں۔“

یہ اشارہ تھا کہ نادر آسانی سے ان کے ہاتھ آگیا تھا لیکن میں نے پھر بھی پوچھ لیا۔ ”کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا کسی ماسے نے تو نہیں دیکھا؟“

”نہیں سب صفائی سے ہو گیا۔“ عبد اللہ نے جواب دیا۔ ”آپ کہاں ہیں؟“

”ہانسمہ کی طرف جا رہے ہیں کیونکہ تمہاری طرف آنا مشکل ہے۔“

”میں بھی یہی کہنے والا ہوں یہاں ہر طرف کتے بھر رہے ہیں۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”ٹیئر کا خیال رکھنا وہ پیار بھی ہے۔“

”فکر نہ کریں اس کے لیے میں نے باہر سے خاص دوا بھی منگوائی ہے جو اسے بالکل ٹھیک کر دے گی۔“

عبد اللہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”وہی دوا جو میرے لیے بھی منگوائی تھی؟“ میں نے تصدیق چاہی۔

”جی وہی۔“ عبد اللہ ہنسا۔ ”دو دن میں آجائے گی۔“

اس دوران میں ہم روانہ ہو رہے تھے اس لیے میں نے عبد اللہ کو خدا حافظ کہا۔ تقریباً دو گھنٹہ کے بعد ہم سڑک سے اتر کر اس کچے راستے پر آ گئے۔ بھوک سب کو لگ رہی تھی لیکن کھانے کے لیے رکنے کا موقع نہیں تھا اس لیے سب نے چلتی گاڑیوں میں کھانے کو جو تھا اس سے پیٹ پوجا کر لی۔ دسم کے آدمیوں نے کھانے پینے کا سامان بھی ساتھ لے لیا تھا۔ کچھ چیزیں پیڑول پمپ کی ریفریش منٹ شاپ سے لی تھیں۔ یہاں کچے راستے پر دھول مٹی بے حساب تھی اس لیے سب نے گاڑیوں کے شیشے چڑھا لیے تھے۔ موسم ابھی اتنا گرم نہیں تھا کہ اسے سی چلانے کی ضرورت پیش آتی۔ آدھے گھنٹے بعد ہم ہانسمہ جانے والی سڑک پر تھے۔ یہ کسی ہائی وے کی طرح ہموار اور کشادہ تو نہیں تھی لیکن بہر حال ہکی سڑک تھی اور اس کچے راستے سے خاصی بہتر تھی جس پر اب تک سفر کرتے رہے تھے۔ یہاں ڈرائیونگ میں نے سنہال لی۔ دسم گزشتہ کئی گھنٹے سے مسلسل ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ دسم نے ایک بار پھر نقشہ نکال کر دیکھا اور بولا۔

”مشکل لگ رہا ہے آج ہم ہانسمہ نہیں پہنچ سکتے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے سورج ڈوبنے کے بعد ہمیں کہیں نہ کہیں رکنا پڑے گا۔“

”اتنی گاڑیوں اور اسٹے کے ساتھ۔“

”ہاں اگر کوئی مناسب جگہ ملے گی تو ٹھیک ہے ورنہ کھلے میں بھی گزارا کر سکتے ہیں۔“

”کھانے کا کیا ہوگا؟“

”اس سڑک پر کہیں نہ کہیں کچھ ملے گا۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

پانی ختم ہونے والا تھا لیکن ایک جگہ کھیتوں کے کنارے ہی رہٹ مل گیا جس سے تازہ پانی نکل کر کھیتوں میں جا رہا تھا۔ ہم نے جی بھر کر یہ پانی پیا اور اپنی بوتلوں میں بھر لیا۔ یہیں گاڑیوں کو آرام کا موقع دیا۔ مسلسل سفر سے ان کے انجن گرم ہو گئے تھے۔ آدھے گھنٹے کے آرام کے بعد دوبارہ روانہ ہوئے تو سورج مغرب کی طرف چھٹنے لگا تھا۔ دسم نے بی بی کا ٹھکانہ چھپنے پر اداس تھا۔ ”اچھی جگہ تھی وہاں دل بھی لگ گیا تھا۔ شام کو ہم فٹ بال یا دالی بال بھی کھیلتے تھے۔“

”یار چھاپا ہی ہوا ہمیں خانہ بدوش بن کر رہنا چاہیے۔ کہتے ہیں کہ خانہ بدوشوں کے خیموں کے پاس گھاس اونچ نہیں ہوتی ہے۔ زیادہ دیر کسی جگہ رکنا دشمن کو متوجہ کرنے کے برابر ہے۔ بزرگ بھی کہتے ہیں کہ حرکت میں برکت ہے۔“

دسم نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”لیکن بزرگ یہ نہیں بتاتے کہ حرکت کس سمت میں کی جائے تو اس میں برکت ہوگی۔“

”کچھ کام ہمیں خود بھی کرنا چاہیے۔“

میرا خیال تھا کہ اگر سب پر کہیں نہ کہیں کوئی جگہ ہوٹل مل جائے گا جہاں کھانا بھی مل سکے گا لیکن میرا

اندازہ غلط ثابت ہوا۔ شام بلکہ رات ہوگئی اور صرف ایک ہوٹل ملا جس کا باورچی اپنے ماموں کی میت میں گیا تھا اس لیے وہاں صرف چائے اور باسی بسکٹ دستیاب تھے۔ اس کے بعد ماسٹر کے پہاڑوں کی چڑھائی شروع ہو گئی تھی۔ یہاں پہنچ کر یہ سڑک مزید تنگ اور خراب ہوگئی تھی۔ وسم کے نقشے کے مطابق اب ہم اپنی منزل سے کوئی دو گھنٹے کی مسافت پر تھے۔ اس لیے بہتر سمجھا کہ کہیں رکنے کی کوشش کے بجائے سفر جاری رکھا جائے بے شک رفتار کم ہو جائے۔ میں نے وسم سے اتفاق کیا کہ ہمیں منزل پر پہنچنا چاہیے اس کے بعد حالات دیکھ کر فیصلہ کریں گے۔ رات آٹھ بجے ایک طویل ترین اور نہایت تھکا دینے والے سفر کے بعد ہم ملک شفتت اللہ کی حویلی پہنچ گئے تھے۔ یہاں شدت کی سردی تھی کیونکہ یہ جگہ سطح سمندر۔ سے کوئی پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر تھی۔ حویلی سڑک سے زیادہ دور نہیں تھی اور اس کے پیچھے دھلاں پر دور تک کھیت اور ان کے درمیان چھوٹے چھوٹے گھر بکھرے ہوئے تھے۔ یہاں بجلی تھی اس لیے روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ سردی اور دیہات ہونے کی وجہ سے رات کے اس پہر وہاں سناٹا ہوتا چاہیے تھا اس لیے جہاں تک نظر جاتی تھی نہ بندہ نہ بندے کی ذات تھی۔ مگر جیسے ہی ہماری گاڑیاں حویلی کے بلند و بالا چھانک کے سامنے پہنچیں اندر کھلی سی جی تھی۔ گیٹ کے نیچے سے کئی افراد کے بے چین پاؤں دکھائی دے رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی نیچے اترتا کسی نے ایک چھوٹی سی کھڑکی کھولی اور لٹکارنے والے انداز میں کہا۔

”کون ہے؟“

وسم نے شیشہ نیچے کر کے بلند آواز میں کہا۔ ”ہم ملک صاحب سے ملنے آئے ہیں۔“

”کون ہو سامنے آکر شناخت کراؤ۔“ بولنے والے نے کمر درے لہجے میں کہا۔

”بکومت۔“ وسم گرم ہو گیا۔ ”تم مجھے جانتے نہیں ہو، جا کر ملک صاحب کو بلاؤ۔“

جواب میں ایک فائر ہوا اور گولی گاڑی کے سامنے زمین پر لگی۔ ”اگلی گولی گاڑی پر لگے گی۔ اس سے پہلے نیچے اتر آؤ اور اپنی شناخت کراؤ۔“

میرا ماتھا ٹٹکا اور میں نے وسم سے کہا۔ ”کوئی گڑبڑ ہے ورنہ اس طرح اپنے دروازے پر آئے آدمی کا

استقبال کوئی نہیں کرتا ہے۔“

”میرا خیال ہے مجھے نیچے اتر کر بات کرنی چاہیے۔“ وسم بولا اور میرے کچھ کہنے سے پہلے نیچے اتر گیا۔

وہ گیٹ کی کھڑکی کے پاس گیا۔ ”کیا بات ہے اس سے پہلے کبھی یہاں میرا استقبال گولی سے نہیں ہوا ملک شفتت

اللہ کہاں ہے؟“

”ملک صاحب اندر ہیں اپنا نام بتاؤ اور یہ بھی کہ اتنی گاڑیوں کے ساتھ اس وقت یہاں کیوں آئے ہو؟“

”گلتا ہے تم کچھ زیادہ ہی ڈرتے ہو۔“ وسم نے طنز کیا۔ ”نام اور یہاں کیوں آیا ہوں یہ میں صرف ملک

شفتت اللہ کو بتاؤں گا اور ہاں اب گولی چلانے سے پہلے سوچ لینا اسلحہ ہمارے پاس بھی ہے۔“

اس بار اندر سے کوئی جواب نہیں آیا اور جو کھڑکی کھلی تھی وہ بھی بند ہوگئی وسم ڈرا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو

گیا۔ اس نے معمول کا لباس پہن رکھا تھا اور یہاں خاصی سردی تھی۔ اس طرح کل کر کھڑے ہونے سے اسے

یقیناً زیادہ سردی لگ رہی ہوگی لیکن وہ برداشت کر رہا تھا۔ جس وقت وسم گاڑی سے اترتا تھا میں نے پیروں کے

پاس موجود خود کار رائل ہاتھ میں لے لی تھی مجھے یقین تھا کہ وسم کے ساتھی بھی پوری طرح تیار ہوں گے۔ تقریباً پانچ منٹ بعد کھڑکی دوبارہ کھلی اور ایک انجینی آواز آئی۔ ”کون ہو تم اور مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟“

”ملک شفتت اللہ تمہاری حویلی پر آج سے پہلے میرا اس طرح استقبال نہیں ہوا۔“ وسم نے ذرا گے جا کر

کہا۔ ”اگر تمہاری آنکھوں میں اب بھی مروت باقی ہے تو مجھے پہچان لو۔“

”وسم۔“ اس نے حیرت سے کہا۔

”شکر ہے۔“ وسم ہنسا۔ ”تمہاری آنکھوں میں اتنی مروت تو ہے اب یہ بتاؤ کہ میرا اس طرح استقبال

کیوں ہوا ہے؟“

”ایک منٹ۔“ ملک شفتت اللہ نے مضطرب لہجے میں کہا۔ ”یہ بتاؤ تمہارے ساتھ کون ہے؟“

”میرے ساتھی ہیں، ہم ایک کام سے آئے تھے اُس طرف سے گزرتے ہوئے رات ہوگئی میں نے سوچا

تمہیں ایک رات کے لیے زحمت دوں مگر مجھے معلوم نہیں تھا۔“

”بس..... بس مجھے افسوس ہے۔“ ملک شفتت اللہ نے اس کی بات کاٹی۔ ”تم پانچ سال بعد آئے ہو اور

میرے آدمیوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جو تمہیں پہچان سکے۔“

وسم نے ظاہر کیا کہ اس نے سخت بے عزتی محسوس کی ہے اور وہ بادل ناخواستہ ملک کی معذرت قبول کر رہا

ہے۔ گیٹ کھل گیا اور ہماری گاڑیاں حویلی کے احاطے میں داخل ہو گئیں۔ یہاں بڑا سامن تھا جو سرخ پکی

اینٹوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ یہاں پہلے سے تین عدد بڑی گاڑیاں کھڑی تھیں لیکن اس کے باوجود خاصی جگہ تھی ہماری

چاروں گاڑیاں بھی آرام سے پارک ہو گئیں۔ اندر داخل ہوتے ہی ملک شفتت اللہ نے لپک کر وسم کو گلے لگایا

اور پھر وسم نے میرا تعارف کرایا۔ ”یہ شہباز صاحب ہیں، میرے دوست اور بہت اچھے ساتھی ہیں۔“

ملک نے مجھے بھی گلے لگے لگایا۔ وہ تقریباً چالیس چالیس برس کا گھٹے ہوئے جسم کا کسی قدر پستہ قد شخص تھا۔

اس نے کسی قدر جذباتی لہجے میں کہا۔ ”اگر اس وقت میں خدا سے کچھ اور مانگ لیتا تو وہ بھی مل جاتا۔“

وسم نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔ ”ملک صاحب خیریت ہے میں تمہارے لہجے میں پریشانی محسوس

کر رہا ہوں۔“

”بتاتا ہوں لیکن پہلے تم اپنے ساتھیوں کے بارے میں بتاؤ۔“

وسم نے سب کا مختصر تعارف کرایا اور جہانگیر علیہ ملک شفتت اللہ سمجھ گیا کہ اس کے مرتبے کے مطابق

صرف میں اور وسم تھے اس نے ہمارے ساتھیوں کو اپنے ملازموں کے حوالے کیا اور خود ہمیں اندر لے آیا۔

مردانے میں ایک شاندار انداز میں جی ہوئی نشست گاہ تھی جہاں آتش دان میں آگ جل رہی تھی۔ اس نے سب

سے پہلے کھانے کا پوچھا اور ہم نے بلا تکلف اقرار کیا کہ ہم سب ہی بھوکے تھے۔ اس نے ایک ملازم کو بلا کر اسے

کھانا کا کہہ کر فوری طور پر خشک میوہ اور قہوہ حاضر کرنے کا حکم دیا۔ وسم نے اسے ہوا بھی لگنے نہیں دی تھی کہ ہم

کہاں سے آرہے تھے اور کس لیے آئے تھے۔ وہ اسے ایسا تاثر دے رہا تھا جیسے وہ ابھی تک اسی دھندے میں

ہے۔ قہوہ اور خشک میوہ چند منٹ میں آگئے۔ یہ بہترین قسم کا خوشبودار قہوہ تھا اور خشک میوے بھی اعلیٰ درجے کا تھا

اس لیے میں نے ان سے انصاف میں کوتاہی نہیں کی۔ وسم نے کچھ دیر بعد ملک شفتت اللہ سے پوچھا۔

”تم کچھ کہہ رہے تھے۔“

اس نے بلا تکلف اپنی بات کہہ دی۔ ”میں سخت مشکل میں ہوں اور مجھے مدد کی ضرورت ہے۔“

”کیسی مشکل ہے اور میں کیا مدد کر سکتا ہوں۔“

”مشکل ایک لڑکی ہے جو خانہ بدوشوں کی ہے اور اسے میرے بیٹے نے حویلی میں پناہ دے دی ہے۔

اب وہ اپنی لڑکی واپس مانگ رہے ہیں لیکن میرا بیٹا اس کے چکر میں آ گیا ہے اور وہ کسی صورت اس لڑکی کو واپس کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔“

مجھے حیرت ہوئی کہ ملک شفقت اللہ کا بیٹا کتنا بڑا تھا جو ابھی سے لڑکیوں کے معاملے میں اپنے باپ سے مقابلے بازی پر اتر آیا تھا۔ ملک شفقت اللہ اپنے لہجے سے پڑھا لکھا لگ رہا تھا۔ اس نے بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”دودن پہلے حویلی پر حملہ ہوا اور میرا ایک آدمی مارا گیا دوسرا زخمی ہو کر اسپتال میں پڑا ہے۔“

”تم نے پولیس میں رپورٹ نہیں لکھوائی؟“ وسیم نے حیرت سے کہا۔ ”تم یہاں کے با اثر آدمی ہو۔“

”میں نے رپورٹ لکھوائی ہے اور میں ان حرازدوں کو بھی دیکھ لیتا لیکن ملک ریاض ان کی مدد پر اتر آیا۔

تم جانتے ہو ہمارے درمیان پرانی خصامت ہے۔“

”ملک ریاض کیوں ان کی مدد کر رہا ہے؟“

”اس کے پاس موقع ہے آنے والے انتخاب سے پہلے وہ مجھے جو نقصان پہنچا سکتا ہے پہنچا دے۔ اس

نے پانچ سال میں علاقے کے لیے کچھ نہیں کیا ہے اور اب کوئی اسے دوث نہیں دے گا۔“

یہ کہتے ہوئے ملک شفقت کے لہجے میں امید آگئی تھی کہ شاید عوام اب اسے دوث دیں گے حالانکہ ایم

این اے ایم پی اے بن کر ملک صاحب نے وہی کرنا تھا جو ان کا حریف کہہ رہا تھا۔ میں خاموشی سے سن رہا تھا

در سوچ رہا تھا کہ ہمیں صبح ہوتے ہی یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے کیونکہ ہم مزید کسی چکر میں نہیں پڑ سکتے تھے۔

کچھ دیر میں کھانا آ گیا تھا۔ یہ خاص دیہاتی طرز کا مرغین اور بھنا ہوا کھانا تھا۔ ملک شفقت اپنی داستان سنا کر چپ

ہو گیا تھا اور وسیم نے بھی سوائے ہمدردی کے کوئی خاص تبصرہ نہیں کیا تھا جس پر وہ بھج گیا تھا لیکن میرا اندازہ تھا وہ

وسیم سے بات ضرور کرے گا۔ کھانے کے بعد ملک کا ملازم ہمیں کمرے دکھانے آیا۔ مہمان خانے میں ہمیں الگ

الگ کمرے ملے تھے۔ یہ بہت پرورش تو نہیں تھے لیکن دیہات کے لحاظ سے اچھے کمرے تھے سب سے اہم بات

کہ یہاں سردی سے بچاؤ کا انتظام تھا۔ کچھ دیر بعد وسیم میرے کمرے میں داخل ہوا۔

”مجھے ملک نے بلایا ہے میرا خیال ہے وہ اس معاملے میں مجھ سے مدد کا طالب ہوگا۔“

”تم جانتے ہو ہمیں فی الحال اپنی مدد آپ کی ضرورت ہے۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”اس لیے تم

مناسب انداز میں اسے ٹال دو۔ ہم صبح ہوتے ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔“

”میں نے بھی یہی سوچا ہے۔“ وسیم نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ ”آپ آرام کریں اگر کوئی معاملہ ہوا تو

میں دیکھ لوں گا۔“

میں نے جوتے اتارے اور بستر پر دراز ہو گیا۔ یہاں ایک شاندار غیر ملکی کبیل موجود تھا۔ سارے دن کی

بھاگ دوڑ کے بعد اب ذرا سکون کا موقع ملا تھا۔ حویلی والا ٹھکانہ ہاتھ سے گیا تھا لیکن ہم نے اکرم چشتی جیسے

زہریلے سانپ کا زہر ہمیشہ کے لیے نکال دیا تھا اور نادر دوبارہ ہمارے ہاتھ میں آ گیا تھا وہ نہایت اہم مہرہ تھا اور اس کی وجہ سے مرشد میرے سامنے مجبور ہو رہا تھا اس کی مجبوری بھائی سے محبت نہیں تھی۔ نادر کی گمشدگی کا ذمے دار اسے قرار دیا جا رہا تھا اور اسے اپنی پوزیشن بچانی تھی۔ اس لیے وہ میرے مقدمات ختم کرنے کو تیار ہو گیا تھا اگرچہ مجھے اب بھی شک تھا کہ مرشد اتنی آسانی سے میرے خلاف مقدمات ختم کرا دے گا۔ اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہاں بھی موبائل سنگل نہیں تھے ورنہ میں ندیم سے تصدیق کر لیتا کہ مرشد کے وکیل نے اس سے رابطہ کیا تھا یا نہیں۔

وسیم کی واپسی نہ جانے کب ہوئی تھی مجھے نہیں پتا چلا کیونکہ میں سو گیا اور پھر میری آنکھ شور سے کھلی تھی۔ باہر سے کچھ افراد کے چلانے کی آواز آرہی تھی اور پھر فائر ہوا۔ اس کے بعد تو ایسا لگا جیسے حماد جنگ کھل گیا ہے۔ ہمارے بڑے ہتھیار گاڑیوں میں تھے لیکن میں اور وسیم پستولوں سے مسلح تھے۔ میں اٹھا تھا کہ وسیم اندر آیا۔ ”میرا خیال ہے خانہ بدوشوں یا ملک ریاض کے آدمیوں نے پھر حملہ کیا ہے؟“

”ملک ریاض کون ہے؟“

”ایک مقامی جاگیر دار ہے لیکن ملک شفقت کے مقابلے میں زیادہ زمینوں اور زیادہ اثر و رسوخ کا مالک ہے۔ پھر ایم پی اے بھی ہے اور حکومتی پارٹی کا حصہ ہے اس لیے ملک شفقت اس سے دبتا ہے۔ ساتھ ہی اس کا مقابلہ کرنے کی تیاری بھی کر رہا ہے۔“

”اتفاقاً کافی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اب ذرا معلوم کرو کہ باہر کیا صورت حال ہے۔“

”صورت حال اچھی نہیں ہے۔“ وسیم نے کہا اور باہر چلا گیا۔ اس کا کہنا درست تھا۔ صورت حال صرف ملک شفقت نہیں ہمارے لیے بھی اچھی نہیں تھی۔ اگر دشمن نے باہر گھیر ڈال لیا تھا تو ہم بھی اندر گھر گئے تھے اور اگر وہ کسی طرح نکل جاتے تب ان سے بڑی مصیبت پولیس کی صورت میں نازل ہو جاتی۔ بہر حال میں اتنا پوس نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ صورت حال اتنی خراب نہ ہو جتنی اس وقت بہ ظاہر لگ رہی تھی۔ وسیم رپورٹ لے کر آتا اس کے بعد ہی درست اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ اگر ہم لڑ بھڑ کر یہاں سے نکل سکتے تب بھی غنیمت تھا۔ یہ پولیس کا سامنا کرنے سے بہتر ہی ہوتا۔ ابتدائی اندھا دھند فائرنگ کے بعد اس میں بتدریج کمی آنے لگی۔ مگر دس منٹ بعد وسیم اندر آیا تو اس کی صورت سے اندازہ ہو گیا کہ صورت حال تقریباً اتنی ہی خراب ہے جتنی کہ نظر آرہی ہے۔ ”گڑبڑ ہو گئی ہے۔“ وسیم نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”باہر کم سے کم بچپوس تین مسلح آدمی موجود ہیں اور انہوں نے حویلی کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔“

”رات کو تم نے ملک شفقت سے کیا کہا تھا؟“

”یہی کہ فی الحال میں اس کا ساتھ نہیں دے سکتا مجھے فوری واپس جانا ہے۔ اس کا موڈ خراب ہوا تھا لیکن میں نے پروا نہیں کی تھی۔“

”لیکن اب شاید یہاں سے نکلنا آسان نہیں ہوگا۔“ میں نے کہا۔ اس دوران میں فائرنگ رک گئی تھی مگر یہ عارضی وقفہ تھا باہر موجود افراد نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا تھا اور اب وہ اندروالوں کے رومل کا انتظار کر رہے تھے۔ ”ملک شفقت نے پولیس کو اطلاع دی؟“

وسم نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہاں ایک فون ہے اور وہ بھی باہر سے کاٹا جا چکا ہے۔ موبائل کے سگنل نہیں ہیں۔“

میں نے سکون کا سانس لیا۔ ”یہ اچھا ہی ہوا ورنہ ہم ایک اور مصیبت میں پھنس جاتے۔“
”لیکن ہمارے پاس ایک ذریعہ ہے۔“ وسم نے سرگوشی میں کہا۔ ”آپ سیٹلائٹ فون بھول رہے ہیں۔“

”ملک شفقت کو اس کی ہوا بھی مت لگنے دینا۔“ میں نے جوابی سرگوشی کی۔ ”یہاں حویلی میں بندوں اور اسلحے کی کیا پوزیشن ہے؟“

”ملک شفقت کے ساتھ ایک درجن آدمی ہیں اسلحے کی پوزیشن بھی ٹھیک ہے ان کے پاس جدید ترین خود کار اسلحہ ہے اور ایمنیشن بھی ٹھیک ٹھاک ہے مگر یہ محصور ہیں اور حملہ آور آزاد ہیں۔ اگر انہوں نے کوئی حربہ استعمال کیا تو ہم چھوٹے ہو کر طرح مارے جاسکتے ہیں۔“

”آگ یا گیس؟“ میں نے اس کی بات پر غور کیا۔

”بالکل دونوں صورتوں میں یہاں موجود افراد تھما کر ڈالنے پر مجبور ہو جائیں گے۔“

”میرا خیال ہے ایسا وقت آنے سے پہلے ہمیں کچھ کرنا چاہیے۔“

”کیا کرنا چاہیے؟“

”سب سے پہلے ہمیں یہاں کا مکمل جائزہ لینا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”ہمیں اور ہمارے آدمیوں کو مکمل آزادی ہونی چاہیے اس کے بعد ہی ہم صورت حال کو کنٹرول کر سکتے ہیں۔“

ملک شفقت سخت سردی کے باوجود حویلی کے سامنے والے کھلے حصے میں موجود تھا اور اپنے آدمیوں کو ہدایت دے رہا تھا ایک بیس بائیس سال کا لیکن ہٹا کٹا نوجوان جس نے بڑی کٹاری دار مونچھیں رکھی تھیں اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ شاید وہ اس کا دبی پر خوردار تھا جس کی وجہ سے یہ آفت نازل ہوئی تھی۔ میں نے ملک شفقت سے کہا۔ ”ملک صاحب یہ کیا چکر ہے، اگر ایسا کوئی خطرہ تھا تو رات کو ہی بتا دیجئے۔“

”تم کیا کرتے؟“ ملک کے بھائے نوجوان نے اکڑ لہجے میں کہا۔

”ہم اسی وقت کوئی فیصلہ کر لیتے اب تو ہم بھی پھنس گئے ہیں۔“

”تو ہم نے کیا تھا آنے کو۔“ نوجوان کا لہجہ مزید تیز ہو گیا۔

وسم نے اسے گھورا۔ ”آرام سے بات کرو۔“

”رفاقت ٹوچ کر۔“ ملک نے اسے گھورا۔ ”ساری مصیبت تیری لائی ہوئی ہے۔“

ملک شفقت کو احساس تھا کہ اس مشکل وقت میں ہم اس کے کام آسکتے تھے اس لیے وہ نرم بلکہ کسی حد تک جھکے انداز میں بات کر رہا تھا۔ حالانکہ میں نے خاصے اکڑا انداز میں بات کی تھی اور رفاقت کا رد عمل بالکل درست تھا مگر جواب میں اسے باپ سے جھماکے لگانے کوئی تھی۔ وہ جیسے ہو کر ہمیں گھورنے لگا تھا۔ ملک نے میری طرف دیکھا۔ ”شہباز صاحب مجھے افسوس ہے لیکن مجھے خود اندازہ نہیں تھا کہ یہ اتنی دلیری دکھائیں گے۔“

”حالانکہ وہ ایک بار پہلے بھی دلیری دکھا چکے ہیں اور تمہارا ایک بندہ مار چکے ہیں۔“ میں نے تلخ لہجے

میں کہا۔ ”قصور بھی تمہارا ہے یہ خانہ بدوش اپنی عورتوں کے معاملے میں بہت حساس ہوتے ہیں۔“
اس بار ملک شفقت نے قہر آلود نظروں سے اپنے لخت جگر کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”میں نے اسے بہت سمجھایا لیکن یہ سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہے حالانکہ اس لڑکی سے اس کا کوئی رشتہ بھی نہیں ہے۔“

”بابا باب وہ میری پناہ میں ہے۔“ رفاقت نے بھڑک کر کہا۔ ”اگر اس کو نکالا تو میں بھی باہر چلا جاؤں گا۔“
ملک رفاقت کم عمری کے جذبات سے بھڑک رہا تھا اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس نے نہ صرف اپنے باپ اور حویلی کے لوگوں کو کتنی مشکل میں ڈال میں دیا تھا بلکہ اس کی وجہ سے ہم بھی مشکل میں پڑ گئے تھے۔ میں ان خانہ بدوشوں کو بھگت چکا تھا اور مجھے اچھی طرح معلوم تھا یہ کتنے خطرناک اور ضدی ہوتے ہیں اگر وہ لڑکی کو لینے کا عزم نہ کر آئے تھے تو اسے لیے بغیر واپس نہیں جاتے۔ میں نے ملک سے پوچھا۔ ”انہوں نے کوئی بات کی ہے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”ایک آدمی ذرا آگے آیا تھا اور اس نے کہا ہے کہ اگر ایک گھنٹے کے اندر لڑکی کو حوالے نہیں کیا گیا تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

”آپ کی کیا پوزیشن ہے؟“

”میرے پاس درجن آدمی ہیں لیکن باہر تین گنا زیادہ لوگ ہیں اور وہ کچھ بھی کرنے کے لیے آزاد ہیں۔“
میں ملک کو ایک طرف لے آیا۔ ”ملک صاحب میں ان خانہ بدوشوں کو بھگت چکا ہوں یہ نہایت خطرناک اور مرنے مارنے والے لوگ ہیں۔ پھر نہایت ضدی ہوتے ہیں جو ایک بار ملے کر لیں اس پر ڈٹ جاتے ہیں۔ یہ اسلحے کے بغیر بھی خطرناک ہو سکتے ہیں۔“

”وہ کیسے؟“

”یہ آتش زنی کے ماہر ہوتے ہیں باہر سے آپ کی حویلی کو آگ لگا سکتے ہیں اور آپ خود سوچ سکتے ہیں یہاں آگ لگ گئی تو ہمارے پاس باہر لگنے کے سوا اور کیا راستہ ہوگا اور باہر وہ خود بیٹھے ہیں۔ یہ بتائیں کہ آپ کی فیملی بھی یہاں موجود ہے؟“

ملک شفقت کا رنگ سفید پڑ گیا۔ ”ہاں میری دونوں بیویاں اور بچے ہیں یہاں۔“

حویلی دو منزلہ تھی اس کا سامنے کا مچلا حصہ سارے کا سارا مردانے پر مشتمل تھا۔ زنانہ اور بچوں کا آغاز ہوتے ہی تمام عورتوں اور بچوں کو درمیان میں ایک کمرے میں منتقل کر دیا گیا تھا جہاں گولی کی رسائی نہیں تھی۔ میں نے ملک سے کئی سوالات اور کیے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ باہر سے کسی مدد کی امید نہیں تھی۔ بچے گاؤں میں سارے غریب غربا تھے جو ملک شفقت کی زمینوں پر کام کر کے بس اتنا حاصل کرتے تھے کہ دو وقت پیٹ بھر کر کھا سکیں ان کے پاس اسلحہ نہیں تھا اور نہ ہی وہ کسی اور طریقے سے ملک شفقت کی مدد کر سکتے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اپنے حرا رعوں کے ساتھ ملک شفقت کا سلوک اچھا نہیں تھا اس لیے وہ ان سے بڑا امید بھی نہیں تھا۔ درحقیقت مجھے ملک شفقت اور اس کے آدمی بھی بودے لگ رہے تھے۔ وہ صرف کمزوروں پر اکڑنے والے لوگ تھے اور جب اپنے ہم پلہ لوگوں سے واسطہ پڑا تھا تو ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھی۔ میں نے وسم سے کہا۔ ”سامان میں نائٹ ویرن ہیں ذرا وہ نکالنا۔“

دسم ایک گاڑی سے ٹائٹ وین اور دو عدد نائٹ گلاز نکال لایا۔ ملک شفقت کے ساتھ ہم ادھر آئے۔ اس کی عورتیں ایک طرف تھیں اس لیے اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور وہ کمر بھی نہیں سکتا تھا ہم اس کی مدد کر رہے تھے۔ یہاں سے منظر اتنا واضح نہیں تھا اس لیے ہم چھت پر نکل آئے یہاں بلا کی سردی تھی اور ہم اتنے گرم کپڑوں میں نہیں تھے۔ ملک شفقت نے ہمارے لیے سیاہ گرم چادریں منگوادیں۔ یہ ہمیں سردی سے بچانے کے ساتھ کیو فلال بھی کر رہی تھی۔ چھت سے باہر کا منظر واضح تھا۔ حویلی کے سامنے ایک چھوٹا سا میدان اور پھر سڑک تھی سڑک نیچے تھی اور اس کے ساتھ پتھروں کی دیوار تھی۔ محاصرہ کرنے والے اسی دیوار کے پیچھے تھے۔ ٹائٹ وین سے ان کے ہولے صاف محسوس کیے جاسکتے تھے۔ سامنے درجن سے زیادہ افراد تھے۔ دائیں بائیں ڈھلان کے ساتھ باغات اور ان سے نیچے کھیت تھے۔ باغوں کی چار دیواری تھی اور دائیں بائیں موجود حملہ آور ان دیواروں کی اوٹ میں تھے۔ عقب میں حویلی کے ساتھ بہت ترچھی ڈھلان تھی۔ دراصل حویلی کا پچھلا حصہ بڑھایا گیا تھا اور اس نے ڈھلان کو گھیر لیا تھا نتیجے میں یہ ڈھلان بہت زیادہ ترچھی ہو گئی تھی اور مٹی کو روکنے کے لیے اسے پتھر سینٹ کی مدد سے لگا کر پختہ کر دیا گیا تھا۔ یہ ڈھلان والا حصہ دائیں بائیں موجود حملہ آوروں کی زد میں تھا۔ اول تو یہاں سے کوئی جان نہیں سکتا تھا اور اگر وہ جانے کی کوشش کرتا تو لازمی محاصرہ کرنے والوں کی نظر میں آ جاتا اس کے بعد اس کا بچنا محال تھا۔ گاؤں کوئی دو سو گز نیچے تھا اور اب وہاں بیشتر گھروں میں روشنیاں گل کر دی گئی تھیں۔ محاصرہ کرنے والوں کی تعداد اندازے سے زیادہ تھی وہ کم سے کم چالیس تھے۔ میں نے ملک سے پوچھا۔

”ان کی دی ہوئی مہلت میں کتنا وقت باقی ہے؟“

”میں منٹ۔“ اس نے سرگوشی میں جواب دیا وہ چھت پر ہمارے ساتھ ہی دیکھا ہوا تھا۔ آسمان پر چاند تھا اور کبھی کبھی بادلوں سے نکل آتا تھا اس لیے ہمیں محتاط ہونا پڑ رہا تھا۔ اس وقت تین بج رہے تھے۔ گویا خانہ بدوش نصف رات کے بعد کسی وقت یہاں آئے تھے۔

”باغات میں آدی نہیں ہوتے ہیں؟“

”ہاں لیکن دو بندے ہوتے ہیں۔“ ملک نے مایوسی سے کہا۔ ”وہ تو آرام سے ان کے ہاتھ لگ گئے ہوں گے۔“

پچھلی بار حملہ اسی طرح رات کو ہوا تھا۔ خانہ بدوش خاموشی سے حویلی کے پاس آ گئے تھے لیکن ایک محافظ نے بروقت دیکھ لیا اس نے لکڑا تو خانہ بدوشوں نے فائر کھول دیا اور محافظ مارا گیا۔ جوابی فائرنگ کے بعد حملہ آور بھاگ گئے لیکن ملک شفقت کا ایک آدی اور زخمی کر گئے تھے۔ خانہ بدوشوں کو کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ اس روز وہ شاید بے خبری میں حملہ کرنا چاہتے تھے مگر آج وہ پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے میں نے پوچھا۔ ”جہیں یقین ہے ملک ریاض ان کی مدد کر رہا ہے۔“

”ان کو اس طرح دیکھ کر بھی پوچھ رہے ہو؟“ اس نے تعجب سے جواب دیا۔ تو میں نے اتفاق کیا۔ خانہ بدوش خطرناک ہوتے ہیں لیکن وہ مارو اور بھاگ جاؤ کی حکمت عملی پر عمل کرتے ہیں اس طرح باقاعدہ محاصرہ کر کے بیٹھ جانا ان کی فطرت کے خلاف ہے کیونکہ وہ پاؤں تلے زمین نہ ہونے کی وجہ سے کمزور ہوتے ہیں۔

خانہ بدوشی ان کی طاقت بھی ہے کہ وہ کام کر کے نکل جاتے ہیں مگر اس لحاظ سے کمزوری بھی ہے کہ وہ کہیں جم کر کسی کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں۔ اس وقت ان کا انداز بتا رہا تھا کہ انہیں کسی طاقتور کی مدد حاصل ہے اور وہ طاقتور ملک ریاض ہی ہو سکتا تھا۔ یہ دو سیاست دانوں کی جنگ تھی۔ ملک ریاض کی خوش قسمتی کہ اس کے ہاتھ اپنے مستقبل کے حریف کی کمزوری آگئی تھی اور وہ اس کا پورا فائدہ اٹھا رہا تھا۔ ملک رفاقت کی عاشق مزاجی اس کے باپ کو پہنچی پڑنے والی تھی۔ ابھی تک میں خود کو ملک شفقت کی مدد کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ہماری لڑائی نہیں تھی اور ہم اس میں شامل ہو کر بلاوجہ ایک دشمن کا اور اضافہ کر لیتے۔ میں نے دسم کو ایک طرف لے گیا۔ ”میرا خیال ہے ہمیں ان سے بات کرنی چاہیے۔“

دسم نے میری بات پر غور کیا۔ ”ہم کیا بات کر سکتے ہیں؟“

”دیکھو اس معاملے سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے اگر ہم یہاں سے جانا چاہیں۔“

”بات کر لیتے ہیں لیکن اگلا بندہ کیا فیصلہ کرتا ہے یہ وہی بتا سکے گا۔“

میں واپس ملک شفقت کے پاس آیا۔ ”میں خانہ بدوشوں سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”کر لیں۔“ اس نے بے دلی سے جواب دیا۔ ”مجھے امید نہیں ہے کہ یہ بات مانیں گے۔“

”آپ کو ان سے نہیں اپنے بیٹے سے بات کرنے کی ضرورت ہے۔ اسے سمجھائیں اگر لڑکی واپس نہیں کی تو حویلی کے دوسرے لوگ بھی متاثر ہو سکتے ہیں۔“

”وہ بہت ضدی ہے میں اسے ہر طرح سے سمجھا چکا ہوں۔“

”جب اس کے ساتھ ضدی بچوں والا سلوک کریں۔“ میں نے کہا۔ ”میں بات کرتا ہوں لیکن مجھے اس معاملے کا یہی ایک حل نظر آ رہا ہے جس میں سب کی بچت ہے۔“

میں نیچے آیا۔ خانہ بدوشوں کے دیئے وقت میں سے صرف پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ پولیس سے بچنے کے لیے ہم نے مانہمرہ کا رخ کیا تھا جیسے گیدڑ شامت سے بچنے کے لیے شہر کا رخ کرتا ہے اور شامت وہیں اس کی منتظر ہوتی ہے۔ ایسا ہی ہمارے ساتھ بھی ہوا تھا۔ گیٹ کے ساتھ والی چھوٹی کھڑکی کھول کر میں نے بلند آواز سے کہا۔ ”سامنے آؤ میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”کو کون ہے؟“ سڑک کی طرف سے آواز آئی۔ سڑک یہاں سے کوئی بیس پچیس گز کی دوری پر تھی۔

”میں ملک شفقت کا ایک مہمان ہوں اور تمہارے سردار سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں بات کر رہا ہوں۔“ وہ آدی بولا میرا بھی یہی اندازہ تھا کہ وہ سردار ہوگا کیونکہ ان میں پردو کوئل کے مطابق صرف سردار ہی بات کر سکتا تھا۔

”سردار ہم کل رات یہاں آئے تھے اور صبح ہمیں چلے جانا ہے ہمارا اس معاملے سے تعلق نہیں ہے۔“

”تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”یہی کہ ہمیں یہاں سے جانے دیا جائے۔“ میں نے مطلب کی بات کی۔

”ٹھیک ہے۔“ سردار نے جواب دیا۔ ”تم میں سے جو مہمان ہے وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آ جائے ہم اطمینان

کر لیں کہ وہ واقعی مہمان ہے تو اسے جانے کی اجازت مل جائے گی۔“

بند ہو جانے والی روشنیاں دوبارہ آن ہو گئیں۔ دسم کے آدمی اپنا کام پھرتی سے مکمل کر چکے تھے میں ملک شفقت کی طرف آیا جو افسوس سے اپنی جل جانے والی چپ دیکھ رہا تھا۔ ”ملک صاحب..... آپ نے دیکھ لیا کہ یہ کس قدر خطرناک لوگ ہیں اور کیا کر سکتے ہیں۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں ان حرامیوں کو چھوڑوں گا نہیں۔“

میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”ملک صاحب ہوش میں آئیں، ایسی ایک دودر جن بتلیں اور آکر گریں تو یہ حویلی راکھ کا ڈھیر بن جائے گی۔ جو آگ سے بچ گئے وہ گولیوں سے مارے جائیں گے۔ یہ خود کشی ہوگی۔ کوئی عقل کا فیصلہ کریں۔“

ملک شفقت نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ”تم کون ہوتے ہو میری حویلی میں مجھ پر حکم چلانے والے۔“

”میرا خیال ہے تمہارا دماغ قابو میں نہیں ہے۔“ میں نے برہمی میں ادب و آداب بالائے طاق رکھ دیئے۔ ”تم دیکھ نہیں رہے ہو وہ کیا کرنے والے ہیں۔“

جواب میں ملک شفقت نے خانہ بدوشوں کے خلاف گالیوں کا دریا بہا دیا تھا ایسا لگ رہا تھا اس حملے نے اس کی دماغی حالت کو متاثر کیا تھا اس کی بک بک سن کر اس کا فرزند ارجمند دوڑ آیا۔ ”کیا ہوا بابا؟“

ملک شفقت نے دھاڑ کر حکم دیا۔ ”اوائے ان لوگوں کی.....“ آگے کی گفتگو ناقابل بیان تھی اور اس کا ایک ہی مطلب نکلا تھا کہ خانہ بدوشوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا جائے۔

میں چلایا۔ ”تمہارا دماغ چل گیا ہے۔“

”بکواس نہ کر۔“ ملک رفاقت نے اچانک ہستول نکال کر میری طرف سیدھا کیا۔ ”تو بھی ان کا ساتھی ہے پہلے تجھ سے منٹے ہیں۔“

اس موقع پر مجھے لگا کہ اب مجھے اور میرے ساتھیوں کو حرکت میں آ جانا چاہیے۔ میں نے ملک رفاقت کا ہستول والا ہاتھ تمام کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ ایک فائر ہوا گولی دروازے پر لگی اور دوسرا فائر کرنے سے پہلے میں نے اسے سمجھا کر اس کی گردن بازو میں جکڑتے ہوئے اس سے ہستول چھین کر اسی کے سر سے لگا دیا۔ لڑکے کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ مجھے شوٹ کرنے والا تھا اور اگر میں ایک لمحے کی تاخیر کرتا تو شاید وہ گولی چلا بھی دیتا۔ میرے فوری فیصلے نے میری جان بچالی تھی۔ اس سے پہلے ملک شفقت اور اس کے آدمی کچھ کرتے میں نے انہیں خبردار کیا۔ ”کوئی حرکت نہ کرے ورنہ یہ مارا جائے گا۔“

ملک شفقت کا ہاتھ جیب کی طرف جاتے جاتے رک گیا اور اس کے آدمیوں نے اپنے ہتھیاروں کا رخ میری طرف کر دیا تھا۔ دسم کچھ دور تھا اس نے اپنا ہستول ملک شفقت کی طرف سیدھا کر دیا۔ دونوں باپ بیٹے زد میں آئے تو ان کے آدمیوں کے ارادے کمزور پڑ گئے۔ دسم کے آدمی بھی حرکت میں آ گئے تھے اور انہوں نے اپنا اسلحہ نکال لیا تھا۔ میں نے ملک شفقت سے کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کہو ہتھیار چھینک دیں۔“

”رفاقت ٹھیک کہہ رہا تھا۔“ ملک شفقت نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ”تم ان لوگوں سے ملے ہوئے ہو۔“

”ہم کسی سے نہیں ملے ہوئے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ہم تمہیں صرف خود کشی سے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تم ان خانہ بدوشوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہو۔“

”یہ دھوکا دے رہا ہے۔“ میرے پاس کھڑے دسم نے سرگوشی کی۔

”مجھے بھی معلوم ہے یار، میں دیکھنا چاہ رہا ہوں کہ یہ کیا کہتے ہیں۔“

”وقت پورا ہونے والا ہے۔“ سردار نے پکار کر کہا۔ ”ملک سے کہو کہ جواب دے تاکہ پھر ہم اسے جواب دیں۔“

ملک بھی گیٹ کے پاس آ گیا تھا۔ سردار کے دھمکی آمیز لہجے پر وہ برہم ہو گیا اور اس نے چلا کر کہا۔ ”تم

لوگ ملک ریاض کی مدد پر آ کر رہے ہو ورنہ ہمارے جوتے چاٹنے والوں میں سے ہو۔“

”ہاں ہم تمہارے جوتے چاٹتے تھے لیکن اب وہ دور گزر گیا ہے اور اگر ہماری لڑکی واپس نہ لی تو تم دیکھو گے ہم کیا کرتے ہیں۔“

”کیا کر لو گے تم؟“ ملک شفقت جو دیسے تو متحمل مزاج اور کسی قدر ڈرا ہوا تھا مگر اس وقت آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

”بس ایک منٹ رہ گیا ہے۔“ سردار نے کہا۔ ”پھر تم دیکھ لو گے کہ ہم کیا کرتے ہیں۔“

مجھے تشویش لاحق ہونے لگی۔ سردار کا لہجہ بتا رہا تھا اس کے پاس ہمارے لیے کوئی سر پرانز تھا۔ حویلی فائرنگ سے محفوظ تھی اس کی دیواریں دس سے بارہ فٹ بلند اور خاصی موٹی پتھروں سے بنی تھیں۔ اوپری منزل بھی محفوظ تھی۔ میں نے دسم سے کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کہو گاڑیوں سے گولہ بارود نکال کر اندر لے جائیں۔“

”گولہ بارود۔“ ملک شفقت چونکا۔

”ملک صاحب ہم سبزی کے آدھی نہیں ہیں جو آلو پیاز لے کر گھومیں۔“ دسم نے ہنس کر کہا۔ ”ہمارے

پاس تو اسی قسم کی چیزیں ہوتی ہیں۔“

اسی لمحے کوئی چیز شوش سے ہمارے سروں سے گزری اور صحن میں کھڑی ملک شفقت کی جیب پر جا گری۔ فوراً ہی اس میں شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ وہاں افراتفری پھیل گئی اور ملک کے آدمی آگ بجھانے کے لیے دوڑے تھے۔ صحن میں ایک طرف پانی کی موٹر لگی تھی۔ اسے چلایا گیا اور ابھی پائپ سے جلتی جیب پر پانی پھینکا جا رہا تھا کہ باہر سے برسٹ چلنے کی آواز آئی۔ روشنیاں مدہم ہوئیں اور لائٹ غائب ہو گئی۔ خانہ بدوشوں نے فائرنگ کر کے حویلی تک آنے والی بجلی کی لائن اڑا دی تھی۔ موٹر رک گئی اور لائٹس بند ہونے سے جلتی جیب کی روشنی اور نمایاں ہو رہی تھی۔ جیب کا پچھلا کبین کیونسا کاٹا ہوا تھا اور آگ اسی میں لگی تھی۔ ملک کے آدمی جلتے کی پروا کیے بغیر جیب کا کیونسا اتار رہے تھے اور بالآخر وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہے۔

اس دوران میں دسم کے آدمی اپنی گاڑیوں سے اسلحہ اور دوسرا سامان اندر منتقل کر رہے تھے۔ یہ گاڑیاں کھلے میں تھیں اور نہایت غیر محفوظ تھیں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ خانہ بدوش کیا کر سکتے ہیں لیکن ذہن کے کسی گوشے میں ایسا ہی خدشہ تھا۔ خانہ بدوشوں نے جو چیز چھین لی تھی وہ مٹی کی بوتل تھی جس میں مٹی کا تیل بھرا تھا اور اس کے منہ پر بندھے کپڑے میں آگ لگی تھی۔ بوتل گرتے ہی ٹوٹ گئی تھی اور اس میں بھرے مٹی کے تیل نے آس پاس آگ لگا دی تھی۔ اسے یقیناً کسی بڑی غلیل کی مدد سے پھینکا گیا تھا۔ خانہ بدوش اس حربے کے ماہر لگ رہے تھے۔ چند منٹ کی افراتفری کے بعد آگ پر قابو پالیا گیا تھا اور کسی نے اندر موجود جڑی بوٹی بھی اشارت کر دیا تھا۔

”تو کیا ہتھیار ڈال دیں؟“ اس نے تلخی سے کہا۔

”ان کی لڑکی واپس کر دو۔“ میں نے کہا۔

رفاقت میری گرفت میں تڑپ گیا تھا وہ صرف دیکھنے میں تو مند لگتا تھا اور اس میں کسی قدر جان بھی تھی لیکن جسم نرم ہی تھا۔ وہ ایک اچھا پلا ہوا دنبہ تھا۔ اس نے گھٹی آواز میں کہا۔ ”یہ نہیں ہو سکتا۔“

”یہ ہوگا۔“ میں نے پیار سے کہا۔ ”ملک شفقت میں صرف تین تک گنوں گا اور اس کے سر میں سوراخ کر دوں گا۔ اس کے بعد تم سے اور تمہارے آدمیوں سے بھی نمٹ سکتے ہیں اس لیے اپنے آدمیوں سے کہو ہتھیار پھینک دیں۔“

اس دوران میں وسم نے ملک شفقت کو کور کر لیا تھا اور اس کے آدمی اپنے جدید ترین ہتھیار نکال کر لے آئے تھے۔ مجبوراً ملک شفقت نے اپنے آدمیوں کو ہتھیار پھینکنے کا حکم دیا۔ ملک رفاقت میری گرفت میں تڑپ رہا تھا اور اب گالیاں دینے پر اتر آیا تھا لیکن میں نے ہستول کی نالی اس کے سر پر ماری تو اس کی زبان رک گئی تھی۔ ضرب ہلکی تھی لیکن اس ناز و نعم میں پلے لڑکے کے اچھی خاصی تھی اسے یقیناً چکرا گیا تھا۔ ملک شفقت نے تڑپ کر کہا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟“

”کچھ نہیں ہلکا سا سبق دیا ہے۔“ میں نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ ”اب یہ اپنی زبان قابو میں رکھے گا۔“ ملک شفقت کے تمام آدمی ہتھیار ڈال چکے تھے۔ جو پیچھے کی طرف اور اوپری منزل پر تھے انہیں بھی بلوایا گیا تھا۔ وسم کے آدمی اب ان کی تلاشی لے رہے تھے۔ بعض کے پاس سے چھوٹے ہتھیار برآمد ہوئے تھے۔ ان سب کی تلاشی لے کر انہیں ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ ان کی جگہ اب وسم کے آدمیوں نے سنبھال لی تھی میں اور وسم ان باپ بیٹے کو اندر لائے۔ ملک شفقت نے وسم سے کہا۔ ”تمہارے آدمی نے اچھا نہیں کیا ہے آج سے ہمارے پرانے تعلقات ختم ہو گئے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ وسم نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ ”میں نے کون سی تمہارے ساتھ رشتے داری کی تھی اس سے پہلے بھی غرض کار شہ تھا۔“

”تم کچھ بھی کر لو یہ خانہ بدوش تمہیں بھی نہیں چھوڑیں گے۔“ ملک رفاقت نے کہا۔ سر کی چوٹ سے سنبھل کر اس کی زبان دوبارہ کھل گئی تھی۔

”نہیں جب ہم ان کی لڑکی ان کے حوالے کریں گے تو وہ خاموشی سے واپس چلے جائیں گے۔“

”تم ایسا نہیں کر سکتے۔“ رفاقت بولا۔ ”وہ اسے مار دیں گے۔“

”ممکن ہے لیکن اتنے لوگوں کی موت کے مقابلے میں ایک آدمی کی موت بہتر ہی ہوگی۔“ وسم نے طنز کیا۔ ”تم شاید بھول رہے ہو یہاں تمہاری ماں بہنیں اور بھائی بھی ہیں اگر خانہ بدوشوں کو لڑکی واپس نہ ملی تو وہ حویلی پر حملہ کر کے سب کو مار دیں گے۔“

ملک شفقت اب اپنے جوش پر قابو پا چکا تھا اس نے بیٹے کی طرف دیکھا۔ ”یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔۔۔۔۔ ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس وقت میں بھی اپنے ہوش کھو بیٹھا تھا۔“

”تمہیں ہمارا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”اگر تمہارے آدمی فائرنگ شروع کر دیتے تو ان کا

کچھ نہیں مجڑتا اور وہ اسی طرح آگ برسا کر پوری حویلی کو جلا چکے ہوتے۔“

”اس کا خطرہ تو اب بھی ہے۔“ وسم بولا۔ ”اس سے پہلے وہ پھر کوئی کارروائی کریں ہمیں لڑکی کو واپس کرنا ہوگا۔“

رفاقت تڑپنے لگا تھا اور اس کی تڑپیں کو قابو میں رکھنے کے لیے ہمیں اس کے ہاتھ پاؤں باندھنے پڑے تھے۔ ملک شفقت دل پر پتھر رکھ کر حالات سے سمجھوتا کر چکا تھا اور اب ہمارے ساتھ تعاون کر رہا تھا ہم اس کے ساتھ اوپر والی منزل پر آئے کیونکہ میں نے اسے اکیلے جانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ”بہاف کرنا، تم جذباتی آدمی ہو اگر اوپر جا کر تمہارے دماغ میں کوئی تور آ گیا تو تم خود بھی مرو گے اور ہمیں بھی مرواؤ گے۔“

ملک شفقت نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ کوئی غلط حرکت نہیں کرے گا لیکن میں اس پر اعتبار کرنے کا رسک نہیں لے سکتا۔ اس نے ذرا اکڑ دکھانے کی کوشش کی تو میں نے وسم کی طرف دیکھا۔ ”میرا خیال ہے ملک صاحب کو کبھی بیٹے کے ساتھ ہی باندھ دو باقی کام ہم خود کر لیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ لیکن وہاں میری عورتیں ہیں ہر کوئی وہاں نہیں جاسکتا۔“

”ایک تو یہ کہ ہمیں تمہارے حرم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے دوسرے ہم ہر کوئی نہیں ہیں یہ بات تم اچھی طرح جان گئے ہو۔“

بادل ناخوستہ وہ ہمیں اوپر لایا۔ خانہ بدوش لڑکی وہیں تھی۔ اس نے ایک خالی کمرے میں آکر اپنی زوجہ نمبرون کو آواز دی۔ ”رفاقت کی ماں۔۔۔۔۔ اس لڑکی کو باہر بھیج۔۔۔۔۔ جلدی۔“

اندر کچھ کھلبلی مچی تھی مگر ایک منٹ بعد ایک لڑکی کو تقریباً زبردستی اس کمرے میں دھکیل دیا گیا۔ وسم تو نارل رہا تھا کیونکہ اس نے لڑکی کو پہلے نہیں دیکھا تھا لیکن میں دم بخود رہ گیا تھا۔ جب وسم نے مانسمہ جانے کا فیصلہ کیا تھا تو میں نے سوچا کبھی نہیں تھا کہ قدرت مجھے کس طرف لے جا رہی ہے اور یہاں میری ملاقات کس سے ہوگی۔ میں اسے دیکھ کر جتنا حیران ہوا تھا اتنا ہی وہ مجھے دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔ پھر اچانک دوڑتی ہوئی آئی اور مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔ میں بوکھلا گیا۔ وسم دم بخود تھا اور ملک شفقت کا صدمے سے برا حال تھا کہ جو خاتون کل تک اس کے آلو بیٹے کو آلو بناتی رہی تھی آج وہ اس کے سامنے ایک غیر مرد سے چٹ کر رو رہی تھی۔ میں اسے تسلی دینے لگا۔ ”آرام سے۔۔۔۔۔ آرام سے۔۔۔۔۔ مہرو۔“

اس بار ملک شفقت دم بخود رہ گیا تھا۔ ”تم۔۔۔۔۔ تم اسے جانتے ہو۔“

”اچھی طرح۔“ میں نے کہا۔ ”وسم تم ذرا ملک صاحب کے ساتھ یہیں رکو۔“

اس سے پہلے کہ ملک شفقت کوئی اعتراض کرتا میں مہرو کا ہاتھ تھام کر نیچے آ گیا۔ مہرو کے سامنے آتے ہی صورت حال یک دم بدل گئی تھی۔ اس حویلی کے باہر خانہ بدوشوں کی موجودگی کے باوجود مجھے خیال نہیں آیا تھا کہ یہاں موجود لڑکی اصل میں مہرو ہوگی۔ وہ جس طرح مجھ سے چٹ کر روئی تھی اس سے لگ رہا تھا وہ مشکل میں تھی اور مجھے اپنا ہمدرد سمجھ رہی تھی۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تب بھی اسے خانہ بدوشوں کے حوالے کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں مہرو سے کوئی بات کرتا باہر سے لگا تار فائرنگ کی آواز آئی اور یہ فائر سنبھل شات

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”تمہیں بریف کیس کے بارے میں معلوم ہے۔“
میں مسکرایا۔ ”میں اپنی ہی چیز کے بارے میں نہیں جانوں گا کیا۔ تمہیں فتح خان نے دھوکے باز کرل
زریسکی کی مدد سے بے وقوف بنایا اور وہ دونوں ایک دوسرے کو بے وقوف بنا رہے تھے نتیجے میں ان میں شدید
دشمنی ہو گئی۔“

مہرونے گہری سانس لی۔ ”اس وقت مجھے اندازہ نہیں تھا کہ کرنل مجھے کس طرح سے بے وقوف بنا رہا ہے
درحقیقت وہ اسی بریف کیس کے چکر میں پاکستان آیا تھا اسے معلوم تھا کہ اسے اس بریف کیس کی منہ مانی قیمت
مل سکتی ہے۔ یہاں آکر اس نے کسی طرح راجا صاحب کے ہاں ملازمت حاصل کی اور پھر اسے میں ملی تو اس کی
لاٹری کھل گئی۔ کیونکہ بریف کیس میرے قبیلے والوں کے پاس تھا۔ اس نے ظاہر کیا کہ وہ مجھ سے متاثر ہے اور مجھ
سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ مگر میں اس کی باتوں میں آگئی۔ میں سمجھی کہ وہ بیچ بھج مخلص ہے اور مسلمان ہو کر مجھ سے
شادی کرنا چاہتا ہے۔“

”اس نے تمہیں تمہارے قبیلے کے پیچھے روانہ کر دیا۔“ میں نے کہا۔ ”آخری بار میں نے تمہیں خانہ
بدوشوں کے دوسرے قبیلے میں دیکھا تھا اور تم میری بھلک دیکھتے ہی غائب ہو گئی تھیں۔“
اس نے سر ہلایا۔ ”ہاں میں حیران تھی کہ تم یہاں کہاں سے آ گئے، میں نے ان لوگوں سے کہا کہ تم
لوگ اچھے نہیں ہو اس لیے وہ جارحانہ انداز میں تمہاری طرف بڑھے اور تم لوگوں نے نکل جانا مناسب
سمجھا۔“

”تمہارا قبیلہ بریف کیس لے کر کہاں چلا گیا تھا؟“

”وہ سرحد پار کر کے کشمیر چلے گیا تھا۔“

”لیکن میں نے سنا ہے کہ سرحد کی سخت نگرانی ہوتی ہے اور کسی کے لیے کنٹرول لائن پار کرنا ممکن نہیں
ہے۔“

”عام لوگوں کے لیے نہیں ہے لیکن ہم لوگ تو سالوں سے آر پار آتے جاتے رہے ہیں۔ اگر دونوں
لرف کے فوجی دیکھ لیتے ہیں تو روکتے نہیں ہیں البتہ حالات خراب ہوں تو روک لیتے ہیں۔ میرا قبیلہ سرحد پار
کر کے چلا گیا تھا۔“

”اسے بریف کیس کے بارے میں نہیں پتا تھا کہ اس کی کیا اہمیت ہے؟“

”نہیں میرا خیال ہے کہ کسی عام آدمی نے بریف کیس اٹھا یا تھا وہ سمجھا کہ اس میں قیمتی چیز یا رقم ہوگی لیکن
میں سرحد کی نظر اس پر پڑ گئی اور اس نے اسے چھین لیا۔ سردار نے اسے کھولنے کی کوشش کی تھی۔“

میں چونکا۔ ”اس نے کھول لیا تھا؟“

”نہیں وہ ناکام رہا، اس نے اسے توڑنے یا کاٹنے کی کوشش بھی نہیں کی۔“

میں نے سکون کا سانس لیا۔ ”یعنی وہ محفوظ رہا؟“

مہرونے سر ہلایا۔ ”میں دوسرے قبیلے کے ساتھ سرحد پار پہنچی تھی یہ بہت مشکل اور تکلیف دہ سفر تھا اکثر
میں سولہ سترہ ہزار فٹ برف پوش پہاڑوں سے گزرتا پڑا تھا لیکن ہم اس سفر کے عادی ہیں۔ وادی میں داخل ہو

تھے جو کسی رائفل سے کیے گئے تھے۔ میں باہر آیا۔ میرے پوچھنے سے پہلے ہی دہم کے ایک آدمی نے کہا۔
”انہوں نے آگ والی بوتل بھینکی تھی لیکن ہم نے راستے میں اڑا دی۔“

میں نے گیٹ سے باہر جھانکا۔ درمیانی خالی جگہ زمین پر آگ بھڑک رہی تھی جو تیزی کے ساتھ سرد پڑ
رہی تھی کیونکہ یہاں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو آگ پکڑتی۔ میں نے ٹائٹ ویژن لگائی اور ایک طرف دیوار سے ذرا
نکلے ہوئے شخص کا پستول سے نشانہ لے کر لگا تار کی فائر کیے۔ وہ تاریکی کی وجہ سے مطمئن تھا کہ اسے حویلی سے
کوئی نہیں دیکھ رہا ہے اور اسی وجہ سے وہ دیوار سے باہر نکلا ہوا تھا۔ وہ غائب ہو گیا اور ساتھ ہی اس کی چیخ بھی
سنائی دی تھی۔ میں نے پستول اندر کر لیا اور چلا کر کہا۔ ”سردار تم میری آواز سن رہے ہو۔“
”ہاں یہ تم نے کیا کیا؟“ وہ جواب چلایا۔

”جو تم چاہ رہے تھے۔ میں نے ملک شفقت کو سمجھا رہا ہوں کہ وہ لڑکی تمہارے حوالے کر دے اور تم
اشتعال انگیزی کر رہے ہو۔ یہ اس کا جواب ہے۔ ہمیں کمزور مت سمجھو۔ تمہارا ایک ایک آدمی ہماری نظر میں
ہے اور ہم چاہتے تو اب تک کئی کو جہنم رسید کر چکے ہوتے لیکن ہم معاملے کو بڑا امن طریقے سے سلجھانا چاہتے ہیں۔
اب اگر تمہاری طرف سے کوئی کارروائی ہوئی تو اسے اعلان جنگ سمجھا جائے گا۔“

میری دھمکی سے زیادہ اپنے آدمی کے نشانہ بننے سے سردار نے سبق حاصل کیا تھا اور اب وہ بولا تو اس کی
آواز بدلی ہوئی تھی۔ ”ٹھیک ہے اب ہماری طرف سے ایک گھنٹے تک کوئی کارروائی نہیں ہوگی لیکن تم نے میرے
آدمی کو زخمی کر کے اچھا نہیں کیا۔“

”اس کا ہر جانہ دے دیا جائے گا۔“ میں نے اس کے مطلب کی بات کی۔ ”لیکن تم لوگ بھی اپنا دماغ
ٹھنڈا رکھو۔ وقت سے پہلے معاملہ بگاڑنے کی کوشش نہ کرو۔“

سردار سے بات کرنے اور اس کی طرف سے یقین دہانی حاصل کرنے کے باوجود میں مطمئن نہیں تھا۔
اول تو یہ خانہ بدوش ہی ناقابل اعتبار تھے پھر ان کے پیچھے ملک ریاض تھا اور وہ اس لیے ان کی مدد نہیں کر رہا تھا
کہ وہ اپنی لڑکی لے کر ٹھنڈے ٹھنڈے یہاں سے چلے جائیں۔ وہ جھگڑے کو بڑھانا چاہتا تھا اور اسے وہاں تک
لے جانا چاہتا تھا جہاں ملک شفقت کو جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑے۔ اس لیے مجھے یہ معاملہ بڑا امن طریقے
سے سلجھنا نظر نہیں آ رہا تھا مگر میں نے ایک مہلت حاصل کر لی تھی کہ مہرونے بات کر کے صورت حال سمجھ سکو۔ مہرونے
بھی میرے ساتھ باہر نکل آئی تھی اور اس نے ساری گفتگو سنی تھی۔ وہ سبھی ہوئی نظر آنے لگی۔ ”شہباز تم مجھے ان
درندوں کے حوالے کر دو گے؟ میں کسی صورت ان کے پاس نہیں جاؤں گی۔“

”یہ تمہارے لوگ ہیں۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ میرے لوگ نہیں، تم جانتے ہو میرے اپنے قبیلے والے میرے خون کے
پیاسے ہو رہے تھے اور اگر میں ان کے ہاتھ لگتی تو میرا سا بن شوہر مجھے ڈنڈے سے مار مار کر ہلاک کرتا۔ قبیلے سے
بھاگ جانے والی عورت کو یہی سزا دی جاتی ہے اور سب کے سامنے دی جاتی ہے۔“

میں اسے کمرے میں لے آیا۔ ”پھر یہ کون ہیں وہی لوگ جن کے قبیلے میں شامل ہو کر تم بریف کیس کی
تلاش میں گئی تھیں۔“

کر ہمیں پتا چلا کہ میرا قبیلہ ایک جگہ موجود ہے۔“

”ایک منٹ یہ بتاؤ کہ تم دوسرے قبیلے کے ساتھ کس حیثیت سے سفر کر رہی تھیں۔“

”یہ کام فتح خان نے کرایا تھا اس نے سردار سے معاہدہ کر لیا تھا کہ وہ مجھے میرے قبیلے تک پہنچائے گا اور

پھر واپس لے کر آئے گا۔“

”اس کے پاس کیا ضمانت تھی کہ سردار تمہیں واپس لے کر آتا اور اگر تم بریف کیس واپس حاصل کر لیتیں

تب بھی اسے لے کر واپس کیسے آتی؟“

مہرو نے گہری سانس لی۔ ”فتح خان نہایت شاطر آدمی ہے اس نے سردار سے وہ ضمانت حاصل کر لی تھا

جسے وہ مسترد کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے سردار کے نو جوان بیٹے کو اپنی قید میں رکھا ہوا ہے۔ میں واپس جاؤں گی تو

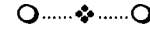
اسے رہائی ملے گی۔“

”تب ہی یہ لوگ تمہارے لیے پاگل ہو رہے ہیں۔“

”میرے لیے نہیں اس بریف کیس کے لیے پاگل ہو رہے ہیں۔“ مہرو نے تلخی سے کہا۔ میں چونک اٹھا

تھا۔

”بریف کیس؟“



مہرو کرنل کے ساتھ ہی راجا عمر دراز کے محل سے نکل گئی تھی۔ اسے راجا یا کسی دوسرے سے غرض نہیں تھی کیونکہ اب اس کی ساری دنیا کرنل تھا۔ ایک طاقتور اور دولت مند شخص، جو اسے وہ سب دے سکتا تھا جس کی مہرو یا کوئی بھی عورت خواہش کر سکتی ہے لیکن اس کے خوابوں کو پہلا دھچکا اس وقت لگا جب فتح خان اس کے سامنے آیا۔ کرنل اسے سوات کے ایک پہاڑی جنگلے میں لایا تھا اور یہ جگہ درحقیقت فتح خان کی ملکیت تھی۔ مہرو فتح خان سے شدید نفرت کرتی تھی اور جب کرنل نے اسے بتایا کہ اب اس نے فتح خان سے صلح کر لی ہے تو وہ اس سے الجھ پڑی تھی۔ مگر کرنل زنی اور رسانیہ سے اسے سمجھاتا رہا کہ یہ ضروری ہے تاکہ اس کا مشن مکمل ہو سکے۔

”تمہارا مشن کیا ہے؟“

”میں ایک چیز لینے پاکستان آیا ہوں لیکن مجھے یہاں تم بھی مل گئی ہو۔ بہر حال وہ چیز بہت اہم اور قیمتی

ہے اگر ہم اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ہم بہت دولت مند ہو جائیں گے۔“

”راجا عمر دراز سے بھی زیادہ؟“ مہرو نے تعجب سے کہا۔

”راجا عمر دراز۔“ کرنل ہنسا۔ ”وہ بے چارہ اتنا دولت مند کہاں ہے یوں سمجھ لو کہ ہم مغربی بیانے کے

مطابق دولت مند ہو جائیں گے ڈالرز میں کروڑ پتی ہوں گے۔ میں تمہیں یوکرائن لے جاؤں گا وہاں ہم بلیک سی

کے کنارے محل بنا کر اس میں رہیں گے۔“

مہرو کو معلوم نہیں تھا کہ یوکرائن کہاں تھا اور بلیک سی کے کنارے محل بنا کر رہنا کیسا ہو سکتا تھا لیکن کرنل

کے خواب اس کی آنکھوں میں اتر آئے تھے اور وہ اس کا ساتھ دینے کو تیار ہو گئی۔ اس نے پوچھا۔ ”وہ چیز کہاں

ہے اور اسے کیسے حاصل کر سکتے ہیں۔“

”تم جانتی ہو کہ وہ چیز کہاں ہے اور تم ہی اسے حاصل کر سکتی ہو۔“ کرنل نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”میں نہیں جانتی۔“

”جانتی ہو تمہیں وہ جگہ یاد ہے جہاں تمہارے قبیلے والوں نے فتح خان کے ٹھکانے پر حملہ کیا تھا۔“

”ہاں یاد ہے۔“

”وہ وہاں سے ایک بریف کیس لے گئے تھے اور میں وہی بریف کیس لینے آیا ہوں۔“

مہرو حیران ہوئی تھی۔ ”مجھے نہیں معلوم ہے اور میں اسے کیسے حاصل کر سکتی ہوں۔“

”تم اس قبیلے سے اچھی طرح واقف ہو اس لیے تم ہی اسے حاصل کر سکتی ہو۔“
 مہر دکانچہ گئی۔ ”نہیں میں نے اپنے قبیلے میں قدم بھی رکھا تو وہ مجھے ماریں گے۔“
 ”تم فکر مت کرو تمہاری حفاظت کی جائے گی اور تم بریف کیس بھی نکال لاؤ گی۔“

مہر د پریشان ہو گئی وہ کرنل کو سمجھانے لگی کہ اس کے قبیلے والے کیسے خوفناک لوگ تھے اور وہ اس کے بھی دشمن بن جائیں گے مگر کرنل نے اس کی باتوں کا کوئی اثر قبول نہیں کیا تھا۔ وہ پُر اعتماد تھا لیکن اس وقت وہ پُر اعتماد نہیں رہا جب فتح خان نے اسے اطلاع دی کہ مذکورہ قبیلہ کنٹرول لائن کے دوسری طرف چلا گیا ہے۔ خاصے غورو خوض کے بعد انہوں نے پلان بنایا کہ مہر د اسی قسم کے خانہ بدوشوں کے دوسرے قبیلے کے ساتھ سفر کرے گی اور اپنے قبیلے تک پہنچ کر وہ بریف کیس واپس حاصل کر کے واپس آئے گی۔ یہ کام وہ کیسے کرتی اس کا سارا پلان کرنل نے مہر د کو بنا کر دیا اور پھر اس کی تربیت شروع کر دی وہ اسے ہتھیار چلانے اور خالی ہاتھ سے اپنے دفاع کی تربیت دے رہا تھا۔ مختصر عرصے میں اس نے مہر د کو خاصی حد تک ٹرینڈ کر دیا۔ اس سے مہر د نے اور بھی بہت کچھ سیکھا تھا۔ دوسری طرف فتح خان اس کے سفر کا انتظام کر رہا تھا۔

اب تک مہر د وہی سمجھ رہی تھی کرنل اسے سچ سچ پسند کرنے لگا ہے اور وہ اسے اپنے ساتھ لے کر جائے گا مگر جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا اسے احساس ہو رہا تھا کہ کرنل درحقیقت اسے استعمال کر رہا ہے اور شاید شروع سے اس کا مقصد یہی تھا۔ فتح خان اور کرنل کے ساتھ اسلام آباد آئی یہاں فتح خان نے ایک دوسرا قبیلہ تلاش کر لیا پہلے اس نے لالچھوے کے سردار کو اس کام پر آمادہ کیا اور جب وہ آمادہ ہو گیا تو فتح خان نے اس کے نوجوان بیٹے کو اپنے قبضے میں کر لیا اور سردار سے کہا کہ جب وہ مہر د کو صحیح سلامت ان کی مطلوبہ چیز سمیت واپس لے آئے گا تو اس کا بیٹا اسے مل جائے گا۔ اگر سردار کی نیت میں کوئی خرابی تھی تو فتح خان کی اس حرکت کے بعد وہ بالکل تیر کی طرح سیدھا ہو گیا۔ وہ مہر د کو لے کر روانہ ہوا۔ انہوں نے جو حکم سے بھرے راستوں پر سفر کیا اور مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو گئے۔ اس سفر میں حسب معمول کئی بوڑھے اور بچے سردی کے ہاتھوں زندگی ہار گئے تھے لیکن ان کے لیے یہ معمول کی بات تھی۔

جلد وہ اس جگہ جا پہنچے جہاں مہر د کا قبیلہ موجود تھا۔ انہوں نے اس کے قریب ہی پڑاؤ ڈالا تھا۔ دونوں آپس میں ایک ہی نسل اور رزم و رواج سے تعلق رکھنے والے قبیلے تھے اس لیے ان میں میل جول بھی تھا۔ مہر د نے حلیہ بدلا اور اپنے قبیلے گئی۔ کئی دوسری عورتیں اس کے ساتھ تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ اگر بریف کیس قبیلے میں ہوا تو وہ سردار کے قبضے میں ہوگا اور سردار کے پاس ایک بڑا سادھاتی ٹریک تھا وہ اپنی تمام قیمتی چیزیں اسی میں رکھتا تھا۔ اس ٹریک پر ایک نہ بھلاہٹ مضبوط قسم کا تالا ہوتا تھا لیکن کرنل نے مہر د کو قفل کھلی کی تربیت اور ضروری آلات فراہم کیے تھے۔ یہی نہیں بلکہ کرنل نے اسے بالکل ویسا ہی ایک بریف کیس بھی دیا تھا۔ مہر د کو یہ رکھ کر دوسرا بریف کیس لانا تھا۔ کام آسان نہیں تھا لیکن مہر د نے کسی طرح سردار کا ٹریک کھول کر یہ کام کر لیا۔ اس نے بریف کیس اتنی مہارت سے تبدیل کیا کہ سردار کو احساس بھی نہیں ہوا تھا اور نہ کسی نے اسے بدلے ہوئے حلیے میں پہچانا۔ آواز چھپانے کے لیے وہ سکوت بن گئی تھی۔ اس طرح ایک سنسنی خیز مہم انجام کو پہنچی۔

اب واپسی کا سفر تھا لیکن اس دوران میں دوسرے قبیلے میں ایک چکر شروع ہو گیا تھا مہر د کو اس کی خبر نہیں

تھی۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کرنل اور فتح خان کی آپس میں ٹھن گئی ہے۔ جس وقت فتح خان سردار سے گٹھ جوڑ کر رہا تھا اور پھر اسے اپنے ٹھکانے میں کس رہا تھا اس وقت کرنل نے سردار کے نائب اور دست راست سے معاملہ کر لیا تھا۔ یہ اصل میں سردار کا سپہ سالار اور اس کے اقتدار کی اصل طاقت تھا۔ کیونکہ سردار کا لڑکا ابھی چھوٹا تھا۔ کرنل پہلے ہی طے کر چکا تھا کہ بریف کیس کے حصول کے بعد فتح خان کا پتا صاف کر دے گا۔ اسی لیے اس نے نائب سے سودا کیا اور اب نائب اس فکر میں تھا کہ کسی طرح سے بریف کیس پہلے حاصل کر لے اسے دو فائدے ہوتے اول کرنل اسے رقم ادا کرتا دوسرے فتح خان سردار زادے کو وعدہ خلائی پر مار دیتا اور نائب کا راستہ خود بہ خود صاف ہو جاتا۔

مہر د اس جھگڑے سے بے خبر تھی جو نائب اور سردار کے درمیان جاری تھا۔ نائب کا مطالبہ تھا کہ بریف کیس اپنے قبضے میں لے لیا اور منہ مانگی قیمت کے بدلے فتح خان کے حوالے کیا جائے جب کہ سردار اپنے بیٹے کی زندگی خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ نائب کا کہنا تھا کہ انہوں نے اتنا طویل اور مشکل ترین سفر بلاوجہ کیا تھا انہیں اس کا کچھ معاوضہ تو ملنا چاہیے تھا۔ فتح خان نے سودا پانچ لاکھ میں کیا تھا اور بیٹگی ایک لاکھ دے کر سردار زادے کو قبضے میں لے لیا تھا۔ ظاہر ہے وہ باقی رقم ادا نہیں کرتا۔ کنٹرول لائن عبور کرنے تک یہ جھگڑا بارہا تھا مگر جب وہ سرحد عبور کر کے اس طرف آئے تو جھگڑا کھل کر سامنے آ گیا۔ نائب نے معاملہ سارے قبیلے کے سامنے رکھا اور سردار پر الزام لگایا کہ وہ صرف اپنے بیٹے کی خاطر سارے قبیلے کے مفاد کو نظر انداز کر رہا تھا۔ معاملہ رقم کا تھا اس لیے اکثر لوگ نائب کی حمایت کرنے لگے خاص طور سے وہ لوگ جن کے گھر کے فرد اس سفر میں موسم کا شکار ہوئے تھے۔ وہ زیادہ شور مچا رہے تھے۔

معاملے کو ملتی روکنے کے لیے سردار نے روٹ تبدیل کر دیا اور وہ آزاد کشمیر سے پنجاب آنے کے بجائے سرحد میں داخل ہو گئے وہ یہاں بھی آتے تھے مگر کئی سال بعد۔ ہزارہ کے اس علاقے میں انہوں نے ذریعہ ڈالا اور اپنا جھگڑا سلجھانے کی کوشش کرنے لگے۔ سردار کسی صورت اپنے بیٹے کی زندگی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا دوسری طرف وہ اپنے لوگوں کو بھی مطمئن نہیں کر پا رہا تھا۔ نتیجہ شدید جھگڑے کی صورت میں برآمد ہوا اور دونوں طرف سے ہتھیار نکل آئے۔ فائرنگ میں سردار زخمی ہوا اور اس کا تختہ الٹ دیا گیا۔ اب معاملات نائب کے ہاتھ میں تھے لیکن اس دوران میں مہر د نے حالات دیکھتے ہوئے چالاکی سے کام لیا اور بریف کیس ایک جگہ چھپا دیا تھا۔ جب نائب نے اسی سے بریف کیس مانگا تو اس نے دینے سے انکار کر دیا۔ وہ غضب ناک ہو کر اس پر تشدد پر اتر آیا تھا لیکن اتفاق سے اسی وقت ملک رفاقت اپنے آدمیوں کے ہمراہ وہاں سے گزرا اور اس نے مہر د کو دیکھا۔ کیونکہ یہ ان کا علاقہ تھا اس لیے ملک رفاقت نے دخل اندازی کی اس پر مہر د نے موقع سے فائدہ اٹھا کر شور مچایا اور الزام لگایا کہ اس کا اس قبیلے سے تعلق نہیں ہے اور وہ اس کے ساتھ زبردستی کر رہے تھے۔

ایک خوب صورت عورت کی فریاد نے نوجوان ملک رفاقت کو متاثر کیا تھا اور وہ اس کی حمایت کرنے لگا۔ پھر بات اتنی بڑھی کہ ملک رفاقت نے اسے اپنی حفاظت میں لے لیا۔ ملک رفاقت اور اس کے مسلح ساتھی خانہ بدوشوں کے لیے مسئلہ نہیں تھے لیکن یہ ان کا علاقہ تھا اور وہ جھگڑا کر کے یہاں سے نکل نہیں سکتے تھے۔ اس لیے وہ دب گئے اور ملک رفاقت مہر د کو حویلی لے آیا۔ مگر اب خانہ بدوش ملک ریاض کی حمایت پا کر شیر ہو رہے تھے اور

انہوں نے حویلی کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ اس دوران میں ہم بھی یہاں آکر پھنس گئے تھے اور اب تک یہاں سے نکلنے کی فکر کر رہے تھے مگر مہرود کے سامنے آنے کے بعد صورت حال بدل گئی تھی۔ اگر وہ عورت مہرود نہ ہوتی تو ہمارے لیے یہاں سے نکلنا مشکل نہیں تھا مگر مہرود کو ہم کسی صورت خانہ بدوشوں کے حوالے نہیں کر سکتے تھے۔

○.....❖.....○

میں نے غور سے مہرود کو دیکھا۔ ”وہ بریف کیس کہاں ہے؟“

”میں نے ایک جگہ زمین میں دبایا تھا۔“

”کیا وہ جگہ محفوظ ہے مطلب یہ کہ کوئی وہاں اتفاق سے نہ پہنچ جائے۔“

”نہیں میں نے خیال رکھا ہے۔“ مہرود بولی۔ ”لیکن اس مصیبت سے جان چھوٹے تو میں بریف کیس نکال سکتی ہوں۔“

”یہ مصیبت اتنی آسانی سے نلتی نظر نہیں آ رہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم نے چھوٹے ملک سے کیا کہا تھا۔“

مہرود کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔ ”وہ اصل میں میرے چکر میں پڑ گیا ہے۔“

”اسے نہیں معلوم کہ تم شادی شدہ ہو؟“

”میں نے اسے نہیں بتایا..... مجھے خطرہ تھا اس صورت میں اس کی دلچسپی ختم ہو جائے گی اور وہ مجھے ان لوگوں کے حوالے کر دے گا۔“

ملک رفاقت یقیناً ایسا ہی کرتا۔ مہرود دیکھنے میں لڑکی جیسی لگتی تھی۔ حالانکہ وہ دو شوہر بھگتا چکی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ پہلے اس کی جسامت خاصی مضبوط تھی اور اس میں نسوانیت کا عنصر بھی اس مضبوطی کے تاثر کو زائل نہیں کر پاتا تھا لیکن اب وہ نازک اندام ہو گئی تھی اور مضبوطی والی بات محسوس نہیں ہوتی تھی شاید اسی لیے ملک رفاقت اسے لڑکی سمجھا تھا۔ اس نے مقامی طرز کا لباس پہن رکھا تھا یہ خانہ بدوشوں کے لباس سے خاصا مختلف تھا۔ اس نے اپنی کہانی خاصی تفصیل سے سنائی تھی اور اس میں تقریباً گھنٹہ گزر گیا تھا۔ خانہ بدوشوں کا دیا ہوا وقت ختم ہونے کے تھا اور وہ اس کے بعد حملہ کر سکتے تھے۔ اس میں شبہ نہیں تھا کہ ان کی پوزیشن بہت مضبوط تھی اور پھر وہ اپنے آگ والے حربے کی وجہ سے سامنے آنے کا خطرہ مول لے بغیر ہمیں بہت زیادہ نقصان پہنچا سکتے تھے۔ ہماری جوابی کارروائی بہت زیادہ جانی نقصان کا باعث بن سکتی تھی اور اس سے نئے مسئلے کھڑے ہو جاتے۔ ملک ریاض جیسے سیاست دان بلاوجہ ہمارے دشمن بن جاتے۔

”اب تم کیا کر گے۔“ مہرود نے پوچھا وہ مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔

”میں چاہتا ہوں کہ معاملہ پُر اس طریقے سے ختم جائے۔“

”اس کا ایک ہی طریقہ ہے۔“ اس نے کسی قدر تیزی سے کہا۔ ”میری قربانی دے دو۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”پہلے میں سمجھا تھا کہ تم بچ اسی قبیلے کی لڑکی ہو اور اسی لیے میں تمہیں ان کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا لیکن اب معاملہ مختلف ہے اگر تم مہرود نہ ہوتیں تب بھی میں تمہیں ان کے حوالے نہ کرتا۔“

”تمہارے لیے بریف کیس بھی تو اہم ہے۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”اہم ہے لیکن کسی انسان کی جان سے زیادہ اہم نہیں ہے۔“

میں نے دسیم کو بلالیا۔ ملک شفقت کو ادھر ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ میں نے دسیم کو صورت حال سے آگاہ کیا۔

”اب بولو اب کیا کرنا چاہیے؟“

”مہرود کو ان کے حوالے کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”جنگ ناگزیر ہوگی۔“

”میرا خیال ہے پہلے ہمیں کرنی چاہیے اور ان کو دہشت زدہ کر کے فرار پر مجبور کر دینا چاہیے۔ اس کے بعد ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔“

”ملک شفقت کا کیا ہوگا؟“

”یہ اپنے مسائل سے خود نمونہ رہے گا۔“ دسیم نے شانے اچکائے۔

”ٹھیک ہے تب فوری کارروائی کرو ہمیں صبح سے پہلے یہاں سے نکلنا ہے۔“ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا جس میں اب پانچ بج رہے تھے۔ ”ان کی دی ہوئی مہلت ختم ہونے والی ہے۔“

اپنے آدمیوں کو چوکس کرتے ہوئے ہم چھت پر آئے۔ مشرق کی طرف ہلکی سی سفیدی نمودار ہونے لگی تھی۔ ہم نے نائٹ ویژن دور بین اور چشموں سے آس پاس کا جائزہ لیا اور میں نے محسوس کیا کہ شروع کے مقابلے میں اب افراد کی تعداد کم تھی۔ سامنے اور دائیں بائیں اب تیس تیس افراد تھے۔ وہ مختلف جگہوں پر دیکھے ہوئے تھے اور ان کے ہیولے اتنے روشن نہیں تھے ایک آدمی کے زخمی ہونے کے بعد انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ ہمارے پاس تاریکی میں دیکھنے والے آلات ہیں اس لیے وہ سامنے آنے سے گریز کر رہے تھے۔ وہ ذرا پھیلے ہوئے تھے۔ میں نے دسیم سے پوچھا۔ ”ہمارے پاس راکٹ لانچر ہیں؟“

”بالکل ہیں جناب۔ چار عدد لانچر اور دو درجن سے زیادہ گرینینڈز ہیں۔“

”ٹھیک ہے چاروں لانچر بیک وقت استعمال کرنے ہیں۔ نشانہ دیواروں کو بنانا ہے۔ دیواریں تباہ ہوں گی تو ان کے پیچھے موجود افراد دہشت زدہ ہو کر بھاگیں گے۔“

”لوگوں کو نشانہ نہیں بنانا ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے انکار کیا۔ ”اصل مقصد انہیں بھگانا ہے۔ دور راکٹ سامنے فائر کرنا اور ایک ایک دائیں بائیں۔ سامنے والے حصے کو صاف کرنا اصل کام ہے تاکہ ہم یہاں سے نکل سکیں۔“

دسیم نیچے روانہ ہو گیا تاکہ آدمی اور ہتھیار لائیکے۔ میں بدستور دور بین سے نیچے کا معائنہ کرتا رہا۔ خانہ بدوش زیادہ محتاط بھی نہیں تھے وہ بار بار اپنی جگہیں بدل رہے تھے۔ اس کی ایک وجہ شاید سردی بھی ہو سکتی تھی جو بچ کے قریب حراج پوچھ رہی تھی۔ ان کی یہ نقل و حرکت ہمارے لیے مشکل پیدا کر سکتی تھی کیونکہ اگر وہ عین گرینینڈ فائر کرتے وقت اپنی جگہ سے حرکت کرتے تو ہماری احتیاط کے باوجود نشانہ بن سکتے تھے۔ کچھ دیر میں دسیم اپنے تین دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ راکٹ لانچر لے آیا تھا۔ گرینینڈز ایک باکس ٹائپ ڈبے میں بند تھے۔ گرینینڈ ان چاروں نے فائر کرنے تھے۔ دسیم جیسی آواز میں انہیں بریفنگ دے رہا تھا۔ پھر وہ چاروں تیار ہو گئے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ راکٹ ایک ساتھ فائر کیے جائیں لیکن پھر میں نے ارادہ بدل دیا۔ وہ چاروں ایک ایک کر کے فائر

”نہیں بڑی مشکل سے تو بریف کیس سامنے آیا ہے اب میں اسے بہر صورت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“
میں نے انکار کیا۔ ”تم اندازے سے سمجھاؤ کہ وہ جگہ یہاں سے کتنی دور ہے۔“

مہر دے پین سے کانڈ پر نقشہ بنا کر سمجھانے کی کوشش کی کہ بریف کیس والی جگہ کس طرف اور کتنی دور تھی۔ فاصلوں کا اسے خود ٹھیک سے علم نہیں تھا۔ میں نے اندازہ لگانے کے بجائے ملک رفاقت سے بات کرنا مناسب سمجھا وہ بس بندھا پڑا تھا۔ میں نے اس کے منہ سے کپڑا نکالا اور پوچھا۔ ”وہ جگہ یہاں سے کتنی دور ہے جہاں سے خانہ بدوش ٹہرے ہوئے ہیں۔“

”تم کیوں پوچھ رہے ہو اور باہر کیا ہو رہا ہے؟“

”میں بتاتا ہوں لیکن پہلے میرے سوال کا جواب دو۔“

”شمال کی طرف کوئی دو میل دور ہے اسی سڑک کے ساتھ جانا ہوگا۔“

”ہم نے فی الحال خانہ بدوشوں کو بھگا دیا ہے اور اب یہاں سے جا رہے ہیں تم لوگ اپنی حویلی کی حفاظت کی ذمہ داری سنبھال لو۔“

”ملک رفاقت کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔“ تم نے کیسے بھگا دیا اور یہ دھماکے کیسے تھے؟“

”ان ہی دھماکوں کی وجہ سے وہ بھاگے ہیں ممکن ہیں ان کے کچھ آدمی مارے گئے یا زخمی ہوئے ہوں۔“

وسیم کے آدمیوں نے سامان دوبارہ گاڑیوں پر لاد دیا تھا۔ وسیم نے اطلاع دی کہ فی الحال تو اس پاس کوئی فرد نظر نہیں آ رہا ہے۔ صبح ہونے والی تھی میرا ارادہ تھا کہ روشنی ہونے پر یہاں سے نکلیں تاکہ کوئی تاریکی میں گھات لگا کر ہمیں نہ روک سکے۔ ہم نے ملک شفقت اور ملک رفاقت کو آزاد کرادیا تھا لیکن ان کے آدمی قید تھے اور اسلحہ بھی نہیں دیا تھا۔ ملک رفاقت یہ سن کر تڑپ گیا کہ مہر دے ہمارے ساتھ جا رہی ہے۔ ”اسے کیوں لے جا رہے ہو؟“

میں نے نرمی سے کہا۔ ”برخوردار تم اس کے بارے میں شاید کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو وہ لوگ نہیں بلکہ ایک شادی شدہ عورت ہے اور اس کا شوہر بھی موجود ہے۔“

رفاقت نے ناقابل یقین نظروں سے مہر دے کی طرف دیکھا۔ ”یہ..... یہ سچ ہے؟“

”ہاں یہ سچ ہے۔“ مہر دے نے آہستہ سے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے میں نے تم سے یہ بات چھپائی تھی۔“

اپنے فرزند ارجمند کی حماقت سامنے آنے پر ملک شفقت نے اسے گھورا اور مجھ سے کہا۔ ”شہباز صاحب

میں آپ کا شکر گزار ہوں جو اس عورت اور خانہ بدوشوں سے میرا پیچھا چھڑوایا ہے۔“

”اسے تو میں لے جا رہا ہوں لیکن خانہ بدوشوں کے بارے میں، میں یقین سے نہیں کہہ سکتا عین ممکن ہے وہ دوبارہ پلٹ کر اس طرف آئیں۔“

”اب میں انہیں دیکھ لوں گا۔“ ملک شفقت نے حوصلے سے کہا۔

ہم چاروں گاڑیوں کے ہمراہ وہاں سے نکلے اور اوپر کی طرف روانہ ہو گئے۔ سورج ابھی مشرق سے سر اٹھا رہا تھا لیکن پہاڑوں پر روشنی پھیل چکی تھی۔ ہم اپنے ہتھیاروں کے ساتھ پوری طرح ہوشیار تھے۔ وسیم ڈرائیو کر رہا تھا اور میں نے رائل سنبھال رکھی تھی۔ دس منٹ بعد ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں خانہ بدوش مقیم تھے لیکن اب وہ

کرتے تو اس کا اثر الگ ہوتا کیونکہ الگ الگ چار دھماکے محاصرہ کرنے والوں کے ہوش اڑا سکتے تھے۔

پہلے وسیم نے راکٹ سامنے والی دیوار کی طرف فائر کیا۔ ایک خوفناک دھماکے کے ساتھ راکٹ ٹھیک نشانے پر دیوار پر لگا اور اس کے ٹکڑے بکھر گئے تھے۔ فوراً ہی آگ کی گیند نمودار ہوئی اور دھماکے کے بعد چھین سنائی دی تھیں۔ راکٹ نے تقریباً پندرہ فٹ کی دیوار صاف کر دی تھی۔ یہ میرے اندازے سے زیادہ تباہ کن ثابت ہوا تھا۔ دیوار جس طرح اڑی تھی اس کے پیچھے کسی کا صحیح سلامت ہونا مشکل لگ رہا تھا۔ میں نے نائٹ ویژن آنکھوں سے ہٹائی تھی کیونکہ وہاں اتنی حرارت ہو گئی تھی کہ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ البتہ لوگوں کی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی میں نے اضطرابی لہجے میں کہا۔ ”احتیاط سے فائر کرو یہ بہت تباہ کن ہتھیار ہے۔“

”نشانے سے ذرا پیچھے مارو۔“ وسیم نے اپنے آدمیوں کو ہدایت کی اور انہوں نے یکے بعد دیگرے تینوں راکٹ فائر کیے۔ چند سیکنڈ بعد میں نے نائٹ ویژن لگا کر دیکھا۔ بچنے والے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ جرات کا مظاہرہ کرتے فائر بھی کرتے جا رہے تھے لیکن ان کے قدم نہیں رک رہے تھے۔ چار راکٹوں نے یقیناً ان کے ہوش اڑا دیے تھے۔ میں نے وسیم سے کہا۔ ”تم نیچے جاؤ اور روانگی کی تیاری کرو دو آدمی ہمیں چھوڑ جاؤ اگر کسی طرف سے مزاحمت ہوئی تو ہم پھر راکٹ ماریں گے۔“

وسیم ایک آدمی کے ساتھ نیچے چلا گیا۔ میں مستقل چاروں طرف نائٹ ویژن سے دیکھ رہا تھا۔ ابتدائی مورچوں سے تو سب ہی پسپا ہو گئے تھے لیکن کچھ فاصلے پر وہ دوبارہ جمع ہو رہے تھے۔ میں نے ایک ساتھی کو جگہ سمجھا کر راکٹ مارنے کا کہا اس نے ٹھیک اسی جگہ نشانہ لیا۔ یہ جگہ باغ میں تھی اور دھماکے کے ساتھ کئی درخت بھی ہوا میں بلند ہوئے تھے۔ اس سے کچھ فاصلے پر موجود لوگوں کو کوئی نقصان نہیں ہوا تھا لیکن وہ دہشت زدہ ہو کر بھاگے تھے۔ اس طرح کا ایک گریڈ فائر بائیں طرف کیا تو وہاں موجود رہنے والے خانہ بدوش بھی پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے تھے۔ سامنے والا حصہ انہوں نے پہلے ہی خالی کر دیا تھا۔ وسیم نیچے سے ہماری مشین گن لے آیا تھا اس نے دونوں طرف اس سے کئی برسٹ مارے تاکہ اگر کوئی موجود ہو بھی تو پھر رکنے کی جرأت نہ کرے۔ خانہ بدوشوں نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ ہمارے پاس اتنے خطرناک ہتھیار بھی ہو سکتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے میدان صاف ہو گیا تھا۔

”میرا خیال ہے اب ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“

”اتنی جلت نہیں۔“ میں نے نیچے جاتے ہوئے کہا۔ ”آس پاس نظر رکھو اور اگر وہ پاس آنے کی کوشش کریں تو مناسب کارروائی کرنا۔“

میں نیچے آیا تو وسیم کے آدمی مستعد تھے انہوں نے ملک شفقت کو بھی بیٹے کے ساتھ ایک جگہ بند کر دیا تھا۔ مہر دے جین تھی مجھے دیکھتے ہی وہ پاس آئی۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”ان کو بھگا رہے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”یہ بتاؤ بریف کیس کہاں دفن کیا ہے ہم کچھ دیر میں یہاں سے نکلیں گے اور بریف کیس حاصل کر کے اس علاقے سے نکل جائیں گے۔“

”بریف کیس اس جگہ سے کچھ دور چھپایا ہے جہاں قبیلے والے رکے ہوئے ہیں اور وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ میں تو کہتی ہوں یہاں سے نکل چلو بریف کیس بعد میں حاصل کرتے رہنا۔“

جگہ خالی تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے وہاں سے پڑاؤ اٹھالیا گیا تھا۔ میں نے پلٹ کر مہرو کی طرف دیکھا۔ ”وہ اسی جگہ تھے؟“

”ہاں لیکن ایسا لگ رہا ہے وہ یہاں سے فرار ہو گئے ہیں۔“

”ممکن ہے ملک ریاض نے انہیں کہیں اور منتقل کر دیا ہو۔ یہ بتاؤ بریف کیس کس جگہ ہے۔“

مہرو نے ایک بلند چوٹی کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ جواو پر گھنے درخت نظر آرہے ہیں ان کے نیچے ایک جگہ چھپایا ہے۔“

وہاں تک پیدل ہی جانا ممکن تھا میں نے وسیم اور تین ساتھیوں کو گاڑیوں کے پاس بھجوا دیا۔ وسیم ساتھ چلنے پر اصرار کر رہا تھا لیکن میں نے اسے ساتھ لے جانا مناسب نہیں سمجھا یہاں بھی کوئی فیصلہ کرنے والا موجود ہونا چاہیے تھا۔ میں تین ساتھیوں اور مہرو کو لے کر پہاڑ کی طرف بڑھا۔ ہم ممکنہ حد تک درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان سے گزر رہے تھے اور ایسی جگہوں سے گزیر کر رہے تھے جہاں دور سے نظر آجائیں۔ مجھے شبہ تھا کہ یہاں سے کچھ افراد گمانی کر رہے ہوں گے۔ خانہ بدوشوں کی غیر موجودگی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ یہ جگہ ملک ریاض کی زمینوں کے پاس تھی شاید بعد میں کسی الزام سے بچنے کے لیے ملک ریاض نے انہیں یہاں سے اٹھا دیا تھا البتہ اس نے یہاں اپنے کچھ افراد کو چھوڑا ہوگا۔ مگر ہمیں کسی نے نہیں روکا اور ہم آرام سے پہاڑ کے اوپر پہنچ گئے۔ یہ جگہ سڑک سے کوئی پانچ سو فٹ بلند تھی اور جب میں نے پلٹ کر گاڑیوں کی طرف دیکھا تو وہ مجھے کھلونوں جیسی لگی تھیں۔ مہرو بے تابی سے درختوں میں داخل ہونا چاہتی تھی میں نے اسے روک دیا۔

”انتہی جلدی کیا ہے؟“

وہ خوف زدہ ہو گئی۔ ”کیا اندر کوئی ہے؟“

”ہم سوکتا ہے ہمیں ہر صورت حال کے لیے تیار رہنا چاہیے۔“ میں نے کہا اور اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور وہ پھیل کر مختلف سمتوں سے درختوں میں داخل ہونے لگے۔ اگر راستہ صاف تھا تو اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ یہاں بھی کوئی نہ ہوتا۔ گھات لگانے کے لیے یہ سب سے اچھی جگہ تھی بشرطیکہ دشمن کو پتا ہوتا کہ ہم یہیں آئیں گے۔ تین ساتھیوں کے بعد میں بھی اندر داخل ہوا اور ہم خاموشی سے سن گن لے رہے تھے۔ مہرو میرے پیچھے چل رہی تھی۔ اندر مکمل خاموشی تھی۔ رفتہ رفتہ ہم نے سارا جھنڈ دیکھ لیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو باہر کی سمتوں پر متعین کیا اور مہرو سے کہا۔ ”اب بتاؤ بریف کیس کہاں ہے؟“

مہرو ایک طرف بڑھی۔ ”وہ یہاں ہے۔“

مہرو درختوں کے درمیان والی جگہ داخل ہوئی اور پھر جھکے سے رک گئی۔ ”یہ کیا.....؟“ اس کے منہ سے نکلا۔ میں تیزی سے آگے آیا تو میں بھی رک گیا۔ یہاں زمین پر پتھریوں بکھرے تھے جیسے انہیں ہٹا دیا ہو۔ ان کے ہٹانے سے ایک گڑھا بن گیا تھا اور اس میں ایک کاغذ رکھا تھا میں نے آگے بڑھ کر کاغذ اٹھایا اس پر انگریزی میں ٹائپ تھا۔ ”ڈیز مہرو بہت شکریہ اور پیار کے ساتھ..... امید ہے اب تم سے ملاقات نہیں ہوگی..... صرف تمہارا۔“

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ کڑل یہاں کام دکھا گیا تھا۔ وہ پہلے ہی آکر بریف کیس نکال گیا تھا۔

پرچہ دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ ہاتھ ہو گیا ہے لیکن یہ پرچہ پڑھ کر معلوم ہوا کہ کام کس نے دکھایا ہے مہرو بھی صدمے میں تھی پھر اس نے کاغذ کے بارے میں پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”دیکھ لو۔“ میں نے اس کی طرف بڑھایا پھر مجھے خیال آیا کہ اسے پڑھنا کہاں آتا ہے اردو انگریزی کا سوال تو بعد میں آتا تھا۔ ”یہ کڑل کی طرف سے ہے تمہارے لیے۔“

”کڑل، وہ کہاں سے آگیا؟“ مہرو نے اضطرابی انداز میں کاغذ مجھ سے لے لیا۔ ”کیا لکھا ہے اس میں؟“

میں نے اسے لفظ بہ لفظ پڑھ کر سنایا اور پھر اس کا ترجمہ پیش کیا۔ مہرو کا چہرہ تاریک ہو گیا اس نے زیر لب کہا۔ ”تو وہ یہاں بھی آگیا تھا۔“

”وہ بہت ذہین آدمی ہے میرا خیال ہے تمہارے نکلنے کے بعد وہ خانہ بدوشوں تک پہنچا ہوگا انہیں تمہارے پیچھے لگا کر اس نے آرام سے بریف کیس تلاش کیا ہوگا اور یہاں کے یہ پرچہ رکھ کر رخصت ہو گیا۔“

”لیکن اسے کیسے پتا چلا کہ میں نے بریف کیس یہاں چھپایا ہے۔“

”بہت آسانی سے..... اس پہاڑی کے آس پاس ایسی کوئی جگہ نہیں ہے جہاں انسان بلا خوف و خطر کوئی چیز چھپا سکے۔ سوائے اس پہاڑی اور اس جھنڈ کے، کیونکہ یہاں کوئی نہیں آتا ہوگا اور یہاں چھپائی چیز کو تلاش کرنے کا مسئلہ بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے کڑل سیدھا یہیں آیا ہوگا اور اسے کچھ دیر لگی ہوگی لیکن اس نے بالآخر بریف کیس تلاش کر لیا ہوگا۔“

مہرو کا منہ لنگ گیا تھا۔ ”اس کا مطلب ہے وہ بریف کیس ہاتھ سے گیا۔“

”سانس کی بات ہے۔“ میں نے سرد آہ بھری۔ ”اب یہاں سے نکلو اس سے پہلے کہ کوئی اور مصیبت نازل ہو جائے۔“

ہم باہر آئے اور نیچے کی طرف روانہ ہو گئے۔ کامیابی بالکل پاس آکر ناکامی ایک بار میرا منہ جڑا گئی تھی اور ایسا بریف کیس کے معاملے میں ہوتا تھا۔ جب اسے حاصل کرنے کا موقع نظر آتا تو وہ ہاتھوں میں آکر پھسل جاتا تھا اور اب وہ کڑل کے پاس جا چکا تھا جو اس کا سودا کسی بڑی طاقت سے کرنے کا اہل بھی تھا۔ گویا بریف کیس تقریباً میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ کڑل صرف اسی کے پکر میں پاکستان آیا تھا اور اب اپنا مقصد پورا کر کے وہ یہاں سے جا رہا تھا۔ یا شاید جا چکا تھا۔ اگر وہ کوئی بلی کا پٹر ہاڑ کرتا تو چند گھنٹوں میں سرحد پار کر سکتا تھا۔ وسیم مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر سمجھ گیا۔ اس نے مایوسی سے کہا۔ ”بریف کیس نہیں ملا؟“

”اسے کڑل زریسکی لے اڑا۔“ میں نے کاغذ اسے تھمایا۔ ”میرا خیال ہے خانہ بدوشوں کے حملے کے پیچھے وہی تھا۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وسیم فکر مند ہو گیا۔ ”اگر ملک ریاض اس معاملے میں شامل نہیں تھا تو جلد یہاں پولیس آنے والی ہوگی اور ہمیں اس سے پہلے اس علاقے سے دور نکل جانا چاہیے۔“

میں نے اس سے اتفاق کیا اور ہم فوری طور پر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ اس سفر میں مہرو ہاتھ آئی تھی اور وہ ہمارے کسی کام کی نہیں تھی بلکہ اس کی صورت میں ایک اضافی ذمہ داری ہمارے سر آگئی تھی۔ کڑل کے

”یہ ٹھیک کہہ رہی ہے وہ شمالی علاقے کی طرف گیا ہوگا۔“ میں نے کہا تو دسم نے سرے سے نقشہ دیکھنا شروع کیا اور اس بار اس نے زیادہ آسانی سے روٹ تلاش کر لیا۔ ”اگر اس کا رخ سوات کی طرف ہوگا تو وہ لازمی اس راستے سے گزرے گا کیونکہ یہی سب سے آسان اور بہتر ہے۔“

”ہمیں اس طرف کا رخ کرنا چاہیے۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”لیکن زیادہ آدمیوں کی ضرورت نہیں ہے صرف دو گاڑیاں اور دو آدمی ساتھ لے لو..... باقی گاڑیاں واپس بھیج دو۔“

دسم تیزی سے حرکت میں آیا اس نے دو جاندار والی گاڑیاں منتخب کیں اور ان میں ضروری اسلحہ منتقل کیا۔ باقی اسلحہ دو گاڑیوں میں منتقل کر کے ان کے ساتھ باقی چار کو واپس جانے کا حکم دیا۔ انہیں عبداللہ کا نمبر دے دیا کہ وہ پنڈی کے پاس پہنچ کر اسے کال کریں اور پھر وہ جو کہے ویسا ہی کریں۔ یہ دو گاڑیاں وہیں سے واپس چلی گئیں دوسری گاڑی میں دسم کے دو آدمی تھے جب کہ ہم تین پہلی گاڑی میں تھے۔ یہ طاقتور انجن والی ڈبل کیبن جیپ تھی جو پہاڑی راستوں پر بھی بہترین کارکردگی دکھاتی ہے۔ مختلف لنک سڑکوں سے گزرتے ہوئے ہم دو گھنٹے بعد سوات جانے والی سڑک پر آگئے تھے۔ یہ پہاڑی سڑک بہت اچھی حالت میں تو نہیں تھی لیکن پھر بھی اس قابل تھی کہ اس پر تیز رفتاری سے ڈرائیو کی جاسکتی تھی۔ موسم بہترین تھا اور سورج نکلا ہوا تھا اس لیے دسم نے اپنی ڈرائیونگ کے جوہر دکھائے۔ بعض اوقات تو وہ خطرناک حد تک رفتار تیز کر لیتا تھا اور مہرو کے ساتھ میرا سانس بھی رک جاتا تھا۔ مگر یہ ٹوکے کا موقع نہیں تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ کرل بھی آجندہ طوفان کی طرح گیا ہوگا۔ سب نے سیٹ بیلٹ باندھ رکھی تھی۔ ہمارے ہاں نوے فیصد گاڑیوں میں سیٹ بیلٹ نہیں ہوتی ہے اور حادثات میں نوے فیصد اموات اسی لیے ہوتی ہیں کہ ان میں سیٹ بیلٹ نہیں بندھی ہوتی ہے۔ اس لیے بعض اوقات معمولی سا حادثہ بھی جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں روڈ اور ڈرائیونگ کی اصولوں پر اکثر عمل کرتے ہیں اس لیے وہاں شدید حادثوں میں لوگ بچ جاتے ہیں۔

دو پہر تک ویسے تو صبح سلامت رہے تھے لیکن بھوک سے جان لیو پر آگئی تھی اس لیے مجبوراً ایک جھگی ہوٹل کے سامنے رکے جہاں ٹرک ڈرائیور لچنگ ٹاؤل فرما رہے تھے اور ڈیک پر اونچی آواز میں پشتو گانے چل رہے تھے مہرو کے ساتھ یہاں لچنگ کرنا تماشا بن جانے کے برابر ہوتا اور ہمارے پاس وقت بھی نہیں تھا۔ اس لیے دسم کے آدمی لچنگ پیک کروالا نے انہوں نے بھنا ہوا دنبے کا گوشت اور تندوری نان لیے تھے انہیں سفر کے دوران بھی آسانی سے کھایا جاسکتا تھا۔ ایک بڑا کین پانی کا لے لیا اور ہم آگے روانہ ہو گئے۔ پہلے میں نے اور مہرو نے لچنگ کیا اور پھر میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور دسم نے لچنگ کیا تھا۔ اسی طرح دوسری گاڑی میں موجود تین افراد نے لچنگ کیا تھا۔ دسم خاصی دیر سے ڈرائیو کر رہا تھا اس لیے اس بار ڈرائیونگ میں نے سنبھالے رکھی۔ تین بجے موسم بدلنے لگا تھا آسمان پر گھنے بادل نمودار ہوئے اور پھر کچھ دیر بعد بارش ہونے لگی۔ جیسے جیسے ہم آگے جا رہے تھے بارش کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی۔ دراصل ہم بارش کے رجب میں داخل ہو گئے تھے۔ اب سفر مشکل اور خطرناک ہو گیا تھا۔ سورج نکلا ہوا تھا لیکن بادلوں کے پیچھے زو پوش تھا اس لیے ماحول تاریک اور دھواں دھار ہو رہا تھا۔ ایسی حالت میں ایک خاص حد سے زیادہ رفتار خطرناک ہو سکتی تھی۔ بارش کے ساتھ رہ کر بادل بھی گرج رہے تھے اس لیے جب دسم نے کہا۔

بارے میں سن کر اور اس کی تحریر کے بارے میں جان کر وہ گم سم سی ہو گئی تھی۔ بے شک کرل دھوکے باز تھا لیکن وہ بہر حال اس کا شوہر تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”مہرو اب تم کیا کرو گی اور کہاں جاؤ گی اس بارے میں سوچا ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم کہ میری جیسی بے سہارا عورتوں کا ٹھکانہ کہاں ہو سکتا ہے۔“ اس نے کسی قدر تنگی سے کہا۔ ”اگر تم میری وجہ سے پریشان ہو تو مجھے کسی بھی شہر میں اتار دینا۔“

”ہم اتنے سفاک نہیں ہیں کہ تمہیں یوں بے سہارا چھوڑ دیں۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”تم جانتی ہو ہم کیسی زندگی گزار رہے ہیں اس میں ہمہ وقت خطرات ہوتے ہیں۔“

اس نے گہری سانس لی۔ ”اب تو میں بھی خطرات کی عادی ہو گئی ہوں لیکن میں تم لوگوں پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔“

”تمہارا مسئلہ بعد میں دیکھیں گے۔“ دسم نے کسی قدر خشک لہجے میں کہا۔ ”فی الحال تمہارے اس نام نہاد شوہر کا مسئلہ ہے۔“

”وہ سچ بچ میرا شوہر ہے۔“ مہرو نے تیز لہجے میں کہا۔ ”نکاح پڑھایا تھا اگر اس کے دل میں کھوٹ تھا تو اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں ہے۔“

”اوکے..... اوکے۔“ دسم نے کہا اور مجھ سے بولا۔ ”جناب وہ ابھی راستے میں ہوگا کیا ہم تیزی سے سفر کر کے اسے نہیں روک سکتے ہیں؟“

دسم کی بات نے مجھے راستہ دکھایا تھا میں نے ایک بار پھر کاغذ کا معائنہ کیا اور مجھے محسوس ہوا کہ یہ بالکل تازہ تھا یعنی اسے پتھروں میں رکھے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔ کیونکہ رات کو یہاں اوس پڑتی ہے اور کاغذ پر ایسا کوئی نشان نہیں تھا اگر اسے رات کے وقت رکھا گیا ہوتا تو اس پر لازمی کچھ نہ کچھ نمی کا اثر ہوتا۔ ہم بھی بالکل صبح سویرے وہاں پہنچے تھے تو اس کا مطلب تھا کہ کاغذ ہماری آمد سے کچھ پہلے ہی وہاں رکھا گیا تھا اور اس صورت میں کرل یہاں سے زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔ مگر اس کا چچھا کرنے میں دو قباحتیں تھیں۔ اول وہ کس راستے سے گیا تھا اور دوسرے وہ کس چیز پر گیا تھا اگر اس کے پاس کوئی طاقتور فوروریل ڈرائیو تھی تو اس کا تعاقب کرنا آسان نہیں تھا۔ میں نے دسم سے کہا۔ ”میرا اندازہ ہے وہ کچھ دیر پہلے ہی یہاں سے نکلا ہوگا۔ کاغذ بالکل صاف ہے۔“

”اسی وجہ سے میں نے آپ سے کہا ہے۔“

”یہاں سے جانے کے کتنے راستے ہیں۔“

”ویسے تو کئی راستے ہیں۔“ دسم نے کہا اور گاڑی ایک طرف روک لی ہم ملک شفقت کی حویلی سے آگے نکل آئے تھے۔ اس نے نقشہ نکالا۔ ”یہ دیکھیں..... یہ سڑک بھی اسلام آباد پنڈی کی طرف جاتی ہے اور یہ سڑک بھی جاری ہے۔“

”تم لوگ غلط سمت میں دیکھ رہے ہو۔“ مہرو نے مداخلت کی۔

دسم نے اسے گھرا۔ ”کیا مطلب؟“

”وہ پنڈی اسلام آباد نہیں بلکہ شمالی علاقے کی طرف گیا ہوگا اسے ان ہی روٹس پر تلاش کرو۔“

”جناب کہیں فائرنگ ہو رہی ہے۔“

تو میں نے جواب دیا۔ ”بادل گرج رہے ہیں۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں یہ فائرنگ کی آواز ہے۔“

اسی لمحے میں نے بھی آواز سن لی اور پھر ایک موڑ کا نٹے ہی منظر بھی سامنے آ گیا۔ ایک بڑی فور و ہیل ڈرائیو سڑک کے وسط میں رکی ہوئی تھی اور ڈرائیو آگے موڑ سے کچھ افراد اس پر گولیاں برس رہے تھے۔ وسم نے اسی جگہ جیب روک لی اور پیچھے آنے والی گاڑی بھی رک گئی۔ پھر ہم ڈرائیو پر اس میں آئے کیونکہ اس جگہ تک گولیاں آ رہی تھیں۔ محفوظ مقام پر آتے ہی میں اور وسم نیچے اتر آئے۔ بارش نے فوراً ہی مزاج پوچھا تھا پانی کے قطرے جیسے سیدھے کسی فریزر سے آ رہے تھے۔ وسم نے دور مار اسٹائپر رائفل نکالی اور میری طرف دیکھا۔ ”میں اوپر جا رہا ہوں ان افراد کو نشانہ بنانے کی کوشش کرتا ہوں جو فور و ہیل پر گولیاں برس رہے ہیں۔“

”سنو تم اس معاملے میں کیوں دخل دے رہے ہو۔“ مہر و نے گاڑی سے جھانک کر کہا۔

”کیونکہ ہمیں دخل دینے کی عادت ہے۔“ میں نے جواب دیا اور رائفل لے کر موڑ کی طرف بڑھ گیا میں وسم کی حکمت عملی سمجھ گیا تھا وہ اوپر سے ان لوگوں کو زیادہ آسانی سے نشانہ بنا سکتا تھا۔ جو خود کار رائفلوں سے گولیوں کا مینہ برسا رہے تھے ان کا انداز ایسا تھا جیسے وہ فور و ہیل ڈرائیو میں موجود ہر ڈیڑی روح کو فٹ کرنا چاہتے ہوں۔ ان سے نمٹنے کی دو وجوہات تھیں ایک وجہ تو ان کا یہی قاتلانہ موڈ تھا اور دوسرے وہ ہمارے راستے میں حائل تھے۔ ظاہر ہے وہ شرافت سے ہمیں آگے جانے کی اجازت کہاں دیتے؟ اس لیے ان سے نمٹنا ہی تھا۔ پچھلی گاڑی سے بھی دو افراد اتر کر آ گئے۔ وہ بھی پوری طرح مسلح تھے ایک کو انہوں نے گاڑی میں جھوڑ دیا تھا۔ میں نے ٹائٹ ویڈن دور بین لی۔ ویسے تو یہ رات میں کام آتی تھی لیکن اس وقت بھی تقریبات جیسا ساں تھا۔ موڈ تک آ کر میں نے دو بین سے جائزہ لیا فوراً ہی مجھے فور و ہیل ڈرائیو میں ایک دھبہ دکھائی دیا یعنی اس میں کوئی زندہ فرد موجود تھا۔ ٹائٹ ویڈن دور بین انفراریڈ کی مدد سے دکھائی ہے اور یہ لہریں اگر طاقتور ہوں یا دیکھنے والی دور بین طاقتور ہو تو چیزوں کے آ پار بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

اسی وجہ سے گاڑی میں دیکھا ہوا آدی بھی نظر آ گیا تھا۔ پھر میں نے دور بین کو موڑ پر چھپے افراد پر فوکس کیا۔ وہاں تین افراد تھے اور ان کے ہاتھوں میں موجود خود کار رائفلیں رہ رہ کر شعلے اگل رہی تھیں جو اس دور بین سے بہت واضح دکھائی دے رہے تھے۔ گولیاں فور و ہیل سے ٹکرانے کی آواز یہاں تک سنائی دے رہی تھی۔ اسی لمحے اسٹائپر رائفل چلنے کی آواز آئی اور تین میں سے ایک گر گیا۔ وہ گرتے ہی ساکت ہو گیا تھا یعنی گولی اسے کسی نازک جگہ لگی تھی اور شاید وہ مر چکا تھا۔ باقی دو نے گھبرا کر فائرنگ روک دی اور آس پاس دیکھنے لگے۔ اس بار وسم نے ایک کے نچلے دھڑ کا نشانہ لیا اور وہ دھڑام سے نیچے گر گیا۔ دوسرے نے اسے بازو سے پکڑ کر پیچھے کھینچا۔ اب موقع تھا۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ میں نے ان دونوں سے کہا اور جھک کر فور و ہیل ڈرائیو کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ دونوں میرے پیچھے تھے۔ فور و ہیل کوئی سو گز دور کھڑی تھی اس تک پہنچ کر میں نے دوبارہ دور بین سے اٹنے سوڑ کا معائنہ کیا لیکن اب وہاں کوئی روشن ہیولہ نہیں تھا۔ اگر پہلا والا بچ گیا تھا تو اس کے ساتھی اسے بھی اٹھا کر لے گئے

میں نے ایک ساتھی کو اشارہ کیا اور وہ پہاڑی کی دیوار کے ساتھ ساتھ موڑ کی طرف جانے لگا۔ میں نے فور و ہیل کا عقبی دروازہ کھولا اور اندر جھانکا ایک شخص اسٹیرنگ و ہیل کے ساتھ والی خالی جگہ دبکا ہوا تھا۔ اس نے دروازہ کھلنے کی آہٹ پر حرکت کرنے کی کوشش کی لیکن وہ زخمی تھا اس لیے پس ہل کر رہ گیا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

”ہم دشمن نہیں ہیں تم پر فائرنگ کرنے والوں کو مار بھگا یا ہے۔“

وہ کراہا میں نے اس بار فور و ہیل کا اگلا دروازہ کھولا اور زخمی کو سیدھا کیا اور دم بخود رہ گیا۔ گزشتہ چوبیس گھنٹے شاید میری حیرت کے لیے مخصوص تھے۔ پہلے غیر متوقع طور پر مہر و ل گئی اور اس نے بریف کیس کا بھی بتایا تھا۔ پھر بریف کیس کرل زمرہ کی عرف عبدالرحمن لے بھاگا تھا اور اب وہی کرل میرے سامنے زخمی حالت میں موجود تھا۔ اس کی جیکٹ سینے اور پیٹ والی جگہ سے سرخ ہو رہی تھی اور وہ نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے احتیاط سے اسے کھینچ کر برابر والی نشست پر ڈالا اور نشست کو ممکن حد تک پیچھے کر دیا تب ہی مجھے دونوں سیٹوں کے درمیان چیزیں رکھنے والی مخصوص جگہ چینی بریف کیس نظر آ گیا لیکن فی الحال کرل میری توجہ کا زیادہ مستحق تھا بہر حال کرل اور بریف کیس دیکھتے ہی مجھے ان لوگوں پر فائرنگ کا جو تھوڑا بہت افسوس تھا وہ خوشی میں بدل گیا۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”ہوشیار رہنا اور اگر کوئی مداخلت کرے تو بے دریغ فائر کرنا یہ دشمن ہیں۔“

”میں ہوشیار ہوں جناب۔“ اس نے مستعدی سے کہا۔

میں نے کرل کی جیکٹ کھولی اسے سینے اور پیٹ پر دو گولیاں لگی تھیں سینے پر گولی دائیں طرف تھی یعنی دل کو نقصان نہیں ہوا تھا لیکن پیچھے دو اماتر ہوا تھا اور پیٹ والی گولی شاید آٹن کو نقصان کرتی نکل گئی تھی۔ کسی اہم عضو کو نقصان نہیں ہوا تھا لیکن اس کا خون خاصا بہہ چکا تھا اس کا اندازہ مجھے وہاں نشستوں اور نیچے موجود خون کی مقدار سے ہوا تھا۔ کرل کو فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ اس کے زخموں سے اب بھی رہ رہ کر خون ابل رہا تھا۔ میں نے اپنے ساتھی کو وہاں سے روک کر کہا اور واپس گاڑی کی طرف بھاگا۔ اس میں طبی امداد کی کٹ موجود تھی۔ وسم نیچے آ گیا تھا میں نے اسے کرل کے بارے میں بتایا تو وہ دنگ رہ گیا تھا اور مہر و ٹپ کر گاڑی سے باہر آ گئی۔

”عبدالرحمن..... وہ یہاں ہے۔“

”وہ کرل زمرہ کیسی ہے۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”وہ زخمی ہے میں اسے دیکھنے جا رہا ہوں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ فتح خان بھی کہیں آس پاس موجود ہے۔“ وسم نے کہا۔ ”میں نے ایک کو شوٹ کر کے ٹھیک کیا۔ بہر حال وہ بھاگ گئے ہیں۔“

میں نے میڈیکل کٹ نکالی اور وسم کے ساتھ فور و ہیل تک آیا۔ ڈرائیو تک سیٹ والے حصے سے اندر آ کر میں نے کٹ سے خون روکنے والے پیڈ نکال کر زخموں پر رکھے اور مضبوطی سے چپکنے والے ٹیپ سے انہیں باندھ دیا۔ وسم میرے ساتھ تھا اس نے زخم دیکھے اور بولا۔ ”اسے فوری کسی اسپتال پہنچانا ہو گا ورنہ یہ زیادہ خون بہنے سے مر جائے گا۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے تم گاڑی یہاں لاؤ اور اپنے آدمیوں کو الٹ کر دو مجھے تمہارا خیال درست لگ رہا ہے فتح خان آس پاس موجود ہے یہ اسی کے آدی ہو سکتے ہیں۔ ہمیں واپس جانا ہو گا۔“

وسم بریف کیس نکال کر لے گیا۔ اس دوران میں مہر و منع کرنے کے باوجود گاڑی سے اتر کر بھینکتی ہوئی

وہاں آگئی تھی۔ کرنل کو اس حالت میں دیکھ کر وہ رونے لگی۔ میرے خیال میں وہ جذباتی ہو رہی تھی کیونکہ کرنل اس سے کام نکل جانے کے بعد اسے اپنی زندگی سے خارج کر چکا تھا۔ بہر حال یہ اس کا ذاتی مسئلہ تھا اس لیے میں نے اسے منع نہیں کیا۔ ویم گاڑی لے آیا اور ہم نے کرنل کو پچھلی نشست پر منتقل کیا۔ مہر داس کے ساتھ بیٹھی گئی اور اس کا سراپا اپنی گود میں رکھ لیا تھا۔ جب میں نے کرنل کو دیکھا تو اس وقت وہ نیم غشی کی کیفیت میں تھا لیکن اب وہ مکمل بے ہوش ہو گیا تھا۔ وہ بریف کیس حاصل کر کے واپس جا رہا تھا کہ اس پر حملہ ہوا اور وہ شدید زخمی ہوا تھا۔ گاڑی میں ایک خود کار رائل موجد تھی کرنل اس سے اپنا دفاع کرتا رہا تھا مگر حملہ آور تعداد میں زیادہ تھے۔ ان کی فائرنگ سے وہ زخمی ہوا تھا اور اگر ہم وہاں نہ پہنچتے تو حملہ کرنے والے یقیناً اسے مار چکے ہوتے۔ وہ اپنا دفاع کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

اس علاقے میں سب سے بڑا شہر ایبٹ آباد تھا اور وہاں کرنل کو طبی امداد مل سکتی تھی۔ میں نے نقشہ پھیلا کر دیکھا۔ ایبٹ آباد یہاں سے کوئی دو گھنٹے کی مسافت پر تھا لیکن اس موسم میں گاڑی ایک حد سے زیادہ رفتار پر نہیں چلائی جاسکتی تھی ورنہ اس کا بھی امکان تھا کہ سب ہی اسپتال پہنچ جاتے یا اسپتال پہنچنے کے قابل بھی نہ رہتے۔ مہر داس کو زخمی دیر بعد رفتار بڑھانے کے کہتی تھی اور ویم ہر بار اسے بتاتا کہ اس سے زیادہ رفتار سے گاڑی نہیں چل سکتی ہے۔ ایک بار اس نے تنگ آ کر کہا۔ ”تم کیوں رو دھو رہی ہو..... یہ تمہیں چھوڑ کر جا رہا تھا۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ وہ روہانے لہجے میں بولی۔ ”مگر میں کیا کروں میں عورت ہوں اور یہ جیسا بھی ہے میرا شوہر ہے۔“

”فکر نہ کرو اسے کچھ نہیں ہو گا۔“ میں نے مہر داس کو تسلی دی۔ ”کرنل سخت جان فوجی رہا ہے اور گولیوں کا زخم اس کے لیے الجھنی نہیں ہے کچھ عرصے پہلے اس کے شانے پر بھی گولی لگی تھی لیکن تم دیکھو اس کا زخم مندمل ہو چکا ہے۔“

میں نے پچھلی گاڑی والوں کو کہا تھا کہ وہ عقب کی طرف سے ہوشیار رہیں۔ مجھے خدشہ تھا کہ فتح خان اس شکست کے باوجود پیچھا کر سکتا تھا۔ اس کے نزدیک آدمیوں کی اہمیت نہیں تھی اور اگر کوئی مرجا تا یا زخمی ہوتا تو وہ اس کی جگہ دوسرے آتا تھا۔ اس کے نزدیک اپنے مفاد کی زیادہ اہمیت تھی۔ سب بارش میں بھیگ گئے تھے اس لیے گاڑیوں کے بیڑاں کر لیے گئے تھے اس سے کچھ دیر میں کپڑے سوکھنے لگے ورنہ کم سے کم مجھے خاصی سردی لگ رہی تھی۔ میں نے ہلکی جیکٹ اتار کر سامنے ڈیش بورڈ پر ڈال دی تھی تاکہ اندر کی شرٹ ٹھیک سے خشک ہو جائے۔ گرناش سے کرنل کو بھی فائدہ ہوا تھا اور اس کی سانس کی رفتار بہتر ہوئی تھی اور چہرے کی رنگت بحال ہو رہی تھی۔ جیسے جیسے ایبٹ آباد قریب آ رہا تھا ہمارے ذہنوں میں دوسرے مسائل اٹھ رہے تھے۔ ان میں سب سے اہم مسئلہ پولیس کا تھا۔ میں نے ویم سے کہا۔ ”اگر اسے چھوڑنے اسپتال تک گئے تو وہاں پولیس ہمیں نہیں چھوڑے گی۔“

”درست فرمایا آپ نے۔ اس مسئلے کا کیا حل ہو سکتا ہے؟“

”اس لیے اسے اس طرح اسپتال پہنچانا ہے کہ ہم سامنے نہ آئیں۔“

”میرے ذہن میں ایک خیال ہے۔“ ویم نے کہا۔ ”ہم شہر میں رضا کار ایسوی بیولنس کے سینٹر پر کرنل کو چھوڑ

دیں گے اور وہ خود اسے مناسب اسپتال تک پہنچا دیں گے۔“

”نہیں۔“ مہر داس نے تڑپ کر کہا۔ ”تم اسے بے یار و مددگار چھوڑنے کی بات کر رہے ہو۔“

”یہ ہمارا رشتہ دار نہیں ہے۔“ ویم نے بھنا کر جواب دیا۔ ”اگر تمہیں اتنا خیال آ رہا ہے تو تم اس کے ساتھ اتر جانا لیکن ہمارا اسپتال تک جانا کسی صورت ممکن نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے تم مجھے اس کے ساتھ اتار دینا۔“ وہ بولی۔ ”لیکن مجھے کچھ رقم چاہیے ہوگی میں بالکل خالی ہاتھ ہوں۔“

”ہم تمہیں رقم دے سکتے ہیں۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”لیکن میرا خیال ہے کرنل خالی جیب نہیں ہو گا تم دیکھو ذرا اسے۔“

مہر داس کی اس تلاش لی تو اس کے پرس میں اچھی خاصی رقم پائی گئی تھی۔ پانچ ہزار والے اور ہزار کے خاصے نوٹ تھے۔ پھر اس کی جیکٹ کی اندرونی جیب سے پانچ ہزار والی دو عدد گڈیاں نکلی تھیں۔ میں نے ہنس کر کہا۔ ”تم بلاوجہ پریشان ہو رہی تھیں۔ تمہارا شوہر کروڑ پتی ہے اور کبھی خالی جیب نہیں ہوتا تمہیں معلوم ہے اس نے ہمارے تلوں سے میرا سودا میں لاکھ ڈالرز میں کیا تھا۔ اس نے مجھے بھارتیوں کے حوالے کر دیا تھا لیکن ساتھ ہی ایسا بندوبست بھی کیا تھا کہ میں بھارتیوں کی قید میں نہ رہوں۔“

”نہیں یہ تم لوگوں کا آپس کا معاملہ ہے میں بھی کرنل کے لیے تم سے کوئی رعایت طلب نہیں کروں گی۔“ اس نے آنسو صاف کیے۔ ”ٹھیک ہے تم مجھے ایسوی بیولنس سینٹر پر اتار دینا میں خود اسے کسی اسپتال لے جاؤں گی۔“

شہر شروع ہو گیا تھا اور موسم بھی اچھا ہو گیا تھا اگرچہ اب شام ہو رہی تھی اور تاریکی چھانے لگی لیکن بارش والا موسم نہیں تھا۔ تاریکی اچھی ثابت ہوئی تھی ورنہ آس پاس سے گزرنے والے کرنل کو دیکھ سکتے تھے۔ بالآخر ہم ایسوی بیولنس سینٹر پہنچے اور وہاں مہر داس کو تار کر ایسوی بیولنس کے لیے بات کرنے لگی تھی اس نے پتا نہیں کیا داستان سنائی کہ اندر سے فوراً ہی دو عدد رضا کار آئے انہوں نے ایک ایسوی بیولنس سے اسٹرینچر اتارا اور کرنل کو اس پر منتقل کرنے لگے انہیں سنانے کے لیے مہر داس سے کہا۔ ”بھائیو میں آپ لوگوں کی بہت شکر گزار ہوں جو آپ نے میرے زخمی شوہر کو یہاں تک پہنچایا۔“

”یہ تو ہمارا فرض تھا۔“ میں نے رسمی انداز میں کہا اور فوراً رخصت ہو گئے۔ جیسے بس اپنا فرض ہی پورا کر رہے تھے ہمارے جانے کے دوران ہی ایسوی بیولنس حرکت میں آگئی تھی کیونکہ کرنل کی حالت سچ جگہ نازک تھی۔ مہر داس کے ساتھ ہی ایسوی بیولنس میں موجود تھی۔ انہیں خدا اور حالات کے حوالے کر کے ہم فوری ہی آگے بڑھ گئے تھے۔ شہر میں رکنا ممکن نہیں تھا۔ ہمارا جلد از جلد یہاں سے نکل جانا ضروری تھا عین ممکن تھا کرنل کی وجہ سے پولیس حرکت میں آجاتی اور ہوٹلوں میں تلاش کرتی تو ہم با آسانی بازیافت ہو جاتے۔ ڈزرنہم نے شہر سے باہر ایک اچھے ریسٹوران میں کیا۔ مگر گاڑیاں اکیسے نہ چھوڑنے کے خیال سے اس میں خاصا وقت لگ گیا تھا۔ ہم نے دو بار یوں میں ڈزرنہم کیا۔

رات نو بجے پنڈی کی طرف روانہ ہوئے تو چھکن سے سب کا برا حال تھا کیونکہ کل کا سارا دن بھی سفر میں گزرا تھا اور یہ دن بھی سفر میں گزرا تھا رات سونے کا موقع بھی کم ملا تھا۔ ہم نے واپسی کے لیے مری والا راستہ

اختیار کیا تھا۔ یہ شارٹ بھی پڑتا اور مری ہائی وے سے ہم سیدھا عبداللہ کے سنے ٹھکانے پہنچ سکتے تھے۔ مگر مشکلیں ابھی تمام نہیں ہوئی تھیں۔ ابھی ہم مری سے بھی دور تھے کہ ایک جگہ روشنیاں دکھائی دیں۔ یہ بھی کوئی اچھا سیاحتی مقام تھا کیونکہ سڑک کے ساتھ کئی ہوٹلز اور گیسٹ ہاؤسز دکھائی دے رہے تھے۔ دکائیں اور شارٹنگ کے مراکز بھی تھے۔ یہاں سے دن میں خاصا ٹریفک گزرتا تھا لیکن اس وقت وہاں بہت گاڑیاں تھیں۔ جیسے ہی ہم ایک جگہ سے مڑے نیچے گاڑیاں رکی دکھائی دیں اور ان میں پولیس کی گاڑیاں بھی تھیں جن کے لو پر روشنیاں گھوم رہی تھیں۔ دسیم نے بے ساختہ گاڑی روک دی۔ ”پولیس.....“

”نہیں یار یہ کوئی اور جگہ ہے۔“ میں نے غور کیا۔ ”گاڑیاں رکی ہوئی ہیں شاید آگے کچھ ہوا ہے۔“
”اس صورت میں آگے جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔“ دسیم نے کہا اور گاڑی کو پورس میں لے جانے لگا۔ ایک مناسب جگہ اس نے گاڑی گھما کر اس کا رخ دوسری طرف کر دیا۔ دوسری گاڑی ہمارے ساتھ ساتھ تھی۔ دسیم نے اس میں سے ایک آدمی کو طلب کیا۔ ”نیچے جا کر دیکھو کیا ہوا ہے ٹریفک کیوں جام ہے؟“
”عام طور سے اس کی ایک ہی وجہ ہوتی ہے اور وہ لینڈ سلائڈنگ ہے۔“ میں نے کہا۔
”بعض اوقات کوئی بڑی گاڑی الٹ جاتی ہے اور اس سے بھی سڑک بند ہو جاتی ہے۔“ دسیم نے کہا۔ دس منٹ بعد دسیم کا آدمی واپس آگیا اور اس نے میرے اندیشے کی تصدیق کر دی۔
”جناہ یہاں لینڈ سلائڈنگ ہو گئی ہے۔ ابھی ٹریکٹر بھی نہیں آئے ہیں جو سڑک صاف کریں وہاں موجود لوگوں کا کہنا ہے کہ صبح سے پہلے سڑک کلیئر نہیں ہوگی۔“
”لگتا ہے آج رات یہیں نہیں رہنا پڑے گا۔“ میں نے کہا۔ ”واپس چلو۔۔۔۔۔ اس سے پہلے دوسرے لوگ بھی آجائیں اور ہوٹلوں میں جگہ بھی نہ رہے۔“

دسیم نے اتفاق کیا اور ہم واپس اسی راستے پر چل پڑے مگر مقصد واپسی نہیں تھا اتنا طویل فاصلہ طے کر کے کسی دوسرے راستے سے پنڈی تک جانے میں ویسے ہی صبح ہو جاتی۔ اس لیے اب کسی جگہ رکتا مجبوری تھی۔ دسیم نے نظر آنے والے پہلے گیسٹ ہاؤس کے ساتھ سڑک پر گاڑی روک لی۔ وہ خود اتر کر اوپر گیا اور فوراً واپس آگیا۔ ”یہاں تو لان تک بک ہو گئے ہیں۔“

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”ایسا لگ رہا ہے آگے بھی کچھ ایسا ہی ٹریفک جام ملے گا۔“
میرا یہ خدشہ بھی درست ثابت ہوا تھا۔ لینڈ سلائڈنگ سرشارم ہی ہو گئی تھی اور اس راستے سے گزر کر جانے والے اب اگلی صبح تک ٹھہرنے پر مجبور تھے اس لیے ہوٹلز اور گیسٹ ہاؤسز جو اس سیزن میں ویسے ہی فلر جاتے ہیں اب ہاؤس فلر ہو چکے تھے اور کہیں جگہ نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے ایک کمرہ ملا جس میں تین سے زیادہ افراد کو ٹھہرنے کی اجازت نہیں تھی۔ دسیم کے آدمیوں نے کہا کہ وہ رات گاڑیوں میں گزار لیں گے۔ ان میں سے کوئی ہمارے ساتھ رکنے کو تیار نہیں ہوا تھا۔ گاڑیوں کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتے ان میں اچھا خاصا اسلحہ تھا اور اسے ہوٹل میں بھی نہیں لے سکتے تھے۔ ہوٹل کسی قدر بلندی پر تھا اور جب ہم کمرے میں آئے تو خوش قسمتی سے یہاں میر۔ موبائل پر سگنل آگئے تھے میں نے عبداللہ کو کال کی۔ میری آواز سن کر وہ خوش ہو گیا۔ ”شکر ہے آپ لوگوں کی آوا سنائی دی..... لیکن آپ کہاں ہیں؟“

”فی الحال راستے میں ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لینڈ سلائڈنگ کی وجہ سے رات یہیں رکنے پر مجبور ہیں ممکن ہے صبح تک سڑک کلیئر ہو جائے تو ہم ڈیڑھ گھنٹے میں تمہارے پاس پہنچ جائیں گے۔ یہ بتاؤ کہ باقی دو گاڑیاں اور بندے پہنچ گئے؟“

”جی وہ آگئے ہیں۔ سب اوکے ہے۔“

آواز مشکل سے اور کٹ کر آ رہی تھی اس لیے زیادہ دیر بات نہیں ہو سکی تھی۔ دسیم گاڑی سے بریف کیس اور رقم والا سوٹ کیس لے آیا تھا۔ یہ ہمارے پاس ہی تھا۔ اس میں اب بھی ڈیڑھ کروڑ کے قریب رقم موجود تھی۔ مرشد کے دیئے اس تحفے سے ہم نے اب تک بہت فائدہ اٹھائے تھے۔ اس کے باوجود اس میں سے ایک چوتھائی سے زیادہ رقم خرچ نہیں ہوئی تھی۔ میں نے چینی بریف کیس کا معائنہ کیا۔ یہ وہی بریف کیس تھا اور کسی نے اسے غلط طریقے سے کھولنے کی کوشش نہیں کی تھی ورنہ یہ اب تک اپنے اندر موجود رازوں سمیت فنا ہو چکا ہوتا۔ پچھلے دنوں میں ایک امریکی جینل پر چین کی بڑھتی ہوئی فوجی قوت کے بارے میں ایک رپورٹ دیکھ رہا تھا۔ اس رپورٹ میں اگرچہ مبالغہ کا عنصر موجود تھا۔ مگر اس سے اس حد تک حقیقت کا عنصر بھی شامل تھا کہ چین آنے والے دودھائیوں میں نہ صرف دنیا کی سب سے بڑی معاشی قوت بلکہ سب سے بڑی فوجی قوت بھی بن جائے گا۔ اس وقت تک موجودہ سپر پاور ترقی معکوس کرتی ہوئی چین سے نیچے آجائے گی اور یہ چیز بھی چین کو اوپر جانے میں مدد دے گی۔ مگر میرے خیال میں مغرب کو اصل خطرہ چین کی فوجی قوت سے نہیں ہے بلکہ اس کی ان معاشی بین الاقوامی پالیسیوں سے ہے۔ جن کی مدد سے چین نے دنیا کے بہت سارے ایسے ممالک کو اپنے حلیفوں میں شامل کر لیا ہے جو مغرب کے لیے ہمیشہ در دہر بنے رہے اور چین اب ان کے معدنی اور زرعی وسائل سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ اس مقصد کے لیے چین نے پہلے ان ملکوں کی مدد کی۔ وہاں ترقیاتی کام کرائے اور لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کیں۔ اب وہ اس کا پھل کھا رہا تھا۔ مختصر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو کام مغرب اپنی ہیبت ناک جنگی قوت سے نہیں کر سکا وہ چین نے اپنی مفاہمانہ نرم پالیسی سے ممکن کر لیا۔

اس بین الاقوامی سیاسی صورت حال میں اس بریف کیس کی حیثیت مسلم تھی۔ قسمت نے اسے میرے ذمے ڈال دیا تھا جب پہلی کا پٹر کر لیش ہونے کے بعد تمام چینی اہلکار اور افسران مارے گئے تھے اور صرف میں اور بیٹو بچے تھے۔ تب یہ بریف کیس ہماری ذمے داری بن گیا تھا اور اسے ساتھ لیے لیے ہم پاکستان آگئے تھے۔ یہاں یہ غائب ہوا اور اب دوبارہ ہمارے ہاتھ آگیا تھا۔ اگر ہم اسے کسی اہل چینی سفارت کار تک پہنچا دیتے تو ہماری ذمے داری ختم ہو جاتی۔ اس کے ساتھ ہی میرا ایک اہم مسئلہ بھی حل ہو جاتا۔ ہم شہر کے پاس آچکے تھے لیکن لینڈ سلائڈنگ کی وجہ سے اس جگہ قید ہو کر رہ گئے تھے۔ دسیم نے کہا۔ ”میرا خیال ہے آپ کو سامنے آئے بغیر بریف کیس چینی سفارت خانے بھجوا دینا چاہیے۔“

”وجہ؟“

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”وجہ سامنے ہے آپ چینیوں کے نزدیک ویسے ہی مشکوک ہیں اور وہ آپ کی تصویر بھی پاکستانی حکام کو دے چکے ہیں اس صورت میں بعد میں کوئی خرابی سامنے آتی ہے تو چینی حکام آپ کا مطالبہ بھی کر سکتے ہیں۔ آپ کا ان کے سامنے آنا کسی صورت مناسب نہیں ہے۔“

لیے پریشانی کا باعث تو بنتے ہیں لیکن بالآخر وہ خود اپنے انجام کو پہنچتے ہیں اور آپ کو ان کے خون کا داغ اپنے دامن پر نہیں لینا پڑتا ہے۔“

”شاید تمہارا اشارہ شہلا کی طرف ہے۔“

”ہاں میں اسے بار بار چھوٹ دینے کے خلاف تھا میرے نزدیک وہ زہریلی ناگن تھی جس کا سر پہلی فرصت میں کچل دینا چاہیے تھا لیکن جب وہ اپنے انجام کو پہنچی تو اسے دیکھ کر مجھے بھی ترس آنے لگا تھا۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”دیکھا جائے تو ایک ایک کر کے ہمارے سارے دشمن مکافاتِ عمل کا شکار ہو رہے ہیں۔ فاضلی زندگی و موت کی کشمکش میں ہے۔ نادرنا کارہ ہو گیا ہے اور اسی کی مدد سے مجھے مقدمات سے نجات ملے گی۔“

”آپ نے ندیم سے بات کی کہ مرشد کے وکیل نے اس سے رابطہ کیا ہے؟“

”نہیں لیکن کوشش کرتا ہوں۔“

میں نے ندیم کو کال کرنے کی کوشش کی لیکن اب سگنل نہ ہونے کے برابر تھے اس لیے تیل بھی نہیں جاری تھی۔ کئی ناکام کوششوں کے بعد میں نے موبائل رکھ دیا۔ چائے آگئی تھی وسم نے کپ تیار کر کے میری طرف بڑھایا۔ ”حوالی تو ہاتھ سے گئی اب کوئی نیا ٹھکانہ دیکھنا پڑے گا۔“

”یہ بہت ضروری ہے۔“ میں نے کہا۔ ”بہتر ہوگا اسی طرح شہر سے نزدیک لیکن غیر آباد علاقے میں کوئی جگہ دیکھو۔“

”ہاں پنڈی کے آس پاس کئی جگہ ہیں جو شہر کے پاس بھی ہیں اور وہاں آبادی نہیں ہے۔ چک لالا کے پاس بھی ایسی جگہ ہیں۔“

”نہیں وہ ہائی سیکورٹی کا علاقہ ہے میرا تو خیال ہے کہ تلہ گنگ یا خان پور کے آس پاس دیکھو۔“

کمرے میں ٹی وی تھا لیکن کیبل بند تھی اس لیے بے کار تھا۔ میں جانتا چاہتا تھا کہ اکرم چشتی کے ساتھ کیا گزری اور کل کے ریڈ پر پولیس اور انتظامیہ کا کیا نکتہ نظر تھا۔ روم سروس کو کال کی۔ ”آج کا اخبار مل سکتا ہے بے شک استعمال شدہ ہو۔“

”میں کوشش کرتا ہوں سر۔“ کلرک نے جواب دیا لیکن اس نے کچھ دیر بعد آج کے کئی اخبارات کا ایک پلندہ بھیج دیا تھا یہ یقیناً لاؤنج کے اخبارات تھے کیونکہ ان میں سے کئی صفحے غائب تھے بہر حال کام کی خبر مل گئی تھی۔ پولیس نے ڈی ایس پی اکرم چشتی کی تلاش میں ایک ویران حویلی پر چھاپہ مارا جہاں دہشت گردوں نے ڈی ایس پی کو ایک اور شخص کے ساتھ یرغمال بنا رکھا تھا۔ پولیس مقابلے کے بعد دہشت گرد حویلی کو آگ لگا کر فرار ہو گئے اور پولیس نے دونوں مغویوں کو آزاد کرالیا لیکن دہشت گردوں نے ڈی ایس پی کی آنکھوں اور کانوں میں مہلک صنعتی سلوشن ڈال دیا تھا اور اسپتال میں ڈاکٹر اس کی بینائی اور سماعت بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ دوسرے مغوی کو نامعلوم افراد راستے میں ایبولینس روک کر اپنے ساتھ لے گئے جب اسے اسپتال منتقل کیا جا رہا تھا۔ رپورٹر نے شب ظاہر کیا تھا کہ مغوی کے دوبارہ اغوا میں پولیس ملوث تھی اور وہ اصل میں معروف سیاسی اور مذہبی شخصیت مرشد علی کا بھائی نادر علی تھا۔ اس کے بعد بھی رپورٹ خاصی طویل تھی اس میں رپورٹر نے حاشیہ آرائی

وسم نے درست تجزیہ کیا تھا۔ اگرچہ ہم۔ بریف کیس حاصل کر لیا تھا اور نیک نیٹی سے اسے چین کو واپس بھی کرنا چاہتے تھے لیکن ساتھ ہی یہ خدشہ بالکل سامنے تھا کہ اگر بعد میں کوئی مسئلہ ہوا تو میں مشکل میں پڑ سکتا تھا۔ وسم سے گفتگو کے دوران اچانک مجھے میجر آدم کا خیال آیا۔ وہ فوج کی انٹیلی جنس میں تھا اور اس نے میرا فیور کیا تھا اگر میں یہ بریف کیس میجر آدم کے حوالے کر دیتا اور وہ اسے فوج یا حکومت کے توسط سے چین کو واپس کرتا تو ہم اس سے کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھا سکتے تھے یا کم سے کم چین کو خوش کر سکتے تھے جو مغرب کے رویے اور دھمکیوں کے خلاف ہمارا واحد اور قابلِ اعتماد دوست تھا۔ وہ ہر مشکل وقت میں ہمارے ساتھ کھڑا ہوتا تھا اور مستقبل کی اس سپر پاور کا ہمارا دوست رہنا بہت زیادہ ضروری ہے۔ میں نے وسم سے اس بارے میں مشورہ کیا تو اس نے کہا۔

”آپ دیکھ لیں ویسے مجھے بھی یہ خیال اچھا لگا ہے لیکن آپ اس سے رابطہ کیسے کریں گے جب کہ آپ اس کا اصل نام بھی نہیں جانتے۔“

یہ درست تھا میں اس کا نام بھی نہیں جانتا تھا اور نہ ہی مجھے اس سینٹر کے بارے میں علم تھا جہاں تعینات کے غرض سے مجھے رکھا گیا تھا۔ میں کس طرح اس سے رابطہ کر سکتا تھا۔ پھر مجھے مری آرڈی ریٹ ہاؤس کا خیال آیا جہاں میں نے ایک رات گزاری تھی اور وہاں یقیناً میرے لیے کچھ نہ کچھ اندراج کیا گیا ہوگا کہ میں کس کس کے توسط سے وہاں رکھا تھا اگر میں کوشش کرتا تو شاید وہاں سے مجھے میجر آدم کا کوئی رابطہ نمبر مل جاتا۔ مری ریٹ ہاؤس یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا لیکن وہاں تک جانے کے لیے اسی سڑک سے گزرنے کا تھا اور جب تک یہ سڑک کھل نہیں جاتی ہم آگے سفر نہیں کر سکتے تھے۔ ایک ڈراسی لینڈ سلائیڈنگ نے کتنے معاملات الجھا دیئے تھے۔ مجھے اصل خطرہ فتح خان سے تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ پیچھے ہوگا۔ وسم نے چائے منگوائی تھی اور اب غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

”آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”ہاں کیونکہ واسطہ فتح خان سے ہے اور وہ نہایت شاطر آدمی ہے ہمیشہ وہاں سے وار کرتا ہے جہاں سے آدمی نے سوچا بھی نہیں ہوتا۔“

”آپ کا خیال ہے وہ ہمارا تعاقب کرتا ہو یا یہاں بھی آ سکتا ہے؟“

”بالکل کیونکہ یہ بریف کیس اس کے لیے نہایت اہم ہے اور وہ اس کی خاطر مجھے قتل کرنے تک کو تیار ہو گیا تھا۔ وہ اس بات کو راز رکھنا چاہتا تھا کہ وہ بریف کیس کے چکر میں ہے۔ اسے معلوم تھا میں لازمی ٹانگ اڑاؤں گا اس لیے اس نے پہلے میرا ہتھاف کرنے کی کا سوچا تھا۔ وہ تو کرلے میں عین موقع پر مدد غلت کی۔“

وسم مسکرایا۔ ”آپ کی کہانیاں بعض اوقات الف لیلہ کی طرح ناقابلِ یقین لگتی ہیں۔ اکثر قسمت آپ پر مہربان رہتی ہے۔“

”اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ میں ہمیشہ مثبت انداز میں سوچتا ہوں۔ کبھی جان بوجھ کر کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہیں بلکہ بعض اوقات تو آپ مہاتما بدھ بن جاتے ہیں اور آپ کی انہماکی پالیسی ہمیں تکلیف دیتی ہے لیکن اس پالیسی کے نتائج سامنے آتے ہیں تو ہم حیران رہ جاتے ہیں۔ آپ کے دشمن آپ کے

کی تھی اور اپنے انداز سے وہ مرشد کا مخالف لگ رہا تھا۔ اس نے الزام لگایا کہ تادری پر اسرار گمشدگی میں مرشد کا ہاتھ تھا۔

”میرا خیال ہے اگر تم چشتی تو کیا۔“ دسیم نے خوش ہو کر کہا۔ ”وہ سلوٹن بہت خطرناک تھا۔“
”اب ایسا بھی نہیں ہے ممکن ہے ڈاکٹر کسی طریقے سے اس کی بیٹائی اور ساعت بچالیں۔ اس صورت میں اس سے دوبارہ نمٹنا پڑے گا۔“

”کوئی بات نہیں ایک بار فیگ گیا تو سلوٹن دوبارہ بھی ڈال سکتے ہیں سو روپے کی ٹیوب آتی ہے۔“ دسیم نے خوشدلی سے کہا اور واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ وہ واپس آیا تو میں نے واش روم کا رخ کیا پانی اچھا خاصا سرد تھا اور یہاں پانی گرم کرنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ میں واپس آیا تو سونے سے پہلے دسیم نے ایک چکر نیچے پارکنگ کا لگایا جہاں ہماری گاڑیاں تھیں۔ اس نے اپنے آدھیوں کو حکم دیا تھا کہ وہ ہوشیار رہیں اور سب سونے سے گریز کریں۔ دسیم آیا تو میں کبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ ٹھکن اور نیند کی کمی تھی اس لیے نیند آنے میں ایک منٹ بھی نہیں لگا تھا جس وقت میں حکیم قاسم کے زیر علاج تھا اور وہ مجھے مخصوص دوائیں استعمال کراتا تو ان سے میری قوت ارادی بھی اتنی مضبوط ہو گئی تھی کہ میں جب چاہتا اور جتنی دیر کے لیے چاہتا سو جاتا تھا اور پھر ٹھیک وقت پر خود بہ خود میری آنکھ کھل جاتی تھی۔ مگر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا دواؤں کا اثر ختم ہو گیا تو قوت ارادی بھی کمزور پڑ گئی اور اب مجھے نیند کے لیے ذرا انتظار کرنا پڑتا تھا اور سونے کے بعد میں اسی وقت اٹھتا تھا جب کوئی مجبور ہوئی تو نیند پوری ہو جاتی تھی۔

دسیم مجھ سے پہلے اٹھ گیا تھا وہ تیار ہو کر باہر گیا تا کہ صورت حال کا جائزہ لے کر آئے۔ وہ واپس آیا تو بوکھلا ہوا تھا اور اس نے مجھے ہلا کر بیدار کیا۔ ”شہباز صاحب اٹھ جائیں..... مصیبت آگئی ہے۔“

میں اٹھ بیٹھا۔ ”کیا مطلب؟“
”مطلب..... فتح خان۔“ اس نے ایک لفافہ پکڑا دیا اور خود کمرے کے چکر کاٹنے لگا۔ ”کوئی ہمارے کمرے کے نمبر سے نیچے کلرک کو دے گیا تھا اور میں نے باہر نکل کر دیکھا تو ہمارے آدمی اور گاڑیاں غائب ہیں۔“

”میرے خدا۔“ میں نے جلدی سے لفافہ کھولا اس میں ایک رقعہ تھا۔ اس پر تحریر تھا۔
”شہباز خان! تمہارا آدمی میرے پاس ہے اور ابھی خیریت سے ہے اگر صبح دس بجے تم تک میری برف کیس لے کر نہیں آیا تو ایک ایک کر کے سب کو ذبح کر دے گا۔ تم راضی ہے تو باہر ایک نیلا کر دلا کھڑا ہے نمبر ایل اے بارہ سترہ ہے۔ اس میں آ جاؤ تم کو مزید ہدایت مل جائے گا۔“

میر نے رقعہ پڑھ کر گہری سانس لی۔ ”میری چھٹی حس خبردار کر رہی تھی کہ فتح خان اتنی آسانی سے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ اس نے ہمارا سراغ لگالیا۔“
”ابھی سات بجے ہیں۔“ دسیم نے کہا۔

”راتے کا کیا ہوا؟“
”ایک گھنٹے میں کلیر ہو جائے گا۔“

”تب تم کسی بھی طرح سے رقم والا سوٹ کیس لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔“
”اور آپ؟“

”میں اس معاملے کو دیکھتا ہوں۔“

”میں آپ کو اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔“

”احقانہ باتیں مت کر دو تم کچھ نہیں کر سکتے اس لیے نکل جاؤ اور پیچھے رہ کر تم میری مدد کر سکو گے۔ دوسرے فتح خان مجھ سے رعایت کرتا ہے لیکن ضروری نہیں ہے وہ میرے ساتھیوں سے بھی رعایت کرے تم اس کے ہاتھ آئے تو میری ایک اور کمزوری اس کے پاس آ جائے گی۔ ابھی ان چار آدمیوں پر تو میں رسک لے سکتا ہوں۔“

”اگر فتح خان اڑ گیا تو.....؟“

”تب مجبوری ہوگی..... یہ بریف کیس بہر حال ہمارے ساتھیوں کی جان سے بڑھ کر تو نہیں ہے لیکن ابھی ہمارے پاس وقت ہے اور ہم سوچ سکتے ہیں۔“ میں نے کہا اور واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ فتح خان نے نہ جانے کیسے ان چاروں کو قابو کر لیا تھا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ ورنہ کوئی دیکھتا یا شور ہوتا تو اب تک سارے ہوٹل کو ہتھ پھل چکا ہوتا۔ ہم تیار ہو کر نیچے آئے جہاں ناشتہ لگنے لگا تھا۔ میں اور دسیم ناشتے کے ساتھ آنے والے مسائل پر بات کرنے لگے۔ میں نے اس سے کہا۔ ”میری دہائی کا کچھ پتا نہیں ہے..... میرا مطلب ہے دیرسور بھی ہو سکتی ہے اس لیے تم لوگ تادری کا معاملہ ہینڈل کرنا..... مرشد سے مذاکرات کرتے رہنا..... دوسرے اگر کم چشتی اور فاضلی پر نظر رکھنا ان دونوں میں سے کوئی دوبارہ ایکٹو ہونے لگے تو اسے واپس بستر عیالت یا قبر میں پہنچانے میں بھی کوئی مضاقت نہیں ہوگا۔“

”آپ فکر نہ کریں۔“ دسیم نے کہا۔ ”لیکن آپ اس طرح بے دریغ فتح خان کے بچائے دام میں جا رہے ہیں۔“

”نہیں میں کوشش کروں گا کہ براہ راست سامنے نہ آؤں اور کوئی متبادل طریقہ اختیار کروں۔ بہر حال ابھی تو ہمیں فتح خان کی ہدایت پر عمل کرنا ہے ورنہ وہ جیج ان چاروں کو ذبح کر دے گا۔“
”اب مجھے مہر واد کر نل کی فکر بھی لاحق ہو گئی ہے۔“ دسیم بولا۔

”میرا خیال ہے وہ محفوظ ہوں گے فتح خان ہمارا تعاقب کرتا ہوا یہاں تک آیا اور بد قسمتی سے لینڈ سلائڈنگ کی وجہ سے اسے موقع مل گیا ورنہ اب تک ہم پنڈی پہنچ چکے ہوتے اور اس کی دسترس سے نکل جاتے۔“

”بس چند گھنٹے کی تاخیر نے ہمیں پھنسا دیا۔“ دسیم نے سر ہلایا۔ ”ورنہ ہم اب تک نکل چکے ہوتے۔“
”یعنی اس نے خوش قسمتی سے ہمیں پالیا۔“ میں نے سر آہ بھری۔ ”لگتا ہے اب اس کا وقت آ گیا ورنہ کر نل جیسا آدمی اس کے سامنے یوں بے بس نہ ہو جاتا۔“

ناشتے کے دوران ہی دسیم نے ایک گاڑی والے سے بات کر لی تھی وہ وہیں موجود تھا۔ اس کے پاس کار تھی اور اس نے پنڈی تک پہنچانے کے پندرہ سو روپے طلب کیے۔ وہ اصل میں پنڈی سے ہی آیا تھا اور اب

حسب توقع میجر کا سنتے ہی کلرک کا دل پیچ گیا تھا اور اس نے ادب اور مستعدی کے ساتھ فون میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے پہلے انفارمیشن کا نمبر ملایا اور مری آرمی ریٹ ہاؤس کے نمبر مانگے۔ نمبرز میں نے ایک پیڈ پر نوٹ کر لیے۔ پھر باری باری ان نمبروں کو ملانا شروع کیا۔ تیسرے نمبر پر کال ریسیو ہو گئی۔ ”میں شہباز ملک بات کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا اور کن آکھیوں سے کلرک کی طرف دیکھا اس نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا کہ میں نے میجر کا حوالہ کیوں نہیں دیا۔

”جی سر میں کیا مدد کر سکتا ہوں۔“ دوسری طرف سے مہذب لہجے میں کہا گیا۔ میں نے تاریخ اور کمرہ نمبر کا حوالہ دیا۔

”اس رات کو میں اس کمرے میں ٹھہرا تھا۔ میں معلوم یہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہاں کن صاحب نے مجھے ٹھہرایا تھا۔“

”یہ تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔“

”میں انہیں میجر آدم کے نام سے جانتا ہوں لیکن مجھے شبہ ہے کہ یہ ان کا اصل نام نہیں ہے۔ مجھے ان سے بہت ضروری بات کرنی ہے یوں سمجھ لیں کہ میرے پاس ان کے لیے ایک امانت موجود ہے اور اس کا تعلق قومی سلامتی سے ہے۔“

آپرٹر ہوشیار آدمی تھا۔ ”ایک منٹ سر میں آپ کی بات ریٹ ہاؤس کے منتظم کرنل خواجہ سے کراتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے آہستہ سے کہا اور کلرک کی طرف دیکھا تو وہ اشارہ سمجھ کر کاؤنٹر کے آخری سرے کی طرف چلا گیا۔ میں اس کی مخالف سمت میں ہو گیا تھا۔ چند لمحے بعد کرنل خواجہ لائن پر تھا اس نے میری بات سنی اور پوچھا۔

”آپ کہاں سے بات کر رہے ہیں؟“

”میں اس وقت مری سے کچھ دور ایک ہوٹل سے بات کر رہا ہوں اور میرے پاس وقت کم ہے پلیز اگر آپ میجر آدم کا کوئی کونٹیکٹ نمبر دے سکتے ہیں تو.....“

”نمبر نہیں دے سکتا آپ آدھے گھنٹے اسی جگہ انتظار کریں میں ریگ بیک کراتا ہوں۔“ کرنل نے کہا اور لائن کٹ گئی۔ میرے پاس انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں سوا آٹھ بجے ہوٹل سے نکل آیا تھا اور اس وقت ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ فتح خان نے مجھے دس بجے تک کا وقت دیا تھا اس کا مطلب تھا اس کے آدمی کسی ایسی جگہ میرے منتظر تھے جہاں میں دس بجے تک پہنچ سکتا تھا اور میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں آدھا گھنٹہ یہاں رکتا مگر اب مجبوری تھی۔ ممکن ہے کرنل خواجہ جلد میجر آدم کو تلاش کر لے اور اس سے میرا رابطہ کرادے۔ میں کلرک کو کال کے بارے میں بتا کر لاؤنج میں آ بیٹھا۔ یہ ہوٹل بھی اعلیٰ درجے کا تھا اس لیے میں نے کافی منگوانے میں حرج نہیں سمجھا۔ ابھی میں کافی پی رہا تھا کہ فون کی بیل بجی اور کلرک نے میری طرف دیکھا میں پیالی سمیت کاؤنٹر پہنچ گیا۔ دوسری طرف میجر آدم تھا۔ اس نے مختاطا انداز میں کہا۔

”شہباز ملک.....“

اسے واپس جانا تھا۔ وسیم نے بھاؤ تاؤ کیا اور نو سو میں سودا ہو گیا۔ وسیم رکنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے فوری جانے پر مجبور کر دیا۔ ”تم آدمی لے کر واپس آؤ گے اور یہاں کسی ایسی جگہ رکنا جہاں موبائل سگنل ہوں ممکن ہے میں ایک دو دن میں کسی وقت رابطہ کروں دو دن سے زیادہ مت رکنا۔“

میرے پاس پندرہ ہزار کے قریب رقم تھی اس لیے میں نے مزید رقم کی پٹیکش مسٹر دکر دی۔ اسلئے میں میرے پاس ایک ہسٹول اور اس کے دو فاضل میگزین تھے۔ وسیم نے اپنا ہسٹول اور ایمونیشن بھی میرے حوالے کر دیا۔ وہ باہر گیا اور کچھ دیر بعد دوبارہ آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک شاپر تھا وہ اس نے میرے سامنے میز پر رکھ دیا۔ ”ایک شخص جیکٹ اور گرم ٹراؤزر پہن رہا تھا میں نے آپ کے لیے لیے ہیں میرا خیال ہے فٹ ہوں گے۔“

ہمارے پاس ہیکلے کپڑے تھے اور اس دوران میں ہم زیادہ تر ٹھہرتے ہی رہے تھے۔ وسیم نے یہ اچھا کام کیا تھا وہ چلا گیا۔ میں نے ناشے کا بل ادا کیا کرے کا کرایہ ہم پہلے ہی ادا کر چکے تھے اس لیے یہاں سے روانگی میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ میں باہر آیا ہوٹل کے ساتھ سڑک کے کنارے ایک مقامی لڑکا چھتریاں اور مختلف سازز کے بیگز بیچ رہا تھا مجھے خیال آیا اور میں نے ایک پشت پر باندھنے والا بیگ لے کر بریف کیس اور کپڑوں کا شاپر اس میں ڈال لیا۔ مجھے نیلی ٹوپوٹا کی تلاش تھی۔ وہ ہوٹل کی پارکنگ میں نہیں تھی۔ وہ ہوٹل سے کچھ دور سڑک کے ساتھ کھڑی ملی۔ میں نے اندر جھانکا چایاں آئینہ میں نہیں تھیں۔ کار کے دروازے بھی لاک تھے میں نے اگلے اور پچھلے حصے میں مڈ گاڑ کے اندر ہاتھ پھیرا۔ چایاں پچھلے مڈ گاڑ سے چکی مل گئیں۔ ان کے ساتھ طاقتور مقناطیس کی ڈسک تھی۔

انجن اسٹارٹ کرنے سے پہلے میں نے احتیاطاً بونٹ کھول کر انجن چیک کیا۔ ممکن ہے بیٹری کے ساتھ کوئی بم منسلک ہوتا اور چابی گھماتے ہی فرشتہ اجل سے ملاقات ہو جاتی۔ مگر انجن اور بیٹری کے تاروں کے ساتھ ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ پوری گاڑی چیک کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے میں اندر بیٹھا اور سب سے پہلے ڈیش بورڈ چیک کیا۔ حسب توقع وہاں بھی ایک رقعہ ملا۔ فتح خان نے حکم دیا تھا۔ ”امیٹ آبادا دالے راستے پر آؤ میرے آدمی تمہیں کہیں بھی روک لیں گے۔ بریف کیس ان کے حوالے کر دینا میں تمہارے آدمیوں کو چھوڑ دوں گا۔“

اس بار فتح خان چالاکی سے کام لے رہا تھا وہ میرے سامنے نہیں آیا تھا کہ میں اس سے بات کر سکوں یا اپنی بات منواسکوں۔ وہ رقعوں سے کام چلا رہا تھا اور وہ جانتا تھا میں اس کی ہدایت پر عمل کروں گا۔ میں نے کلمہ شہادت پڑھ کر کار اسٹارٹ کی۔ جب واسطہ فتح خان جیسے آدمی سے ہوتا کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے اسے خبردار کیا تھا کہ اب وہ میرے راستے میں آیا یا میرے کسی کام میں ٹانگ اڑائی تو یہ کلمی دشمنی ہوگی اور پھر میں اسے کوئی رعایت نہیں دے سکوں گا۔ مگر فتح خان نہایت ڈھیت آدمی تھا اس نے میری وارننگ کا کوئی اثر نہیں لیا اور جیسے ہی اسے موقع ملا وہ پھر سامنے آ گیا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا کہ اس صورت حال میں مجھے کیا کرنا چاہیے تھا۔ ڈرائیو کے دوران میں عقب میں دیکھ رہا تھا لیکن دس منٹ تک جب کوئی گاڑی تعاقب میں نظر نہیں آئی تو میں مطمئن ہو گیا۔ میں نے راستے میں آنے والے پہلے ہوٹل کے سامنے کار روکی اور اتر کر اندر آیا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ یہاں فون ہے۔ میں نے استقبالیہ پر موجود آدمی سے مخصوص انداز میں کہا۔

”میجر شہباز ملک..... مجھے ایک ضروری کال کرنی ہے۔“

اس میں ہاتھ کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا اور کلرک کو اشارہ کیا جو انجان بن کر میری باتیں سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”میرے نام نے دورانِ تفتیش ایک چینی معاملے کا ذکر کیا تھا؟“

”اس بریف کیس کا کچھ کیوٹا ہے۔“ میں نے غلط بیانی سے کام لیا۔

”اے، کیا یہ لائن محفوظ ہے؟“

”اس میں کہہ سکتا کیونکہ یہ ایک ہوٹل کی لائن ہے۔“ میں نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ ”میرے پاس اس بارے میں کچھ سہمی ان لوگوں کی قید میں ہیں جن کے پاس وہ چیز ہے۔ اگر تم میسرڈی مدد کرو تو میں اس میں مل سکتا ہوں اور ظاہر ہے تمہاری مدد بھی ہو جائے گی۔“

”اے، ہاں جلد کرو۔“

”اس میں یہاں سے نکل رہا ہوں مجھے اپنا کوئی نمبر دو میں آگے کہیں تم سے رابطہ کروں گا مجھے دھمکی ملی ہے۔“ میں نے ان تک نہیں پہنچا تو وہ میرے ساتھیوں کو ایک ایک کر کے مار دیں گے۔“

”اب میں تمہیں کیسے تلاش کروں گا یا تمہاری مدد کروں گا۔“ اس نے کہا اور مجھے ایک تھمیر لکھوایا۔ ”تم اس بارے میں کچھ بات کر سکتے ہو۔“

”میں تم سے کسی وقت بھی کوئیٹ کروں گا۔“ میں نے کہا اور پیالی اور کافی کی قیمت کا دیکھ کر ہار کا اظہار کیا۔ ”اب میں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس کا بھی امکان تھا کہ میجر آدم کے آدی یہاں کے والد ہو چکے ہوں۔ میں بریف کیس فتح خان کے قبضے میں جانے نہیں دینا چاہتا تھا لیکن اگر معاملہ میرے ہاتھوں کی جان پر آ جاتا تو میری ترجیح یقیناً وہی ہوتی۔ مگر میجر کی ترجیح یقیناً پہلے ملک کا مفاد ہوتا۔ ہماری امانت میں بہت زیادہ فرق نہیں تھا لیکن یہ معمولی فرق بھی چار آدمیوں کی موت کا باعث بن سکتا تھا۔ میں نے اس معاملے سے تیز رکھی تھی۔ جو وقت ضائع ہوا تھا میں اس کی سلائی کرنا چاہ رہا تھا۔ فتح خان تمہاری سفاک آدمی تھا اگر اس نے دھمکی دی تھی تو وہ اس پر عمل بھی کر سکتا تھا۔ ساڑھے نو بجے میں ایبٹ آباد وادی روڈ پر تھا۔ یہاں اس نے میجر آدم کو کال کر کے دوبارہ اپنی لوکیشن بتائی۔ اس نے کہا۔

”اگر تم مجھے اپنی گاڑی کے بارے میں بتا دو تو میں اس کی فضائی نگرانی کر دے گا۔“

میں نے سوچا اور میجر آدم کو اپنی گاڑی کے بارے میں بتا دیا۔ ”لیکن ابھی تک ان مجرموں نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا ہے۔“

”تم فکر مت کرو ایک بار وہ ہمارے سامنے آگئے تو سچ کر نہیں جاسکیں گے۔“ میجر آدم نے کہا میں نے ہال منقطع کر دی اور یہاں سے بھی آگے روانہ ہو گیا۔ دس بجے میں ایک سنسان علاقے سے گزر رہا تھا یہاں پہاڑوں پر جنگل تھے اور ان میں کہیں کہیں چھوٹی بستیوں نظر آ رہی تھیں۔ کناروں پر بستیوں اور درکائیں نہیں تھیں۔ ابھی تک مجھے کسی نے نہیں روکا تھا۔ میں نے ایک جگہ گاڑی روکی اور بریف کیس لے کر پیچھے آیا۔ ذرا اوپر آنے پر مجھے مطلوبہ جگہ مل گئی۔ یہاں دو درختوں کے درمیان ایک چٹان آگئی تھی اور ایک درخت کا تنہا چٹان سے یوں مل رہا تھا کہ اس کے درمیان میں خلا سے بن گیا تھا میں نے ایک شاخ کی مدد سے اس نظر نہ آنے والے خلا کی گہرائی

تالی اور اسے مناسب پاکر بریف کیس اس میں رکھ دیا۔ اب میں اسے ہاتھ بڑھا کر اٹھا سکتا تھا لیکن یہ باہر سے کسی کو نظر نہ آتا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا اس لیے مجھے اطمینان تھا کہ اس جگہ کا کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ یہاں سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے جگہ کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔ یہ ضروری تھا ورنہ یہاں تمام جگہیں ایک جیسے لگ رہی تھیں۔

میں آگے روانہ ہوا تھا اور تقریباً ایک میل دور گیا ہوں گا کہ اچانک کچھ آگے دو افراد پہاڑ سے اتر کر سڑک پر آگئے۔ وہ مجھے رکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ انہوں نے کلاشکوف رائفلیں اٹھا بلکہ گاڑی کی طرف تان رکھی تھیں میں نے ان کے پاس پہنچ کر گاڑی روک دی۔ وہ دائیں بائیں سے آئے اور ایک نے مجھے حکم دیا۔ ”نیچے اتر آؤ۔“

میں نیچے اتر آیا۔ ”میرے پاس کوئی سامان نہیں ہے ہاں کچھ رقم ہے وہ چاہیے تو لے لو۔“

”بکواس بند کرو۔“ میری طرف والے نے غرا کر کہا وہ پوری طرح چوکس تھا اگر وہ فتح خان کے آدی تھے اس نے انہیں پوری طرح بریف کر دیا تھا کہ میں کس قسم کا آدی ہوں۔ دوسرا گاڑی کا معائنہ کر رہا تھا اس نے پہلے والے سے کہا۔

”یہاں کوئی بریف کیس نہیں ہے۔“

”بریف کیس کہاں ہے؟“ پہلے والے اس بار زیادہ غرایا۔

”کون سا بریف کیس؟“ میں نے سادگی سے پوچھا۔ ”میں بریف کیس ساتھ نہیں رکھتا۔“

”میں اس بریف کیس کی بات کر رہا ہوں جو تمہارے پاس ہے۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”جسے دینے کے لیے تم یہاں آئے ہوتا کہ تمہارے چار ساتھیوں کی جان بچ سکے۔“

”اوہ اچھا تم فتح خان کے آدی ہو۔“

”تم ٹھیک سمجھو وہ بریف کیس اب ہمارے حوالے کر دو۔“

”بریف کیس تو میرے پاس نہیں ہے۔“

”پھر کہاں ہے۔“ وہ چونکا ہوا گیا اور ذرا پیچھے ہٹ کر رائفل مجھ پر تان لی۔ ”جلدی بتاؤ ورنہ میں گولی مار دوں گا۔“

”امتنانہ باتیں مت کرو کیا فتح خان نے تمہیں میرے بارے میں نہیں بتایا ہے۔ بریف کیس میں ایک جگہ رکھ کر آیا ہوں۔ پہلے تم میرے ساتھی دکھاؤ اگر میں مطمئن ہوا تو بریف کیس تمہارے حوالے کر دوں گا۔“

”تم اس طرح نہیں مانو گے۔“ وہ بولا اور اس نے میرے نزدیک آنے کی کوشش کی۔ شاید وہ رائفل کی نال میرے سر پر مارنا چاہتا تھا کیونکہ اس نے رائفل بلند کر لی تھی اور یہ اس کی غلطی تھی میں نے آگے ہو کر اس کا رائفل والا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور رائفل چھیننے ہوئے اسے اٹھا کر گاڑی کے دوسری طرف پھینک دیا۔ وہ چھٹ سے پھلتا ہوا اپنے ساتھی پر جا کر اور اس سے پہلے وہ اٹھتے میں ان پر رائفل تان چکا تھا۔

”بس اب حرکت مت کرنا۔۔۔۔۔ میرے ساتھی کہاں ہیں۔“

”تمہارے ساتھی یہاں ہیں۔“ عقب سے فتح خان کی آواز آئی۔ ”شہباز خان رائفل پھینک دو۔ یہ

تمہارے کسی کام نہیں آئے گا۔“

میں نے رائق پھینک دی اور گھوم کر دیکھا۔ فتح خان ایک درخت کے تنے سے ٹپک لگائے کھڑا تھا۔
میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ ”اس بار تمہارے ساتھی اناڑی ہیں۔“

”اناڑی تو تمہیں ہیں۔“ فتح خان مکارانہ انداز میں بولا۔ ”دیکھنا نہیں تمہارے چار ساتھی کو کیسے اٹھایا خود ان کو بھی پٹا نہیں چلا..... پر تمہارے مقابلے میں اناڑی ہے۔“

فتح خان کے دونوں ساتھی کھڑے ہو گئے تھے اور اب شرمندہ نظر آ رہے تھے میں نے کہا۔ ”فتح خان وہ چاروں کہاں ہیں؟“

”پہلے تم بریف کیس دو گے تب ان چاروں کو دیکھ سکو گے۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تم نے مجھے کچھ زیادہ ہی سادہ لوح سمجھ لیا ہے جو تمہاری باتوں میں آتا رہے گا اور تمہیں چھوٹ دیتا رہے گا کیکن میں بتا دوں اب حد آگئی ہے۔ بہر حال ابھی میں ان چاروں کو لینے آیا ہوں ان کو دیکھو بغیر بریف کیس تمہارے حوالے کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

فتح خان نیچے آگیا اس کے آدمی نے اپنی کلا شکوف واپس اٹھائی تھی۔ فتح خان نے جیب سے ایک سیٹی نکالی اور منہ سے لگا کر بھائی۔ یہ خاصی سع خراش آواز والی سیٹی تھی اور جب فتح خان نے سیٹی بھجانا بند کر دی تھی تب بھی اس کی آواز پہاڑوں میں گونجتی رہی تھی۔ فتح خان بالکل ٹھیک ٹھاک لگ رہا تھا اور اس کے پاؤں میں جو گولی تھی اس کا زخم یقیناً بھر گیا تھا ورنہ وہ پہاڑوں میں اتنے آرام سے نہ گھوم پھر رہا ہوتا گونج بھی ختم ہوگئی تو فتح خان نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ”کچھ دیر میرا تمہارا ساقی تمہارے سامنے ہوگا۔“

”فتح خان..... تمہیں کیسے پتا چلا تھا کہ کرنل بریف کیس لینے کے لیے اس طرف آیا ہے۔“

”میں بے وقوف نہیں ہے۔“ فتح خان نے اعتراف کرنے والے انداز میں کہا۔ ”میں جانتا تھا وہ حرامی کس چکر میں ہے۔“

”اس چکر میں تو تم بھی ہو۔“ میں نے لعنت سے کہا۔ ”تم بریف کیس کسی کا ذخیرہ کے لیے حاصل نہیں کرنا چاہتے ہو۔“

”ہاں میں اسے بیچے گا اور بہت بڑی قیمت پر بیچے گا۔“

”کیسے اب کر تل تو درمیان میں ہے نہیں جو سودا کرائے گا۔“

”کرنل جائے جہنم میں..... میں خود اس کا سودا کر سکتا ہے۔“

”یہ اتنا آسان نہیں ہے۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ بین الاقوامی سیاست ہے اور بہت خطرناک سیاست ہے تمہیں اس کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔“

”کوئی بات نہیں ہے اس طرح میں اس کا تجربہ بھی حاصل کر لے گا۔“ فتح خان نے اطمینان سے کہا۔

”شہباز خان! تم بے کار میں اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ میں سمجھنے والا ہوتا تو میرا باپ کا جوتا کافی تھا۔“

”میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ اس کا بہت زیادہ امکان ہے کہ تمہیں بریف کیس کے بدلے اذیت ناک موت ملے۔“

”پراس کا امکان بھی تو ہے کہ مجھے بہت سارا دولت مل جائے۔“

”ہاں یوں سمجھ لو دس فیصد امکان ہے۔“

”دس فیصد بہت ہے، میں اس سے بھی کم امکان پر کام کرتا رہا ہے۔“ اس نے جواب دیا اور اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ”یہ کدھر رہ گیا ہے۔“

سیٹی بجا کر اس نے یقیناً اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا تھا کہ وہ میرے چاروں ساتھیوں کو لے آئیں۔ دس منٹ گزر گئے تھے اگر وہ ایک میل کے فاصلے پر تھے تو انہیں اب تک آ جانا چاہیے۔ فتح خان نے دوبارہ سیٹی منہ سے لگائی، لیکن اس سے پہلے کہ وہ سیٹی بجاتا مخالف سمت سے ایک ڈیزل پک اپ نمودار ہوئی۔ فتح خان سیٹی نکالتا ہوا سڑک کی طرف بڑھا اور جیسے ہی پک اپ پاس رکی وہ پشتو میں ان پر برس پڑا تھا۔ ذرا سی دیر میں اس نے گالیوں کا دریا بہا دیا تھا مگر اس کے ساتھی بے حزمہ نہیں ہوئے تھے ایک نے دانت نکال کر کہا۔ ”خان جب تم نے سیٹی بجائی تو ہم پک اپ کا ٹائر بدل رہے تھے۔“

”اسے کیا ہوا؟“

”پتا نہیں اچانک پھس ہو گیا۔“ آدمی نے سادگی سے کہا۔ اس پر فتح خان نے مزید کچھ سنائیں اور چاروں کے بارے میں پوچھا۔

”وہ پیچھے ہیں۔“

فتح خان نے عقب میں دیکھا اور اشارے سے مجھے بلایا۔ اس کے گر گئے اب میرے دائیں بائیں تھے۔ کسی نے میری تلاشی لینے کی کوشش نہیں کی تھی حالانکہ فتح خان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ میں مسلح ہوں گا۔ مگر اسے غور پر اعتماد تھا کہ وہ مجھے اسلحے کے استعمال سے باز رکھ سکتا ہے۔ میں نے پک آپ کے پچھلے حصے میں دیکھا جہاں سیم کے چاروں آدمی بے بسی سے بندھے پڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر ان کا شرمندگی سے برا حال ہو گیا۔ ان میں سے ایک بولا۔ ”شہباز صاحب میں خدا کی قسم کھاتا ہوں مجھے بالکل نہیں پتا چلا کہ میں کس طرح سو گیا۔“

فتح خان ہنسا۔ ”تم سو یا نہیں تھا بلکہ میرا ایک آدمی تم لوگوں کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک ایسی گیس پھونڈ گیا تھا جس کا بو نہیں ہوتا اور تم سب سو گیا۔“

”فکرم ت کرد اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔“ میں نے اسے تسلی دی اور فتح خان کی طرف دیکھا۔
 ”انہیں میرے حوالے کر دو میں تمہیں بریف کیس کا پتا بتا دیتا ہوں۔“

وہ ہنسا۔ ”ابھی تم کہہ رہا تھا کہ تم اتنا سادہ لوح نہیں ہے پر گلتا ہے تم نے مجھے سادہ لوح سمجھا ہے۔ شہباز خاناس ہاتھ بریف کیس دو اور اس ہاتھ اپنے آدمی لے جاؤ۔“

اب تک میں پُر امید تھا کہ میجر آدم کے آدمی فضا سے یا کسی اور طریقے سے ہماری نگرانی کر رہے ہوں گے یا کم سے کم آس پاس ہوں گے مگر آسمان بالکل صاف تھا اور نہ ہی مجھے زمین پر کوئی ایسے آثار نظر آئے تھے کہ میجر کے آدمی آس پاس ہیں۔ شاید وہ اب تک نہیں پہنچ سکے تھے اور اب وقت نہیں تھا۔ اگر انہوں نے میری کار تلاش کر لی ہوتی تو یہ مناسب موقع تھا فتح خان کو اس کے آدمیوں سمیت ہینڈ زاپ کیا جاسکتا ہے۔ میں نے کچھ دیر سوچا اور گہری سانس لی۔ ”ٹھیک ہے میں تمہیں اس جگہ لے جاؤں گا جہاں میں نے برف کیس چھپایا

ہے۔ اس کے بعد تم مجھے میرے ساتھیوں سمیت جانے دو گے؟“

”بالکل۔“ فتح خان نے عقب سے کہا اور اچانک میرے سر سے کسی ہتھیار کی نال لگا دی۔ ”میں تم کو بالکل جانے کی اجازت دے گا لیکن ابھی اپنا تمام ہتھیار میرے حوالے کر دو۔“

اس نے مجھے بے بس کر دیا تھا اور اس کے ایک آدمی نے تلاشی لے کر میرے دونوں پستول اور فاضل میگزین نکال لیے تھے۔ میں نے سکون سے پوچھا۔ ”تم نے پہلے تلاشی کیوں نہیں لی؟“

”شہباز خان جتنا میں تم کو جانتا ہے اتنا کوئی نہیں جانتا ہے۔ مجھے معلوم تھا تم اس وقت کوئی حرکت نہیں کرے گا جب تک اپنے آدمیوں کو نہ دیکھ لے گا۔ اب تم نے دیکھ لیا ہے اور تم کو بریف کیس دینا ہے اس لیے اب تم حرکت کر سکتا ہے۔“

”تم جانتے ہو حرکت کرنے کے لیے مجھے ہتھیاروں کی ضرورت نہیں ہے میں اس کے بغیر بھی بہت کچھ کر سکتا ہوں۔“

”تم ٹھیک کہہ رہا ہے پر تم ہتھیار کے ساتھ اس سے زیادہ کر سکتا ہے جتنا ہتھیار کے بغیر کر سکتا ہے۔“ فتح خان نے عیاری سے کہا۔ ”پر ایک بات یاد رکھنا اگر تم نے کچھ کیا تو میرا ایک آدمی بغیر حکم کے تمہارے چاروں آدمیوں کو چھلنی کر دے گا۔“ اس نے پک آپ میں بیٹھے مشین گن بردار کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس کو بتا دیا ہے۔“

فتح خان نے نہایت چالاک سے کام لیتے ہوئے مجھے ہر طرح سے جکڑ لیا تھا اب بریف کیس اس کے حوالے کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں گاڑی میں بچھلی نشست پر بیٹھا تھا اور میرے دائیں بائیں فتح خان کے آدمی تھے۔ اس کے ساتھ مسلح افراد کی تعداد پانچ تھی اور یہ سب خطرناک اسلحے سے لیس تھے۔ وہ خود آگے ڈرائیونگ سیٹ پر آگیا اور اس نے کار اشارت کر کے آگے بڑھائی۔ میں نے کہا۔ ”میں اور میرے ساتھی واپس کیسے جائیں گے؟“

”پیدل۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”ویسے یہ گاڑی بھی ہے پر یہ چوری کا ہے اگر تم تھانے جانا چاہتا ہے تو اسے لے جانا۔“

میں دنگ رہ گیا۔ ”تم نے میرے لیے گاڑی چرائی۔“

”ہاں یہاں کہاں سے گاڑی لاتا۔ پر فکر مت کرو کام کر کے گاڑی اسی جگہ چھوڑ دے گا جہاں سے لی تھی۔“

مجھے گاڑی کی نہیں بلکہ بریف کیس اور اس حوالے سے میجر آدم کے آدمیوں کی فکر تھی اگر وہ نہ آتے تو مجھے بریف کیس فتح خان کے حوالے کرنا ہی پڑتا۔ فتح خان نے میری طرف دیکھا۔ ”تم نے بریف کیس کہاں چھپایا ہے؟“

”تم چلتے رہے جب وہ جگہ آئے گی تو میں بتا دوں گا۔“

”ٹھیک ہے پر شہباز خان یا درکھنا کہ غلط بولا تو تمہارے ساتھ چار ہندوں کا لاش جائے گا۔“

”دھمکیاں مت دو اگر ایسا ہوتا تو میں سرے سے یہاں آتا ہی نہیں اور تم ان لوگوں کے ساتھ جو چاہے

کرتے۔“

”میں جانتا ہے تم اپنے آدمیوں کا بہت خیال رکھتے ہو۔“ فتح خان نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”اس کے برعکس تم انہیں تنوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے ہو اس لیے کہ ایک مر جائے تو اس کی جگہ دوسرا آ جاتا ہے۔“ میں نے دائیں بائیں بیٹھے گرگوں کی طرف دیکھا تو ان کے تیز بگڑ گئے تھے۔

”تم ٹھیک بولا..... فتح خان روگ پالنے والا آدمی نہیں ہے ادھر آدمیوں کی منڈی میں بہت مال ہے پیسہ چھینکو اور اپنی پسند کا آدمی اٹھا لو۔“

”ہاں تمہیں پیچھے اور خریدنے کا بہت تجربہ ہے۔“ میں نے طنز کیا۔ ”دو دن پہلے تمہارے آقا سے بات ہوئی تھی۔“

”تم ڈیوڈ شا کا بات کر رہا ہے وہ میرا آقا تھا اب نہیں ہے۔“

”ایسا نہیں ہے اگر وہ آج بھی تمہیں بلائے تو تمہیں ان لوگوں کی طرح دم ہلاتے ہوئے جانا پڑے گا تم ایک بار بیک چکے ہو اس لیے انکار نہیں کر سکتے۔“

فتح خان کا موڈ خراب ہو گیا۔ ”تم بہت بڑھ کر بولنے لگا ہے۔“

”ہاں مجھے یہ جرأت میری آزادی نے دی ہے میں کسی کا غلام نہیں ہوں۔“

”راجا عمر دراز کا بھی نہیں۔“ فتح خان نے طنز کیا۔

”نہیں..... تم اسے زیادہ سے زیادہ میرا ہمدرد کہہ سکتے ہو خود سے کہہ کر میں نے اس کا بھی احسان نہیں لیا اگرچہ اس نے میرے لیے جو کیا ہے اسے میں احسان ہی سمجھتا ہوں۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تم اس تعلق کا موازنہ اپنے اور ڈیوڈ شا کے تعلق سے مت کرو جس کی نوعیت تم اچھی طرح سمجھتے ہو۔ تم عام لوگوں کو کتنا کہہ رہے ہو کیونکہ وہ بک رہے ہیں تو اس لحاظ سے تم میں اور ان میں بس نسل کا.....“

”تم نے بہت بک بک کر لیا۔“ فتح خان کا صبر جواب دے گیا اس نے گاڑی روک لی تھی۔ ”بریف کیس کدھر ہے۔“

”تم نے بالکل ٹھیک جگہ گاڑی روکی ہے اب مجھے اترنے کی اجازت دو تاکہ میں تمہیں بتا سکوں کہ بریف کیس کہاں ہے۔“

”اسے ہوشیاری سے لاؤ۔“ فتح خان نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ ”اگر یہ کوئی گڑبگڑ ہو کرے تو اس کا پیر میں گولی مارتا۔“

پہلے ایک اتر اور اس نے مجھے نشانے پر لے کر نیچے اترنے کا حکم دیا میں شرافت سے نیچے اتر آیا۔ فی الحال شرافت کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا کیونکہ فتح خان کے یہ دونوں آدمی اب بہت زیادہ مستعد تھے اور ان کی انگلیاں رائفلوں کی بلی پر تھی ذرا سی حرکت سے گولی چل سکتی تھی اس لیے میں نے انہیں اشتعال دلانے والی حرکت سے گریز کیا میں آہستہ سے باہر آیا اور فتح خان کی طرف دیکھا جو پہلے ہی میری طرف متوجہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس نشانی کو دیکھا جس کی سیدھ میں اوپر جا کر مجھے وہ دو درخت مل جاتے جن کے ساتھ چٹان کی جڑ میں بریف کیس چھپایا تھا۔ میں آگے بڑھا اور فتح خان تینوں ساتھیوں کے ہمراہ میرے پیچھے آنے لگا اس نے مجھے بھروارنگ دی۔ ”کوئی غلط حرکت مت کرنا۔ میرا آدمی کوئی رعایت نہیں کرے گا۔“

فتح خان نے کہا۔ ”شہباز خان افسوس تم نے موقع گنوا دیا۔“
میں نے جلدی سے کہا۔ ”فتح خان میری بات سنو۔۔۔۔۔“
”تم نے دھوکا کیا اب کیا سنے گا، تم گولی کا آواز سنو۔“
میرا جسم تن گیا تھا موقع گولی کے انتظار میں۔



گولی کے بجائے ہوا برست چلا تھا لیکن ان میں سے کوئی گولی مجھے نہیں لگی۔ بلکہ سڑک پر موجود فتح خان کے آدمیوں کے چلا۔ نہ کی واڑ آئی۔ کم سے کم ایک موت کا شکار ہوا تھا کیونکہ اس کی چیخ میں موت کا کرب تھا۔ فتح خان بری طرح چونکا تھا اس کی توجہ چند لمبے کے لیے نیچے کی طرف ہوئی تھی اور اس موقع سے فائدہ نہ اٹھانا حماقت ہوتی اور میں اس حق بننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ چٹان پر ٹیکتے ہوئے پیچھے کی جانب دھکی دیا اور فتح خان ایک دھاڑ کے ساتھ نیچے لڑھک گیا۔ اسے ہوشیار ہونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اب نیچے سے کم سے کم تین چار خود کار ہتھیاروں کی آواز آرہی تھی۔ شاید بمبر آدم کے پیچھے آدمی دیر سے سہی مگر بالآخر پہنچ گئے تھے۔ فتح خان کو دہشت مارنے کے ساتھ ہی میں نے چھلانگ لگائی اور چٹان کے اوپر سے ہوتا دوسری طرف جا کر۔ پاؤں میں چوٹ آئی تھی لیکن میں جان بچاؤ گئی تھی کیونکہ فتح خان کے کسی ساتھی نے میری طرف فائر کیا تھا۔ گولی چٹان پر لگی تھی۔ زمین پر گرنے کے بعد میں فوری اٹھا نہیں تھا بلکہ لیٹا رہا اور اسی لمحے میری نظر درخت کے اوپر گئی تھی۔ میں دنگ رہ گیا تھا۔

مگر یہ عالم حیرت میں رہ جانے کا موقع نہیں تھا کیونکہ نیچے فتح خان اپنے آدمیوں سے چلا چلا کر کچھ کہہ رہا تھا مگر فائرنگ کے شور میں اس کی آواز سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ ابتدائی چیخوں کے بعد کسی کی چیخ سنائی نہیں دی تھی۔ اب یہاں رکتنا خطرے سے خالی نہیں تھا جس طرح میں چٹان پھلانگ کر آیا تھا اسی طرح فتح خان یا اس کا کوئی ساتھی چٹان پر چڑھ کر فائر کر سکتا تھا۔ میں زمین پر لیٹے لیٹے کھسکا اور ایک درخت کی آڑ میں ہو گیا۔ میرا کھسکا کام آگیا کیونکہ اسی لمحے فتح خان کا ایک ساتھی چٹان پر نمودار ہوا اور اس نے میری جھلک دیکھتے ہی برست مارا تھا مگر درخت کے تنے کی وجہ سے میں محفوظ رہا ساری گولیاں اس میں پیوست ہو گئی تھیں اسے دوبارہ برست مارنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ عقب سے فائر ہوا اور وہ چٹان پر ہی اوندھے منہ گر گیا اس کے سر سے خون کے ساتھ مغز بہہ نکلا تھا۔ میں نے فائر کرنے والے کے نشانے کی داد دی اس نے صرف ایک گولی چلائی تھی اور فتح خان کے آدمی کے سر میں سوراخ کر دیا۔

میرا اندازہ تھا کہ فتح خان کے تین آدمی مارے جا چکے تھے یا کم سے کم ناکارہ ہو گئے تھے اور اب اس کے ساتھ دو آدمی تھے۔ حملہ کرنے والوں کا کوئی جانی نقصان ہوا تھا تو میں اس سے بے خبر تھا لیکن ان کی طرف سے فائرنگ کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ فتح خان اور اس کے ساتھیوں کو سننے کا موقع نہیں دے رہے تھے۔ فائرنگ کا یہ سلسلہ تقریباً پانچ منٹ جاری رہا اور پھر فتح خان کے آدمی چلا چلا کر ہتھیار بھینکنے اور زندگی کی بھیک مانگنے لگے۔ گویا انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا گیا تھا اور اب مقابلہ کرنا خودکشی کے مترادف ہوتا۔ کسی نے بلند آواز سے کہا۔ ”اپنے ہتھیار پھینک کر اور ہاتھ اوپر کر کے سامنے آ جاؤ۔“

”میں بالکل ٹھیک حرکت کروں گا۔“ میں نے خوشدلی سے کہا۔ ”یہ دو درختوں کے درمیان چٹان دیکھ رہے ہو بریف کیس دائیں درخت کے ساتھ لگی چٹان اور تنے کے درمیانی خلا میں ہے۔ تمہارا آدمی ہاتھ بڑھا کر نکال سکتا ہے۔“

فتح خان نے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا اور وہ آگے بڑھا۔ میں نے اس کی رہنمائی کی اور اس نے خلا میں ہاتھ ڈالا۔ پھر مزید ہاتھ ڈالا۔ اس کا قد مجھ سے کم تھا اسی لحاظ سے ہاتھوں کی لمبائی بھی کم تھی اس لیے اسے بریف کیس تک پہنچنے کے لیے زیادہ جگہ دو کرنا پڑ رہی تھی۔ مگر اس کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ اسے بریف کیس تک پہنچنے میں ناکامی ہو رہی تھی۔ میں نے فتح خان سے کہا۔ ”کسی دراز کو دیکھو جو میں نے حفظ بالقدیم کے طور پر بریف کیس خاصا اندر کر دیا تھا۔ اس کا ہاتھ نہیں جا پارہا ہے۔“

”احتیاطاً۔“ میں نے وضاحت کی۔ فتح خان اپنے سب سے لمبے آدمی کو طلب کیا اور اسے خلا سے بریف کیس نکالنے کا حکم دیا۔ آدمی نے ڈرتے ڈرتے خلا میں ہاتھ ڈالا۔ شاید اسے خطرہ تھا کہ اندر کوئی سانپ یا اسی قبیل کا زہریلا جانور موجود تھا جو ہاتھ ڈالتے ہی اسے ڈس لے گا۔ اس لیے وہ پورا ہاتھ ڈالتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ فتح خان نے اس کی جھجک محسوس کر لی اور دھاڑ کر اسے پورا ہاتھ اندر ڈال کر بریف کیس نکالنے کا حکم دیا۔ بادل ناخواستہ آدمی نے حکم کی تعمیل کی اور اپنا دراز ہاتھ خلا میں ڈال کر بریف کیس پکڑنے کی کوشش کی اور پھر ہانپتے ہوئے بولا۔

”یہاں کچھ نہیں ہے۔“

میں نے بریف کیس جتنا اندر کیا تھا اس آدمی کا ہاتھ لازمی اس تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ فتح خان نے میری طرف دیکھا اور غور سمجھ میں بولا۔ ”شہباز۔۔۔۔۔ بریف کیس کہاں ہے؟“

”میں قسم نہیں کھاتا لیکن اگر تمہاری تسلی قسم سے ہوتی ہے تو میں قسم کھانے کو تیار ہوں میں نے بریف کیس یہیں رکھا ہے میرا خیال ہے تمہارے آدمی ٹھیک سے نہیں دیکھ رہے ہیں۔“

اس نے پستول لہرایا۔ ”ٹھیک ہے تم آکر ٹھیک سے دیکھ لو پر اب فتح خان قسم کھاتا ہے اگر تمہارا ہاتھ خالی واپس آیا تو تمہارے سر میں سوراخ کر دے گا۔“ اس کا لہجہ نہایت خوفناک اور سنجیدہ تھا۔ میں آگے آیا اور خلا میں ہاتھ داخل کیا مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ بریف کیس اسی جگہ رکھا تھا لیکن اب وہاں خلا تھا اور میرا ہاتھ اس میں لہرا رہا تھا۔ اگر بریف کیس وہاں ہوتا تو لازمی میرے ہاتھ میں آ جاتا۔ مگر وہاں نہیں تھا میں نے فتح خان کی طرف دیکھا۔

”میرا خیال ہے بریف کیس سڑک کر آئے۔ تم اجازت دو تو میں لکڑی کی مدد سے ٹولوں؟“

”یہ بھی کرلو۔“ وہ پیچھے ہو گیا۔ ”شہباز خان آج تمہارے پاس آخری موقع ہے۔ جو کرتا ہے کر لو بلکہ چاہو تو کلہ شریف پڑھ کر اپنے گناہوں کی معافی بھی مانگ لو۔“

میں نے وہی لکڑی اٹھائی جس کی مدد سے میں نے اس خلا کی پیمائش کی تھی۔ میں نے اسے خلا میں داخل کیا اور آخر تک چپک کیا۔ ایک لمحے کو میرا دل رک گیا تھا خلا بالکل خالی تھا بریف کیس وہاں نہیں تھا۔ عقب سے

”آپ بے فکر رہیں شہباز صاحب۔“ ان میں سے ایک اعتماد سے بولا۔ ”ہم جانتے ہیں ان کو کیا بتانا ہے۔“

میں پک آپ سے اتر کر کیپٹن اقبال کے پاس آیا وہ جب کے ریڈیو پر کسی سے بات کرتے ہوئے اسے رپورٹ دے رہا تھا یہ خاص زبان تھی جو ہر آدمی نہیں سمجھ سکتا ہے لیکن میرے دو بھائی آرمی میں تھے اور میں کسی حد تک یہ کوڈز دُرُز سمجھتا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے ریڈیو کا مائیک میری طرف بڑھا دیا۔ ”میجر صاحب۔“

دوسری طرف میجر آدم تھا۔ ”شہباز تم ٹھیک ہو؟“

”میں ٹھیک ہوں لیکن فتح خان ہاتھ سے نکل گیا۔“

”اسے جہنم میں جھونکو، بریف کیس کا بتاؤ۔“

”وہ میرے پاس ہے لیکن جب تک مجھے اعتماد نہیں ہوگا کہ فتح خان آس پاس نہیں ہے میں اسے نکالنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔“

”تم اس سے اتنا ڈر رہے ہو؟“ میجر آدم نے حیرت سے کہا۔

”کیونکہ اسے میں جانتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کہو کہ میری بات نظر انداز نہ کریں۔ وہ ایسا شخص ہے جسے موقع مل جائے تو وہ ایک منٹ میں بازی پلٹ دیتا ہے۔“

”اوکے میں کیپٹن سے کہتا ہوں وہ تمہارے احکامات کی تعمیل کرے گا لیکن وہ بریف کیس مجھے بہر صورت چاہیے۔ بات اوپر تک جا چکی ہے تم سمجھ رہے ہو نا؟“

”ہاں میں سمجھ رہا ہوں تم اگر مزید آدمی روانہ کر سکتے ہو تو اچھا ہے میرا خیال ہے یہ ایک درجن افراد نا کافی ہیں۔“

”فکر مت کرو ایک دستہ اور روانہ ہو چکا ہے وہ کچھ دیر میں تم تک پہنچ جائے گا۔“ میجر آدم نے کہا۔ ”ریڈیو کیپٹن کو دو۔“

میں نے ریسپور کیپٹن کی طرف بڑھا دیا وہ میجر کی ہدایات سننے لگا۔ میجر سے بات کرنے کے بعد میں پُر اعتماد ہو گیا تھا میں نے فتح خان کے آدمیوں سے حاصل کردہ اسلحہ چیک کیا اور اس میں سے پہلے اپنے دونوں ہتھوڑوں اور ان کا اضافی ایندھن نکال لیا۔ کیپٹن میرے پاس آیا تو میں نے اس سے کہا۔ ”یہ اسلحہ میرے ساتھیوں کو دے دو۔ جب تک اضافی دستہ نہیں آ جاتا ہمیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔“

کیپٹن اقبال نے ہر اسلحہ یا اور اپنے آدمیوں کو ہدایت دینے لگا۔ اسلحہ میرے ساتھیوں کو دے دیا گیا۔ میں نے انہیں آس پاس لگا دیا۔ میرے ذہن میں یہ خطرہ تھا کہ کہیں فتح خان کے پاس اور آدمی نہ ہوں اور وہ ان کی مدد سے دوبارہ ہم پر قابو پانے کی کوشش کرے گا۔ بریف کیس اس کے لیے اتنا اہم تھا کہ اس کے حصول کے لیے وہ بے دریغ اپنے درجنوں آدمی کو مار سکتا تھا۔ یہاں پڑی تین لاشیں اس کا ثبوت تھیں اور اسے اپنے فتح جانے والے آدمیوں کی پروا بھی نہیں تھی اس کی بلاستے وہ جہنم میں جاتے۔ ایسا آدمی ہماری پروا کہاں کرتا۔ میں اوپر آ گیا تھا اسی چٹان کے پاس جس کی جڑ میں بریف کیس رکھا تھا۔ چٹان سے فتح خان کے آدمی کی لاش ہٹائی گئی تھی۔ مگر اس کا خون بدستور چٹان پر پھیلا ہوا تھا۔ مجھے افسوس ہوا تھا کہ دولت کی خاطر انسان کتنی بے دردی سے

فتح خان کے آدمیوں نے حکم کی تعمیل کی۔ فتح خان انہیں روکنے یا سزا دینے کے لیے موجود نہیں تھا۔ وہ مارا گیا تھا؟ میں نے احتیاط سے درخت کے پیچھے سے جھانکا تھا کہ اسی آدمی نے مجھے پکارا۔ ”شہباز ملک سامنے آئیں۔ ہم ہجر کے آدمی ہیں۔“

میں درخت کی آڑ سے نکل کر نیچے آیا تو مجھے سڑک پر فتح خان کے وہی دونوں آدمی سروں پر ہاتھ رکھے گھٹنوں کے بل بیٹھے نظر آئے۔ جب کہ دو خاک و خون میں تھڑے پڑے تھے۔ آرمی کی وردیوں میں ایک درجن مسلح افراد دکھائی دے رہے تھے۔ ایک جوان کیپٹن آگے آیا۔ میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ”شہباز ملک۔“

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”کیپٹن اقبال حسن۔“

میں نے پک آپ کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس میں میرے چار ساتھی ہیں جنہیں ان لوگوں نے یرغمال بنالیا تھا۔“

”وہ محفوظ ہیں ایک شاید معمولی زخمی ہے۔“

میں آس پاس دیکھ رہا تھا لیکن فتح خان کہیں نہیں تھا۔ میں نے کیپٹن اقبال کو اس کے بارے میں خبردار کیا اور اس نے فوراً اپنے آدمیوں کو چاروں طرف پھیل کر فتح خان کو تلاش کرنے کا حکم دیا۔ میرا اطمینان تشویش میں بدل گیا تھا فتح خان کے بچ نکلنے کا مطلب تھا کہ خطرے کی تلوار مستقل میرے سر پر لٹکتی رہے۔ میں نے کیپٹن کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ کتنا خطرناک اور شاطر آدمی ہے۔ اگر وہ اکیلا رہ گیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ فرار کی کوشش کرے گا بلکہ وہ کہیں آس پاس رہ کر ہمیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔ مگر یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی وہ فتح خان کو عام مجرم سمجھ رہا تھا جو قانون کا سامنا ہوتے ہی فرار کے راستے تلاش کرتے ہیں۔ فتح خان کے بجائے اس بریف کیس سے زیادہ دلچسپی تھی۔ ”میجر صاحب نے کسی بریف کیس کا ذکر کیا تھا؟ جو مجھے اپنی تحویل میں لینا ہے۔“

”وہ بریف کیس میں نے اس چٹان کے خلا میں چھپایا تھا۔“ میں نے اوپر موجود چٹان کی طرف اشارہ کیا۔ ”لیکن جب فتح خان کو یہاں لے کر آیا تو بریف کیس خلا میں نہیں تھا۔“

وہ چونکا۔ ”پھر کہاں گیا؟“

”فتح خان اسی بات پر مجھے شوٹ کرنے والا تھا لیکن آپ لوگوں نے بروقت مداخلت کی۔“

”ہمیں پہنچنے میں ڈرا دیر ہوئی۔“ اس نے جواب دیا اور ریڈیو پر اپنے آدمیوں سے رپورٹ لینے لگا۔ وہ بڑی جیپوں میں آئے تھے اور اب یہ جیپیں یہاں آگئی تھیں۔ وہاں چار افراد تھے جو لاشوں کو دیکھ رہے تھے اور ایک آدمی فتح خان کے زندہ ساتھیوں کے سر پر سوار تھا۔ میں پک آپ کی طرف بڑھا جس میں میرے ساتھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک کے پاؤں گولی چمید کرتی گزر گئی تھی اور اس کے ساتھی اس کی مرہم پٹی کر رہے تھے۔ سب سے پہلے مشین گن بردار مارا گیا تھا ورنہ فتح خان نے اسے حکم دے رکھا تھا کہ کسی گڑبڑ کی صورت میں ان چاروں کو چھٹائی کر دے۔ میں نے خیریت دریافت کرنے کے بعد اہستہ سے انہیں کہا۔ ”تم خود کو میرا عام ملازم ظاہر کر دو گے۔ اپنے بارے میں زیادہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ بائوڈیٹا درست بتانا۔“

دوسرے کی زندگی داؤ پر لگا دیتا ہے۔ میں چٹان سے ٹک کر کھڑا ہو گیا۔

کیپٹن کے آدمی فتح خان کی تلاش میں ناکام ہو کر واپس آ گئے تھے اور اب اس جگہ کے گرد پھیل کر چاروں طرف نظر رکھے ہوئے تھے۔ کیپٹن شاید میری اہتیا علی تدابیر سے مطمئن نہیں تھا لیکن میجر سے احکام حاصل کر کے میری ہدایات پر پوری طرح عمل کر رہا تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو چوکنا کر دیا تھا۔ وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ دوپہر ڈھل رہی تھی اور سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ تقریباً تین بجے ایک ٹرک نمودار ہوا اور یہ ملٹری ٹرک تھا وہ آکر ہمارے پاس رکا اور اس سے دو درجن مسلح سپاہی اتر کر چاروں طرف پھیل گئی اور مجھے خوشگوار حیرت ہوئی جب ٹرک کے کپارٹ سے میجر آدم بھی اتر آیا تھا وہ گرم جوشی سے میرے سینے سے لگا۔ ”میری خواہش تھی کہ تم سے پھر ملاقات ہو اور دیکھو قدرت نے یہ خواہش کس طرح پوری کی۔“

”میں بھی تم سے پھر ملنا چاہتا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”اگرچہ امید نہیں تھی کہ ملاقات ہوگی۔“

”بریف کیس کہاں ہے؟“

میں نے اس کے آدمیوں کا معائنہ کیا اور ایک چھری سے جسم والے سپاہی کی طرف اشارہ کیا۔ ”اسے ساتھ لے کر میرے ساتھ چلو۔“

ہم اسی چٹان کے پاس آئے اور میں نے سپاہی سے کہا۔ ”جو ان اس درخت پر چڑھ جاؤ اور وہ دیکھ رہے ہو شاخوں میں چاندی جیسی چیز جھلک رہی ہے، وہ اتار لاؤ۔“

مستعد سپاہی تیزی سے شاخوں کو پکڑ کر اوپر چڑھ گیا۔ ایک منٹ سے بھی پہلے وہ شاخوں تک پہنچ گیا اور اس نے وہاں رکھا بریف کیس اٹھا کر اپنی پشت پر ٹانگ لیا۔ اس کا وہ بیگ غائب تھا جس میں اسے حفاظت کے نکتہ نظر سے رکھا تھا اور اسی وجہ سے یہ نظر بھی آیا تھا جب فتح خان کے آدمیوں سے بچتے ہوئے چٹان کے دوسری طرف چھلانگ لگائی تھی تب زمین پر پڑے ہوئے میری نظر شاخوں پر گئی تھی اور وہاں مجھے بریف کیس کی جھلک دکھائی دی تھی۔ اس وقت بھی میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ چٹان کے خلا سے یہ درخت تک کیسے پہنچا۔ میجر آدم نے تعریفی انداز میں کہا۔ ”اچھی جگہ چھپایا تم اسے۔“

”میں نے تو اسے یہاں چھپایا تھا۔“ میں نے چٹان کے خلا کی طرف اشارہ کیا۔ ”مجھے نہیں معلوم کہ یہ وہاں کیسے گیا۔“

سپاہی نیچے آ گیا تھا اس نے کہا۔ ”میں بتاؤں سر یہ وہاں کیسے گیا؟“

”تم جان گئے ہو؟“ میں نے دلچسپی سے کہا۔

”جی صاحب ادھر بندر ہوتے ہیں درخت پر جگہ جگہ ان کے بال ہیں ابھی وہ یہاں نہیں ہیں ورنہ بہت شور مچاتے۔ کوئی بندر اٹھا کر لے گیا ہوگا اور اس نے شاخوں میں رکھ دیا۔“

”اس لحاظ سے بندر کا شکر یہ ادا کرنا چاہیے ورنہ فتح خان بریف کیس حاصل کر لیتا اور پھر اسے لے کر غائب ہو جاتا۔“

میجر آدم خان پوری تیاری سے آیا تھا۔ ہم وہاں سے روانہ ہوئے لیکن کچھ دور گئے ہوں گے کہ قافلہ ایک نسبتاً کھلی جگہ رک گیا۔ میں میجر کے ساتھ ایک جیب میں تھا۔ میرے ساتھی اسی پک آپ میں سپاہیوں کے ہمراہ آ

رہے تھے۔ میں نے میجر کی طرف دیکھا تو اس نے کہا۔ ”یہاں سے میں الگ جاؤں گا۔“

ہم نیچے اتر آئے۔ چند منٹ بعد آسمان پر ایک پرندہ نمودار ہوا اور بتدریج نیچے آنے لگا۔ نیلی کا پتر سے پہلے اس کا شور آیا۔ وہ یہاں لینڈ نہیں کر سکتا تھا لیکن سڑک سے چند فٹ اوپر ہوا میں ملحق ہو گیا۔ میجر نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ”پھر ملیں گے اگر خدا نے چاہا تو۔“

”دوست ہمارا کیا ہوگا؟“

”میں نے کیپٹن اقبال سے کہہ دیا ہے وہ تمہیں مری تک چھوڑ دے گا۔ یہ سب ان آفیشلی ہوا ہے۔“

میں نے سکون کا سانس لیا۔ ”میں بھی یہی چاہتا ہوں دوست ورنہ میرے سامنے آنے سے خاصی پیچیدگیاں ہو سکتی ہیں میرے لیے بھی اور حکومت کے لیے بھی۔“

”اسی بنا پر تمہیں اس معاملے سے الگ رکھنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔“ وہ میرے گلے لگ کر بولا۔ ”اللہ حافظ برادر۔“

میجر آدم ایک بار پھر ہاتھ ملا کر نیلی کا پتر کی طرف بڑھ گیا۔ اندر موجود افراد نے اس کی مدد کی اور اسے اندر کھینچ لیا فوراً ہی نیلی کا پتر فضا میں بلند ہوا اور بلند ہوتا چلا گیا۔ ذرا دیر میں وہ غائب ہو چکا تھا۔ میرے سر سے ایک بوجھ اتر گیا تھا۔ کئی مہینے پہلے یہ بلاجہ میرے سر پر گرا تھا بہر حال اب جلد چھین کی امانت اسے مل جائے گی اور اس کے فوجی راز محفوظ رہیں گے، نیلی کا پتر کے جاتے ہی ہمارا قافلہ دوبارہ چل پڑا تھا۔ ٹرک ایک جگہ ہم سے الگ ہو گیا اور ہمیں سے دوسری جیب بھی واپس چلی گئی۔ اس کے ساتھ پک بھی تھی جس میں فتح خان کے زندہ اور مردہ آدمی تھے۔ میرے چاروں ساتھی جیب میں آ گئے اب کیپٹن اقبال کے ساتھ صرف ایک ڈرائیور تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”ہم آپ کو مری تک پہنچا دیں گے۔“

”یہ تمہاری مہربانی ہوگی۔“ میں نے کہا۔

”نہیں جناب۔“ وہ احترام سے بولا۔ ”یہ ہمارا فرض ہے۔“

شام کے قریب ہم نے ایک جگہ رک کر دوپہر کا کھانا کھایا جو ٹھنڈا اور بد مزہ ہو چکا تھا لیکن پیٹ بھرنا تھا۔ مری اب کچھ دور تھا۔ سورج غروب ہوتے ہی ہم مری کے قریب پہنچ گئے۔ لینڈ سلائیڈنگ صاف ہو چکی تھی اور سڑک پر ٹریفک چل رہا تھا۔ یہاں کیپٹن اقبال ہاتھ ملا کر رخصت ہوا۔ میں ایک بار پھر میجر آدم کا احسان مند تھا کہ اس نے مجھے فوراً دیا۔ ورنہ اصولاً تو انہیں بریف کیس کے ساتھ مجھے بھی تحویل میں لے لیتا یا چاہیے تھا اور جب تک وہ بریف کیس کی طرف سے اطمینان حاصل نہ کر لیتے مجھے چھوڑنے کا جواز نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس نے مجھے جانے دیا تھا۔ میں نے سب سے پہلے وسم کو کال کی۔ وہ میری آواز سنتے ہی بے تابی سے بولا۔ ”شہباز صاحب آپ ٹھیک ہیں نا؟“

”ہاں یار کام ہو گیا ہے ہمارے ساتھی بھی فٹ گئے ہیں اور بریف کیس بھی محفوظ ہاتھوں میں پہنچ گیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”براہیہ ہوا کہ میرا موبائل فتح خان کے ہاتھ لگ گیا ہے اس لیے سب سے کمزور رابطے کے نمبر فوری طور پر ترک کر دیں۔“

”میں سب کو خبردار کرتا ہوں۔“

”ہم آرہے ہیں۔“ میں نے یہ بتانے سے گریز کیا کہ ہم کہاں ہیں۔ فتح خان ڈیوڈ شا کا چیلرا ہا تھا اور اس کے پاس وہ سارے گرو اور آلات تھے جو ڈیوڈ شانے اسے مہیا کیے تھے جن کی مدد سے اس نے کئی بار میرا سراغ لگایا تھا۔ بریف کیس ہاتھ سے نکل جانے کے بعد وہ زخم خوردہ سانپ بن گیا ہوگا۔ مری آنے والی کئی گاڑیاں اب خالی واپس جا رہی تھیں۔ ایک ہائی روف ہمیں مل گئی۔ ڈرائیور نے موقع سے فائدہ اٹھا کر منہ مانگا کرایہ مانگا تھا۔ جب میں مان گیا تو اسے حیرت ہوئی تھی میرا خیال تھا کہ وہ نصف کرائے پر بھی مان جاتا لیکن میں نے بارکینک نہیں کی اور وہ سارے راستے مجھ پر واری قربان ہوتا رہا۔ مگر میں نے پھر بھی احتیاطاً اسے فیض آباد کے شروع میں روک دیا اور جب وہ رخصت ہو گیا تو ہم دونوں کیسیوں میں کوشی کی طرف روانہ ہوئے جہاں سب بے تابی سے ہمارے منتظر تھے۔ ٹیکسیاں رکستے دیکھ کر اندر کھلبلی مچتی تھی کہ دشمن نے حملہ تو نہیں کر دیا ہے اور جب ایک ٹیکسی میں میرا چہرہ دکھائی دیا تو دوبارہ کھلبلی مچ گئی۔ گیٹ کھل گیا لیکن ٹیکسیاں اندر لانے کے بجائے ہم نے انہیں باہر سے ہی رخصت کر دیا میرا ارادہ تو انہیں گلی کے کونے سے رخصت کرنے کا تھا لیکن دوسری ٹیکسی آگے نکل گئی اور اس میں سوار تینوں ساتھی اسے کوشی تک لے گئے۔ اس لیے مجبوراً مجھے بھی ان کے پیچھے جانا پڑا تھا۔ وسیم باہری مل گیا۔ ”شکر ہے آپ محفوظ ہیں ورنہ میں بہت پریشان تھا۔“

”یاریا ہوتا رہتا ہے اب تو عادت ہو جانی چاہیے۔“ میں ہنسا۔ ”پھنس گیا تھا لیکن اللہ کی مدد شامل حال رہی اور بازی میرے حق میں رہی۔ فتح خان پھر نا کام رہا۔“

عبداللہ نہار ہا تھا وہ میری آمد کی خبر پا کر غلٹ میں کپڑے پہن کر چلا آیا تھا اس کے بالوں سے ابھی تک پانی ٹپک رہا تھا۔ وہ بھی یوں گلے ملا جیسے میں حج یا جہاد سے واپس آ گیا ہوں۔ ہم اندر آئے۔ میں نے انہیں مختصراً زوداد سنائی۔ کیونکہ میرا تھکن سے برا حال تھا اور میں غسل فرما کر کچھ دیر سونا چاہتا تھا۔ مگر وسیم نے تجویز پیش کی۔ ”رات کے کھانے میں کچھ دیر ہے آپ کھانا کھا کر سوئیں ورنہ آدھی رات کو بھوک سے آنکھ کھل جائے گی۔“

مجبوراً اس کی بات ماننا پڑی اور اس بار انہوں نے سوالات کی مدد سے تفصیلات حاصل کیں۔ بریف کیس انٹیلی جنس کی تحویل میں جانے کا سن کر انہوں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ ایک قصہ تو ختم ہوا تھا۔ میں نے واش روم جانے سے پہلے نادر کا پوچھا۔ ”عبداللہ نے کہا۔“ وہ یہیں ہے کیونکہ فی الحال کوئی دوسری جگہ نہیں ہے لیکن میں دیکھ رہا ہوں امید ہے ایک دو دن میں کوئی دوسرا ٹھکانہ بھی مل جائے گا۔“

”میں بھی دیکھ رہا ہوں یہ ضروری ہو گیا ہے۔“ وسیم نے کہا۔

”تب تک غیر ضروری افراد کو چھٹی پر بھیج دو۔“ میں نے مشورہ دیا اور اپنے کمرے میں آیا۔ بیک سے دوسرا لباس نکال کر ہاتھ روم میں گھس گیا۔ بھاگ دوڑنے حلیہ خراب کر دیا تھا۔ موسم معتدل تھا اس لیے عام پانی سے نہانے میں مزہ آیا تھا۔ شیو کر کے میں نے قلمیں لمبی چھوڑ دیں۔ سر کے بال چھوٹے تھے۔ لباس بدل کر سکون ملا تھا۔ کھانے کی میز پر اکرم چشتی کے بارے میں غنی معلومات ملیں۔ ڈاکٹر زاس کی بیٹائی اور سماعت کی طرف سے مایوسی ظاہر کرتے تھے۔ شاید اس کا علاج ہو جاتا لیکن رشوت خوری کے باوجود اس کی اتنی اوقات نہیں تھی کہ کسی ترقی یافتہ ملک کے علاج کے اخراجات برداشت کر سکتا۔ اس کے آقاؤں کو اس سے اب کوئی دلچسپی نہیں ہو گی کیونکہ ایسے پولیس افسران کی کمی نہیں ہوگی جو اکرم چشتی کی جگہ لینے کے لیے بے تاب ہوں گے۔ کام کی

اطلاع یہ تھی کہ عبداللہ نے وہ انجکشن منگوا لیے تھے جو آدمی کو پانچ سال کا بچہ بنا دیتے ہیں۔ اس نے ایک ڈرگ دیلر سے یہ انجکشن منگوائے تھے اور اس نے ان کی ضمانت دی تھی۔ یہ خاصے مہنگے پڑے تھے لیکن عبداللہ نے ان کی قیمت نہیں بتائی تھی۔ اس نے بتایا۔

”میں کل صبح راجا صاحب کی کوشی کا سودا کرنے جاؤں گا اسی دوران میں کوئی دوسری جگہ بھی دیکھوں گا۔“

اس کوشی میں گنجائش کم تھی اور وسیم کے سارے آدمی یہاں مشکل سے ساتے اس لیے وہ ان کی چھاننی کرنے چلا گیا میں نے بیڈروم کا رخ کیا اور بستر پر لیٹنے ہی آنکھ لگ گئی تھی۔ مجھے ندیم سے بات کرنے کا خیال آیا کہ مرشد کے دکھانے اس سے رابطہ کیا یا نہیں لیکن پھر یہ کام میں نے صبح تک کے لیے ملتوی کر دیا۔ ایک تھکا دینے والے سفر اور بڑی کامیابی کے بعد میں کچھ دیر اس دنیا سے بے خبر رہ کر گزارنا چاہتا تھا۔ میری خواہش پوری ہوئی اور میں صبح تک بے خواب نیند سوتا رہا۔ سورج کی کرنوں کی چکا چوند نے مجھے بیدار کیا۔ کھڑکی کا رخ عین مشرق کی طرف تھا اور پردہ ہٹا ہوا تھا اس لیے سورج نکلا تو دھوپ براہ راست اندر آئی تھی۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی کھولی اور صبح کی تازہ ہوا میں چند گہرے سانس لیے۔ موسم گرم ہو چلا تھا لیکن صبح کی ہوا میں خوشگوار خشکی تھی۔ میری توجہ سرہانے کی طرف گئی جہاں ایک موبائل فون رکھا ہوا تھا میں نے اسے چیک کیا اس میں سب کے نئے نمبر ناموں سے فید تھے اور اس موبائل کا نمبر بھی تھا۔ میری نیند کے دوران کوئی اسے یہاں رکھ گیا تھا۔ میں نے سویرا کا نمبر ملایا۔ اس کا نمبر پرانا ہی تھا اور فتح خان پہلے ہی اس نمبر سے واقف تھا۔ اس لیے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس نے کال ریسیو کی اور آہستہ سے بولی۔

”ہیلو۔“

”السلام علیکم۔“ میں نے کہا تو اس کی آواز کھل اٹھی۔

”کیسے ہیں آپ؟“ اس نے سلام کا جواب دے کر پوچھا۔ ”مجھے لگ رہا تھا آپ کہیں گئے ہوئے ہیں۔“

”ہاں میں گیا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”کل فتح خان کا مجھے فون آیا تھا وہ بہت غصے میں تھا اور آپ کو دھمکیاں دے رہا تھا۔“

”تم نے اس کی بجائے اس کی فون بند کر دیتیں۔“

”میں نے بھی کیا مشکل سے پندرہ سیکنڈ کی کال ہوگی اس دوران میں وہ بولتا ہی رہا۔ میں نے تو بعد میں موبائل بھی آف کر دیا تھا۔“

”تم نے ٹھیک کیا یہ بتاؤ کوئی نئی سم ہے تمہارے پاس؟“

”ہاں اب میرے پاس تین دوسری سمز ہیں۔“

”تم نے نمبر دیکھ لیا ہے اس پر کال کرو اور اب یہ سم پھینک دو۔“

میں نے کال کاٹ دی چند منٹ بعد ایک اجنبی نمبر سے کال آئی۔ یہ سویرا کا دوسرا نمبر تھا میں نے کال ریسیو کی۔ ”تم کیسی ہو جو ملی کے حالات کیسے ہیں۔“

”میں ٹھیک ہوں اور یہاں بھی سب ٹھیک ہیں۔“ اس نے چپک کر کہا اور پھر ہنسی۔ ”آپ نے کیا پیڑو

بھیجے ہیں۔ انہوں نے تو گاؤں والوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔“

”مانی اور بیٹو..... بچے ہیں اور کام کے بچے ہیں۔ بیٹو کے بارے میں تو تم جانتی ہو۔ یہ مانی نیا اضافہ ہے۔“

”مانی نے پوری حویلی میں کسرے لگا دیے ہیں۔ اب بابا اور گارڈز اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ہر طرف نظر رکھ سکتے ہیں۔“ سویرا بتا رہی تھی۔ ”بابا کے باہر جاتے ہی یہ ہمارے پاس آ جاتے ہیں۔ جب بابا ہوں تو شرافت سے مردانے میں رہتے ہیں۔“

”سفیر، مونا اور سعد یہ کیسے ہیں؟“

”تینوں ٹھیک ہیں۔ سفیر بھائی کی وجہ سے مونا بہت خوش ہے البتہ سعد یہ اداس ہے۔“

”ہاں یہاں بھی ایک بندہ اداس ہے۔“ میں ہنسا۔

”آپ نہیں ہیں؟“ اس نے شوفی سے پوچھا۔

”میں بھی ہوں لیکن اس طرح نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”شازیہ کا مسئلہ حل ہوا یا نہیں؟“

سویرا جھینپ گئی پھر اس نے انک انک کرتا یا۔ ”ماں جی نے اسے کسی لیڈی ڈاکٹر کو دکھایا ہے۔ وہ ہمدرد عورت ہے غلط کام نہیں کرتی ہے لیکن جب اسے شازیہ کے ساتھ ہونے والے ظلم کا پتا چلا تو وہ تیار ہو گئی۔“

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”یعنی مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ ممکن ہے کچھ دن میں اسے یہاں واپس بلا لیں۔ اس کا باپ آئے گا تو اس کے حوالے کر دیں گے۔“

”وہ پھر اسے کسی جہنم میں جمونیک دے گا۔“ سویرا نے دکھ سے کہا۔ ”میں اس کی کہانی سن کر کاپ گئی تھی۔ اس معصوم نے ذرا سی عمر میں کیا دیکھا اور سہا ہے۔ یہاں خوش ہے۔“

”مگر اس کا وارث اس کا باپ ہے۔“ میں نے سویرا کو یاد دلایا۔

”آپ کب آرہے ہیں۔“ اس نے موضوع بدل دیا۔

”میں معاملات سمیٹنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ جلد مجھ پر قائم مقدمات ختم ہو جائیں گے۔ اس کے بعد میں کہیں بھی جانے کے لیے آزاد ہوں گا۔“

”اللہ وہ وقت جلد لائے۔“ سویرا بولی۔ اس سے کچھ دیر بات کی۔ پھر حویلی کے نمبر پر کال کر کے ماں جی اور دوسرے لوگوں سے بات کی۔ بابا بھی موجود تھے اور خوش تھے کیونکہ بہت دنوں بعد حویلی میں رونق آئی تھی۔ آبا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی لیکن شفی نے بہت دیر میرا سر کھایا تھا۔ مجبوراً اسے شفیق کے حوالے سے چھیڑا تو وہ خون چھوڑ کر غائب ہو گئی۔ اپنے پیاروں سے بات کر کے انسان کیسے ہلکا ہو جاتا ہے خاص طور سے جب وہ بہت دنوں سے ان سے دور ہو۔ یہ بات وہی جانتے ہیں جو اس دوری سے گزر رہے ہوں۔ کال بند کر کے میں نے ندیم کا نمبر ملایا۔ اس کے پاس میرا یہ نمبر نہیں تھا اس لیے اس نے بیزار سے کہا۔

”کون ہے بھائی؟“

”تیرا ایک بھوکا پیاسا ماسکل..... جسے چھانی سے پہلے ناشتہ بھی نہیں ملے گا۔“

”ٹو.....“ ندیم نے گالی دی۔ ”اے بے ٹول جانے تو میں خود تجھے لٹکا دوں میری زندگی کے دشمن۔“

”لگتا ہے مرشد کے دکھانے رابطہ کر لیا ہے۔“ میں ہنسا۔

”ایک وکیل ہے اور بڑا حرامی وکیل ہے۔ یوں مجھ لے کہ میرا بھی باپ ہے۔“

”تب تو تُو ہوتا وہ۔“ میں نے کہا۔

”کیا؟“ ندیم نے بے خیالی میں کہا اور جب بات سمجھ آئی تو اس نے مزید گالیاں دیں۔

”بس کر میرے گفتار کے غازی..... اس سے زیادہ بکواس کی تو وہاں آکر شہید کر دوں۔ بہت پہلے کر چکا

ہوتا لیکن تیرے بیوی بچوں کا خیال آتا ہے۔“

”بکواس مت کر وہ صبح شام میرے سر پر سوار رہتا ہے۔ اپنا سارا کام چھوڑ کر بیٹھا ہوں۔ دو منٹ بھاگ گئے

ہیں جن کے کیس کی پیشیاں رہ گئیں۔ آج دو اور بھاگ جائیں گے کیونکہ میں آج بھی عدالت نہیں جاسکوں گا۔“

”چل یار دل جمعی سے کام کر..... ایک بار میرے کیسوں سے چھٹکارا مل جائے تو دل بھر کر پریکٹس کرنا

ور دوسروں کو لٹنا۔“ میں نے مشورہ دیا۔ ندیم نے کچھ دیر بک بک کرنے کے بعد بتایا کہ مرشد کا وکیل بھی اس سے

کم نہیں تھا وہ معاملات کو تو زبردستی اپنے حق میں لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ فی الحال اس کی کوشش تھی کہ

تصفیے میں زیادہ سے زیادہ وقت لگے۔ میں نے کہا۔ ”رک جا ابھی میں مرشد سے بات کر لوں پھر اس سے

ملاقات کرنا۔“

”دیکھ کر اگر تیرے پاس مرشد کی کوئی دھتھی رگ ہے تو اسے ذرا زور سے دبا اور اس حرامی کو پٹا ڈالو۔ اگر

میرے ہاتھ میں ہوتا تو اب تک کیس ری فائل کر چکا ہوتا۔“

”ٹو لگرنہ کر میں ابھی بات کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

میں نیچے آیا تو ناشتہ تیار ہو رہا تھا۔ وسیم اور عبداللہ ڈانٹنگ ٹیبل پر جادو کر رہے تھے۔ وسیم نے اخبار

میں کسی جگہ کا اشتہار دیکھا تھا۔ یہ راول چوک کے قریب کوئی جگہ تھی۔ عبداللہ کو جلدی تھی اس لیے وہ ناشتہ تقریباً

کر چکا تھا۔ اس نے وسیم سے کہا۔ ”میں فارغ ہو کر اس جگہ کو بھی دیکھنا آؤں گا۔“

”مگر ہوشیار رہنا پھر کوئی افغان جیسا چکر باز نہ لگے پڑ جائے۔“ میں نے ناشتہ کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کی حویلی بات ہوئی ہے۔“ وسیم نے کہا۔

”تمہیں کیسے پتا چلا..... اوہ اچھا تم بھی کسی کو کال کر رہے ہو گے۔“

”ہاں میں سعدیہ سے بات کر رہا تھا۔“

”میں تو کہہ رہا ہوں تم بھی حویلی کا چکر لگاؤ۔ ابھی کوئی ایسا معاملہ نہیں ہے جسے دیکھنا ضروری ہو۔“

وسیم نے سر ہلایا۔ ”میں بھی سوچ رہا ہوں لیکن کہیں انکل یہ نہ سوچیں کہ سب نے حویلی کا راستہ دیکھ لیا ہے۔“

”بابا بہت مہمان نواز ہیں اور تم لوگ مہمان نہیں ہو۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”بابا بہت خوش ہوں

گے۔ وہ تو اب بھی خوش ہیں کہ حویلی میں کتنی رونق ہے۔“

”ٹھیک ہے میں جاتا ہوں۔ میں نے اپنے تقریباً تمام آدمیوں کو چھٹی دے دی ہے۔ بس تین آدمی ہیں۔“

”یہ اچھا ہے، جب تک کوئی نیا ٹھکانہ نہ ملے بیٹھ جیٹنی کم ہوا چھا ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”مجھے مرشد سے

بات کرنی ہے اس کا وکیل معاملات کو الجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔“

دونوں کے مسائل حل ہو جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے میں اپنے وکیل سے کہتا ہوں کہ وہ تمہارے وکیل کی ہدایت کے مطابق کام کرے۔"

"اور اس کے کسی کام میں ٹانگ بھی نہ اڑائے۔"

"ٹھیک ہے۔" مرشد نے بادل ناخواستہ کہا۔ غالباً اس نے کبھی خود کو اتنا مجبور محسوس نہیں کیا ہو گا۔

"میں نے اسے چھیڑا۔" سنا ہے تمہارا ایک خاص آدمی زخمی ہے اب اس کی حالت کیسی ہے؟"

"فاضلی ٹھیک ہے۔" مرشد نے پاٹ لچھے میں کہا۔ "ایک دو دن میں وہ چلنے پھرنے لگے گا۔"

"نہ..... نہ اس سے کہو اتنی جلدی کیا ہے اس بار اسے ہمیشہ کے لئے لٹانا ہے۔"

"شہباز اب اسے بھول جاؤ وہ کبھی تمہارے راستے میں نہیں آئے گا۔"

"مرشد وہ کتے کی ذمہ ہے جسے سورس بھی نگلی میں رکھو تو وہ میز صحرے کی اور فاضلی تو اتنا میڑھا ہے

کہ نگلی میڑھی ہو جائے گی اور تم کہہ رہے ہو کہ وہ کبھی میرے راستے میں نہیں آئے گا۔"

"میں اسے سنبھال لوں گا۔"

"سنبھالو گے۔" میں نے معصومانہ حیرت سے کہا۔ "وہ تمہارا ملازم ہے یا تمہاری اولاد ہے جو تم اسے

سنبھالو گے۔"

مرشد دلہنی لاشعوری غلطی کا احساس ہوا۔ "میرا مطلب ہے وہ میری مرضی کے بغیر کچھ نہیں کرے

گا۔"

"بھئی تو میں کہہ رہا ہوں کہ تمہارے آدمی تمہارے مرضی کے بغیر کچھ نہیں کرتے ہیں۔ اس لئے اگر

ان کی طرف سے کوئی کاروائی ہوئی تو دراصل تمہاری طرف سے سمجھی جائے گی۔" میں نے اسے خبردار کیا اور کال

بند کر دی۔

ب۔



اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات

تیرھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں۔

"یہ کوشش وہ مرشد کی ہدایت پر کر رہا ہو گا۔" وسیم نے یقین سے کہا۔ "ورنہ اس کی اپنی اتنی جرأت کہاں کہ خود سے ایسا کوئی کام کر سکے۔"

"تب ہی مرشد سے بات کرنی ہے۔" میں نے کہا۔ ناشتہ کر کے چائے لے کر میں اوپر آیا وسیم میرے ساتھ ہی تھا۔ لیپ ٹاپ آن کر کے کال والی سائیٹ کھولی اور مانی کے اکاؤنٹ سے مرشد ہاؤس کا نمبر ملایا۔ اس کے شعلیق سیکرٹری نے کال ریسیو کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس معمولی سے کام کے لیے سیکرٹری کا انتخاب کیوں کیا گیا تھا۔ اس نے مختاطہ انداز میں پوچھا۔

"کون بول رہا ہے؟"

"مرشد کا والد الیٹانی جہنم سے بات کر رہا ہوں۔ اسے یہاں بلانا ہے۔"

"شہباز صاحب۔" اس نے بدستور مختاطہ انداز میں کہا۔

"مرشد کہاں ہے؟"

"ایک منٹ میں چیک کرتا ہوں۔" اس نے کہا اور کال ہولڈ پر کر دی۔ کچھ دیر بعد مرشد کی آواز آئی۔

"شہباز....."

"نام لینے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "تم اچھی طرح جانتے ہو میں کون ہوں۔"

"میں نے تمہاری بات مان لی ہے اور اپنے وکیل کو تمہارے وکیل کے پاس بھیج دیا ہے۔"

"ہاں وہ اپنا کام اچھی طرح کر رہا ہے۔" میں نے طنز کیا۔ "کیس ری فائل کرنے میں تاخیر کر رہا ہے۔"

"وہ اصل میں یہ قانونی مسائل ہیں اور میں ان سے زیادہ واقف نہیں ہوں۔" مرشد نے انجان بننے کی

کوشش کی۔

"حالانکہ قانون کو تم جیسے لوگوں نے موسم کی ناک بنا رکھا ہے اپنی مرضی سے اسے توڑتے مروڑتے رہتے

ہو۔ مجھے بے وقوف مت بناؤ میں پہلے ہی خاصا بے وقوف ہوں۔"

مرشد نے دفاعی انداز میں کہا۔ "اب تم کیا چاہتے ہو؟"

"مرشد کیس مجھ پر ہیں تم پر نہیں اور صلح تم چاہتے ہو میں نہیں۔ اس لیے ابھی اور اسی وقت اپنے وکیل سے

کہو کہ وہ صرف میرے وکیل کی معاونت کرے اس کے کام میں مداخلت یا فیصلے نہ کرے۔"

"وہ ایسا نہیں کر رہا ہے۔"

"میری ابھی اپنے وکیل سے بات ہوئی ہے۔ وہ تمہارے وکیل کی حرکتوں سے بالکل خوش نہیں ہے۔

ظاہر ہے وہ تمہاری ہدایات کے برعکس تو کچھ نہیں کر رہا ہو گا اس لیے بہتر ہے تم خود اسے پٹا ڈال دو۔ دوسری

صورت میں میرے پاس کچھ آپشن اور بھی ہیں تم سمجھ رہے ہوتا؟"

"تم نادر کا حوالہ دے رہے ہو؟"

"میں نہیں جانتا کہ تم نادر کی بات کیوں کر رہے ہو لیکن تم میری بات سمجھ رہے ہو۔ مرشد تمہارے پاس دو

دن ہیں۔ تم اپنے وکیل سے کہو کہ وہ ندیم کے کام میں کوئی مداخلت نہ کرے اور پرسوں تک کیس لازمی ری فائل کر

دیئے جائیں۔ میں تب تم سے فیصلہ کن بات کروں گا۔ امید ہے اگر معاملات درست سمت میں چلتے رہے تو ہم

